اٹھارہویں صدی میں

ہندوستانی معاشرت

میر کا عہد

ڈاکٹر محمد عمر

شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

اٹھارہویں صدی میں

ہندوستانی معاشرت

میر کا عہد

یعنی اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سماج کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ادبی تاریخ۔ جس میں خصوصی طور پر میر تقی میر دہلوی کی حیات اور شاعری کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر
استاد شعبہ تاریخ
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

طبع اول : ۱۹۷۳ء

مطبع : جمال پرنٹنگ پریس دہلی

تعداد : چھ سو

قیمت : بیس روپے

کتابت : حفیظ الرحمٰن عباسی

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہلال بُک ڈپو

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

نئی دہلی ۱۳

انتساب

اپنے استادِ محترم

پروفیسر خلیق احمد نظامی

کے نام

مِل گیا دل ترے پیکان سے کتنی جلدی
ورنہ بیگانوں سے برسوں میں لہو ملتا ہے

فہرست مضامین

باب اوّل

سیاسی حالات اندرونی خلفشار

بیرونی حملے

شاہ ابدالی شہر شاہجہاں آباد میں اور اُس کے سپاہ کا ظلم و ستم

ماکولات و مشروبات: ۲۱۱ - ۲۱۳

میر کے کلام میں ماکولات

مسلم جشن، تہوار اور تقریبات

میلے ٹھیلے اور بزرگان دین کے عرس

اعراس

کھیل تماشے

مدرسے ۲۶۱-۲۶۲

ادبی مجلسیں، مشاعرے وغیرہ

دہلی میں کیسے کیسے احباب!

باب چہارم
مذہب اور اخلاق

حصہ دوم
میر لکھنؤ میں: ۱۷۸۱-۱۸۱۰ء

باب پنجم
سیاسی حالات

نواب شجاع الدولہ

نواب آصف الدولہ

باب ششم

اقتصادی حالت

باب ہفتم

لکھنؤ کا معاشرہ و تمدن

دربار اودھ کے جشن و تقریبات

عام مسلمانوں کی معاشرت

رسوم و رواج

مسلم جشن، تہوار، تقریبات

کھیل، تفریحی مشاغل

بچوں کے کھیل

باب نہم

پیش لفظ

میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت و رفعت کے سامنے سب نے عقیدت سے سر جھکایا ہے۔ انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی شہرت و مقبولیت نصیب ہو گئی تھی۔ وہ ایک مسلمہ روایت کے مطابق ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے[1] اور انھوں نے ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء کے بعد کسی وقت دہلی میں سکونت اختیار کی[2]۔ اور یہاں سید سعادت علی امروہوی کی ترغیب و تحریک سے وہ زبان اردوے معلّی شاہجہان آباد دہلی میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ گویا خود میر نے اپنے قول کے مطابق ۱۶-۱۷ سال کی عمر میں ریختہ کہا — ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء کے لگ بھگ جب وہ اپنا تذکرہ نکات الشعراء مرتب کر رہے تھے۔ اُن کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہیں تھی[3]۔ خواجہ میر درد

---

[1] اس کا مدار نوادر الکلام (کتب خانہ راجا محمود آباد) کی ایک عبارت پر ہے۔ علاوہ بریں دیوان چہارم کے ایک مخطوطے میں محمد محسن نے لکھا ہے کہ میر نے نوّے سال کی عمر میں ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ تفصیل دیکھیے: مقدمہ کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی، طبع نولکشور

[2] میر کی آپ بیتی: ۹۲ [3] میر کی آپ بیتی: ۹۲ [سید سعادت علی کے تفصیلی حالات [illegible]

[illegible]

کے بیان میں انھوں نے درؔد کے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب (متوفی ۱۱۷۲ھ / ۵۹-۱۷۵۸ء) سے اپنی ملاقات کا بھی حوالہ دیا ہے۔

"ایامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگوار شرف اندوز می شد، از زبانِ مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد الحمدُ لِلّٰہ والمِنّۃ کہ حرفِ آخر سر سلسلۂ خدا پرستاں مؤثر افتاد"۔ [1]

گویا نکات الشعراء کی تالیف کے وقت تک خود میرؔ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ "میرِ مجلس" ہو چکے ہیں۔ اُن کا کلام گلی کوچوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اور اُس کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا۔ کہ:-

میر دریا ہے، سُنے شعر زبانی اُس کے
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی
خاطرِ بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اُڑانی اُس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی!
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہرِ دلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی [2]

لیکن وہ ایک ایسے پُر آشوب دور میں پیدا ہوا کہ اُسے فراغِ خاطر

(بقیہ صفحہ ۱۵ کا) علاوہ میرا مضمون۔ معشوق چہل سالہ۔ اُردو ادب علی گڑھ شمارہ ۱۹۹۶ء بھی ملاحظہ ہوں۔ [1] نکات الشعرا (۱۱۸) ص ۵۰؛ [2] کلیات میر [illegible]

کے ساتھ اپنے فن پر ریاض کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ مغلیہ سلطنت کا دورِ زوال بہت ہی خلفشار، سیاسی ہیجان، ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کا عہد ہے۔ میر خود ان حالات کی بے رحمی کا شکار ہوا۔ اور اُسے حوادث کے سیلاب میں ایک بے سہارا تنکے کی طرح بہنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس نے اپنی سوانح عمری "ذکرِ میر" لکھی تو اپنے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں بھی نہیں بتائیں۔ تمام تر اپنے عہد کے سیاسی واقعات کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ ذکر میر کو پڑھنے والا کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اِس کتاب کا نام "ذکرِ عہدِ میر" ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں میر اپنے دادا پردادا کا نام نہیں بتاتا۔ اپنی ولادت، تعلیم، تربیت، سکونت، کسی بات کا ذکر تا وضاحت سے نہیں کرتا۔ والد کا نام بھی ایک موقع پر ضمناً بیان کر دیا ہے۔ وہ اگر کسی نواب کے دربار سے متوسل رہا تو اس کا منصبی کام کیا تھا۔ تنخواہ کتنی تھی۔ اس نے کب اور کہاں شادی کی۔ کتنا بڑا کنبہ تھا۔ حلقۂ احباب کیسا تھا۔ مکروہات و مرغوبات کیا کیا تھے۔ غرض کوئی ایسا سوال سوچ لیجیے جس کا جواب کسی کی سوانح عمری میں ڈھونڈا جاتا ہے۔ وہ جواب آپ کو "ذکرِ میر" میں نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس آپ دیکھیں گے کہ میر نے بہت سرسری انداز میں اپنے اجداد کے حجاز سے گجرات اور وہاں سے آگرہ کو منتقل ہونے کا بیان کیا ہے۔ پھر اپنے باپ کی درویشی اور صوفیانہ طرز زندگی کا ذکر اور اُن کے مختصر حالات و ملفوظات ہیں۔ یہ ملفوظات تمام تر میر کے خلاق ذہن کی اختراع ہیں۔ اگر اُن کے باپ اوسط درجے کے درویش یا صوفی بھی ہوتے اور آگرہ میں اُن کی وہ مقبولیت ہوتی جو میر نے بتائی ہے تو اُن کا حال کہیں نہ کہیں موجود ہوتا۔ اس عہد کے تمام تاریخی اور قدیم تاریخ

ماخذ اُن کے وجود سے بے خبر ہیں۔

والد کے انتقال کے بعد میر نے نادر شاہی حملہ کا بیان کیا ہے، اور یہاں سے جو تاریخی وقائع کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو بس تاریخ ہی لکھتے چلے گئے ہیں۔ کہیں کہیں درمیان میں سرسری اور ضمنی طور پر اُن کی اپنی شخصیت بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی حیثیت کسی ڈرامے کے غیر اہم کردار کی ہے۔ پھر وہ وقائع سیاسی کے یلغار میں گم ہو جاتے ہیں۔

جس شاعر کے کلام میں ایسی خود پسندی اور اتنی انانیت ہو، وہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہوئے خود کو اپنے ماحول میں اتنا گم کر دے، یہ عجب طرح کا تضاد ہے۔ لیکن آپ اس غور و تامل کریں تو معلوم ہوگا کہ میر اس ماحول کی پیداوار تھا جو بے یقینی، تشکیک، ناپائداری، کس مپرسی سے عبارت تھا اس وقت حالات کی کشاکش شخصیتوں کو بگاڑ رہی تھی۔ بنا نہیں رہی تھی۔ میر کے ذہن و مزاج، شخصیت و افکار، اور افتادِ طبع کو سمجھنے کے لئے اس سے بہتر پیرایہ اور اس سے زیادہ بلیغ ترسیل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کہ اس کے عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا آئینہ سامنے رکھ دیا جائے۔ تاریخ میں بڑی وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ صرف سیاسی وقائع ہی نہیں ہوتے اس میں پورا سماج۔ اس کی طرز بود و ماند، آداب خورد و نوش، ہنگامے، اور ہنگامے، رسوم، رواج، میلے، تہوار، عقائد، توہمات، سب کچھ شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح اقتصادی عوامل، تہذیبی رشتے، ثقافتی محرکات اور ان سب کا فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر مل کر تاریخ کو معنی خیز اور عبرت انگیز بناتا ہے۔ سیاسی حالات بھی اپنے سماجی پس منظر، اور معاشرتی تغیروں سے جدا ہو کر سمجھ میں نہیں آسکتے۔

جس طرح میر کی زندگی اس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور سماجی مظاہر میں گم ہو گئی ہے۔ اُسی طرح یہ دَور اُس کی شاعری کا جزِ لاینفک بن گیا ہے۔ خود میر کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ " دلّی اور دل " کے مرثیے لکھتا ہے۔ یہ " دلّی " دراصل اُس ہند ایرانی شائستگی کی علامت ہے جس کے آثار میر کی نگاہوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔

پہلا تاریخی واقعہ، جس کا حوالہ " ذکرِ میر " میں آیا ہے[1] وہ نادر شاہ کا حملہ (مارچ ۱۷۳۹ء) ہے۔ اس میں میر کے اوّلین مربّی نواب صمصام الدولہ کام آئے تھے۔ آخری واقعہ غلام قادر روہیلہ کا قلعہ معلّٰے پر قبضہ اور پھر مادھوجی سیندھیا کے ہاتھوں گرفتار ہونا ہے[2] (مارچ ۱۷۸۹ء)۔ اِس طرح ذکرِ میر میں پورے پچاس سال کی تاریخ کے اہم واقعات کا حوالہ ملتا ہے۔ اور عجیب اتفاق ہے۔ کہ سر جادو ناتھ سرکار کی مشہور کتاب " زوالِ سلطنتِ مغلیہ " (FALL OF THE MUGHAL EMPIRE) کی پہلی جلد بھی مارچ ۱۷۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ اور تیسری جلد کا اختتام مارچ ۱۷۸۹ء کے وقائع پر ہوتا ہے۔ اس طرح سرکار کی کتاب کو ہم " ذکرِ میر " کی تاریخی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ اہم نتائج کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

میر جتنا عظیم شاعر ہے اتنا ہی بڑا بدنصیب بھی ہے۔ غالب اور اقبال کو بہترین دماغ اور قلم مل گئے۔ اور اُن کی تشریح و تعبیر کے اتنے پہلو سامنے آ گئے کہ اب اُنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میر اِن دونوں سے کم پلّہ نہیں ہے۔ مگر اُس کی زندگی اور فن پر ابھی تک کوئی سنجیدہ تحقیقی

---

[1] میر کی آپ بیتی : ۹۲ [2] میر کی آپ بیتی : ۱۹۰

(تنقیدی کام نہیں ہوا۔ مولانا عبدالباری آسی کا مرتبہ کلیات میر اور اس کا مقدمہ، مولوی عبدالحق مرحوم کے مضامین جو ذکرِ میر اور نکات الشعرا (طبع ثانی) کے مقدموں کی صورت میں شامل ہیں۔ اثر لکھنوی کی مرتبہ "مزامیر" کا دیباچہ ـــ یہ سب کام اچھے ہیں، مگر ابتدائی اور اشاراتی ہیں۔ تنقیدِ میر کے موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب " تنقیدِ میر" متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ اگرچہ میر کے طالب علموں کے لیے بہت نافع ہے۔ مگر کوئی مربوط اور منظم مطالعہ نہیں ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب " میر تقی میر: حیات اور شاعری" کے اوصاف حمیدہ سے بحث کرنے کا یہ مناسب محل نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ کتاب بھی میر کا حق ادا کرنے میں ناکام رہی ہے۔

تصانیف میر کے اچھے اور قابلِ استناد متون بھی موجود نہیں ہیں

۱۔ نکات الشعرا: تین بار چھپ چکا ہے۔ لیکن ضروری حواشی اور متقاطع حوالوں کے ساتھ اس کے ایک انتقادی متن کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

۲۔ ذکرِ میر۔ صرف ایک بار ۱۹۲۹ء میں چھپی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ مگر فارسی متن تمام قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تیار ہونا چاہیئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا۔[1]

۳۔ کلیاتِ میر۔ متعدد بار چھپ چکی ہے۔ نسخۂ فورٹ ولیم تو میر کی زندگی

---

[1] اب میر کی آپ بیتی کے دوسرے ایڈیشن میں یہ فارسی متن بھی نئی ترتیب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

میں مرتب ہوا ہے اور اُن کی وفات سے چھ ماہ بعد شائع ہوا۔ یہ بھی جدید اصول ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ اس نسخہ کو علمی مجلس دہلی نے ۱۹۶۸ء میں ——— چھاپا ہے۔ مگر اُس کی دوسری جلد ابھی باقی ہے ایسا کوئی نسخہ ابھی تک مرتب نہیں ہوا۔ جس میں دستیاب قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہو۔

۴۔ فیضِ میر: دو بار چھپی ہے۔ ساتھ ہی ترجمہ بھی ہے۔ اِسے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے مرتب کیا ہے اور تصانیفِ میر میں یہی ایک ایسا رسالہ ہے جو سلیقے سے چھپ گیا ہے۔

۵۔ دیوانِ فارسی: ابھی تک نہیں چھپا۔

۶۔ دریائے عشق (نثر): اس کا متن دہلی کالج میگزین: میر نمبر میں شامل ہے

متون کی انتقادی ترتیب و تدوین کے بعد دوسرا مرحلہ اُن کی تاریخی بازیافت کا ہے۔ یعنی یہ طے کیا جائے کہ کون سا دیوان کب مرتب ہوا اس سے فنکار کے شعوری ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جزوی طور پر کلام میر کی تاریخی ترتیب کا کام تذکروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "نکات الشعراء" میں میر نے اپنی جن غزلوں کو انتخاب کیا ہے۔ اُن کے بارے میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ غزلیں ۱۱۶۵ھ/ ۵۲-۱۷۵۱ء تک کہی جا چکی تھیں۔ اس طرح جو کلام "مخزنِ نکات" "چمنستانِ شعرا" اور "تذکرہ میر حسن" یا "طبقات الشعراء" (قدرت اللہ شوق) میں ملتا ہے۔ وہ سب میر کے سفر لکھنؤ سے پہلے کا قرار پاتا ہے۔ اُن کا یہ سفر ۱۱۹۶ھ/ ۸۲-۱۷۸۱ء میں ہوا ہے۔ کلام میر کی تاریخی ترتیب کے

موضوع پر ابھی تک کسی نے قلم اُٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ حالانکہ یہ مطالعہ اہم نتائج تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

میر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی قدیم بیاضوں اور تذکروں میں محفوظ ہوگا۔ اُسے تلاش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

پھر میر کی ایک جامع فرہنگ اردو اور فارسی کی تیار ہونا باقی ہے۔ اس سے اُن کے کلام کا لسانیاتی مطالعہ کرنے میں رہنمائی حاصل ہوگی۔ میر سے پہلے کون سے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں۔ اور کن الفاظ کو خود میر نے چلن دیا ہے۔ کون سے محاورات اُس نے فارسی سے ترجمہ کیے ہیں۔ اور زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کون سی تبدیلیاں کی ہیں جن کی وجہ سے اُس کی زبان اور اُسلوب معاصرین و متقدمین سے ممتاز ہو گیا ہے اس کے اسلوبِ نظم و نثر کا فنی اور تکنیکی مطالعہ و تجزیہ بھی ہنوز باقی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعض مضامین میں اس طرح کی کوشش ملتی ہے۔ مگر یہ زیادہ سائنٹفک سطح پر ہونا چاہیے۔

میر کی غزل، قصیدہ، مثنوی اور دوسری اصنافِ سخن کا علیحدہ علیحدہ انتقادی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی فارسی نثر و نظم پر ابھی تک بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ "ذکر میر" سوانح عمری کی تعریف پر کہاں تک پوری اترتی ہے۔ اور معاصر تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے کتنی قابل اعتماد ہے۔ یہ دونوں موضوع ابھی تک تشنہ ہیں۔

سب سے آخر میں میر کے افکار کا تجزیہ ہے۔ اُن کے مذہبی عقائد۔ صوفیانہ افکار، اخلاقی تصورات، فلسفیانہ نظریات، معاشرتی اور تہذیبی اقدار، کس حد تک روایاتی ہیں۔ اور کہاں اُن کی جڑیں گھر سے علم و عرفان

کی زمین میں پیوست ہیں۔ یہ سب جانے بغیر ہم میرؔ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ جب ان سب پہلوؤں پر گفتگو ہو جائے گی تب میرؔ کے اصلی خط و خال اُجاگر ہوں گے۔ اور اُسے کسی ابہام کے بغیر سمجھنا ممکن ہو گا۔

میرؔ پر جو کام ہونا باقی ہیں اُنھیں ہم پہلے تنقید اور تحقیق کے دو بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تحقیق میر کے دو اہم پہلو ہیں: پہلا تو ذاتی اور سوانحی ہے۔ اس میں ابھی تک اُن کے خاندان کا مسئلہ ہی طے نہیں ہو سکا ہے انھوں نے ذکر میرؔ کے آغاز ہی میں لکھا ہے۔

"میرے آبا و اجداد ملکِ حجاز کو خیر باد کہہ کر ..... ہندوستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے۔ اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گیا۔ پھر اُن میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے۔ اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاش روزگار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے جدِّ اعلیٰ دارالخلافہ (اکبر آباد) آگئے[1]"

میرؔ نے شیخ عبدالعزیز عزت اور اُن کے فرزند سے "قرابت قریبہ" کا اعتراف کیا ہے[2] اور عزت کے احوال میں یہی قرابت شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے۔

"نسبش بہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما می رسد۔ یکے از اجداد اُو بتصاریف ایام از مکہ معظمہ بہ ہند اُفتاد، بعضے آبائے اُو در قصبہ ڈھبائی[3] از توابعِ اکبر آباد توطن گرفت[4]"

---

[1] میر کی آپ بیتی: ۳۱ [2] میر کی آپ بیتی: ۳۹ [یہاں ناقل کی غلطی سے قمرالدین خاں نام چھپا ہے۔ یہی فارسی متن میں بھی ہے۔ مگر صحیح فخرالدین خاں ہے۔ اور میر کی آپ بیتی: ۹۶ میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ نیز تاریخ محمدی: ۵۷] [3] یہ قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر میں ہے اور آگرہ سے قریب ہے۔ [4] تین تذکرے: ۲۶۴

عزّت کا شجرۂ خاندان اس طرح بنتا ہے ۔

- ملا عبدالرشید اکبرآبادی (ف ۱۰۸۸ھ)
  - شیخ عطاء اللہ (ف ۱۱۱۸ھ)
  - شیخ عبدالعزیز عزّت (ف ۱۰۸۹ھ)
    - سعدالدین خاں (ف ۱۱۱۸ھ)
      - قُطب الدّین خاں [2]
      - حفیظ الدین خاں [3] مخاطب بہ سعدالدین خاں
    - فخرالدین خاں [1] (ف ۱۱۳۴ھ)

اگر یہ صحیح ہے کہ عزّت اور میر تقی میر کے اجداد ایک ہی قبیلے کے تھے تو میر بھی شیخ صدیقی ہوئے ۔ وہ اپنے اور اپنے برادر خورد محمد رضی کے ناموں کے ساتھ التزاماً لفظ " میر ،، لکھتے ہیں ۔ اپنے برادر علاّتی حافظ محمد حسن یا اُنکے بیٹے

---

[1] ان کا حوالہ میر کی آپ بیتی میں دو جگہ آیا ہے ۔ ص ۳۹ (یہاں نام غلطی سے قمرالدین چھپا ہے) ص ۹۶: انھوں نے ستّر سال کی عمر میں انتقال کیا (تاریخ محمدی : ۷۵)

[2] ذکرِ میر کے نسخۂ لاہور کے خاتمے کی عبارت (میر کی آپ بیتی : ۱۹) میں اِن کا حوالہ ہے ۔

[3] میر کی آپ بیتی ۱۱۲، ۱۳۰

محمد محسن کو میر نہیں کہتے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد علی نے دوسری شادی کسی شیعہ خاتون سے کی ہوگی۔ جو سیادت کا دعوی بھی رکھتی ہوں گی۔ اِس بارے میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ توران میں سلسلۂ نسب ماں کی طرف بھی ملایا جاتا ہے۔ اور سیادت کی حد تک ایرانیوں نے بھی اس رسم کو قبول کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو "دنیا لۂ سادات" کہا جاتا ہے۔ اورنگزیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد شیعت کے فروغ کا ایک دور آیا تھا۔ خود اورنگزیب کے اس جانشین نے شیعی عقائد اختیار کر لیے تھے۔ اور ماں کی طرف سے سید ہونے کا دعوی بھی کر دیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ بہادر شاہ اول کی ماں ایک کشمیری راجا (راجوری) کی لڑکی تھی۔ جو اورنگزیب کو نذر کی گئی تھی۔ اُس کے بارے میں یہ افسانہ گڑھا گیا کہ حضرت غوث الاعظم کی اولاد میں سے ایک نہایت مقدس بزرگ "سید شاہ میر" کشمیر میں وارد ہوئے تھے اور راجا اُن کا اس حد تک معتقد ہو گیا تھا۔ کہ اپنی ایک بیٹی اُن سے بیاہ دی تھی۔ جس کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر سید شاہ میر حج کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے۔ اور کبھی واپس نہیں آئے ان بچوں نے اپنے نانا کے پاس پرورش پائی اور جب شاہجہاں نے راجہ سے خراج طلب کیا تو اُس نے یہی لڑکی بادشاہ کو "ڈولے" کی رسم کے طور پر بھیجدی جو شاہزادہ اورنگزیب سے بیاہ دی گئی۔ اُس کا نام "کلمتہ النساء بیگم" تھا۔ مگر نواب بائی بیگم کہلاتی تھی۔ اُس کے بطن سے بہادر شاہ اول پیدا ہوا۔ لہذا اُس نے بھی سید ہونے کا دعوی کر دیا۔ نواب بائی کے نسب کا یہ افسانہ شاہ جہاں کے عہد میں نہیں گڑھا گیا تھا بلکہ اورنگزیب کے زمانۂ اقتدار میں بنایا گیا۔ اور اسی لئے سلسلۂ نسب

بھی حضرت غوث الاعظم سے ملایا۔ زمانۂ مابعد میں اگر یہ بات شائع کی جاتی تو ظاہر ہے کہ یہ نسب کہیں اور جا کر ملتا۔[1]

میرا خیال ہے کہ اتنی کم سنی میں شیعی عقائد کی طرف میر کا مائل ہونا تعلیم یا مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انھوں نے یہ اثر اپنی ماں سے قبول کیا اور مادری سلسلہ سے ہی وہ اپنے تئیں سید سمجھتے رہے۔ انھوں نے اپنے باپ سے جو کلمات منسوب کیے ہیں غالباً ان میں سے دو چار فیصد کا انتساب بھی محمد علی عرف علی متقی سے درست نہیں ہے۔ لیکن یہ ملفوظات یا واقعات و اشارات، بے مقصد نہیں ہیں۔ ان کے لکھنے سے میر کا منشاء کچھ اور باتوں کا ثابت کرنا ہے جنہیں ان واقعات کے بین السطور میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ بہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میرے باپ بھی شیعی عقائد رکھتے تھے۔ اس کے ثبوت میں ایک واقعہ تو انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ "ایک دن (میر کے والد نے) اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقائد جیسا کچھ درست کر لیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہے۔ لیکن حاکم شام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔" کسی دن بتائیں گے۔"

مدت بعد ایک صبح، منہ اندھیرے، محرم خان، خواجہ سرائے شاہجہانی، اس مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے ملازم ان کے وضو کے لئے پانی لانے کو دوڑے۔ مگر والد صاحب خود اٹھے۔ لوٹا لیا۔ اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔ اس وقت شاہ صاحب نے فرمایا:

---

[1] ؎

" میاں علی شقی۔ تمام عمر اُس کا نام میری زبان پر نہیں آیا۔ اس کے لئے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں" میرے والد کہتے تھے "خدا کا شکر ہے کہ اُس کے بعد میں نے بھی کبھی اُس کا نام نہیں لیا"[1]

یہاں حاکم شام سے حضرت امیر معاویہ (ف ۶۰ھ/۶۷۹-۶۸۰ء) مراد ہیں۔ میر نے غالبًا اپنے باپ کے تفضیلی عقائد اختیار کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی میں خلفائے ثلاثہ پر حضرت علی کی فضیلت تو مانتا ہی ہوں۔ مگر حضرت معاویہ کے باب میں کیا عقیدہ رکھوں۔؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ مرشد نے اس بات کا جواب دینے کے لئے مہلت کیوں طلب کی تھی۔ محرم خاں، خواجہ سرا جس کی مسجد کا حوالہ ہے، خواجہ وقار مخاطب بہ محرم خاں (ف ۱۰۹۵ھ) ہے، یہ غالبًا شیعی عقیدہ رکھتا تھا۔

خواجہ علی اکبر مودودی (ف ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء) کے ملفوظات "لطائف اکبری" میں بھی ایک ایسی ہی عبارت ملتی ہے۔

ایک روز الہ آباد میں ایک شخص فقیر کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ پسر حاکم شام کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے۔؟ میں نے کہا کہ اُسے جو بھی آپ کہیں اُس سے بھی بدتر ہے۔ مگر میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اس سے کیا سروکار۔؟ میں اُس کا نام اپنی زبان پر کیوں لاؤں؟ مجھے اُس کا نام لینے سے کراہیت آتی ہے[2]

---

[1] میر کی آپ بیتی: ۳۳-۳۲

[2] لطائف اکبری ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی تلخیص مفتی محمد رضا انصاری نے رسالہ برہان (دہلی) میں شائع کرائی تھی۔ مذکورہ بالا اقتباس کے لئے دیکھیے برہان جلد ۶۷ شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۷۱ء) ص ۵۱

ان ملفوظات کے جامع خواجہ حسن مودودی کھماری ہیں[۱]۔ جو میر کے ہم عصر بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میر نے یہ واقعہ اُن سے سُن رکھا ہو۔

اپنے باپ کی شیعیت کے اثبات میں دوسرا اشارہ انھوں نے "رؤیت باری کا مسئلہ چھیڑ کر کیا ہے شیعی عقیدہ یہ ہے کہ " لا تُدْرِکُہُ العُیُونُ بِمُشَاهِدَۃِ العیان۔ ولٰکِنْ تُدْرِکُہُ القلوبُ بحقائقِ الایمان۔ (خدا کو بہ ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں بلکہ اس کا دیدار حقائقِ ایمان کے ذریعہ سے قلب کو ہو سکتا ہے۔)

میر نے لکھا ہے کہ ایک دن اسداللہ نامی درویش نے اُن کے باپ سے سوال کیا کہ مجھے خدا کی رؤیت کے مسئلہ میں کچھ تردّد ہے۔ درویشوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ ایک دن ہم اُس غیرتِ ماہ (خدا) کو بدرِ کامل کی طرح (عیان و برملا) دیکھیں گے۔ اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اس آفتاب کا دیکھنا انسانی بصیرت کے امکان میں نہیں ہے" والد نے فرمایا کہ ہم فقیروں کو کچھ فکر نہیں۔ جب یہ طے شدہ ہے کہ وہ عینِ کائنات ہے۔ تو جدھر نظر ڈالتے ہیں وہ دکھائی دیتا ہے۔ اور جس کسی میں دیکھتے ہیں جلوہ دکھاتا ہے۔ وہ معنی ہے اور ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔ نظر ہو تو اُس کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔"

رؤیت باری کا مسئلہ بحث و تمحیص کے گرماگرم مسائل میں سے ایک

---

[۱] خواجہ حسن مودودی کے لیے: انیس الاحباء (قلمی، علی گڑھ)۔ طبقات سخن (قلمی) ورق ۱۷ الف سفینہ ہندی ۶۲-۶۳ مسرت افزا: ۵۷، خمخانہ جاوید ۲: ۲۸الم۔ رسالہ صحیفہ (لاہور) شمارہ ۳۹/۱۹۶۷ء

رہا ہے۔ اِسے معتزلہ نے اتنی ہوا دی کہ یہ تسنّن اور اعتزال کے درمیان حدِ فاصل بن گیا۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ رویت کے لئے جسمانیت، جہت، اور لون وغیرہ لازم ہیں۔ اور خدا اِن سب سے منزّہ ہے۔ پھر قرآن میں ہے۔

" لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ "

اسی طرح حضرت موسیٰ نے خدا سے رویت کا مطالبہ کیا تو ارشاد ہوا کہ " لَنْ تَرَانِي "، اُن کے مخالفین یعنی اَشاعرہ کہتے تھے کہ قرآن میں نصِ صریح موجود ہے۔ " وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۲ إِلىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔ "

اور حضرت موسیٰ سے خدا نے یہی تو کہا تھا کہ " تم مجھے نہیں دیکھ سکتے " یہ کب کہا تھا کہ " میں دیکھا نہیں جا سکتا۔"[1] یعنی حضرت موسیٰ نے بھی رویت باری کو محال نہیں سمجھا تھا۔ ورنہ وہ خدا سے ایک امر محال کے لئے مطالبہ نہ کرتے[2] وہ بہرحال معتزلہ سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ کہ کیا ممکن ہے اور کیا محال ہے۔

جن احادیث سے رویتِ باری کا اثبات ہوتا تھا اُن سے معتزلہ منکر ہو گئے۔ اور جہاں حدیث کی صحت میں شک کرنے کی گنجائش کم نظر آئی وہاں کہتے تھے کہ حدیث ناسخِ قرآن نہیں ہو سکتی۔ اشاعرہ کا کہنا تھا کہ خدا " موجود " ہے۔ اور ہر موجود کو دیکھنا ممکن ہے۔ باقی رویت کی قیود جہت، زمان مکان، لون، وغیرہ تو اس عالم کی شرائط ہیں۔ یہ خدا ہی جانتا ہے۔ کہ آخرت میں رویت کس شان کی ہوگی۔[3]

---

[1] الاشعری : مقالات الاسلامیین

[2] تفسیر الکشاف ۱/۱۹۸

[3] ظہر الاسلام ۴/۸۲

اصل عقیدہ رویت باری کے مستحیل ہونے کا درحقیقت معتزلہ کا ہی ہے۔ اور یہ اُن کے نظریۂ توحید کی ایک فروعی بحث کے طور پر سامنے آیا تھا مگر اس پر اتنی جرح و تعدیل ہوئی کہ اسے " اہلِ سنت والجماعت " ہونے کی نشانی سمجھ لیا گیا۔ اسی وجہ سے شیعوں نے بھی مسلکِ معتزلہ ہی اختیار کر لیا۔

میر نے اپنے والد کا جو نظریۂ توحید پیش کیا ہے وہ صرف رویت کی حد تک معتزلہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی میر نے " جواب گریز " دینے کی کوشش کی ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا معتزلہ یا امامیہ فرقہ سے کچھ سروکار نہیں۔ یہ مسلک اشاعرہ کا ہے۔ میر کے باپ رویت کے مسئلہ میں تو معتزلی ہیں۔ نظریۂ توحید میں اشعری۔ اور دوسرے اُمور میں شیعہ یہ ایسا تضاد ہے جو میر کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ میر خود اس مسئلہ کو پورے فلسفیانہ سیاق و سباق میں سمجھے ہوئے نہیں ہیں۔ اُنھیں یہ معلوم تھا کہ مسئلہ رویت حضرات اہلِ سنت اور امامیہ کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ لہذا اُنھوں نے ایک ایسا مکالمہ تیار کیا جسے دونوں طرح سے معنی پہنائے جاسکیں۔

یہاں ایک بات پر اور توجہ کر لیجئے۔ میر کے والدِ بزرگوار سے یہ سوال کس نے کیا ہے۔؟ یہ ایک درویش ہے۔ جس کا نام اسد اللہ ہے یہ میر کے والد کا پیر بھائی ہے۔ رہنے والا " کبود جامہ " کا ہے۔ پیشہ " سیرابہ پز" [لہ] یعنی نہاری پکا کر بیچنے والا۔ میر کے والد نے اپنے پیر سے کہا

[لہ] میر کی آپ بیتی: ۷۶

تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ مجھے اپنی موت کا علم پہلے سے ہو جائے۔ پیر نے کہا کہ جب تم اس "سیر ابہ پز کبود جامہ" کو دیکھو تو سمجھ لینا کہ سالِ آئندہ تک زندہ نہ رہو گے۔ ۱۱۴۵ھ/۳۳-۱۷۳۲ء میں کسی وقت اسد اللہ نے خواب میں اپنے پیر سے ہدایت حاصل کی کہ تم فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہو جاؤ میرے اور علی متقی کے درمیان ایک اشارہ ہے جو وہ تمہارے پہونچنے سے سمجھ جائیں گے۔

اسد اللہ بہت معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ ہندوستان میں جس طرح صبح کو نہاری پکا کر بیچنے کا رواج ہے۔ اُسی طرح ایران میں "سیرابہ" پکاتے ہیں۔ یہ غالباً سیر اور آب کا مرکب ہے۔ خانِ آرزو نے اہلِ زبان سے تحقیق کر کے اس کے معنیٰ لکھے ہیں۔ اس میں "کلہ و پارچہ" (یعنی سری) ہوتی تھی۔ میر نے ایک لفظ چراغِ ہدایت میں نیا دیکھا۔ جو عام لغات میں نہیں ملتا۔ اور جس کی تشریح آرزو نے محض اہلِ زبان سے ذاتی تحقیق کرنے کی بعد کی ہے۔ تو اُنھوں نے یہ لفظ استعمال کرنے کے شوق میں شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے اسد اللہ کو بیعت کرایا۔ اب یہ ضروری تھا کہ اس کا ایران سے کچھ رشتہ پیدا کیا جائے۔ تاکہ "سیرابہ پز" کہلانے کا جواز پیدا ہو۔ لہٰذا اُسے "کبود جامہ" کا باشندہ بنایا گیا۔ اس میں درویشی سے لفظی مناسبت بھی اتفاق سے موجود ہے۔ یہ ایران میں ایک چھوٹا سا گانو ہے۔ عموماً دیہات میں نہاری فروش کی دوکان نہیں ہوتی خیر یہ مان لیا کہ اُس کی دوکان تھی۔ خود میر نے لکھا ہے کہ کساد بازاری تھی اور تجارت بالکل ٹھپ پڑی تھی[1] اس عالم میں شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی

---

[1] میر کی آپ بیتی : ۷۷

آگرہ سے کبود جامہ تک اُسے خواب میں یہ حکم دینے پہنچ گئے کہ تمہیں آگرہ جانا ہے۔ یہی بشارت وہ خود آگرہ میں علی متقی کو بھی دے سکتے تھے اتنا سا رمز بتانے کے لئے ایک غریب نہاری فروش کو تقریباً ڈھائی ہزار میل پیدل چلا کر آگرہ بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔؟

یہ نہاری فروش اسد اللہ، اتنی علمیت کا آدمی بھی ہے کہ رؤیت باری جیسے دقیق مسائل پر علی متقی سے گفتگو کرتا ہے۔ آج بھی اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات اس مسئلے پر آسانی سے بحث نہیں کر سکتے۔ میرے یہ قطعاً نہ سوچا کہ وہ کون سا مکالمہ کس کردار کی زبان سے ادا کرا رہے ہیں

اسی طرح کی ایک مثال یہ ہے کہ علی متقی ایک دن رنج کے عالم میں سید امان اللہ کی موت کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک "شکری رنگ" خوش وضع نوجوان جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا اور شکر انگور کے کچھ دانے ہاتھ پر رکھ کر نذر گذرانے' اور کہا کہ ابھی ولایت سے آرہا ہوں اور حج کیلئے جانے کا ارادہ ہے۔ اس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا۔ مشتاقِ دیدار ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں۔

یہ واقعہ بھی شاید ہی کبھی خارج میں واقع ہوا ہو۔ میرنے "شکری رنگ اور شکر انگور" کا لفظ استعمال کرنے کا شوق میں پوری داستان وضع کر لی۔ یہ انگور کی ایک قسم ہے اور ایران سے مخصوص ہے۔ احمد بیگ اگر ایران سے حج کرنے کی خاطر نکلا تھا۔ تو ظاہر ہے اس سفر میں آگرہ تک پہنچنے کے لئے کئی ماہ کا عرصہ درکار ہے اتنی مدت تک انگوروں کا محفوظ رکھنا ممکن نہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اُس لے اُن کی حفاظت کے لیئے کچھ خصوصی تدابیر اختیار کی ہوں گی۔ تو اس شبہ کا رفع کرنا کس طرح ممکن ہے کہ ایران سے عرب کی طرف جاتے ہوئے آگرہ کسی طرح درمیان

میں نہیں آسکتا، تا وقتیکہ اس کا سفر بالقصد کیا جائے۔

میر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو) نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کیا۔ میں بہت کڑھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اٹھ گیا۔ جب اُن سے نبھتی نہ دیکھی تو شام کو اُن کے گھر سے نکلا۔ اور جامع مسجد کا راستہ لیا۔ اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پر آنکلا جو وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے یہاں میں نے پانی پیا۔ کسی نہر یا حوض سے پانی پینا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے کہ اس کا تذکرہ سوانح عمری میں کیا جائے۔ یہاں "آب کشیدن" کے محاورہ کا استعمال مقصود تھا۔ اصل واقعہ اتنا ہو گا کہ حافظ محمد حسن نے خان آرزو کو کوئی خط لکھا ہو گا۔ جس سے متاثر ہو کر انھوں نے میر کے ساتھ دشمنوں کا سا برتاؤ شروع کر دیا۔ میر کے باپ کا جب انتقال ہوا تو میر ۱۰-۱۱ سال کے تھے اور اس زمانے سے انھیں فکر معاش میں سرگرداں پھرنا پڑا۔ سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے باپ کے ترکے کی تین سو کتابیں میں سے بھی میر کو اُن کا حصہ نہیں دیا اور باپ کی زندگی ہی میں یہ کہہ دیا تھا۔ میر ان کتابوں کا کیا کریں گے۔ پھر میر دلی آئے تو یہاں بھی محمد حسن نے اپنے حقیقی ماموں خانِ آرزو کو لکھ بھیجا۔ کہ میر تقی فتنہ روزگار ہے۔ اس کی تربیت ہرگز نہ کی جائے۔ خان آرزو نے بھی ایک کمسن یتیم پر رحم نہ کیا۔ اور بھانجے کے ورغلانے میں آگئے۔ آخر اسکے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ ہمارے سامنے صرف میر کا بیان ہے۔ اور محمد حسن یا خان آرزو کا بیان صفائی موجود نہیں ہے یک طرفہ بیان پر جو فیصلہ کیا جائے گا۔ وہ ظاہر ہے کہ منصفانہ نہیں ہو سکتا میں یہ سمجھتا ہوں کہ محمد حسن اور آرزو کے سلوک کا سبب میر کا مذہب

رہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی ماحول ہی میں تشیع کے اثرات قبول کر لیے تھے اور یہ بات اُن کے باپ کی زندگی ہی میں ظاہر ہو چکی ہو گی کہ میر شیعیت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ حافظ محمد حسن (ان کے نام کے ساتھ لفظ "حافظ" ہی بتا رہا ہے کہ یہ شیعہ نہیں تھے، اور میر نے بھی کہیں ان کے نام کے ساتھ لفظ "میر" نہیں لکھا) نے اس وجہ سے باپ کی متروکہ کتابوں میں سے انہیں حصہ نہیں دیا۔ انھوں نے باپ سے یہی کہا ہوگا کہ محمد تقی شیعہ ہو گیا ہے۔ آپ کی سب کتابیں تصوف کی ہیں یا مذہب تسنن سے علاقہ رکھتی ہیں۔ میر آخر ان کتابوں کا کیا کرے گا۔؟ اسلئے شاید انھوں نے خان آرزو کو بھی لکھ بھیجا ہو گا کہ میر کی تربیت نہ کریں۔[1]

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے اسلامی ہند کی معاشرت میں مذہبی عقائد کی بہت اہمیت تھی۔ ایک ہی فرقے میں فروعی اختلافات عقائد بھی اکثر افتراق کا سبب بن جاتے تھے۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں بھی اہل سنت کے دو گروہ "دیوبندی" اور "بریلوی" کہلاتے ہیں ان میں عقائد کی سطح پر کبھی کبھی اتفاق بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ اختلافات شادی بیاہ یا دوسرے سماجی روابط کے قیام میں خاصی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ میر اگر اس خاندان کے تھے جس سے عبدالعزیز عزت اکبر آبادی (ف ۱۰۸۹ھ) کا تعلق

۱؎ حافظ محمد حسن کے بیٹے محمد محسن تھے۔ جن کا حال نکات ط۱/۱۴۸ میں ہے۔ تالیف تذکرہ کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ اس سے حافظ محمد حسن کی عمر کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی کی وفات (۱۱۴۶ھ) کے وقت وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔

تھا تو یہ خاندان عقائدِ اہلِ سنّت میں بہت راسخ رہا ہے۔ خود عزت نے شیعیت کے ردّ میں ایک کتاب "کشف الغطاء" لکھی تھی۔ اور وہ عملاً بھی اپنے عقائد کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی ترغیب سے ایزد بخش رسا (ف ۱۱۱۹ھ) نے مذہب تشیّع چھوڑ کر عقائدِ اہلِ سنّت کو اختیار کیا تھا۔ ایک ایسے خاندان کا فرد اگر اپنے عقائد تبدیل کر لے تو اُس دور کی سماجی زندگی میں اُس کے لیے دشواریاں پیدا ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

اس کے باوجود جب میر پر جنون کا حملہ ہوا تو عزت کے بیٹے فخر الدین خاں کی بیوی نے ان کے علاج پر بہت روپیہ صرف کیا تھا۔

میر نے بہت سی باتوں کو وضاحت سے نہیں لکھا۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ اُن کے والد کی وفات کے بعد سارے ماحول نے اُن کے خلاف کیوں بغاوت کر دی۔ اور اتنے کم سِن بچوں (محمد تقی اور محمد رضی) کو زمانے کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا۔ صرف میر کے مبہم بیانات کی بنیاد پر دوسروں کو ظالم اور بے رحم مان لینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میر نے اُس زمانے میں کوئی معاشقہ بہت شد و مد کے ساتھ کیا تھا۔ اور اس جذباتی ہیجان کی لہریں اُن کی شاعری میں بھی نظر آ رہی ہیں۔ جسے وہ "جنون" بتا رہے ہیں۔ وہ اسی "حضرتِ عشق" کی کرامات معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے چاند میں ایک صورت کے نظر آنے اور اُس سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا بیان کیا ہے۔ میر کی شاعری میں 'چاند'، 'چاندنی'، 'مہتاب'، 'مہتابی'، 'گلِ مہتابی'، 'قمر' اور 'ماہ' کے الفاظ اتنی کثرت سے آئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر مجھے گمان ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی سے میر عشق فرماتے تھے اُن کا نام بھی کچھ "چاندنی" یا "مہتاب" یا "قمر" رہا ہوگا۔ عالمِ جنوں میں میر اُس کے تصور سے باتیں کرتے تھے اور

اور اس کا نام لے کر سوتے سے چونک اٹھتے تھے۔ اس کی تاویل اپنی سوانح عمری میں اس طرح کر رہے ہیں۔ "چاندنی رات میں ایک حسین پیکر...... کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رشک پری پر پڑتی۔ جس طرف دیکھتا اسی غیرتِ حور کا تماشا دیکھتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورقِ تصویر ہو گئے تھے۔ یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے، کبھی سیرگاہِ دل میں محوِ خرام۔ اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اس کی جدائی میں وحشت...... چار مہینے تک وہ گل شبِ افروز نت نئے انداز دکھاتا رہا۔ اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا...... وہ خیالی صورت ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اس کی مشکیں زلفوں کا دھیان رہا۔"

خان آرزو سے اُن کے تعلقات شاید اسی معاشقے کی وجہ سے خراب رہے ہوں۔ ورنہ اُن سے اتنی سنگدلی کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ ایک یتیم بچے کی پرورش سے نہ صرف گریز کریں بلکہ وہ بیمار ہو تو اُس کی دوا دارو سے بھی کوئی دلچسپی نہ رکھیں۔ اس موقع پر فخر الدین خاں کی بیوی کا ہمدردانہ رویّہ ایک عورت کی نفسیات کا اشاریہ ہے۔ جو ایسے حالات میں فطری طور پر دلسوزی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اُس دور کے سماج کا گہرا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر یہ راز سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اس زمانے میں کسی شریف گھرانے کی لڑکی سے معاشقہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اور اس کا صریح مطلب پورے ماحول کی مخالفت کو دعوت دینا تھا۔ اب میر کے اس معاشقے کی تفصیلات کا دستیاب ہونا تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن میر کے سوانح کی دلکشی اور رنگینی میں

اضافے کی خاطر اگر کچھ اشارات بھی مل سکیں تو بسا غنیمت ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں داخلی شواہد کا اصول سب سے زیادہ معاون ثابت ہوگا۔

میر نے اپنے اولین استادوں میں میر جعفر علی عظیم آبادی اور سید سعادت علی امروہوی کا تذکرہ کیا ہے۔ یعنی وہ خانِ آرزو کو اپنا استاد بھی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ میر جعفر ایک مجہول شخصیت ہیں اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ شیعی مسلک رکھتے ہوں گے۔ سعادت علی کے بارے میں ہمیں معلوم ہے امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ شرف الدین نقوی الواسطی معروف بہ "شاہِ ولایت" کی اولاد میں تھے۔ اور امروہہ کے محلہ حقانی میں رہتے تھے۔ شاہِ ولایت ابن بطوطہ کے معاصرین میں سے ہیں۔ بعد کے زمانہ میں اُن کی اولاد میں سے بعض نے مذہبِ امامیہ قبول کر لیا تھا۔ اور سعادت کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔

میر نے خانِ آرزو کے تلمذ سے اپنے برأت کا اظہار کرنا بھی شاید اسی اختلاف عقائد کی وجہ سے ضروری سمجھا ہو۔ ورنہ خود میر کی فارسی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ اُنھوں نے فارسی کی حد تک جو کچھ سیکھا ہے وہ سب خانِ آرزو کا فیضان ہے میں نے ۱۹۵۷ء میں "ذکرِ میر" کا اردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ ذکرِ میر میں جو فارسی محاورات استعمال کئے گئے ہیں وہ فارسی کی مروجہ کتبِ لغات میں عام طور سے نہیں ملتے۔ اور خانِ آرزو کی مرتبہ "چراغِ ہدایت" میں عموماً موجود ہیں اور اُن میں سے بھی اکثر محاورات کے لئے خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ یہ اہلِ زبان سے تحقیق کر کے لکھا گیا ہے۔ غور سے مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ "ذکرِ میر" کا پہلا تہائی حصہ میر نے اس طرح لکھا ہے کہ ایک ہی صفحے کے محاورے اپنی کتاب کے

ایک پیراگراف میں استعمال کر لیتے ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کتاب چراغِ ہدایت اُن کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہو۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے۔

"ولے بہم رساں کہ او پسندد، جائے پیدا کن کہ باو پیوندد۔ دست بدست به از خود دے دہ کہ ازین راہ، این راہ دور دست، دست بدست است، زینہار دست بر دست منہ کہ چوں دست و پا خشک شوند راہ پست است"

دوسرے موقع پر پھر دست کے محاورے یوں باندھے ہیں۔

دست دستِ ظالماں بود۔ دست کجی بیکر وند۔ دست پلشتی میمودند دست بہ بر سر میکشیدند۔ دست بہ بازوے زناں میرسیدند۔ تیغہا می آختند، دست گاہ می ساختند، از دستِ شہریاں ہیچ نمی آمد۔ زیرا کہ دست و دلِ ایشاں سرد شدہ بود، کسے دست باچہ می شد و کسے دست بزیرِ سر ستون می نمود ......"

میر کی آپ بیتی کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت میر کی فارسی نگاری کے اس پہلو پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے صرف مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ ذکر میر کے محاورے چراغ ہدایت کے سوا دوسری لغت میں شاذ ہی ملتے ہیں۔ اب اس موضوع پر دوسرے ایڈیشن میں خاصی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے ایک موقع پر لکھ دیا تھا کہ: "میر نہ منصف ہیں نہ راست گفتار۔ اُن کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں۔" بعض حضرات نے

لہ ذکر میر/۲۹۔ میر کی آپ بیتی/۵۵

لہ ذکر میر صفحہ ۸ ۔ میر کی آپ بیتی/۱۲۲

اس ریمارک پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اسے میر کے استخفاف پر محمول کیا۔ اس ناگواری کا سبب ایک تو مشرق کی روایتی "ہیرو پرستی" ہے، اور دوسری وجہ میر پر علمی تحقیق کا فقدان بھی ہے۔ اگر ہمارا علم میر کے بارے میں اتنا محدود نہ ہوتا جتنا کہ وہ آج ہے تو اس ریمارک پر خفگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

میر نے اپنی سوانح عمری کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ اُن کے دادا کو "فوجداری نواح اکبر آباد" کا عہدہ مل گیا تھا۔ اور یہ کہ اُنھوں نے ملازمت کے زمانے ہی میں گوالیار میں انتقال کیا۔ دادا کا نام اُنھوں نے ظاہر نہیں کیا۔ "فوجداری نواح" خاصا بڑا عہدہ تھا۔ اور آجکل کے ڈپٹی کمشنر کی برابر تھا۔ اگر اُن کے دادا واقعی فوجدار نواح تھے تو اُن کا زمانہ اورنگ زیب کا عہد رہا ہوگا۔ اور عہد عالمگیری کے بیشتر امرا کا حال تاریخوں میں دستیاب ہے۔ ان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے نواح اکبر آباد کی فوجداری کا عہدہ حاصل ہوا اور اُس پر جدِ میر ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

پہلے یہ اندازہ کر لیجئے کہ "فوجدار" کس حیثیت کا حاکم ہوتا تھا۔ شُکر اللہ خاں خاکسار (ف ١١٠٨ھ) جو مرزا عبدالقادر بیدل (ف ١١٣٣ھ) کے مربی اور ممدوح اور نواب عاقل خاں رازی (ف ١١٠٨ھ) کے داماد ہیں ١٠٩٨ھ میں "فوجداری نواحی جہان آباد" یعنی نواحِ دہلی کے فوجدار تھے۔ اور اُن کا زمانہ وہی ہے۔ جو میر کے دادا کا عہد ہونا چاہیئے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر جدِ میر اس عہدے پر تھے تو وہ کس مرتبے کے حاکم ہوں گے۔

اسی طرح بہادر شاہ اول کے عہد میں چین قلیچ خاں گورکھپور کے

فوجدار تھے۔ یہ ہفت ہزاری تھے۔ نواب محمد امین خاں بہادر جو بعد کو محمد شاہ کے وزیر اعظم ہوئے۔ پہلے مراد آباد کے فوجدار تھے۔ عہد عالمگیری میں نواب ارادت خانِ واضح "نواحِ اورنگ آباد" کے فوجدار تھے۔ انھیں ارادت خاں خطاب اور ہفت صدی ہزار ذات منصب ملا ہوا تھا۔

فوجداری کا عہدہ عموماً منصب کے ساتھ ملتا تھا۔ یعنی خطاب بھی عطا ہوتا تھا۔ اور جاگیر بھی۔ میر کے دادا ہفت ہزاری نہ سہی، ہزاری منصب پر بھی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اُس دور کے مصادرِ تاریخی میں اُن کا حوالہ نہ آتا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ وہ بقول میر حالتِ ملازمت میں مرے تھے۔ مغلیہ حکومت کے طریق کار کے مطابق اگر کوئی سرکاری ملازم خدمت کی حالت میں فوت ہوتا تھا تو قاضی کا مصدقہ وراثت نامہ داخل کرنے پر اُس کے ورثہ کے نام اُس کی پوری تنخواہ جاری ہو جاتی تھی۔ یا اُس متوفی کے بیٹے کو وہی خطاب اور منصب دیدیا جاتا تھا۔ اگر میر کے دادا نواحِ اکبر آباد کے فوجدار ہوتے تو اُن کے انتقال پر یہ منصب محمد علی عرف علی متقی کو اور پھر خود میر کو ملنے میں بظاہر کوئی مانع ہونا نہیں چاہیئے تھا۔ میرا خیال ہے کہ میر نے اپنے دادا کا عہدہ بڑھا کر بیان کیا ہے۔

دوسری مثال حافظے کی کمزوری کی بھی دیکھ لیجئے۔ انھوں نے ایک درویش احسان اللہ کی خدمت میں اپنی حاضری کا بیان لکھا ہے۔ اُس میں ہے کہ۔ "شہر کے صوبیدار کا مصاحب آیا اور اُس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں قدمبوسی کے لئے حاضر ہو رہا ہے... جب صوبیدار دروازہ پر آیا ہاتھی سے اتر پڑا اور دوڑ کر شرف پابوسی حاصل کیا اور پانچ اشرفیاں نذر کیں..." اسی میں ایک عبارت سے مترشح ہے کہ میر امان اللہ اس ملاقات کے وقت

وہاں موجود تھے۔ اور میر بھی اُن کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت اللہ رکن الدولہ نصرت یار خاں سادات بارہہ میں سے تھا۔ یہ نواب شہامت خاں کا بھتیجا اور ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ اُس نے ۲۲ رمضان ۱۱۳۴ھ کو ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی وفات سے تقریباً ایک سال کے بعد میر کی ولادت ہوئی ہے۔ نُصرت یار خاں نام کا دوسرا کوئی صوبیدار آگرہ میں نہیں ہوا۔ میر نے اُس کا نام سُن رکھا ہوگا۔ لیکن ذکر میر لکھتے وقت اُنھیں یہ دھیان نہ رہا کہ جس گورنر کو وہ درویش کی خدمت میں حاضر کر رہے ہیں۔ وہ اُن کی ولادت سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اسی طرح بایزید نامی ایک فقیر سے ملاقات کرنے گئے ہیں تو لکھتے ہیں کہ "ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملاقات کرنے گئے" مگر لکھتے لکھتے حافظہ نے دھوکا دیا۔ اور چار صفحوں کے بعد کہتے ہیں۔ "اسی دوران میں عصر کا وقت ہوگیا۔ ہم اُٹھے اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی۔"

ذکر میر کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے بحث و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کتاب میں جو تاریخی واقعات آئے ہیں وہ میر نے اپنی معلومات عامہ سے فراہم کیے ہیں۔ یا اُن کا کوئی ماخذ تحریری بھی رہا ہے۔؟ دوسرے یہ کہ ذکرِ میر کا زمانہ تالیف کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ متعین کرنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی ماخذ کی حیثیت سے ذکر میر کا پایۂ استناد کیا ہے۔؟ اس کی بحث میں نے میر کی آپ بیتی طبع ثانی کے مقدمہ میں کی ہے

یہ اُن امور کی طرف کچھ سرسری اشارے ہیں جن کا تعلق میر کی سوانح اور اُن کے عہد کے وقائعِ تاریخی سے ہے۔ ان کا تذکرہ اسلیے کیا گیا کہ اس امر کو

ثابت کیا جا سکے کہ میر کی تحقیق اور اُس کے بارے میں معلوم حقائق کی تاویلات میں ابھی بہت کچھ گنجائش بحث و نظر کی ہے۔

میر کا کلام سمجھنے کے لئے اس عہد کے معاشی اور سماجی ڈھانچے کو اچھی طرح دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے حکومت اور سرکاری نظام کا علم ہونا چاہیئے۔ میر کی اور سودا کی شاعری میں ایسی اصطلاحیں بکثر استعمال ہوئی ہیں جن کے مفہوم کو اب سمجھنا ممکن نہیں رہا ہے تاوقتیکہ تاریخ کی کتابوں سے رُجوع کیا جائے۔ مثلاً سرکاری عہدوں میں بخشی، میر بخشی، اور اس عہدے کے دوسرے مراتب، یا احدی، والا شاہی، یساول، کمبل پوش، میردہ، نجیب، بارگیر، مہینگ باشی، قدر انداز، ذوالقدر، ڈھلیت سہ بندی وغیرہ۔ اسلحہ میں بان، جزائر، رہکلہ، غازی خان، شیر دہان، زنبورک، فوجی اصطلاحوں میں التمش، ہرنغار، جنداول، قول، وغیرہ۔ اسبابِ شاہی میں تختِ رواں، کوکبہ، اختہ بیگی، ماہی مراتب، چتر توغ، یہ ایسے الفاظ ہیں کہ لغت کی عام کتابوں میں اُن کی قابلِ اطمینان تشریح نہیں ملتی۔ اگر اس سماج کی کوئی مفصل تاریخ لکھی جائے یا اُس عہد کے کسی فنکار کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنا مقصود ہو تو ایسے الفاظ اور اصطلاحوں کا پورا پس منظر ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

معاشی ڈھانچے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ آج کی حکومتوں کے زیر انتظام جو محکمات ہیں وہ اُس زمانے میں تمام تر عوام کی ذمہ داری تھے۔ تعلیم اور صحت عامہ کا محکمہ بھی سرکاری نہیں تھا۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں کا بھی حکومت سے سروکار نہیں تھا۔ بلکہ بادشاہ وقت اپنی ضروریات کی چیزیں عوام کی کارخانوں سے حاصل کرتا تھا یا سرکاری کارخانجات میں

ہنرمندوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ جاگیرداروں کی مالی حالت خراب ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اہلِ حرفہ بے روزگار ہو جاتے تھے۔ شہر آشوب کا موضوع اسی لیے مختلف پیشہ وروں کی بے روزگاری اور کساد بازاری ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر حکومت کی اقتصادی کمزوری کا براہِ راست اثر پڑتا تھا۔

میر کے عہد میں لوگوں کے لیے معاشی ذرائع یہ تھے:

۱۔ سرکاری منصب و جاگیر۔ ۲۔ زراعت ۳۔ صنعت و حرفت ۴۔ سپاہ گری

میر کے عہد میں جاگیرداروں کا حال بہت ابتر ہو چکا تھا۔ اور آئے دن کی یورشوں اور خانہ جنگیوں نے زراعت اور صنعت و حرفت کو بھی بہت نقصان پہنچایا تھا۔ سپاہ گری ایسا پیشہ تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں سرکاری ملازمت کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر مرکز کی کمزوری سے یہ بھی "نیم سرکاری" اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی ہو گیا تھا۔ چند امراء تو خود مختار ہو کر اور اپنی الگ فوج لے کر مرکز سے دور جا بیٹھے تھے۔ باقی امیروں کا حال کسی جواری کا سا تھا جو ہمہ وقت طالع آزمائی میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی سپاہ کو بروقت تنخواہ نہیں ملتی تھی تو وہ ڈیوڑھی پر دنگا کرتے تھے۔

ان امراء میں دراصل اقتصادی شعور کی کمی تھی اور یہ اپنی فوج کی تنظیم کسی پلان کے تحت نہیں کرتے تھے۔ اپنے روپوں کی وصولیابی کی فکر میں ہی ایک فوجی اپنے سردار کی حفاظت آخر وقت تک کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے مارے جانے کا مطلب کئی کئی ماہ کی بقایا تنخواہ کا بھی سوخت ہو جاتا تھا۔ سپاہی کے گھر والے اس عرصہ میں بنیے سے ادھار لے کر کھاتے رہتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ گھر کا سب ساز و سامان بنیے کے پاس رہن ہو جاتا تھا۔ اگر سپاہی مالِ غنیمت لے کر واپس آگیا تب تو اس کا بڑا حصہ بنیے کی اصل اور سود میں چلا گیا۔ ورنہ

گھر والوں کے لئے فاقہ کشی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

اس وقت فوج میں رجمنٹ بھی نہیں تھے۔ ہر سپاہی کسی منصب دار کا نوکر ہوتا تھا۔ اور وہ منصب دار اپنے سے بڑے امیر سے الحاق کر لیتا تھا۔ اس طرح چھوٹی بڑی ٹکڑیاں مل کر پوری فوج بنجاتی تھی۔ مگر اس فوج کی ایک متحدہ کمان نہیں تھی۔ ہر گروہ کا سپاہی صرف اپنے آقا ہی کا حکم مانتا تھا۔ اور اُسی کا مفاد دیکھتا تھا۔ اُس کے کمزور ہونے کی صورت میں وہ باغیانہ سرگرمیاں بھی اختیار کر لیتا تھا۔ اور اس سے خلق آزاری کا آغاز ہوتا تھا۔ جس کی مثالوں سے ذکر میر بھی خالی نہیں ہے۔

ہر منصب دار جو فوج رکھتا تھا اُسے مختلف کاری گر اور ماہرین فن بھی رکھنے ہوتے تھے۔ مثلاً لوہار، بڑھئی، جراح، نعلبند، وغیرہ۔ ایک سہ ہزاری امیر کے پاس کم سے کم دو جراح، دو آھن گر اور چھ نعلبند ضرور ہوتے تھے۔ معاشی بدحالی کے زمانے میں یا اس منصب دار کا زوال ہونے پر یہ سب بے روزگار ہو جاتے تھے میر اور سودا کی شاعری میں جہاں معاشی زبوں حالی کا رونا ہے یا اُس عہد میں اہل حرفہ کی ناقدری کا بیان آیا ہے، اُس کا عالمانہ تجزیہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک ان کی صحیح پوزیشن اور اس سماج میں ان کے رول کا پورا علم نہ ہو۔

ایک اور پہلو رسوم و رواج کا ہے۔ یہ رسمیں کچھ تو مذہبی عقائد سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور کچھ کا سرچشمہ عوام کے میل جول میں ہوتا ہے۔ جاگیردارانہ عہد کی بہت سی رسمیں اور رواج اب ختم ہو چکے ہیں۔ بہت سے توہمات بھی دم توڑ گئے ہیں، مگر شاعری میں اُن کا حوالہ موجود ہے۔ لباس، گفتار، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے آداب سمجھنے سے بھی کلام کا صحیح پس منظر اور اُس کا مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت صرف میر کی شاعری کی بازیافت ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر اس عہد کے شاعروں کا کلام ان تفصیلات کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔ میر کی شاعری میں جو کچھ

سماجی روابط کے حوالے اور ان حالات کا عکس زیادہ شدت سے آیا ہے۔ اور انھوں نے طویل عمر بھی پائی ہے۔ اور اتفاق سے وہ پوری عمر اس زوال آمادہ دور میں صرف بھی ہوئی ہے۔ اس لیے انھیں علامات مان کر اس طرح کا جو مطالعہ کیا جائے گا وہ دوسرے شاعروں کو سمجھنے میں بھی اتنا ہی نافع ہوگا۔

(سب جانتے ہیں کہ کسی ملک کا ادب اُس کے سیاسی سماجی اور تہذیبی حالات کا آئینہ ہوتا ہے) بہ (حالات تیزی سے بدلتے رہتے ہیں۔) اور اس بات کو اگر مارکسی نقطۂ نظر سے کہا جائے تو یہ خود اپنی نفی کرتے رہتے ہیں (اس لیے ہم کسی مخصوص زمانے کا ادب پڑھ کر اس دور کی ہر کشمکش کو زیریں لہر کی طرح اس میں تلاش کر سکتے ہیں لیکن جب کوئی تہذیب اتنا طویل سفر طے کر کے ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو چکی ہو۔ جتنا اس ہند ایرانی کلچر نے کیا ہے۔ اور وہ اتنی بیگانہ بھی ہو گئی ہو جتنا یہ مشترک کلچر آج کے ہندوستان میں ہو چکا ہے۔ تو ادب میں اُس تہذیب کی تلاش کا پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ خود اس تہذیب میں ادب کی تلاش کی جائے۔

تاریخی مطالعے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ واقعات کا تاریخی تجزیہ کیا جائے۔ یہ کام بہت نازک ہے۔ ناقد کو حالات کے ساتھ ساتھ پورا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اور اس ماحول کو اپنے ذہن میں دوبارہ زندہ کرنا ہوتا ہے۔ واقعات کا فراہم کر لینا تو کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ اسباب و علل کا سراغ لگانا یہ اصل غایت ہوتی ہے) اور اس میں عموماً کوتاہی یوں ہوتی ہے کہ مورخ جانب دار یا متعصب ہو جاتا ہے۔ اور واقعات کو اُن کی اصلی روپ میں دیکھنے کی بجائے اپنے نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے تجزیاتی مطالعے میں ہمیشہ اختلاف رائے کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ واقعات کو ایک نقطۂ نظر سے ہم نے بھی پیش کیا ہے۔

دوسری صورت قطعاً معروضی ہے۔ یعنی صرف وقائع سے بحث ہو۔ اور انکا

تجزیہ نہ ہو۔ اس میں تحقیق اور تاریخ کے طریق کار اور مسلمہ ضوابط کے احترام کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے یعنی کن ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔ اگر یہ منظور ہے کہ موضوع کا کامل احاطہ ہو۔ تب، تو اولین اور پھر ثانوی مصادر تاریخی ترتیب سے آتے ہیں۔ اور اگر صرف ایک مجموعی تصویر بنانی ہے تو ماخذ کے زمانی تقدم و تاخر سے زیادہ اُن کی پہنائی کو دیکھا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب اسی دوسری نوعیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے بجائے خود ایک ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں واقعات پر زیادہ، اور تجزیہ پر کم زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ کے اُستاد ہیں۔ اور انھوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی نگرانی میں ہندوستان کی اٹھارویں صدی کی معاشرت پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ابھی چند سال ہوئے وہ "ہفت تماشا" کا اردو ترجمہ کر کے اپنی تاریخی سوجھ بوجھ اور علمی لگن کا ثبوت دے چکے ہیں۔ ان کا ایک اور قابلِ ذکر علمی کارنامہ "مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات" کا مطالعہ ہے۔ یہ کتاب عنقریب حکومت ہند کی وزارت نشریات کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں نے دہلی کالج اردو میگزین کا میر نمبر ترتیب دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس نمبر میں ایک مضمون ایسا بھی ہونا چاہیئے۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ میر کا معاشرہ کیسا تھا؟ (اُس عہد میں ایک عام آدمی کی زندگی کیا تھی؟ رسوم و رواج کیا تھے، مرنے جینے کی تقریبات، لباس، زیورات، مکانوں کی آرائش کے ڈھنگ، میلے ٹھیلے، ادبی اجتماعات، مذہبی تقریبات اور اس طرح کی وہ سب باتیں جو اس سماج کی زندہ اور متحرک تصویر نگاہوں کے سامنے لے آئیں) بہت غور کرنے پر بھی محمد عمر صاحب سے زیادہ موزوں دوسرا نام ذہن میں نہیں آیا اس لئے کہ انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ اس دور پر لکھا ہے جو عہدِ میر کہلاتا ہے۔ میری فرمائش پر انھوں نے یہ مضمون لکھا تو وہ اتنا طویل ہو گیا کہ اس میں قطع و برید کر نیکو دل آمادہ نہ تھا۔ اور نمبر ملک کے دامن میں اُسکی گنجائش نہ تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ اب اِسے اور شرح و بسط سے لکھا جائے اور کتابی صورت میں سامنے لایا جائے۔ زیر نظر کتاب اُس ابتدائی مضمون کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کتاب کے سامنے آنے سے عہد میر کا سمجھنا اردو والوں کیلیے آسان ہو جائیگا۔ اور میر کی تعبیر و تشریح کے بھی نئے امکانات روشن ہوں گے۔

دہلی کالج، دہلی ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء ——— [illegible]

تمہید

کسی ملک اور قوم کا ادب اس کی زندگی، کردار، عقائد، رسوم و رواج، تصورات خوشیوں اور غموں، امیدوں، امنگوں اور خطرات کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ صرف فنکار کی نفسیات کا آئینہ ہی نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کا عکاس بھی ہوا کرتا ہے۔ اس سے کسی ملک کے باشندوں کی ترقی کے عوامل اور انحطاط کے اسباب اجاگر ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اردو ادب کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ ہندوستانی معاشرت کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے آئینے میں ساری قوم کا چہرہ نظر آجاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی، مذہبی اور اخلاقی انحطاط نے اس عہد کے لوگوں میں کیا ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اس دور کے شاعروں نے اپنے سماج کا جو حال قلم بند کیا ہے یا اس سے متعلق جو تلمیحات استعمال کی ہیں، وہ خاصی معنی خیز ہیں۔ اور ایک مورخ کے لیے اس میں وافر معلوماتی اشارے مل جاتے ہیں۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اپنے مقالے کی تیاری کے زمانے میں مجھے میر تقی میر (۱۷۲۲ء۔ ۱۸۱۰ء) کے کلام اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ میر نے طویل عمر پائی تھی۔ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے کہ سلطنت مغلیہ زوال پذیر تھی۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط کا اثر پیدا ہو چلا تھا۔ میر نے اپنی زندگی کے نوے سال دلی اور لکھنؤ میں بسر کیے تھے۔ اور وہ اپنے دور کے حالات سے بڑی حد تک براہ راست متاثر تھے۔ کیونکہ سیاسی اور معاشی بحران کے وہ خود بھی ہدف بنے تھے۔ گھر اجڑا۔ وطن چھوٹا۔ تنگدستی اور عسرت سے دوچار ہوئے۔ در در کاسۂ گدائی لیے پھرنا پڑا۔ اس لیے اس دور کی حالات کی عکاسی ان کے کلام کے علاوہ ان کی تصنیف ذکر میر میں بھی بخوبی کی گئی ہے۔ میں نے میر کے کلام اور دوسری تصانیف کی بنیا

پر ایک مقالہ " اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت : میر کا عہد" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ اور اس میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس دور کے سیاسی حوادث، سماجی حالات اور تہذیبی رجحانات کا ایک ایسا مرقع پیش کر دیا جائے جس سے میر کی شخصیت اور اُن کے ذہن کی نشو و نما۔ نیز اُن کے فن کی داخلی فضا کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

مقالے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ دہلی کے اس دور سے متعلق ہے جو میر نے اس شہر میں گذارا تھا یعنی حملۂ نادر شاہ (۱۷۳۹ء) سے میر کے سفر لکھنؤ (۸۲-۱۷۸۱ء) تک، دوسرے حصہ میں لکھنؤ کی معاشرت، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اخلاقی حالات پر بحث کی گئی ہے۔ اور یہ زمانہ ۱۷۸۱ء سے ۱۸۱۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس مقالے میں اس دور کے تمام جزوی حالات بھی آ گئے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اہم رجحانات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اور اس مقالہ کی ترتیب میں یہ بات پیش نظر رہی ہے کہ یہ میر تقی میر کی شخصیت، فن، اور اُن کے عہد کے پس منظر کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔ چونکہ مجملاً ہی سہی۔ مگر تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری تھی۔ اسلیے یہ مقالہ قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن امید یہی ہے کہ اس سے کسی حد تک اس سماج کی تصویر سامنے آ جائے گی۔ جس میں میر نے زندگی گذاری اور جس میں اُن کا فن جاوداں بن گیا۔ دونوں حصوں کو چار چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) سیاسی (ب) اقتصادی (ج) معاشرتی و تہذیبی (د) مذہبی اور اخلاقی۔ آخری باب میر کی آخری زندگی کے ایام پر مشتمل ہے۔ ادبی رجحانات سے ان حالات کا رابطہ قائم کرنے کیلیے اس دور کے شاعروں کے کلام سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ اور اُن کے بیانات کی تصدیق و توثیق کے لیے فارسی ادب سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں جن احباب سے مجھے مدد ملی ہے۔ اُن میں جناب ڈاکٹر عظیم الشان اور جناب نظیر حسن زیدی اور محمد ذہین کا شکریہ ادا کرنا میرا خوشگوار فرض ہے۔ اپنے بزرگ جناب مولانا شبیر احمد صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے کتاب کی طباعت میں پوری عملی مالی اور وقتاً فوقتاً مجھے نیک مشوروں سے نوازا۔ محمد عمر۔ جنوری ۱۹۷۳ء

بابِ اوّل

سیاسی حالات و اندرونی خلفشار

(۱) دہلی میں | ہمارا موضوعِ سخن اٹھارھویں صدی عیسوی ہے، یہ زمانہ عہدِ حاضر کے انقلاب کا دیباچہ تھا۔ اور اس کا نظرِ غائر سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی عوامل اس طرح اپنا کام کر رہے تھے جو آگے چل کر زندگی کا دھارا بدلنے میں مدد دیں، بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی یہ عبوری عہد صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بڑی اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ کچھ ملک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ امریکہ کی جنگِ آزادی کامیاب طور پر لڑی جا چکی تھی۔ انقلابِ فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی تحریکوں کو اُبھار دیا تھا[1]، لیکن دنیائے اسلام کی حالت اُس سے مختلف تھی، مجموعی طور پر وہاں کا عام رجحان تنزل اور پستی کی طرف

---

[1] تاریخِ مشائخِ چشت۔ ص ۳۰۹

تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں مغلیہ حکومت بھی زوال کے کنارے پر آ چکی تھی،
اس وقت ہندوستان میں صرف سیاسی طور پر ہی کمزوری نہیں تھی، اقتصادی
حالات بھی اتنے پیچیدہ ہو چکے تھے کہ عوام اور طبقۂ خواص اس کی زد میں
آ گئے تھے، ۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ تو گویا حکومت
کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک طرف تخت نشینی کی جنگوں نے سیاسی نظام کو متزلزل کر
رکھا تھا، دوسری طرف اورنگ زیب کے جانشینوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پسندی
اور پست ہمتی نے حالات کو نازک سے نازک تر اور بد سے بدتر بنا رکھا تھا۔
انھوں نے اپنی طاقت آپس ہی میں لڑ کر ختم کر دی تھی اور بیرونی طاقتوں کا
مقابلہ کرنے کی تاب باقی نہیں رہی تھی۔ ایک شاعر نے ذیل کے شعر میں اسی حقیقت
کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کہیں ہے شیشہ سرنگوں اور کہیں شکستہ جام ہے
کیا مچائی میکشوں نے آج میخانے میں دھوم[1]

شاہی خزانہ عیش و عشرت کی محفلوں کے نذر ہو کر خالی ہوتا رہا اور ان بادشاہوں
نے جو اورنگ زیب کے بعد مسند نشین ہوئے، حالات کو اپنے قابو سے باہر
دیکھا تو عیش و عشرت میں اُسی طرح غرق ہو گئے، جس طرح شتر مرغ ریگستانوں
میں آندھیوں کے وقت ریت میں سر چھپا لیتا ہے، اور دنیا و مافیہا سے
بے خبر رہ کر زندگی گزارنے لگے۔

اِن حالات کا ردِّ عمل اس دور کی شاعری میں ملتا ہے، حاتم، حسرت،

---

[1] چمنستانِ شعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۳۸۔

قائم اور سودا کے شہر آشوب اِن زوال پذیر معاشرے کی بڑی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

حاتم

امیرزادے ہیں حیران، اپنے حال کے بیچ
تھے آفتاب پر اب آگئے زوال کے بیچ
پھرے ہیں چرخی سے ہر دن تلاشِ مال کے بیچ
وہی گھمنڈِ امارت ہے پھر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو پر اب تو ہے دشوار

عجب یہ اُلٹی بہی ہے گی باؤ دِلّی میں
کہ شاہ باز چڑی مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں
جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

ہر ایک جنس کے خاوند ہیں گے دست فروش
کیسری صاحبِ خرقوں کے آج ہیں سرپوش
جوتی فروش دکھاتے ہیں سب کے تئیں پاپوش
نجیب خانہ بدوش، ایک بینی و دو گوش
ہے باغباں کے گھر میں بہار جوں گلزار

تمام شہر میں کھٹوں کے مالک ہیں گے بزاز
اور آج سب ہیں بڑے خود نما ہیں آئینہ ساز
ستارا اپنا کو دکھاتے ہیں سب کو آتش باز
کمان گر بھی ہوئے گھر میں اپنے تیر انداز
نہانی آری چلاتا ہے خلق پر نجّار

جہاں میں صاحبِ شمشیر ہیں گے صیقل گر
ہے گندھیوں کا معطر سدا دکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں کنجڑ بھونجے اپنے بختوں پر
اہیر دودھ ملائی دہی سے ہیں خوگر
بنا ہے خانۂ نقّاش رشکِ نقش و نگار

دلوں کے بیچ صفائی نہیں ہے یاروں میں
کہیں جو ملتے تھے شاید تو اب ہزاروں میں
صندوق ساز کے زر ہے بھرا پٹاروں میں
جو تھے سائیس سو نوکر ہیں اب سواروں میں
عراقیوں کے ہوئے ہیں سر طویلہ حمّار[1]

مرزا جعفر علی حسرت

کسی کو حسن پرستی و عاشقی سے شوق
کسی کو مطرب و مے سے کسی کو زہد سے ذوق

---

[1] دیوان زادہ (قلمی) ص ۲۴۶، ۲۴۷

برائے گل کوئی بلبل سے نالہ زن ما فوق
ہوائے سرو سے جوں قمری اک سکے کوئی طوق
سو، آہ سب ہوئے دام بلا میں بے پر و بال

مٹے وہ چہچہے سب کی گئی خوش الحانی
اسیر غم ہوئے یہ بلبل گلستانی
اب آب و دانے کی خاطر اٹھے ہے حیرانی
گہر فشانوں کی اب ہو چکی پرافشانی
کٹی وہ شاخ ہی کرتے تھے جس پہ سب گریال

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت اور تاج
وہ اپنی قوت کو اطفال کا ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج
غنیم (اس کا) لے اس سے اس کے شہر سے خراج
وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

وہ شہ سپہر انجم نمط تھی جس کی سپاہ
سو اس کی ڈیوڑھی پہ کئی پیادے ہیں بحال تباہ
سو مارے فاقوں کے مرتے ہیں چھٹے نے تنخواہ
کہیں ہیں ہم کو ملے کیا خوراک، خاص کو آہ
سحر کو تب ہو، جو بہو پیچھے کر دوڑیا کتوال

جواہر اور خزانہ تو سب لٹا یکسر
رہیں سو کس پہ یہ فرقے کے نوکر اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ، کوٹھوں کے اندر
جو چھت تھی چاندی کی، دیوانِ خاص میں پرزر
سو وہ وزیر نے کی خرچ، بھیج کر ٹکسال

جو اصطبل ہے سو دیوانِ خاص اُس کا مکان
عراقی اور عربی، سو بھی اس کی ہیچ کہاں
جو فیل خانہ ہے سو اس میں فیل کا نہ نشان
بہ مشکل نیز اب اس سے لنگڑے گئے رواں (کذا)
کہ جس پہ جنگ کے دن لاتے تھے ایک نہال [1]

ہے میری ڈیوڑھی کے ناظر کو تیسرا فاقہ
جو محل دار ہے اُس نے دیا ہے استعفیٰ
مچایا ترکنی، کشمیرنی نے اب غوغا
رہے بچارے سلاطین، اُن کا حال سو کیا
کسی کے مرنے کی نوبت، کوئی پڑا ہے نڈھال [2]

قائم چاند پوری

گردش کا آسماں کی جو ہو ہے کوئی سبب
اہلِ زمیں پہ آئے ہیں ایک رنج یا تعب

---

[1] دیوان مرزا جعفر علی حسرت (قلمی رامپور) ص ۱۳۲ (الف) اور (ب) [2] حوالۂ بالا ص ۱۳۳ (ب)

ٹوٹے غضب یہ تجھ پہ، نہ اتنا کہیں غضب
مردوں کے جو کھڑے تھے سے پُر ہونہ تا بلب
ایسی نہ باؤلی ہے، نہ چشمہ، نہ چاہ ہے

قصبات، اک جگہ تھی، شریفوں کی بود و باش
فاسق نظر پڑے جو کوئی واں، بصد تلاش
عصمت زنوں کی، عفتِ مریم سے زیادہ فاش
تقوے کی رو سے مرد فرشتوں کی سی معاش
سو بھوکھ سے حرام پر اُن کی نگاہ ہے

جو شہر لیں تھے مصر سے، ہر چیز میں خراج
ٹھیکے دوا کے گنج میں رہتے تھے جوں اناج
واں درد سے شکم کے کوئی مر رہا ہو آج
کس چیز سے حکیم کرے بیٹھ کر علاج
نے زیرہ ہے، نے سونف ہے، نے نان خواہ ہے

تن زیب پہرتے جنہیں آتی تھی جی میں عار
خاصہ ہمیشہ چشم میں اُن کی تھا، بے وقار
سو ظلم سے تیرے ہیں وے یاں تک ذلیل و خوار
دستار ہوے سر سے ہے اب اُن سروں پہ بار
جامہ اگر ہے تن پہ تو وہ گردِ راہ ہے

وہ دن گئے کہ ساگ کو اگا ہے جو من چلا
بیٹھی کو ایک دیر تلک، گوشت میں تلا
کھاتے ہیں اب تو آئے جو کچھ، خاک یا بلا
نالی کے ساگ کا ہوا الٰہی، بہت بھلا
روٹی کا جس کے ساتھ تنک اب نباہ ہے

نوشہ کہے ہے یاروں سے اپنے یہ بھر کے آہ
کس خبط میں ہیں بندہ خدا جانے قبلہ گاہ
احوال پر مرے بھی یہ کچھ کرتے ہیں نگاہ
مرتا ہوں میں تو جی سے یہ کس کا کریں ہیں بیاہ
فاقوں سے یاں کمر میں نہ قوت نہ باہ ہے

اس سب پر اب ہے عاشق و معشوق تک یہ ڈھنگ
دیکھے جو نور شمع یہ، تو جل مرے پتنگ
عالم سے اٹھ گیا، غم ناموس و پاس ننگ
جس سے سنو تو رنک سے بیٹی کے ماں ہے تنگ
دیکھو جدھر تو باپ کا بیٹا کا ڈاہ ہے[1]

سودا

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر
نہ وہ گل ہی نظر آیا، نہ وہ گلشن، نہ بہار

---

[1] شہر آشوب قائم چاندپوری (مرتبہ جناب نثار احمد صاحب فاروقی) نقوش، اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۹۵-۱۰۰

نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اُڑتی ہے، ہر سمت پڑے ہیں خس و خار
مُسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ہنستا تھا
اشک شبنم کے بھی قطرے کا نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے، سرو و شمشاد
مُشت پر قمری کے اُس جا نظر آئے اک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر، سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے، بے بال و پر و دل افگار
بدم سَرد و بصد حسرت و صد سوزِ جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے بانالہ و زار
"حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شُد
رُوئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد"[۱]

فرصت چمن کی سیر کی لیکن ہمیں کہاں
فکرِ معاش و عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے[۲]

---

[۱] کلیاتِ سودا از نول کشور ۱۹۳۲ء جلد اوّل۔ ص ۳۴۶ - ۳۴۷۔
[۲] ایضاً۔ ص ۲۱۰

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کر کے ڈھلیتے انھوں نے ہو ناچار
میانِ قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو، سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش
کہیں پلاؤ تو، باورچی دال پکاویں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہیں کر مٹا اٹھ کے چاندنی کا جھول

یہ خادمانِ محل کی ہے اِن دنوں صورت
نہ خوان ڈھونے کا، کشمیرنی میں باقی ست
نہ اُٹھ سکے ہلنے کی ہرگز، روٹے میں طاقت
بنی ہے بھوک سے درباریوں کی یہ گت
کہ بوڑھی ہتھنی کے جس طرح بیٹھ جائیں کپول

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے، یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں، گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے ہے جو ہم ایسے بجاتی کے ہیں پہاڑ

تو چاہیئے کہ ہیں سب کو زہر دیجئے گھول[۵]

میرؔ

ہیں خرابے آج جتنے کل یہ تھے لوگوں کے گھر
مت بنائے خانہ میں منعم رہا کر اس قدر

گھر کا صاحب تو اُڑایا کر کے یکساں خاک سے
اینٹ ماریں اینٹ سے یہ کچھ ہوا اس گھر اوپر

کیسے کیسے خان وادے خاک میں یاں مل گئے
جائے عبرت ہے یہ معمورہ جہاں کا بے خبر

سبزانِ تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھئے تو واں نہیں سایہ درخت کا

دمِ صبح بزمِ خوش جہاں شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

حال گلزارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے اک آن کے بیچ

۵؎ کلیاتِ سودا جلد اول ۔ ص ۳۶۸ - ۳۶۹

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں   کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے   ایک ازاں جملہ کربلا ہے یہاں

اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے   ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یہاں

اس زمانے میں صوفیاء اور علماء نے اصلاحی کوششیں بھی کیں، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس دور میں اپنی بصیرت سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہندوستان کا اقتصادی نظام بگڑ چکا ہے اور مذہب کی صحیح فکر بیدار کرنا ضروری ہے، انھوں نے حکمراں طبقہ کو اُس کے فرائض یاد دلاتے ہوئے مطالبہ کیا:

"یہ کہ بادشاہِ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں، گذشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آیندہ گناہوں سے بچتے رہیں[1]"

اسی طرح شاہ فخر الدین[2] دہلوی نے بادشاہِ وقت کو ہدایت کی: -

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۹۶ [2] شاہ فخر الدین دہلوی (۱۱۲۶ھ - ۱۱۹۹ھ)، شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کے بیٹے اور جانشین تھے، ۱۱۶۵ھ میں دہلی تشریف لائے اور اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں، جو آج کل دہلی کالج کہلاتا ہے، درس و تدریس کا کام شروع کیا تھا۔ اور درسی کتابوں (باقی ص پر)

"پس پہلی مقدم بات یہ ہے کہ وہ لوگ بذاتِ خود محنت کشی اور ملک گیری کے لئے مستعد ہوں"[1]

لیکن صوفیاء اور علماء کی یہ کوشش بارآور نہ ہوسکی۔ زوال اور انحطاط کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی، مرکزی حکومت میں رخنے پیدا ہوچکے تھے۔ ایرانی اور تورانی گروپ کی آویزش بڑھ کر بحران کی کیفیت اختیار کرچکی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ صوبائی حکومتیں مرکز سے زیادہ طاقت ور اور تقریباً خود مختار ہوگئی تھیں، جو سلطنت مغلیہ بائیس صوبوں پر مشتمل تھی، اور جس کا ڈنکا کشمیر سے دکن تک اور بنگال سے کابل و قندھار تک بجتا تھا، اب سمٹ کر قلعۂ معلیٰ کی چار دیواری میں آگئی تھی[2]۔ یقینؔ کا ذیل کا شعر اس تباہی و بربادی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

گر نہ ہوتا آشیانِ بلبلِ غم گیں خراب
کر نہ سکتا باغ کو اے باغباں گلچیں خراب[3]

بادشاہوں کی غفلت شعاری اور عیش پرستی سے امراء کا طبقہ سب سے زیادہ

(بقیہ حاشیہ ص) کے علاوہ حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے۔ آخری وقت تک دہلی میں قیام رہا اور یہیں انتقال فرمایا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزارِ پاک کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔ مفصل حالات کے لیئے ملاحظہ ہو، مناقبِ فخریہ۔ فخرالطالبین۔ تکملہ سیرالاولیا، تاریخ مشائخ چشت۔ ص۔ ۴۶۰۔ ۵۲۹۔

[1] مناقبِ فخریہ (قلمی مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)، ص ۳۵۔ ۳۶۔ [2] چہارِ گلزارِ شجاعی (قلمی)، ص ۴۸۴۔ [3] دیوانِ یقین۔ ص ۹۔

فائدہ اٹھاتا ہے، ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوا، جادوناتھ سرکار نے صحیح لکھا ہے کہ ان امراء کی آویزش اور گروہ بندی کے مسموم اثرات محلاتِ شاہی سے لے کر دور دراز کے جھونپڑوں تک پہنچتے تھے، اور سماجی زندگی میں کشمکش اور تلخیاں پیدا کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دربار میں دو جتھے بن گئے تھے۔ ایرانی (شیعہ) اور تورانی (سنّی) انھوں نے سیاسی حالات کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور اس دور کی تاریخ دراصل انھیں فرقوں کی کشمکش کی داستان ہے۔ حتّٰی کہ بادشاہوں کی قسمت بھی انھیں امراء سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ سرکار نے تاریخ احمد شاہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

> "یہ تمام فتنہ و فساد، ایرانی اور تورانی امراء کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ ہے۔"[1]

ان حالات میں ملک کی تمام دبی ہوئی سیاسی قوتوں نے قسمت آزمائی شروع کردی۔ مرہٹے، سکھ، روہیلے اور جاٹ۔ سب اس پراگندہ سیاسی ماحول کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور ملک سے امن و اماں رخصت ہو چکا تھا۔

اس اندرونی کمزوری اور کشمکش کا پورا فائدہ ایک بیرونی طاقت نے اٹھایا یعنی انگریزوں نے اس تفریق کو اور بھی ہوا دے کر اپنی حکومت کے لئے

---

[1] مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) جلد ۱۔ ص ۸۔ ایرانی و تورانی جتھوں کے آپسی جھگڑوں کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔

PARTIES AND POLITICS AT THE MUGHAL COURT:

DR. S. CHANDRA

میدان ہموار کر لیا۔ اور جن صوبائی طاقتوں سے کبھی سرکشی متوقع ہو سکتی تھی انھیں ختم کر دیا یا مفلوج کر کے رکھ دیا۔

یہ تھا ایک مجمل خاکہ اُس ماحول کا جہاں میر محمد تقی میر سنہ ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی نشو و نما ہوئی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن سیاسی حوادث کا جائزہ قدرے تفصیل سے لیا جائے جن کا میر نے مشاہدہ کیا یا ان سے متاثر ہوئے اور جن حالات کی طرف انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری۔ ذکرِ میر۔ میں اشارے کئے ہیں۔

(ب) بیرونی حملے | اٹھارھویں صدی میں ہندوستان پر متعدد بیرونی حملے ہوئے، کیونکہ مغربی سرحد کی حفاظت کی طرف اورنگ زیب کے بعد کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، اِن حملوں نے ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیا اور باغیانہ قوتوں کو سلطنتِ مغلیہ میں ہر طرف سے ابتری اور انتشار پیدا کرنے کے مواقع فراہم کر دیئے۔

دربارِ مغلیہ کی حالت | اُس زمانے میں تختِ مغلیہ پر محمد شاہ رنگیلا (۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء) جلوہ افروز تھا۔ یہ بادشاہ فطرتاً کمزور، بزدل، عیش پرست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ افیون کھا کھا کر اپنی تندرستی اتنی خراب کر لی تھی کہ چلنا پھرنا بھی اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ ہاتھیوں کی جنگ دیکھ کر دل بہلاتا اور امورِ مملکت سے تغافل برتتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے عام طور پر اپنے درباری امراء اور خاص طور پر کچھ منظورِ نظر امراء کو بے حد حقوق تفویض کر دیئے تھے۔

بقول غلام علی طباطبائی:-

درتیں، روشن الدولہ دخیل مزاج بادشاہ ہو کر برآمد کار مقدمۂ خلائق کرتا تھا اور شاہ جہاں محمد فقیر کی لڑکی کوکی نے محمد شاہ کے حضور میں نہایت ادب حاصل کیا اور بادشاہ کا قلمدان اُس کے سپرد تھا وہ بادشاہ کی طرف سے صاحبِ دستخط تھی۔ محل کے اندر حاجت مندوں کی عرضی توقیع کرتی تھی۔ بادشاہ چونکہ جوان اور کم جرأت تھا۔ عیش وعشرت میں پڑا رہتا۔ عمدۃ الملک امیر خاں وغیرہ امرا اور امرا زادہ خوش طبع و رنگین مزاج کی طرف طبیعت کو اپنی رغبت دی۔ کارِ سلطنت سے بے غرض تھا۔ اس سبب سے کچھ کچھ خوف وہراس امرا بلکہ عوام کے دلوں سے دور ہونے لگا۔ ہر شخص اپنے اپنے خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف نظر آنے لگا! بجائے خود دمِ استقلال بھرنے لگے[1]۔ اس طرح بادشاہ کے منظور نظر امرا امورِ ملکی میں سفید وسیاہ کے مالک بن بیٹھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درباری امرا میں نفاق اور عناد کی گرم بازاری ہوئی۔ ہر ایک امیر اپنے مدِ مقابل کی بیخ کنی میں اپنی تمام قوت ضائع کرنے لگا۔ حاتم اپنے ذیل کے شعر میں امرا کے نفاق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سارے تونگروں میں جو دیکھا تو ہے نفاق
آپس میں ہے جو کچھ تو غریباں کی دوستی[2]

---

[1] سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۲ ص ۸۲، نیز ملاحظہ ہو۔ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی سرکار) ج ۱ ص ۹ - ۱۰۔ [2] دیوان زادہ (قلمی) ص ۲۹۹۔

اس زمانے میں درباری امرا دو گروہوں۔ ایرانی۔ اور تورانی۔ میں منقسم تھے۔ ایک گروہ دوسرے کے خون کا پیاسا تھا۔ اس عناد و نفاق کے مسموم اثرات سارے ملک کی سیاسی فضا کو متاثر کر رہے تھے[۱]۔

نظام الملک[۲] آصف جاہ تورانی گروہ کا لیڈر اور وزیر الممالک تھا، اس کے مدِمقابل عمدۃ الملک امیر خان[۳] میر اسحاق انجام اور اسحاق خاں[۴] نجم الدولہ تھے اور ایرانی جماعت کی پیشوائی کر رہے تھے۔ بقول سر جادو ناتھ سرکار

---

[۱] مغلیہ سلطنت کا زوال۔ ج ۱ ص ۸

[۲] نظام الملک کے نانا، سعد اللہ خان، شاہ جہاں بادشاہ کے وزیر اعظم تھے، والدہ کی طرف سے اُن کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے۔ اُن کے والد میر شہاب الدین غازی الدین خان، اورنگ زیب کے عہد میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ نظام الملک کا اصلی نام میر قمر الدین تھا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں خانِ دوراں بہادر کا خطاب ملا اور صوبۂ اودھ کی صوبیداری اور لکھنؤ کی فوجداری تفویض ہوئی۔ ناساعد حالات سے مجبور ہو کر کچھ دنوں خانہ نشیں رہے۔ جہاں دار شاہ کے زمانہ میں پھر سابق عہدہ ملا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں نظام الملک فتح جنگ کے خطاب کے ساتھ دکن کی نظامت کا منصب ملا۔ سید بھائیوں کے زوال اور محمد امین خاں وزیر کے انتقال کے بعد محمد شاہ نے ان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ آصف جاہ صاحبِ دیوان شاعر تھے، اُن کے دربار سے عرب، خراسان، عراق اور ماوراء النہر کے علماء، شعراء اور ادبا منسلک تھے۔ ان کی وفات سنہ ۱۱۳۲ھ میں ہوئی۔ برائے تفصیل دیکھئے۔ (بقیہ ص ۱۸ پر)

"۱۷۳۶ء کے بعد کی تاریخ مغلیہ درحقیقت ان دونوں گروہوں کی تاریخ ہے،[۱] سُنّی امرا نظام الملک کو معزول کرانے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ وزیر الممالک امور ملکی اور مالی میں چند ضروری اصلاحیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ لوگ اُس کے اِس کام میں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ طبا طبائی کا بیان ہے کہ

"نظام الملک چاہتا تھا کہ بادشاہ اُس کی رائے کے بموجب تعمیل کرے اور صحبت رنگین مزاجان نازنین منش و اختیار مدار المہامی زنان نازک سرشت مثل کوکی وغیرہ دلِ بادشاہ اور کاروبار ملکی مالی سے نکل جاوے، اس سبب سے ہر ایک امیر و امرا اور بادشاہ اس کی طرف سے بدظن اور مسخر گی کرتے اور غیبت میں اس کے حق میں کلماتِ رکیک زبان پر لاتے تھے۔[۲]

(بقیہ ص۱۷) ماثر الامرا (فارسی) ج ۳ ص ۸۳۸ تا ۸۴۸، خزانۂ عامرہ ص ۴۵ - ۴۹ ۔ سفینۂ ہندی۔ بھگوان داس ہندی) ص ۷ - ۸ ، عقد ثریا ص ۷، گل عجائب ص ۲۱ - ۲۲

[۲] یہ میر میران نعمت اللہ ولی کی نسل سے تھے۔ امیر خاں نام اور عمدۃ الملک خطاب تھا۔ محمد شاہ کے جلیس خاص تھے۔ نہایت ظریف، حاضر جواب، لطیفہ گو اور شیریں کلام تھے۔ موسیقی اور گانے میں بڑا درک تھا۔ فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعروں کے قدردان بھی تھے، میر شاکر ناجی ان کے داروغہ دیوان خانہ تھے۔ ۱۱۵۹ھ میں قلعۂ معلی کے دروازے پر کسی سپاہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ برائے تفصیل ۔ سفینۂ ہندی۔ ص ۶ - ۷ - ماثر الامرا (فارسی ج ۲۔ ص ۸۳۹ - ۸۴۱

(باقی ص۱۹ پر)

اُس وقت نظام الملک کی عمر ۹۴ سال سے بھی زیادہ تھی، اب اُس کے قویٰ میں اتنی طاقت باقی نہ تھی کہ وہ اپنے مخالفین کو بزورِ شمشیر دبا سکتا۔ لہٰذا اس بے بسی، دل برداشتگی، مایوسی و پریشانی کے عالم میں اپنے دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے اُس نے نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، نادر شاہ نے جو پہلے ہی ایسے موقع کی تلاش میں تھا، فوراً دعوت قبول کر لی اور ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء میں اس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔

(بقیہ ص۱۷) عقد ثریا ص ۹، تذکرہ ریختہ گویان ص ۲۰۔

مخزن نکات ص ۳۱۔ گل رعنا ص ۱۰۷، گلشن ہند ص ۱۴ زوالِ سلطنت مغلیہ ج ۱ ص ۱۰-۱۱

۱۵ محمد اسحاق خان معتمد الدولہ (برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ماثر الامرا (فارسی) ج ۳ ص ۷۷۴-۷۷۵) کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے اسحاق خاں دوم (نجم الدولہ) کو محمد شاہ کی قربت حاصل ہوئی دیوانِ خالصہ کا منصب ملا۔ احمد شاہ کے عہد میں سابق منصب قائم رہا۔ جب صفدر جنگ نے بنگش افغانوں کے خلاف فوج کشی کی تو محمد اسحاق خان اُس کے ساتھ گیا افغانوں سے جنگ کے موقع پر اُس نے بڑی بہادری دکھائی لیکن میدانِ جنگ میں کام آیا۔ ماثر الامرا (فارسی)، ج ۳ ص ۷۷۵، ۷۷۶، بقیہ ص۱۸ لہ مغلیہ سلطنت کا زوال، ج ۱، ص ۸۔

اپنے ہاتھوں آپ ہی کرتے ہیں سر تن سے جُدا ورنہ کیا طاقت ہے آوے اس جگہ جلاد کو

تذکرہ ہندی ص ۱۵۱۔

کس جنگ جو کی صبح کو باتیں نکالیاں
باہم صبا چمن میں الجھتی ہیں ڈالیاں

لہ سیر المتاخرین (اُردو ترجمہ) ج ۲، ص ۸۲۔ تذکرہ گلشن ہند ص ۳۶

اٹک ندی پار کر نادرشاہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوگیا جب لاہور کے ناظم زکریا خان[1] کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ اپنی فوج لے کر آگے بڑھا اور نادرشاہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور دہلی سے کمک بھیجنے کی درخواست کی لیکن بادشاہ اور اُس کے امراء رقص و سرود کی محفلیں سجائے بیٹھے تھے، کسے فرصت تھی کہ اس درخواست پر غور کرتا، زکریا خان نے ایسے حالات میں ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔ نادرشاہ فاتح کی حیثیت سے لاہور شہر میں داخل ہوا۔ ایرانی سپاہ نے شہر اور گرد و نواح کے قصبوں اور گاؤں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔

آنند رام مخلص نے اس تباہی و بربادی کا نقشہ اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے

"چہ نوشتہ شود، کہ برآں دیار و سکنۂ آں گلزار چہ قیامت گذشت۔ مثل وزیر آباد، امن آباد، گجرات و قصبہ جات کہ ہر یکی بنا بر کثرت آبادی نیمچہ شہرے بودہ است، بخاک سیاہ برابر گشت، بر ہمگی آں گل زمین بہزار رنگ بید اد رفت، مالہا بتاراج و ناموسہا برباد رفت"

---

[1] یہ سیف الدولہ عبد الصمد خاں دیر ابراے تفصیل۔ ماثر الامراء (فارسی) ج ۲ ص ۵۱۴ تا ۵۱۷) کا لڑکا تھا۔ والد کی زندگی میں لاہور کا صوبہ دار بنایا گیا اور بعد میں ملتان بھی اُس کے سپرد ہوا۔ نادرشاہ جب ہندوستان سے واپس چلا گیا اور اس نے زکریا خان کو سندھ بھیجا ۱۱۵۸ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ ماثر الامراء (فارسی) ج ۲ ص ۱۰۶ تا ۱۰۷۔

نوک خاری نیست کز خون شکاری سُرخ نیست
آفتی بود، ایں شکار افگن کزیں صحرا گذشت[۱]

جب زکریا خان کے مغلوب ہونے کی خبر دربارِ دہلی میں پہونچی تو بادشاہ اور امراء دونوں کا نشہ کافور ہو گیا۔ چل توں محمد شاہ نے فوج آراستہ کی اور بذاتِ خود نادر شاہ کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ کرنال پہونچ کر فروکش ہوا لیکن اس جنگ میں مغلوں نے منہ کی کھائی۔ اور مفتوح کا کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ مرزا محمد مہدی نے ذیل کے اشعار میں اُس تباہ کُن جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے:۔

شد افروختہ آتشِ رزم کیں	ز خون گشت گلگوں سرای زمیں
گرفتہ ز گرد سپہ مہر و ماہ	فضائے جہاں گشتہ چوں شب سیاہ
ز نوک سنا نہائے خارا گذر	شدہ چشمہ چشمہ زدہ سر بسر
ز غلطیدن کشتگاں در مصاف	شدہ پشتہ بر پشتہ چوں کوہ قاف
ز بسیاری کشتہ و خستہا	درآں عرصہ خالی نبُد جای پا[۲]

بیشمار مال غنیمہ، سامانِ حرب، ہاتھی گھوڑے فاتح کو دستیاب ہوئے۔ بقول مرزا محمد مہدی:۔

"خزائن بے حدود مع فیلان کوہ پیکر و توپخانہ ہا بادشاہی و امراء کہ بعزمِ جنگ آمدہ بودند با غنایم بسیار و اسباب و اثاثہ فزوں از شمار بحیطۂ تصرف در آمد"[۳]

---

[۱] اقتباس بدائع (اوزنیل کالج میگزین۔ ماہ اگست ۱۹۵۵ء) ص ۶۵ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۲ ص ۱۰۵-۱۰۸ برائے تفصیل۔ جہاں کشائے نادری، ص ۲۳۳ تا ۲۳۷، نیز لیٹر مغلس (انگریزی)، ج ۲، ص ۳۴۹۔ میر کی آپ بیتی، ص ۹۲

[۲] جہاں کشائے نادری، ص ۲۳۷

بعد ازیں امراء کی وساطت سے صلح کی گفتگو شروع ہوئی، محمد شاہ، نظام الملک، کے ساتھ نادر شاہ سے ملاقات کرنے اُس کے قیام گاہ پر گیا۔ یہ ملاقات خوشگوار رہی۔ اس کے بعد محمد شاہ اور نادر شاہ نے دہلی کے لئے کوچ کیا۔ دہلی میں نادر شاہ مہمان کی حیثیت سے قلعۂ معلیٰ میں فروکش ہوا۔ محمد شاہ نے دل کھول کر مہمان نوازی کے فرائض انجام دیئے۔ یہ واقعہ ۱۱۵۱ھ کا ہے۔ جب دہلی کے قلعہ میں دو بادشاہ رونق افروز تھے۔ مخلص نے اس واقعہ کی تاریخ کہی ہے۔

در ہزار و صد و پنجاہ و یک — شاہِ ایراں گذشت از آبِ اٹک
یک مملکتِ ہند دو خسرو دارد — چیدہ است عجب بازیِ شطرنجِ فلک[1]

اُس سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر جامع مسجد میں اور دیگر مقامات میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔[2]

دہلی میں قتلِ عام| ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایرانی سپاہی شہر میں گشت کرتے پھر رہے تھے، کچھ ناعاقبت اندیش ہندوستانیوں نے افواہ اُڑا دی کہ نادر شاہ مارا گیا۔ اب کیا تھا، شہر کے کچھ غنڈوں نے اُن پر وار کیا۔ اس وجہ سے شہر میں بدامنی پھیل گئی۔ اور اس ہنگامہ میں سات سو ایرانی مارے گئے۔[3] جب نادر شاہ کو اس حادثہ کی خبر پہونچی تو اُس کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ قلعہ معلیٰ سے نکل کر چاندنی چوک کی سنہری مسجد (جو آج بھی کوتوالی کے پاس ہے)

۱؎ اقتباس بدائع وقائع (اورنٹیل کالج میگزین۔ ماہِ اگست ۱۹۳۵ء) ص ۶۱

۲؎ سیر المتاخرین (اُردو ترجمہ) ج ۲، ص ۱۰۹۔

۳؎ سیر المتاخرین (اُردو ترجمہ) ج ۲، ص ۱۰۹

میں آیا اور قتل عام کا حکم صادر کیا۔ آناً فاناً ایرانی سپاہیوں نے لُوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ ہنگامۂ کشت و خون صرّافہ اردو (ئی دیہ مقام لال قلعہ کے قریب تھا) سے پرانی عیدگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ خانم کا بازار جامع مسجد کے قرب وجوار کا علاقہ، روئی فروشوں اور جوہریوں کے بازار تباہ کر دیئے گئے۔ کئی مقامات پر آگ لگادی گئی، جس کسی کو گلی کوچوں، سڑکوں اور دکانوں پر پایا، چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، عورت یا مرد، اُسے تہ تیغ کر دیا، یہاں تک کہ جانور بھی اس زد سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہزاروں کی تعداد میں عورتیں مقید کر لی گئیں اور ہزاروں نے "جوہر" کیا۔ قتل اور غارت گری کا یہ بازار صبح آٹھ بجے سے سہ پہر تک گرم رہا۔ ایک لاکھ بیس ہزار افراد قتل ہوئے، پندرہ ہزار مجروح اور زخمی ہوئے[۱]۔ طباطبائی نے لکھا کہ "دوپہر تک وہ زرود کُشت ہوئی کہ خون کے نالے بہے اور مقتولوں کا شمار اندازۂ قیاس سے باہر ہوا۔۔۔لاشوں کی کثرت سے راہ میں وہ تعفن تھی کہ گذر دشوار ہوا۔ آخر صفائی کا حکم ہوا اور کوتوال شہر نے سب لاشیں جمع کرا کے بے تلاش ہندو مسلمان کے خس وخاشاک میں جلوا دیں[۲]

معاصر لٹریچر میں اس غارت گری و تباہی کا بڑا دل دوز نقشہ ملتا ہے۔

اشرف علی خاں پیام

دہلی کے کجکلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا
ایک عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نے قتل عام کیا[۳]

---

[۱] نادر شاہ (انگریزی) فریزر ص ۱۸ تا ۸۳ [۲] سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۲ ص ۱۱۰ [۳] اقتباس بدائع وقائع (اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۱ء) ص ۱۴۳

۱۶

مرزا عسکری!

تو نادر شاہ ہے ملک پری رویوں کا اے ظالم
جدھر بھر کر نظر دیکھے تو قتلِ عام ہو جائے۔ لہ

تاریخ ہندی کے مصنف کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"چنانچہ سہ پاس قتلِ عام بر خاص و عام بود۔ بروایتی عدد مقتولان قریب یک لک رسید ہرج و مرج بر مردم شاہ جہان آباد بدرجہ از دیاد رو داد۔ چنانچہ خانہ بو علی کوکہ و خانہ تربیت خاں کہ از امرای عالی شان بود بتاراج رفت و حکیم امام الدین کہ سید برحق و بکمالات حکمت و طبابت سر آمد حکما و روزگار بود و در جود و سخاوت ممتاز این دیار بود معہ توابعان بدرجۂ شہادت رسید۔ بروایتی حکیم علوی خان کہ در کمال علوم حکمی وقت بود نیز ہم چنان شد، و بسیاری از علماء و صلحاء و حافظ قرآن و قرأ بدرجۂ شہادت فائز شدند۔ شہوار خاں، و سید نیاز خان و خوشحال رای مشرف تخت را دستگیر ساختہ شکم پارہ نمودہ و والہ بردیخان قزادل بگی کہ از امرا قدیم و بمنصب ہزاری سرفرازی داشت بنا بر درشتی مخلصان خود را کشت۔" ؎

بقول اعظم خان بہادر:۔

"عالم را بسیوف آبدار ساختند و جہانے را چون خس و خاشاک درہم شکستند،"

لہ عیار الشعراء (قلمی)، ص ۳۱۶ ؎ تاریخ ہندی (قلمی)، ص ۲۷۵-۳۰۷۵۔

بسان دیوان عربده خو و فیلان بدمست خوی تمیز از دست داده
ونیک و بد هیچ نشناخته طفلان معصوم و زنان معصوم را دو لخت
می ساختند، جانوران مجبور و وحشیان معذور از تیغ بیدریغ
آنها پناه نیافتند، بلکه گربه و سگان را از دست شان رهائی نیافته
طعمۀ مرگ شدند، چه گویم از آن قتل عام و چه نالم از آن روز بدسر
انجام آن موکلان ملک الموت و نابینایان عزرائیل بدان شکل و
شمائل در کوچه و بازار و خانه و دیوار برآمده قبض ارواح عالم
نموده دست بغارت کشادند زر و جواهر و خزینه و دفینه و مال و
متاع که خراج مملکت اقسام بناش و تاراج کردند. . . . .
از جمیع اطراف شهر فراهم آمده در شهر پناه و اردوی معلی و محلات
چاندنی چوک و فیض الله بازار و جوهری بازار و دیگر امکنه محفوظ و
محروس پنداشته، مال گزیده بود، همه تلف و پامال گشتند و ننگ و
ناموس غربا و اغنیا بدست آنها گرفتار شدند، هزاران پری پیکر
بدیع جمال که از عصمت و عفت گاهی بطرف خورشید و مه درست
نگاه نکرده بیش وپس آنها در رسته و بازار برهنه بدتر از احوال
خاکساران و گنهگاران می رفتند. بجز آن کارنامه دیگر انچه احمال و
اثقال از طاقت بشری خود فراوان دیدند، حوالۀ آتش نمودند.
شعلۀ آتش جوش بر فلک رسیده و نائرۀ غضب در خروش اطراف
عالم رو دیده زلزلۀ کلان در رستخیز نمایان آشکاره بوده.

بقیۃ السیف، اکثری از اہل ناموس علی الخصوص بیشتر از جوہریانؑ
جوہر عزت خود آشکارا کردہ "جوہر نمودند، بسیاری زنان
بچہای خود را کشتند و داغ حسرت وخجالت وندامت با ملامت
بردند، بر خون و دل جگر گون برداشتند" (کذا) [1]

مختصر یہ کہ محمد شاہ رنگیلے کی دلّی کے جو کوچے گلزار کی روِشوں سے خوبصورتی میں کسی طرح بھی کم نہ تھے، اور ہر ایک کوچہ دلا ویز زُلف کے مانند تھا اور جس کے ہر محلے میں بُلبُلوں کی سی شور انگیزی تھی، اُسے اب ایسی نظرِ بد لگی تھی کہ زلفِ بُتاں کے مانند پریشان حال تھا اور بقول آنند رام مخلص " اپنی اصلی حالت پر دوبارہ آنے کے لئے اُسے ایک مدتِ دراز درکار ہوگی" آتش زنی کی وجہ سے اب شہر خاکِ سیاہ ہوگیا ہے۔ [2]

دل سرو کارش بر نگار رنگ داغ افتادہ است
ہمچو دہلی شہر خوبی بے چراغ افتادہ است [3]

---

[1] تاریخ مبارکنامہ از اعظم خاں بہادر (قلمی)، ص ۱۴۹ (الف)، و ۱۴۹ (ب)

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو" مرقع دہلی" از درگاہ قلی خاں، کلیاتِ میر، حدیقۃ الاقالیم ص ۱۴۳

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے ؛ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں ؛ دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

دلّی تھی طلسمات کی ہر جاگہ میسّر ؛ ان آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا نہیں دیکھا

[3] وقائع آنند رام مخلص (قلمی)، حصہ دوم ص ۱۷ (الف)، تا ۱۸ (الف)، نیز ملاحظہ ہو اقتباس بدائع وقائع (راورنشل کالج میگزین ماہ نومبر ۱۹۴۱ء)، ص ۸۰

اب شہر ہر طرف سے میدان ہوگیا ہے ؛ پھیلا تھا اس طرح کا کاہیکو یاں خرابا: کلیاتِ میر ص ۲۶

مختصر یہ کہ دلی تباہ و برباد ہوگئی، بقول خواجہ برہان الدین عاصمی: ؎

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمّل تھا — ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں — بتاتا باغباں رو رو کے یہاں غنچہ تھا واں گل تھا

نادر شاہ نے اپنے لڑکے نصر اللہ کی شادی شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے رچائی۔ تاوان اور دیگر طریقوں سے نادر شاہ کے قبضے میں بے حساب دولت پہونچ گئی، چونکہ ایک طرح سے محمد شاہ کو اپنی گئی ہوئی سلطنت پھر سے ملی تھی اس لئے اس نے بطور پیش کش دریائے اٹک کے اُس طرف کے تمام علاقے مثلاً کابل

---

۱۲ نکات الشعراء میر (مرتبہ مولوی عبدالحق) صفحہ ۱۱۹۔ نادر شاہ کے حملے اور دہلی کی تباہی و بربادی کے متعلق تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ مراۃ آفتاب نما (قلمی)، صفحہ ۱۰۵ (الف) نادر نامہ (قلمی)، صفحہ ۲۲۱ (الف)، تا صفحہ ۲۲۳ (ب)۔

وقائع آنندرام مخلص (قلمی)، حصہ دوم صفحہ ۱۷ (الف)، تاریخ چغتائی (قلمی)، صفحہ ۱۱۶۔ مجمع النفائس (قلمی)، صفحہ ۱۰۳، تاریخ مبارک نامہ (قلمی)، صفحہ ۱۴۶ (الف)، ۱۴۷ (ب) سیر المتاخرین اُردو ترجمہ، ج ۲، ص ۱۰۹۔۱۱۰۔ دیوان مرزا جعفر علی حسرت (قلمی)، ص ۱۳۲ (ب)، تا ۱۳۵ (ب)۔ مجمع الاخبار (قلمی)، صفحہ ۴۵۲ (الف)، عماد السعادت (قلمی)، صفحہ ۳۷ (ب)، دیوان مصحفی (مرتبہ حسرت موہانی)، صفحہ ۶۶، اخبار محبت (قلمی)، ۴۸ تا ۴۹، بیان وقائع نادر شاہ (قلمی)، صفحہ ۱۶ (الف)، ۱۶ (ب)۔ جہاں کشائے نادری (مطبوعہ ۱۲۹۲ھ)، صفحہ ۲۲۱۔ حدیقۃ الاقالیم صفحہ ۱۲۲، شہر آشوب سودا۔ حاتم۔ تاریخ محمد شاہی (قلمی)، صفحہ ۱۲۹ (ب)، ۱۳۰ (الف)، نیز ۱۴۸ (الف)، تاریخ مظفری (قلمی)، صفحہ ۲۳ (ب)، لیٹر مغلس (انگریزی)، ج ۲، ۳۴۴، ۳۷۰، عیار الشعراء (قلمی)، صفحہ ۳۱۶۔ فہرست خاندان مغلیہ (قلمی)، صفحہ ۱۰۷ (ب)۔

اور دیگر چار محال، ٹھٹھہ اور ملتان کا نصف صوبہ نادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا جو اُس نے بڑی خوشی سے قبول کر لئے۔ [۱]

نادر شاہ کے حملے کے نتائج | نادر شاہ کا حملہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے پہلی بار ہندوستان سے بے حساب دولت، مغل بادشاہوں کی سات پشتوں کے جمع کئے ہوئے خزانے کسی بیرونی ملک کی طرف منتقل ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کو اقتصادی طور پر بدحال کر دیا تھا۔ شیوا داس لکھنوی کے اندازے کے مطابق سب زر و نقد، ساز و یراق، گھوڑے ہاتھی، سونے چاندی کے ظروف اور جواہرات وغیرہ جو نادر شاہ اپنے ساتھ لے گیا، ایک ارب اسی (۸۰) کروڑ روپے کی مالیت کے تھے اُن میں صرف تخت طاؤس جو بقول آنند رام مخلص "آبروئے ہندوستان" [۲] تھا، سات کروڑ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ [۳] اس حملے کے بعد بقول شاکر خان "ہمہ مداخل کمی فاحش پذیرفت و مخارج بحال ہیچ رونق در سلطنت نماند" [۴]

سیاسی اعتبار سے یہ حملہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت خطرناک اور

---

[۱] جہاں کشائے نادری، ص ۲۴۳ تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۱۰۴ تاریخ مبارک نامہ (قلمی) ص ۱۵۵ (ب)، تاریخ مظفری (قلمی)، ج ۱ ص ۲۳۹ (الف)، مجمع الاخبار (قلمی)، ص ۳۵۴ (الف) نادر شاہ۔ فریزر ص ۲۲۲/۲۲۴ [۲] مراۃ الاصطلاح۔ (قلمی) ص ۶۰ (الف)، [۳] تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی مملوکہ جناب حسن عسکری صاحب۔ پٹنہ) ص ۲۶۷۔ نیز ملاحظہ ہو نادر شاہ (فریزر)، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ تذکرہ مشاہیر عالم۔ تاریخ مبارک نامہ (قلمی)، ص ۱۵۲ (الف)، ص ۱۵۲ (ب)، جہاں کشائے نادری ص ۲۴۳، چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۳۵۰ [۴] تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۱۰۴

اور نقصان رساں ثابت ہوا۔ اُس نے مغلیہ بادشاہوں کے ظاہری وقار کو بڑا دھکا پہونچایا اور اُن کی کمزوری کو ظاہر کر دیا۔ اُس کی وجہ سے ملک کی باغی سیاسی طاقتوں کو اُبھرنے کا سنہری موقع ملا۔ مرہٹہ، جاٹ، سکھ وغیرہ کی نظریں دہلی پر جمی ہوئی تھیں۔

مرہٹوں نے بنگال و بہار میں لوٹ مار و غارت گری شروع کر دی، پنجاب میں سکھوں نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ تاخت و تاراج کی وجہ سے تجارت کے راستے مسدود ہو گئے، زراعت تباہ و برباد ہو گئی۔ اس حملے کے دس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر مسلسل نو حملے کئے اور ملک کو خوب لوٹا گھسوٹا اور برباد کیا۔

جارج ہنری گروز کا بیان بہت اہم ہے کہ جنوبی ہند اور مرکز سے دور کے صوبوں میں اس حملے کے اُن سیاسی نتائج کو محسوس نہیں کیا گیا جو چند برسوں کے بعد ظہور پذیر ہوئے، اِس حملے نے مغلیہ سلطنت کے اقتصادی نظام کے علاوہ سیاسی اقتدار و صولت کو بہت بڑا دھکا پہونچایا تھا۔ حالانکہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے ہی مغلیہ سلطنت کا اقتدار و وقار زوال کی طرف مائل تھا، لیکن اس خطرناک و تباہ کن حملے نے زوال کی اُس رفتار کو تیز تر کر دیا، اور مغلوں کے رہے سہے اقتدار کو یک قلم ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ داروں نے اپنے طرزِ عمل میں آزادانہ رویّہ اختیار کر لیا۔ بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف اپنے اپنے صوبوں پر قابض رہنے لگے اور اس کی مرضی خلاف اپنے علاقوں میں جاگیرداروں کا تقرر کرنے لگے، علاوہ ازیں یہ صوبہ دار

اپنے جانشین خود مقرر کرنے لگے، یہ طرزِ عمل و طریقۂ کار ایسا تھا کہ اس سے بادشاہ اور صوبہ دار دونوں کا عوام کی نظر میں وقار گر گیا[۱]

میر محمد تقی میرؔ اسی زمانے میں آگرہ سے دہلی آ گئے تھے اور یہاں خواجہ باسط کے توسط سے اُن کی رسائی امیرالامرا صمصام الدولہ[۲] کے دربار میں ہوئی، نواب نے حقوقِ سابق پر نظر کر کے ایک روپیہ روز اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ لیکن نادرشاہ کے حملے کی خبر سُن کر محمد شاہ کی طرف سے جو لشکر مقابلہ کرنے کے لئے کرنال تک گیا، اُس میں صمصام الدولہ بھی تھے جو وہیں نادرشاہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے[۳] اور میرؔ کا یہ روزینہ بھی بند ہو گیا۔ میرؔ نے حملۂ نادرشاہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اس کے شاہدِ عینی نہ تھے۔

(ب) احمد شاہ ابدالی | احمد شاہ ابدالی نے نادرشاہ کے حملہ کے آٹھ سال بعد ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر نو حملے[۴] کئے۔ یہ حملے اپنے ہولناک نتائج اور مظالم کے اعتبار سے کسی طرح بھی نادرشاہ کے حملے سے کم نہ تھے۔ عام طریقہ سے بدامنی اور بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ ابدالی سپاہ کے ہاتھوں شرفاء کی بہو بیٹیوں کی عزّت و عصمت بھی خطرے میں رہتی تھی۔ قدرت اللہ قاسم کا بیان

---

[۱] سفرنامہ (مقدمہ)، ج ۲، ص۸، نیز ص۲۷۵ تا ۲۷۷۔ [۲] برائے تفصیل ملاحظہ ہو: مآثرالامرا (فارسی) ج ۱، ص۸۱۹ تا ص۸۲۳

[۳] مآثرالامرا، ج ۳، ص۸۸۔ تاریخ محمدی ص۱۰۶۔ سیرالمتاخرین (اردو ترجمہ)، ج ۲ ص۱۰۸۔ میر کی آپ بیتی ص۹۱۔ [۴] ہندوستانی مورخین نے صرف سات حملوں کا ذکر کیا ہے۔

ہے کہ خوب چند ذکا کے گھر کی مستورات نے ابدالیوں کے مظالم سے بچنے کے لئے "رسم جوہر" ادا کی تھی[۱] سیکڑوں صاحب غیرت دہلی سے ترکِ وطن کر گئے اور یہاں سے نکل کر لکھنؤ، مرشد آباد، شاہجہاں پور، ٹانڈہ یا حیدر آباد کا رُخ کرتے تھے۔ میرؔ نے دہلی کی تباہی و بربادی کا حال بہت تفصیل سے اور دل دوز پیرائے میں لکھا ہے، خود اُن کا مکان بھی اس غارت گری میں منہدم ہوا تھا، اور انہیں بھی در در کی خاک چھاننی پڑی تھی۔

میرؔ اُن تمام حملوں کے زمانہ میں دلّی میں موجود تھے، اُن کے بیانات کی روشنی میں ان حملوں کا حال مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا حملہ ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء یہ حملہ پنجاب پر ہوا۔ احمد شاہ ابدالی ہندوستان کی بدنظمی اور نظم و نسق کے انحطاط اور زوال پذیری سے ہمت افزا ہو کر ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، یہ محمد شاہی دور تھا، اُس زمانے میں شاہ نواز خاں پسر زکریا خاں[۲]، لاہور کا ناظم تھا، شاہ نواز خاں ابدالی سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ابدالی شہر میں داخل ہوا اور اس کی سپاہ نے تباہی و بربادی کا

---

[۱] مجموعہ نغز، ج ۱، ص ۲۶۰، نیز ملاحظہ ہو۔ ج ۲، ص ۲۰۰، ۱۴

[۲] زکریا خاں کے دو لڑکے تھے، بڑا لڑکا میر یحییٰ خان درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا اور چھوٹا لڑکا جس کا اصلی نام مرزا پہلوی حیات اللہ خان تھا، نادر شاہ کی طرف سے شاہ نواز خاں کے خطاب سے سرفراز ہو کر ملتان کا ناظم مقرر ہوا تھا۔ معین الملک میر منو بن اعتماد الدولہ قمر الدین خان سے جنگ کرتے وقت کام آیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ماثر الامراء (فارسی) ج ۲ ص ۱۰، خزانۂ عامرہ، ص ۹۷ [۳] سیف الدولہ عبدالصمد خان

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

دروازہ کھول دیا۔ وہاں کے باشندوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے، ان کی عزت و ناموس خاک میں ملادی، بے حساب مال غنیمت ابدالیوں کے ہاتھ لگا۔ ناظم اور اس کے خاندان سے تحصیل کردہ مال و متاع و زر خلاصی کے علاوہ وہ تمام سامانِ حرب، جس میں بندوقیں۔ رہکلے، اور منجنیق شامل تھے، اُن کے قبضے میں آیا جو گذشتہ پچیس برسوں سے جمع تھا۔ اس مال و اسباب کی بار برداری کے لئے ابدالیوں نے شہر اور گرد و نواح کے تمام گھوڑے اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ [1]

جب محمد شاہ بادشاہ کو اس امر کی خبر پہونچی تو اس نے اپنے لڑکے احمد شاہ، کو مع وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں، صفدر جنگ اور ایشر سنگھ پسر راجا جے سنگھ سوائی والیٔ جے پور، ابدالی سے مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا، ابدالی نے سرہند پر قابض ہو کر اُس شہر کو خوب لوٹا کھسوٹا اور اور وہاں کے بے گناہ لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ [2] سرہند کے قریب طرفین کی افواج صف بستہ ہوئیں۔ جنگ شروع ہوئی، وزیر قمر الدین خاں ایک گولہ کی زد میں آکر شہید ہوا۔ اس حادثہ کی وجہ سے ایشر سنگھ نے جیسے سرداروں کی

(بقیہ صفحہ ۳۱) (برائے حالات ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی)، ج ۲ ص ۵۱۴۔ ۵۱۷)، کا لڑکا تھا اور اپنے والد کی زندگی ہی میں لاہور کا گورنر ہو گیا تھا۔ اس کا نظم و نسق احسن سلوک اور عدل گستری زبان زد خاص و عام تھی۔ والد کے انتقال کے بعد ملتان بھی اس کے علاقے میں شامل کر دیا گیا تھا۔ نادر شاہ سے تاب مقاومت نہ لا کر اُس نے نادر کو اپنا حاکم مان لیا تھا۔ ۱۱۵۸ھ میں انتقال ہوا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مآثر الامرا، (فارسی)، ج ۲ ص ۱۰۲ تا ۱۰۶

[1] خزانۂ عامرہ ص ۹۷، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۲ ص ۱۵ تا ۱۸۔ [2] خزانۂ عامرہ ص ۹۷۔ ۹۸۔

ہمت ٹوٹ گئی لیکن معین[1] الملک (پسر قمرالدین خان) اور صفدر[2] جنگ، شہزادہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر افغانوں سے بھڑ گئے اور انہوں نے جان کی بازی لگا دی اور ابدالیوں کو مار بھگایا۔[3]

سید محمد علی الحسینی نے میدانِ جنگ کا منظر ان اشعار میں پیش کیا ہے:

دراں دشت پر محنت و ہولناک ۔۔۔ بر آمیخت خونِ دو لشکر بہ خاک
تو گوئی دراں وادیِ سہمناک ۔۔۔ ز تیر یلاں، سر برآورد خاک
دم تیغ چوں شعلہ آتش فشاں ۔۔۔ سنان ہا ز زخم یلان خوں چکاں

---

[1] اصلی نام میر منو تھا۔ احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کے وقت اس نے جان کی بازی لگا دی۔ فتح کے بعد "رستم ہند" کا خطاب پایا اور ملتان اور لاہور کی صوبیداری ملی۔ ۱۱۶۷ھ میں جب احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا تو معین الملک نے پہلے تو اس کا مقابلہ کیا اور بعد میں صلح کر کے اس کے نائب کی حیثیت سے صوبیداری کے عہدہ پر بدستور سابق قائم رہا۔ بدہضمی کی وجہ سے فوت ہوا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مآثر الامراء (فارسی) ج ۱، صفحہ ۳۴۶۔ [2] میرزا مقیم نام، اور برہان الملک سعادت خاں (ملاحظہ ہو، مآثر الامراء (فارسی)، ج ۲ صفحہ ۴۶۳۔ ۴۶۶) کا بھانجا اور داماد تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں صفدر جنگ خطاب ملا اور صوبۂ اودھ کی نظامت تفویض ہوئی۔ برائے تفصیل، مآثر الامراء (فارسی) ج ۲ صفحہ ۳۶۵۔ ۳۶۹۔

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ (قلمی آنند رام مخلص)، صفحہ ۱۴۱۔ ۱۹۰۔ ملخص التواریخ صفحہ ۳۶۰۔ ۳۶۲۔ اقبال نامہ (قلمی بشیو پرشاد لکھنوی)، ص ۳۳۵۔ جام جہاں نما (قلمی)، ص ۴۹۰۔ ۴۹۸۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۳۲۶۔ خزانۂ عامرہ صفحہ ۹۸۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ)۔ ج ۲ صفحہ ۱۰۔ مآثر الامراء (فارسی) ج ۲ صفحہ ۹۴۔ وقائع بعد اورنگ زیب (قلمی)، صفحہ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔

نہادند بر خشم وکیں او بہم | دلیرانِ جنگ آزمابیش وکم
زبس کشتہا پشتہا شد پدید | دگر آن چناں روز گیتی نہ دید

سواراں ز بہر سو گریزاں شدند | سلاح از تنِ خویش ریزاں شدند
بزرگانِ لشکر سرانِ سپاہ | بہ خواری فتادند از عز و جاہ[1]

میر اِس جنگ کے موقع پر رعایت خان کی خدمت میں تھے۔ ابدالی فوج جب بُری طرح ہار کر بھاگ گئی تو معین الملک لاہور کا ناظم مقرر ہوا ر میسّر صفدر جنگ کے ساتھ دہلی واپس چلے آئے۔[2]

محمد شاہ کا انتقال اور احمد شاہ کی تخت نشینی | واپسی کے وقت جب مغلیہ سردار پانی پت کے قریب پہونچے تو انہیں محمد شاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ فوج شاہی میں اس خبر سے تہلکہ مچ گیا۔ صفدر جنگ نے احمد شاہ کو تختِ شاہی پر بٹھادیا۔[3] احمد شاہ بڑے کرّ وفر سے شہر دہلی میں داخل ہوا اور اس موقع پر جاوید[4] خان کو، جو مرحوم بادشاہ (محمد شاہ) کا خواجہ سرا تھا، نواب بہادر کا خطاب ملا۔ اور اختیاراتِ سلطنت اُس کے سپرد ہوئے[5]

---

[1] تاریخ راحت افزا، ص ۱۵۷، ۱۵۹ [2] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۰ [3] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۰ ۔ ۱۰۱۔ تاریخ راحت افزا، ص ۱۵۹ ۔ ۱۶۰ ۔ اقبال نامہ (قلمی) شیو پرشاد لکھنوی، ص ۳۵ ۳۶ ملخص التواریخ ص ۲۶۰ ۔ ۲۶۲، مفتاح التواریخ ص ۳۲۶ ۔ ۳۲۷

[4] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مآثر الامراء (فارسی) ج ۱ ص ۳۶۷، ۳۶۸ مفتاح التواریخ ص ۳۳۳

[5] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۱

صفدر جنگ کی وزارت نظام الملک آصف جاہ[1] کے فوت ہونے کے بعد عہدۂ وزارت صفدر جنگ کو ملا، اور سعادت خاں ذوالفقار جنگ، بخشی گری کے منصب پر فائز کیا گیا۔ صفدر جنگ کی وزارت کے زمانے میں اندرونی خلفشار تیزی سے بڑھنے لگا۔ نئے بخشی نے راجہ بخت سنگھ کو جو بڑا تجربہ کار اور نام برآوردہ زمین دار تھا اور اُس کا بڑا بھائی ابھے سنگھ ریاست جودھ پور پر متمکن تھا، صوبہ اجمیر کی نیابت دے کر بھائی کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیج دیا۔ راجہ نے رعایت خاں کو فوج کا سردار بنایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ اس موقع پر میر بھی رعایت خاں کے ہمراہ اجمیر گئے اور درگاہ مبارک کی زیارت سے سعادت اندوز ہوئے، اور اجمیر کے نواح کی سیر کر کے واپس چلے آئے[2]

صفدر جنگ، بنگش اور روہیلہ خاندانوں سے پرانی عداوت رکھتا تھا اور وہ دونوں خاندانوں کو ملیا میٹ کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا۔ آخر اس نے یہ ترکیب کی کہ محمد خاں[3] بنگش کے انتقال کے بعد، اس کے جانشین قائم خاں بنگش کے نام اس نے روہیلکھنڈ کی صوبہ داری کا فرمان بادشاہ سے لکھوا کر بھیج دیا، اور یہ لکھ دیا کہ اس علاقہ پر تم قبضہ کر لو۔ ادھر روہیلہ سرداروں

---

[1] مفتاح التواریخ ص ۳۲۹-۳۳۲، مآثرالامراء (فارسی) ج ۳ ص ۸۳۷، ۸۳۸، خزانۂ عامرہ ص ۴۵، ۴۸، گلِ عجائب ص ۱۲، ۲۲، [2] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲، ۱۰۳، بہادر شاہ کے عہد تک وہ مئیں پوری کے راجا کے ہاں ایک سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی اور راجہ نے اس کا ایک روپیہ اور بعد میں پانچ روپیہ یومیہ مقرر کر دیا تھا۔ فرخ سیر کے زمانے میں اُس نے کارِ نمایاں انجام دئے اور شاہی ملازمت حاصل کر لی

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

کو لکھ بھیجا کہ وہ قائم خاں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں. قائم خاں نے وزیر کی پشت پناہی کے زعم میں آکر روہیلہ افغانوں پر حملہ کر دیا اور میدانِ جنگ میں کام آیا [1]

بعد ازیں صفدر جنگ نے قائم خاں کی املاک کی ضبطی کی غرض سے فرخ آباد کے لئے کوچ کیا. میر بھی اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ اس نواح کی سیر کو گئے. قائم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں اور وزیر کے درمیان بھاری جنگ ہوئی اور وزیر کو منہ کی کھانی پڑی. اسحاق خاں بھی قتل ہوئے. میر اس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اٹھا کر شہر دہلی واپس آئے. [2]

(بقیہ صفحہ ۳۵) اور مالوہ کی صوبیداری ملی، اس کے پاس پچاس ہزار فوج تھی. اُس نے فرخ آباد کے ارد گرد کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا. نادر شاہ سے جنگ کے موقع پر وہ میدانِ جنگ میں محمد شاہ کے ساتھ گیا تھا. نادر شاہ سے جنگ کے موقع پر وہ میدان جنگ میں محمد شاہ کے ساتھ گیا تھا. ۱۱۵۶ھ میں فوت ہوا۔ تفصیل ملاحظہ ہو. مفتاح التواریخ ص ۳۴۹ اقبال نامہ (قلمی) ص ۱۶۲ - ۱۶۹. مآثر الامراء (فارسی)، ج ۲، ص ۱۷۷.

جام جہاں نما (قلمی)، ص ۳۹۲ - ۳۹۷ تاریخ راحت افزا ص ۱۲۰ - ۱۲۱، رسالہ محمد شاہ و خان دوران "نواب محمد خاں بنگش در وقتِ جنگ نادر شاہ در میدان ....

و چند اوں لشکر قضا و قدر (محمد شاہ بادشاہ) بوجود فائض الوجود مورد عنایات بادشاہی مہبط السلطنت تا منتہای نواب محمد خاں بنگش ترتیب یافت ص ۱۰۲ (الف)

[1] مآثر الامراء (فارسی)، ج ۳، ص ۷۷۴ - ۷۷۷، مفتاح التواریخ ص ۳۵۰، حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۷۴ - ۷۶ میر کی آپ بیتی، ص ۱۰۲. وقائع از وفات عالمگیر (قلمی)، ص ۱۵۱ (الف) ۱۵۲ (ب)، جام جہاں نما (قلمی)، ص ۳۹۹ - ۴۰۰. [2] میر کی آپ بیتی، ص ۱۰۲ - ۱۰۵. وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی)، ص ۱۵۲ (الف)، تا ۱۵۲ (الف).

لبعد ازیں ۱۷۵۱ء میں صفدر جنگ نے مرہٹہ سرداروں۔ ملہار راؤ ہلکر اور آپا سیندھیا۔ کو کثیر رقم کا لالچ دے کر اپنے ساتھ کر لیا اور دو لاکھ فوج لے کر دوبارہ فرخ آباد پر حملہ کیا۔ اس بار احمد خاں بنگش کو شکست ہوئی لیکن اس شرط پر صلح ہو گئی کہ احمد خاں، صفدر جنگ کو پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوانِ جنگ اور پانچ لاکھ سالانہ شاہی خراج ادا کرے گا۔[۱]

نواب بہادر کا بادشاہ پر اتنا اثر تھا کہ اس نے ذوالفقار جنگ کو میر بخشی کے عہدہ سے معزول کرا دیا۔ امیر الامرائی کا منصب غازی الدین خاں فیروز جنگ پسر نظام الملک آصف جاہ کو عنایت ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد بخشی گری کی خدمت اُس کے لڑکے عماد الملک کو تفویض ہوئی۔[۲] ان حالات سے تنگ آ کر ان دنوں میر نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور پڑھنے میں لگ گئے۔[۳]

صفدر جنگ نے دھوکے سے نواب جاوید خاں بہادر کو مروا ڈالا۔[۴]

دوسرا حملہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۰ء | احمد شاہ ابدالی نے دوسری مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا۔

۱۔ میر کی آپ بیتی، ص۱۰۱، حیات حافظ رحمت خان، ص ۲۰۱-۲۰۵، مآثر الامراء (فارسی)، ج ۲، ص ۷۷۲، وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی)، صفحہ ۱۵۲ (الف)، جامِ جہاں نما (قلمی)، ص ۵۰۰-۵۰۱۔ تاریخ راحت افزا، ص ۱۶۹-۱۷۰۔ ملخص التواریخ، ص ۲۷۱-۲۷۲

۲۔ میر کی آپ بیتی، ص ۱۰۵۔ ۳۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔ ۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔ جامِ جہاں نما (قلمی)، ص ۵۰۱-۵۰۲۔ تاریخ راحت افزا، ص ۲۷۳۔ وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی)، ص ۱۵۷ ب تا ۱۷۰ الف۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۳۳، مآثر الامراء (فارسی)، ج ۱، ص ۳۶۲-۳۶۷۔ ملخص التواریخ، ص ۳۸۸۔

احمد شاہ بادشاہ کے ایماء پر وزیر صفدر جنگ نے ابدالی سے مقابلہ کرنے کی غرض سے مرہٹوں کی امداد حاصل کی لیکن اس سے کوئی بارآور نتیجہ نہ نکلا۔ لاہور کے ناظم معین الملک نے ابدالی سے صلح کر لی۔ احمد شاہ ابدالی نے نادر شاہ کی طرح، سیالکوٹ، گجرات، اورنگ آباد اور پرسرور کے چاروں محال، جن کی سالانہ آمدنی ۱۴ لاکھ روپے تھی، اپنے قبضے میں کر لئے، صلح نامہ کی رو سے ان محالوں کی سالانہ آمدنی ابدالی کو بطور پیش کش ادا ہونا طے پایا۔ علاوہ ازیں معین الملک نے سندھ کے مغربی علاقے ابدالی کے حوالے کر دیئے[1] بقول مصنف تاریخ احمد بادشاہ مرکزی حکومت کی ہدایت کے مطابق معین الملک نے یہ علاقے احمد شاہ ابدالی کے سپرد کئے تھے[2]

تیسرا حملہ[3] ۱۷۵۱ء / ۱۱۶۵ھ پچھلے صلحنامہ کی رُو سے سالانہ پیش کش کا روپیہ ادا نہیں کیا گیا تھا۔ ابدالی نے اس وجہ سے ۱۷۵۱ء میں پھر حملہ کر دیا۔ جب معین الملک کو ابدالی حملے کی خبر ملی تو اُس نے اس بلا کو ٹالنے کی غرض سے فوراً ابدالی کی خدمت میں نو (۹) لاکھ روپے بھیج دیئے، لیکن چونکہ مطالبہ چودہ (۱۴) لاکھ کا تھا، بنا بریں احمد شاہ ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی، معین الملک نے شہر سے نکل کر ابدالی کا مقابلہ کیا اور شکست کھا کر ابدالی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے درمیان از سر نو ایک سمجھوتہ ہوا معین الملک نے جان بخشی کے عوض دس لاکھ روپیہ دینا منظور کیا مزید براں اس

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۹۸۔ ملخص التواریخ ص ۱۳۰-۱۳۷، [2] تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص ۶ ب، الف۔
[2] ایلیٹ و ڈاؤسن (انگریزی) ج ۸ ص ۱۱۴-۱۱۵ [3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ احمد شاہ درانی (انگریزی) ص ۱۰۱-۱۲۷، مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج ۱ ص ۲۷-۲۸۔

علاقے کے بدلے میں دس لاکھ روپے کی ادائیگی طے ہوئی جو اُس کے حوالے کیا گیا تھا، اس کے علاوہ ہندوستان سے واپس چلے جانے کے صلے میں دس لاکھ روپیہ اور دیا گیا۔ شاہ ابدالی نے ملتان اور لاہور کے صوبے اپنے علاقے میں شامل کر لئے۔[1]

چوتھا حملہ ۱۷۵۲ء / ۱۱۶۵ھ | احمد شاہ ابدالی نے کشمیر کے حاکم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لے، حاکمِ کشمیر نے جب اس مطالبے کو رد کر دیا تو ابدالی نے ۱۷۵۲ء میں چوتھی مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ رنجیت دیو (۱۷۳۵ء۔۱۷۸۱ء) راجا جموں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر میں نتیجہ شکست ہی میں نکلا، اور کشمیر شاہ ابدالی کے قبضے میں چلا گیا۔[2]

احمد شاہ بادشاہ اور صفدر جنگ وزیر | نواب بہادر کے قتل کے بعد سے بادشاہ اور وزیر کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اور وزیر کے دل میں بادشاہ کی طرف بدظنی پیدا ہو گئی تھی۔ وزیر نے بادشاہ سے بغاوت کر دی۔ ہر چند صلح کی کوشش کی گئی لیکن اُس نے امارت کے گھمنڈ میں اپنا سر نیچا نہ کیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اُسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ صفدر جنگ شہر سے نکل کر اپنے خداوندِ نعمت (احمد شاہ) سے جنگ کرنے پر تُل گیا۔ ادھر عماد الملک (جو نظام الملک آصف جاہ کا پوتا تھا)

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۹۸۔۹۹۔ ملخص التواریخ، ص ۳۸۵۔۳۸۸۔ مآثر الامراء (فارسی) ج ۲، ص ۷۱۹

[2] احمد شاہ درانی (انگریزی) ص ۱۰۱،۱۰۲، ISLAMIC CULTURE Vol. ... No. ... pp 498-500

[3] انتظام الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیر (متوفی ۱۷۴۸ء) کا بڑا لڑکا تھا۔ مارچ ۱۷۵۳ء میں وزیر ہوا اور مئی ۱۷۵۴ء تک اس عہدے پر متمکن رہا۔ ۱۷۵۶ء میں اپنے عزیزوں کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ مآثر الامراء (فارسی) ج ۱، ص ۳۶۶

اور بخشی گری پر مامور تھا۔ نیز اس کے ماموں اور انتظام الدولہ اور شاہی فوج کے دوسرے سرداروں نے شہر کی حفاظت کی۔ پُرانا شہر تو سب تاراج ہوگیا۔ چھ مہینے تک جنگ جاری رہی۔ لیکن شاہی فوج نے ایسی جی توڑ کوشش کی کہ میدان مار لیا اور باغی وزیر کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مجبور ہوکر اس نے صلح کا پیغام بھیجا۔ بادشاہ نے اُس کی شکست کو غنیمت جان کر اُسے اُس کے صوبے (اودھ) کی گورنری مرحمت کردی اور وزیر انتظام الدولہ ہوا۔[1]

احمد شاہ بادشاہ کا قتل اور عالمگیر ثانی کی تخت نشینی | انتظام الدولہ کے قتل کے بعد قلم دانِ وزارت عماد الملک کے سپرد ہوا۔ اُس نے بادشاہ کو تختِ شاہی سے معزول کردیا اور قید کرکے احمد شاہ بادشاہ اور اس کی ماں کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں۔[2] میر نے اپنے ایک شعر میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں[3]

بعد ازیں عزیز الدین بن معز الدین جہاں دار شاہ بن بہادر شاہ بن اورنگ زیب کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا۔[4]

میر | نواب بہادر جاوید خان کے قتل ہونے کے بعد میر بے روزگار ہوگئے۔[5] مہانرائن نے (جو وزیر کے دیوان تھے) اپنے داروغہ دیوان خانہ میر نجم الدین علی سلام

[1] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۶، ۱۰۷۔ ملخص التواریخ ص ۳۸۹، ۳۹۲، تاریخ راحت افزا۔ ص ۲۷۲ [2] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۹ جام جہاں نما (قلمی)، ص ۵۰۲ ملخص التواریخ۔ ص ۲۹۵ تاریخ راحت افزا۔ ص ۲۹۲۔ تاریخ احمد شاہ [3] کلیات میر (نول کشور)، ص ۸۲ [5] جام جہاں نما (قلمی)، ص ۵۰۲ ملخص التواریخ ص ۲۹۵ تاریخ راحت افزا۔ ص ۲۹۲، ۲۹۳

کے ہاتھ جو میر شریف الدین پیام[۱] کے لڑکے تھے، کچھ نقدی بھیجی اور بڑے اشتیاق سے میر کو اپنے ہاں بلایا۔ میر نے اس ملازمت کو قبول کر لیا اور اس طرح کچھ دن فراغت سے بسر کئے۔[۲]

انہیں دنوں میں زمانے کی ناسازگاری سے تنگ آکر میر نے اپنے ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو)[۳] کی ہمسایگی ترک کر دی کیونکہ آرزو میر کو ہلکی نظر سے دیکھتے تھے اور بُرا برتاؤ کرتے تھے۔ اور امیر خان کی حویلی میں سکونت اختیار کی۔[۴]

جس زمانے میں عماد الملک نے سورج مل جاٹ پر یورش کی تھی۔ اور

---

[۱] اکبر آباد کے باشندے، فارسی کے شعراء میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے ۱۱۶۲ھ میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو، نکات الشعراء ص ۶۶ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۶۶، مخزن نکات ص ۲۲-۲۳، ریاض الفصحاء، ص ۵۲، سفینۂ ہندی، ص ۲۷۔ [۲] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۶۔

[۳] سراج الدین خاں آرزو، حسام الدین حسام کے بیٹے تھے، اُن کا سلسلۂ نسب شیخ کمال الدین خواہرزادۂ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (خلیفہ شیخ نظام الدین اولیاء) تک پہونچتا ہے، اور ننھال کا سلسلہ شیخ محمد غوث گوالیاری پر منتہی ہوتا ہے۔ آرزو ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا، اُن کی نعش دہلی لا کر دفن کی گئی۔ ملاحظہ ہو، نکات الشعراء ص ۳۔ خزانۂ عامرہ، ص ۱۱۶ تا ۱۱۹، قاموس المشاہیر، ج ۱ ص ۲۸۵، سفینۂ ہندی، ص ۵۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۶ اور نٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۳ء جلد ۲۰ عدد ۱، ص ۳ تا ۲۵۔ میر کی آپ بیتی، ص ۱۰۹-۱۱۰۔ [۴] میر کی آپ بیتی، ص ۱۲۷۔

بادشاہ احمد شاہ بھی شہر (دہلی) سے نکلا تھا۔ اور دریائے جمنا سے بیس میل اُدھر سکندر آباد کے قریب ڈیرے ڈال دیئے تھے، لیکن یہ خبر سن کر کہ سرداران دکن اور عمادالملک نے سورج مل سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور وہ شاہی لشکر کو لوٹنے اور برباد کرنے کے لئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر چل پڑے ہیں تو بادشاہ مضطرب و سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سفر وحشت اثر میں میرؔ بھی احمد شاہ بادشاہ کے ہمراہ تھے، واپس آکر میرؔ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ [1]

دو تین مہینے کے بعد راجا جگل کشور، [2] میرؔ کو گھر سے بلا کر لے گئے، اور اپنے اشعار پر اصلاح کی خدمت سپرد کی، مگر راجا کے اشعار ایسے نہ تھے کہ ان کی اصلاح کی جا سکتی۔ لہٰذا میرؔ نے "ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا"۔ [3]

میرؔ نے ابدالی کے چوتھے اور پانچویں حملے میں امتیاز نہیں کیا۔ اُن کا بیان ہے کہ احمد شاہ ابدالی سرہند سے شکست کھا کر واپس چلا تو گیا لیکن ہندوستان فتح کرنے کی ترکیبیں برابر سوچتا رہا۔ بھاری لاؤلشکر کے ساتھ لاہور آیا۔" وہاں کے وضیع و شریف لوگوں نے کون سا ستم تھا جو نہ جھیلا اور کون سی جفا تھی جو نہ سہی۔ کوئی روکنے والا تو تھا نہیں، وہاں سے ابدالی نے دلی کا قصد کیا۔

معین الملک پہلے ہی مغلوب ہو چکا تھا۔ اور کچھ دنوں بعد گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ ابدالی کی آمد آمد سے سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ بادشاہ اور

---

[1] میرؔ کی آپ بیتی، ص ۱۰۹۔ [2] راجا جگل کشور محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ (میرؔ کی آپ بیتی، ص ۱۱۰)

[3] میرؔ کی آپ بیتی، ص ۱۱۰

وزیر سے کچھ بن نہ پڑا، آخر اس کی پذیرائی کے لئے بڑھے اور قید کر لئے گئے۔ . . .
. . تقریباً ایک مہینے تک شہر میں رسد کی تنگی رہی اور بعد ازیں احمد شاہ نے عالمگیر ثانی کو سلطنت سپرد کی، اور وزیر عماد الملک کو ساتھ لے کر آگرہ کا رُخ کیا۔ اس کی فوج نے لُوٹ مار شروع کر دی، متھرا شہر . . . . . (جو) بڑا پُر رونق اور آباد شہر تھا، سب برباد ہو گیا۔ جب ہوا متعفن ہو گئی تو شاہ ابدالی نے طاعون کے خوف سے سورج مل کے معاملے کو ملتوی کر کے دفعتاً کوچ کر دیا، اور محمد شاہ کی بیٹی سے عقد کر کے بالا بالا نکل گیا۔[۱]

عماد الملک آگرے کے نواح میں رہ گیا اور نجیب الدولہ جو صفدر جنگ اور احمد شاہ بادشاہ کی لڑائی میں بادشاہ کا ملازم ہوا تھا، نمایاں ترقی کر کے میر بخشی اور مختارِ سلطنت بن گیا۔[۲]

نجیب الدولہ سے جھڑپ | احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد عماد الملک مرہٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا، نجیب الدولہ شہر بند ہو گیا۔ توپ خانے کی جنگ ہوئی، آخر کار عماد الملک نے نجیب الدولہ سے صلح کر لی اور وہ اپنی جاگیر سہارنپور چلا گیا، وزیر (عماد الملک) اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا، دکنی فوج کو رخصت کر دیا۔ توپ خانے کی داروغگی راجا (ناگر مل) کے لڑکے کو تفویض ہوئی اور احمد خان میر بخشی ہو گیا۔[۳]

اس زمانے میں میر کی حالت | بقول میر "چوں کہ چاقو ہڈی تک پہونچ گیا یعنی فقر و فاقہ

---

[۱] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۱۱ - ۱۱۳ [۲] میر کی آپ بیتی ص ۱۱۳، خزانۂ عامرہ ص ۱۰۰

[۳] میر کی آپ بیتی ص ۱۱۴ - ۱۱۵

کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی، اضطراب بہت بڑھ گیا، ایک دن صبح کی نماز کے بعد اس (راجہ جگل کشور) کے دروازے پر پہونچ گیا، چوبداروں کا میر دہ جے سنگھ نامی، میرے سامنے آیا اور کہنے لگا "یہ دربار کا کون سا وقت ہے؟" میں نے کہا: "اضطراب کا عالم ہے"! بولا "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں، تم شاید یہ نہیں جانتے کہ ــــ ایک ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا، یہاں اپنی ریاست کے آگے تمہاری فکر کسے ہے، صابر و شاکر رہنا چاہئے، ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، یہاں تو تمہاری رسائی مشکل ہے، البتہ اُن کے بڑے لڑکے سے مل سکتے ہیں، میں نہایت شرمندہ ہوا اور واپس آگیا۔" [1]

بعد ازیں خواجہ غالب کے توسل میر راجا کے لڑکے کی خدمت میں پہونچے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا جو میر کو ایک سال تک ملتا رہا، اُس دن سے عشاء کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے میر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور دو گھڑی رات گئے تک رہتے تھے، اس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سکھ سے گذر اوقات ہو رہی تھی۔ [2]

پانچواں حملہ ۱۷۵۷ء اس حملے کی نوعیت پچھلے چار حملوں سے بالکل مختلف تھی، اس مرتبہ احمد شاہ ابدالی خود نہیں آیا تھا بلکہ اپنے مغرور طاقتور وزیر عماد الملک غازی الدین سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے عالمگیر ثانی نے خود ابدالی کو بلایا تھا [3] فرحت الناظرین کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر ثانی

---

[1] میر کی آپ بیتی ص ۱۱۵۔ [2] حوالہ بالا ص ۱۱۶ [3] سیاسی مکتوبات ص ۱۹۵

HISTORY OF THE REIGN OF SHAHALUAM P4.

نے نجیب الدولہ کے توسل سے ابدالی کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ [۱]

خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ عمادالملک نے لاہور کے اُس نظام کو، جو شاہ ابدالی نے قائم کیا تھا، درہم برہم کر دیا تھا اور معین الملک کی بیوی مغلانی بیگم کو معزول کر کے وہاں کی حکومت آدینہ بیگ خان کے سپرد کر دی تھی۔ [۲]

اس بات سے ناراض ہو کر شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ آدینہ بیگ مقابلے کی تاب نہ لا کر وہاں سے فرار ہو کر حصار اور ہانسی کے جنگلوں سے ہوتا ہوا ہانسی کے قلعہ میں چلا آیا۔ شاہ ابدالی اس کے تعاقب میں دہلی تک پہونچ گیا۔ عمادالملک، جو بے سروسامانی کی حالت میں تھا اور مقابلے کی تاب بھی نہ تھی، اپنی عافیت کے لئے شاہ ابدالی کی خدمت میں بذاتِ خود حاضر ہو گیا۔ [۳]

شاہ ابدالی شہر شاہ جہاں آباد میں اور اس کی سپاہ کے ظلم وستم

شاہ ابدالی قلعۂ معلی میں داخل ہوا اور عالمگیر ثانی سے ملاقات کی۔ [۴] سارے ملک کے وکیلوں کو طلب کیا گیا اور انہوں نے شاہ ابدالی کی خدمت میں نذریں پیش کیں۔ جاٹوں کے سردار سورج مل کے علاوہ سب نے ابدالی کی اطاعت قبول کر لی۔ ابدالی نے غازی الدین کو معطل کر کے عالمگیر ثانی کے بڑے بیٹے عالی گہر کو نائب سلطنت

---

[۱] ایلیٹ وڈاوسن (انگریزی)، ج ۸، ص ۱۴۳ [۲] خزانۂ عامرہ ص ۹۸، ۹۹؛ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ)، ج ۳، ص ۴۸ تا ۵۰۔ [۳] خزانۂ عامرہ ص ۹۹؛ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۳ ص ۵۷۔

[۴] ملخص التواریخ، ص ۴۰۲، خزانۂ عامرہ ص ۹۹۔

مقرر کیا[1] اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی عالمگیر ثانی کی بھتیجی سے رچائی۔[2]
اس موقع پر ابدالی سپاہ نے جو مظالم اور جبر و تشدد کئے تھے اُن کی
بڑی دردناک تصویر اُس زمانے لٹریچر میں تفصیل سے ملتی ہے۔ غلام علی آزاد
بلگرامی کا بیان ہے کہ

"دست بتاراج اموال و ناموس متوطان شہر دراز کردہ دقیقہ
از نہیب و غارت مہمل نگذاشت اہلِ غیرت خود را بہ سم و سلاح ہلاک کردند"[3]

اس حملہ میں خود میر کا مکان بھی منہدم ہوا تھا۔ اس تباہی و بربادی کا حال میر
نے بڑے دل دوز پیرائے میں لکھا ہے۔ اُن کا بیان ہے :۔

"بندہ (میر) اپنی عزت بچائے شہر میں بیٹھا رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ
"بادشاہ نے امان دے دی ہے، رعایا کو چاہیئے کہ پریشان نہ ہو" مگر جب
گھڑی بھر رات گذری تو غارت گروں نے ظلم و ستم ڈھانا شروع کئے، شہر کو آگ لگا دی،
گھروں کو جلا دیا، اور سارا ساز و سامان لے گئے، صبح کو (جو گویا) صبحِ قیامت تھی
تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت میں لگ گئے۔
(شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کر لیا۔ بہتوں کو جلا دیا اور سر کاٹ
لئے، ایک عالم پر یہ مظالم توڑے اور تین دن رات تک اس ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔

---

[1] HISTORY OF THE REIGN OF SHAH AULLAM PP. 5, 6.

[2] خزانۂ عامرہ ص ۹۹۔ ملخص التواریخ۔ ص ۲۰۴، تاریخ عالمگیر ثانی ص ۱۰۱ (الف) میر کی
آپ بیتی ص ۱۲۔ [3] خزانۂ عامرہ ص ۹۹۔ نیز ملاحظہ ہو، ملخص التواریخ ص ۲۰۴

کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے کچھ نہ چھوڑا چھتیں توڑ دیں، دیواریں ڈھا دیں (ان مصیبتوں سے کتنوں ہی کے) سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کر دئے، وہ فتنہ گر ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور شرفا کی مٹی پلید ہو رہی تھی، شہر کے عمائد خستہ حال ہو گئے تھے بڑے بڑے امیر ایک گھونٹ پانی کے لئے بھی محتاج بن گئے گوشہ نشین بے گھر اور نواب گداگر بن گئے، شرفا ننگے تھے، گھر والے بکھرے، ہر ایک بلا میں گرفتار اور رسوائے کوچہ و بازار تھا، اکثر لوگ مصیبت میں مبتلا، اور ان کے زن و فرزند اسیر (شہر میں غارت گروں کا) ہجوم تھا اور بے روک ٹوک قتل و غارت ہو رہی تھی، لوگوں کا حال ابتر ہو گیا، بہتوں کی جان لبوں تک آ گئی (یہ غارت گر زخم بھی لگاتے اور گالیاں گفتاریاں بھی دیتے، روپیہ بھی سب چھین لیتے اور مار الگ لگاتے، جو سامنے آ جاتا اُس کے بدن کے کپڑے تک نہ چھوڑتے۔ ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مر گیا، ایک جہان کی عزت و ناموس برباد ہو گئی، نیا شہر جل کر سیاہ ہو گیا، تیسرے دن انتظام سنبھالا، انزلا خان نامی نسقچی آیا تو رہا سہا اُس نے لوٹ لیا۔ بارے منتظمین نے لوٹ جانے والوں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں، اب وہ بے رحم لوگ پرانے شہر کو تاراج کرنے میں لگ گئے۔ وہاں بے شمار انسانوں کو قتل کر دیا، سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ رہا، ایک وقت کھانے اور ستر ڈھکنے کے وسائل بھی کسی کے گھر میں نہ رہے، مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی بھی نہ تھی، چونکہ راستے بند تھے، بہت سے لوگ زخم کھا کھا کر مر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اکڑ گئے (اس فوج نے ہر کی بے حیائی سے لوٹ مچائی اور شہریوں کو بے آبرو کیا، غلہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے

فروخت کرتے۔ ان غارت گروں کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہونچ رہا تھا، مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سنتا ہی نہ تھا، ہزاروں خراب اس ہنگامے سے نکل کر بصد حسرت ترکِ وطن کر گئے، اور جنگل کی طرف منہ اُٹھا کر چل دئے، چونکہ ان جفا کاروں کی بن آئی تھی، لوٹتے کھسوٹتے، ایذائیں دیتے، ستم ڈھاتے، عورتوں کی بے حرمتی کرتے، اپنی تلواریں لئے مال بٹورتے پھرتے، شہریوں سے کچھ نہ ہو سکتا تھا، کیوں کہ ان میں قوت مدافعت نہ تھی، کوئی سراسیمہ و مضطرب تھا، کوئی حسرت و افسوس کرتا تھا، ہر گھر میں ہر گلی کوچے میں، ہر بازار میں غارت گر تھے اور اُن کی دار و گیر، ہر طرف خوں ریزی ہر سمت ظلم و ستم ایذا بھی دیتے اور طمانچے بھی مارتے، غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے اور یہ لٹیرے ملندریاں مارتے پھر رہے تھے، گھر جل گئے۔ محلے ویران ہو گئے، سینکڑوں لوگ ان سختیوں کی تاب نہ لاکر چل بسے، اور کسی کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا، ایک عالم اُن کے ستم سے ہلاک ہو گیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی، پرانے شہر کا علاقہ جسے رونق و شادابی کے باعث "جہاں تازہ" کہتے تھے، کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے، ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہو رہی، یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، خاک سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا جو مظلوم مر گیا گویا آرام پا گیا۔ اور جو اُن کی زد میں آ گیا بچ کے نہ جا سکا، میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا، اب اور زیادہ مفلس ہو گیا۔ افلاس اور تہی دستی سے حال بہت ابتر ہو گیا، سڑک کے کنارے جو مکان تھا وہ بھی ڈھ کر برابر ہو گیا، غرض کہ وہ ظالم سارے شہر کا اسباب لاد کر

لے گئے، اور شہر کے لوگ بڑی ذلت و رسوائی اٹھا کر جان سے گزر گئے۔"[1]

کم و بیش اٹھارہویں صدی کے ہر شاعر نے دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم کیا ہے، اور شہر آشوب کی صورت میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں، اُن میں سماجی اور سیاسی مطالعہ کے نقطۂ نظر سے سوداؔ، حاتمؔ، جعفر علی حسرتؔ، میرؔ اور قائمؔ چاندپوری کے شہر آشوب خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں، ان شعراء کے کلام سے بعض ایسی مثالیں، یہاں پیش کی جاتی ہیں جن سے اُس عہد کا انتشار اور بدامنی سامنے آجاتی ہے۔

سوداؔ:-

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز + تو اُس کو سن کے کریں ہوش جغد کے پرواز
نہیں وہ گھر ہو جس میں شغال کی آواز + کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

کسی کے ہاں نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاغ + ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ، وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ + اور اُن مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھکر ہنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس + کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک و پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اُداس + بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے، کہیں پڑا ہے مرغول[2]

---

[1] میرؔ کی آپ بیتی، ص ۱۲۱، ۱۲۴، نیز ملاحظہ ہو، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص ۱۰۲، کلیات میرؔ
سہ شہر میں گھر خراب ہے اپنا + آتے ہیں یاں اب اس نشاں سے لوگ ص ۸۴۳ نیز وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی) ص ۱۹۲ (دلت)

[2] کلیاتِ سوداؔ (نول کشور) جلد اول ص ۳۷۰

حاتم :-

جہاں سنتے تھے شب روز طنبورا ڈھولک + تہاں اب مرد ہیں مانند زناں نوحہ کناں
کیا زمانہ کی ہوا پھر گئی سبحان اللہ + زندگی ہوئی ہر ایک کی اب دشمن جاں
گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے + کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آوے طوفاں
غرض یہ کہ کوئی کام نہ آیا میرے + آشنا تھا مرا ازبسکہ تمام ہندوستاں[1]

مصحفی :-

دلی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں
اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں پوچھوں
بیرون در چمن کے، یک مشت پر پڑے ہیں

گئے وہ دن جو رہتے تھے جہان آباد میں ہم
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھ[2]

مرزا جعفر علی حسرت :-

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اُسے ویراں + کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالت بستاں

---

[1] دیوان زادہ (قلمی)، علی گڑھ، ص ۱۸۷ - ۱۸۸ ، [2] مصحفی، ص ۶۶
دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفیؔ :- میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا
(ریاض الفصحا مقدمہ ص ب)

نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں + گذر کیا ستم افغاں[1] کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا، یہ کشت سبز سب پامال
وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب جیسیں گل سے + اور اُن کی زلفیں فزوں تر تھیں جعدہ سنبل سے
چمن کے رشک تھے رخسار و خط و کاکل سے + دراز اُس پہ ہو دستِ ستم تطاوُل سے
دریغ مٹ گیا نقشا، رہا نہ وہ خط و خال
سواد اُس کے سے تھی زلفِ مہوشاں نخچیر + بہار اُس کی سے عرفات شرم تھا کشمیر
ہر ایک اُس کے مکاں میں بہشت کی تعمیر + جدھر نظر کرو سوجھے تھا عالم تصویر
نہ سر کی وہاں سے جدھر جا پڑے نگاہ خیال
سو اب نہ نہر نظر آوے ہے نہ اُس میں آب + کنارے جمنا کے ہے سگِ قلعہ اور سیر آب
پڑے ہے اُن کے مزل جہاں تھا عطر و گلاب + کھنڈر میں سنگ کے ٹوٹے ستون اور محراب
جو ترشے سرو کی صورت تھے اور شکلِ ہلال
نہ چھت نہ تختہ، مکانوں میں اور نہ خوبی کہیں + سوائے سنگ اس انگشتری کے گھر میں نہیں
پہچانی جاوے نہ ویرانی سے وہاں کی زمیں + ملک سجدے گھستے تھے جس پہ آکے جبیں
وہاں پھرے ہے شرارت سے لشکرِ دجّال
یہ ہے نہ آئینہ خانے نہ دیکھنے والے + پڑے ہیں آبلے سینوں میں پانوں میں چھالے
نہیں وہ مست، وہ شیشے، وہ جام، وہ پیالے + جو دل تھے شیشہ صفت توڑ چرخ نے ڈالے
پڑی ہیں خاک میں ٹکلیں جو کیجے غربال دکذا[2]

---

[1] افغان سے مراد ابدالی کی افواج ہیں۔

[2] دیوان حسرت (جعفر علی)، قلمی رام پور، ص ۱۳۲ ب - ۱۳۳ (الف)

قائمؔ چاندپوری:۔

شہر داخل ہوا جب ابدالی + دیکھ درّانیوں کے چہرہ رفت
ایک شش و پنج میں تھی خلقِ خدا + کہ کہیں ہو نہ اُون سے بہشت و ہفت
نہ فقیروں کی چھوڑتے تھے کلاہ + نہ امیروں کا جامۂ زر بفت

شاہ از تخت گاہ دہلی رفت[1]

خواری سے جب جہاں کا ٹھہرایا کے رنگ + تھا دس کہاں وصبر کدھر کس کا عار و ننگ
کٹنے کا صبح و شام کے باقی رہا نہ ڈھنگ + ہر صبح غم سے شام کے عالم یہاں ہے تنگ

ہر شام دل میں خلق کے فکرِ پگاہ ہے

مُردوں کے ہر طرف ہیں پڑے سیکڑوں اٹم + سسکے ہے کوئی راہ میں نکلے ہے کسی کا دم
یک ہاتھ سر کے نیچے رکھے ایک سرِ شکم + مانندِ چوب پاؤں میں خشکی سے پیچ و خم

چہرے کا ڈول، فاقے کے اوپر گواہ ہے

کھوٹے، ڈھسے، خراب ہوئے اس قدر مکاں + جُوتی نہ ہو جو سقف، وہ زیرِ فلک کہاں
دیوار کی نمی سے پڑی سوکھتی ہے جاں + تلرو کے ڈر سے چار طرف نالہ و فغاں

ساون کے تس پہ مینھ کی یہ سخت چاہ ہے[2]

میرؔ:۔

جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں + یہاں ہم نے انہیں آنکھوں سے دیکھیں میں بہاریں
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ + یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

---

[1] دیوان قائمؔ چاندپوری (قلمی رام پور) ص ۱۸۱ (الف)

[2] نقوش (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص ۹۹-۱۰۰

سرسری تم جہان سے گزرے + ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا[1]
دلّی میں بہت سخت کی اب کے گزران دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شاں کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے عرصہ تھا تنگ[2]

غارت گری و تباہی کے بعد احمد شاہ ابدالی اپنے ساتھ بے حساب دولت لے گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی فوج کے اسّی ہزار سوار جو سب غارت دلوٹ کا مال لئے جا رہے تھے، پیدل چل رہے تھے، سواریوں پر مال واسباب لدا ہوا تھا۔ جہاں جہاں سے ابدالی گذرا ایک مرلی ٹوٹی بھی اس نے نہیں چھوڑا تھا۔[3] قمرالدین خاں وزیر کے گھر میں تو صاف جھاڑو دے گئے ایک تنکا بھی نہ چھوڑا۔[4]

آخرکار شاہ ابدالی نے سورج مل جاٹ کا تعاقب کیا اور اسی طرح متھرا تک جا پہنچا، اس شہر کو خوب تباہ و برباد کیا۔ جاٹ ابدالی کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے، بعدازیں شاہ ابدالی اکبر آباد کی طرف آیا۔ وہاں کے قلعہ دار نے شاہ کی اطاعت قبول نہ کی اور مقابلہ کرنے کی تیاری

---

[1] کلیاتِ میر (نول کشور) ص۱۲ [2] کلیاتِ میر۔ ص ۴۷۴

[3] احمد شاہ درانی (انگریزی) ص ۱۶۵-۱۶۸ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج ۲۔ ص ص ۹۳ [4] خزانۂ عامرہ۔ ص ۹۹-۱۰۰ ملخص التواریخ۔ ص ۴۰۳-۴۰۴

تاریخ فرح بخش (قلمی) ص ۶۱ (الف)

کی، شاہ ابدالی نے جہاں خان کو جاٹوں کے قلعوں کی تسخیر کے لئے پیچھے چھوڑا اور خود ولایت کے لئے روانہ ہوگیا، کیونکہ اس کی فوج میں طاعون پھیل گیا تھا۔

جب شاہ ابدالی دہلی کے قریب سے گزرا تو عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ نے مقصود آباد کے تالاب کے کنارے اس سے ملاقات کی، اس موقع پر احمد شاہ ابدالی نے محمد شاہ کی لڑکی سے نکاح کیا، اور عماد الملک غازی الدین کو قلمدانِ وزارت سپرد کیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامرائی۔[۱]

عالمگیر ثانی اور انتظام الدولہ کا قتل اور شاہ جہاں ثانی کی تخت نشینی احمد شاہ ابدالی کے پانچویں اور چھٹے حملے کے درمیان میں ہندوستان میں وقوع پذیر واقعات کا میر نے مجملاً ذکر کیا ہے، احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد مرہٹوں نے دکن سے آکر دہلی کے اطراف میں اپنے خیمے لگا دیے، اس واقعہ سے بہتوں کے دل ہل گئے۔ ایک ہلڑ مچ گیا۔ امیروں کی سٹی گم ہوگئی، بادشاہ اور وزیر نے ان سے صلح کرلی، دتا نامی سردار کو جو اس بہادر اور جیالے جوان دھنگو کا مدار المہام تھا، نجیب الدولہ کی طرف بھیج دیا جو گنگا کے کنارے وسطی علاقے میں قدم جمائے بیٹھا تھا، وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی ہے۔[۲]

"اب یہاں سب نے وزیر کے ہاں جمع ہوکر مشورہ کیا کہ اگر یہ بھاری سپاہ واپسی میں ہم پر ٹوٹ پڑی تو ایسی تباہی مچائے گی کہ عالم تہ و بالا کردے گی اور سارا شہر غارت ہو جائے گا، بن پڑے تو

---

[۱] سیر المتاخرین (اردو ترجمہ)، ج ۳، ص ۵۲

[۲] میر کی آپ بیتی، ص ۱۱۷ - ۱۱۸

اِن سے مل کر نجیب الدولہ کا کام تمام کر دیں، ورنہ درمیان میں پڑ کر صلح کرا دیں ؎

وزیر نے بادشاہ سے اس منصوبے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اُس نے بیماری کے بہانے صاف انکار کر دیا۔ چونکہ لوگوں کو بادشاہ کی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مشورہ کیا کہ شہر جا کر بادشاہ کو ختم کر دیں اور انتظام الدولہ کو بھی جیتا نہ چھوڑیں۔[1]

درحقیقت وزیر اور بادشاہ کے تعلقات اس وجہ سے کشیدہ ہوئے کہ بادشاہ اپنی زبوں حالی اور تذلیل سے تنگ آ کر وزیر کے چنگل سے نکلنے کا خواہش مند تھا۔ اِسی مقصد کے تحت اُس نے شہزادہ عالی گہر کو ۱۷۵۷ء۔ ۱۷۵۸ء میں اور عالی جاہ کو (۱۷۵۸ء) میں دوآبہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، بادشاہ کے اس طرزِ عمل سے ناراض ہو کر وزیر نے عالی گہر کے مسکن کا محاصرہ کر کے گولہ باری کی۔ مگر شہزادہ جان بچا کر نکل بھاگا اور شجاع الدولہ کے پاس اودھ پہنچ گیا۔[2]

مختصر یہ کہ وزیر کے چند اشخاص "لشکر سے نکل کر شہر آئے اور بادشاہ سامنے قسمیں کھائیں کہ ہم وزیر سے خوش نہیں ہیں لیکن زمانہ سازی کر رہے ہیں اگر حضور فائدہ اٹھائیں تو ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہے، وہ سادہ لوح (بادشاہ) ان بدباطنوں کے فریب میں آ گیا۔ پوچھا: "وہ کیا؟" انہوں نے کہا "ایک پہنچا ہوا فقیر جو تارکِ دنیا ہے، دو تین روز سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں وارد ہے"

---

[1] ملخص التواریخ۔ ص ۴۰۸ - ۴۱۱

[2] برائے تفصیل ملخص التواریخ ص ۴۰۸، جام جہاں نما (قلمی رام پور) ص ۵۰۴۔

کل چلا جائے گا اگر آپ شام کو اُس سے مل لیں تو غالب ہے کہ اس خدا رسیدہ بزرگ کی دعا سے ہم ان آفتوں سے محفوظ ہو جائیں اور وزیر پر غلبہ پالیں" بادشاہ ان نمک حراموں کی منافقت سے بے خبر تھا، وعدہ کرلیا کہ ہم ضرور ملیں گے" آخر شام کے قریب اُسے سوار کرکے لے گئے، جب کوٹلے میں پہونچے تو اُس بے گناہ کے چاقو مار کر ہلاک کردیا اور اس کی نعش دیوار کے نیچے پھینک دی، شام کے بعد وہاں سے پلٹ کر خانِ خاناں کے گلے میں پھندا ڈالا، جبکہ وہ نماز پڑھ رہا تھا، اُسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کردیا اُس کے مردے کو سب کی نگاہوں سے بچا کر لے گئے اور دریا میں ڈال دیا۔ بادشاہ کی نعش تمام دن کس مپرسی کی حالت میں زمین پر پڑی رہی، دیکھتا وہ اس وحشیانہ فعل پر لعنت کرتا تھا، آخر اس کے وارثوں نے جی کڑا کرکے اُس کی میت راتوں رات دفنادی۔۔۔۔
۔۔۔۔دوسرے دن صبح وہ اشقیاء قلعے میں آئے، اور شاہ جہاں نامی ایک جوان کو تخت پر بٹھا کر نذریں پیش کیں" [1]

---

[1] میر کی آپ بیتی، ص ۱۱۸، ۱۱۹، مفتاح التواریخ، ص ۳۴۰ تا ۳۴۲، جام جہاں نما (قلمی رامپور) ص ۵۰، وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی) ص ۱۶۱ (ب)، تاریخ فرح بخش (قلمی)، ص ۱۶۸ الف، ۱۶۹ ب، تاریخ احمد شاہ (قلمی)، ص ۹۲ (الف، ب)، تاریخ مظفری (قلمی)، ج ۲ ص ۷۶ (الف د ب)، تاریخ راحت افزا ص ۳۴۳

ملخص التواریخ میں لکھا ہے کہ "اول انتظام الدولہ را کہ مقید داشت، بہ تیغ جفا در گذرانید و بعد از سہ روز مہدی علی خان کشمیری را تلقین نمودہ پیش بادشاہ فرستاد او آمدہ بجد تمام و ثنا ظاہر ساخت کہ درویشی صاحبِ حال در کوٹلہ فیروز شاہ وارد گردیدہ قابل زیارت

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

میر کا بیان ہے کہ بادشاہ اور انتظام الدولہ کے قتل سے فارغ ہو کر عمادالملک بھاگم بھاگ راستہ طے کر کے مرہٹوں کی فوج سے مل گیا اور جنگ میں ان کا شریک بن گیا[1] چونکہ نجیب الدولہ اور مرہٹوں کے مابین صلح ہو گئی اور اسی اثنا میں احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان آنے کا شور و غل اٹھا تو اپنی عافیت کے لئے عمادالملک سورج مل جاٹ کے پاس چلا گیا[2]

چھٹا حملہ ۱۱۷۶۰-۶۱ء ہندوستان کی تاریخ میں شاہ ابدالی کا یہ حملہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے اسی حملے کے موقع پر جنگ پانی پت ہوئی جس نے مرہٹوں کی روزافزوں طاقت کا قلع قمع کر دیا تھا۔

غلام علی آزاد بلگرامی نے اس حملے کی دو وجوہ بیان کی ہیں پہلی وجہ تو یہ بتائی ہے کہ مرہٹہ سردار بالاجی راؤ کے دونوں بھائی رگھنا تھ اور شمشیر بہادر

(بقیہ صفحہ ۵۶) است، آں ابلہ بہ تلبیس ابلیس مذکور جدیدہ بملاقات درویش مجہول قاصد گردید چوں بجائے معہود رسید واندرونِ حجرۂ کہ قاتلانش رانشانیدہ بود رفت کشمیری مذکور درِ را از بیرون بزنجیر بند نمود، مرزا بابر خلاف اعزالدین داماد بادشاہ شمشیر کشیدہ یکے را مجروح ساخت مردم عمادالملک اسیرش نمودہ بر پالکی محفوف نشانیدہ محبس خانۂ سلاطین رسانیدند و سہ چہار ازبک خونخوار کہ درحجرہ بانتظار ورود بادشاہ نشستہ بودند بیچارہ بادشاہ راپی یراق تنہا یافتہ زخمہائی کاردپی درپی زدہ از پایش در آوردند ولاشش مابطرف دریا بر ریگ انگندند، لچہ ہا لباسش را از بر گرفتہ عریاں ساختند، بعد ششش بہ حسب الامر آں کشمیری لاشش را برداشتہ درمقبرۂ ہمایوں مدفون کردند ص ۱۱۲

حاشیہ صفحہ ہذا [1] میر کی آپ بیتی ص ۱۲۰
[2] ملخص التواریخ ص ۱۱۲ ۔ ۱۱۳

ہولکر اور دیگر سرداروں کو ہمراہ لے کر شمالی ہند میں دہلی تک بڑھ آئے تھے، اور وہاں سے لاہور پہونچے، عبدالصمد خاں سے جو شاہ ابدالی کی طرف سے سرہند کا فوجدار تھا، جنگ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ بعد ازیں لاہور پہونچے، وہاں کا حاکم مرہٹوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو ساتھ لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور کابل چلا گیا۔ ان کا تمام مال و اسباب و خزانہ غنیم کے ہاتھ آیا۔ بعد ازیں مرہٹوں کا تسلط و اقتدار ملتان و ڈیرہ غازی خان سے چناب ندی تک قائم ہو گیا۔ برسات کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ دن تک وہاں قیام نہ کر سکے اور ۷۵ لاکھ سالانہ پیش کش کے عوض لاہور آدینہ بیگ کے حوالے کر کے دہلی واپس چلے آئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کر کے دکن واپس چلے گئے۔[۱]

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد آدینہ بیگ کا انتقال ہو گیا، جنگو نامی مرہٹہ سردار نے سرہند کی فوجداری پر آدینہ بیگ کے ایک عزیز صدیق بیگ خاں کو مقرر کیا اور دوآبہ کا علاقہ آدینہ بیگ کی بیوی کو عطا کیا اور صاجبا نامی مرہٹہ سردار کو لاہور کی صوبہ داری تفویض ہوئی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے تمام قدیم راجاؤں کا مرہٹوں[۲] نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ان کے روز افزوں اقتدار سے وہ لوگ پریشان اور ہراساں تھے۔ دتا سندھیہ نے ایک مدت سے نجیب الدولہ کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ نجیب الدولہ اور دیگر افغان سرداروں نے عموماً تقویتِ اسلام اور خصوصاً اپنی نجات کی غرض سے اور دوسرے راجاؤں نے اپنے ملک اور رعیت کی

---

[۱] خزانۂ عامرہ ص ۱۰۰۔۱۰۱ نیز ملاحظہ ہو میر کی آپ بیتی ص ۱۲۹ [۲] خزانۂ عامرہ ص ۱۰۱

حفاظت کے لئے دُرانی کی خدمت میں عرضیاں بھیجیں اور اُس سے ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی[1]

نجیب الدولہ نے ایک خط میں شاہ ابدالی کو لکھا :۔

"این تمام آفات از دستِ کفّار مرہٹہ بر تمام ما مردم می رسد و شما بادشاہ مسلمانان اید می باید کہ چیزے تدارک این امر بکنید"[2]

سید نورالدین حسین خاں بہادر فخری کا بیان ہے کہ :۔

"نجیب الدولہ در ہر ماہ آدم پیشِ احمد شاہ دُرّانی رواں می کرد و بطرف سردارانِ افاغنہ و شجاع الدولہ گفتہ می فرستاد کہ مالا اینہا بسر من رسیدند، من تنہا طاقتِ استقامت با اینہا ندارم شما ہم شریک شوید"[3]

دوسرے خط میں نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کو لکھا :۔

"تا استیصال مرہٹہ بالکل نہ شود ما مردم را در ہندوستان ماندن مشکل است"[4]

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہ کا مکتوب دوم بنام شاہ ابدالی کے نام تھا، اس مکتوب میں ہندوستان کی ان سیاسی جماعتوں کا جن کو شاہانِ مغلیہ کی عدم دور اندیشی، غفلت شعاری، اختلافِ فکر اور عیش و عشرت

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۱۰۰ - ۱۰۱

[2] سرگزشت نواب نجیب الدولہ ص ۹ ۔

[3] سرگذشت نواب نجیب الدولہ ص ۱۱، اقبال نامہ (قلمی رامپور) ص ۲۴۶ - ۲۴۷

[4] " " ص ۱۷ ۔

کی وجہ سے پھلنے پھولنے اور اپنے اقتدار کو جمانے کا سنہری موقع مل گیا تھا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ بعد ازیں شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا:۔

"اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ اقتدار و شوکت ہو اور لشکرِ مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے، یقینی طور پر جنابِ عالی پر فرضِ عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلّط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا، اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزریگا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی، یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے، اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضلِ خداوندی جنابِ عالی کے علاوہ کسی کو میسّر نہیں ہے۔"

"ہم بندگانِ الٰہی، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزّ وجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمتِ مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے۔"[1]

خلاصہ یہ کہ شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی

---

[1] سیاسی مکتوبات۔ ص ۱۰۵۔۱۰۶

دعوت دی تھی ــــ

"نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جنگِ پانی پت نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ ہمیشہ کے لئے بدل دیا ہے"[1]

سرہند کے قریب مرہٹہ اور ابدالی کا معرکہ | تمیرنے لکھا ہے کہ "ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ خبر آئی کہ شاہی فوج (ابدالیوں) نے اٹک پار کر کے صاحبا[2] کو شکست دیدی، مرہٹے نجیب الدولہ کی جنگ یونہی اُدھر میں چھوڑ کر (ابدالی) فوج کو روکنے کے لئے بدحواس ہو کر بھاگے، اور پانی پت کے قریب دریائے جون عبور کر کے اُترے، راستے میں ایک عالم پر مصائب توڑتے اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے کرنال کے اس طرف خیمہ زن ہوئے۔ ...... شام کو سُنا گیا کہ شاہی فوج دریا کی سمت پہنچ چکی ہے، انہوں نے بھی اپنی فوج کو آگے بڑھایا۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے تقریباً آٹھ ہزار جیالے سوار ایک سردار کی سرکردگی میں بھیجے، وہ شاہی فوج سے مقابل ہوئے مگر ایک ہی دھاوے میں بہتوں کے پاؤں اکھڑ گئے، بڑے بڑے سورماؤں کا گھمنڈ نکل گیا جو بہت دنوں کی لیتے تھے، اوندھے ہو گئے اُدھر خون خواروں نے ایسا ہلّا بولا کہ آن کی آن میں کشتوں کے پُشتے لگا دیئے۔ ...... یہ لوگ تو ہار کر واپس آگئے اور وہ (درّانی) مالِ غنیمت لُوٹ کر دریا کے پار اُتر گئے" اس معرکہ کے موقع پر

---

[1] سیاسی مکتوبات ص ۱۸۔

[2] ملخص التواریخ و دیگر تواریخ میں سابا نام لکھا ہے۔ ص ۱۵۴۔

میر میدانِ جنگ میں موجود تھے [1]

معرکۂ باڑولی [2] | بعد ازیں احمد شاہ ابدالی نے ڈوآبے میں ڈیرے ڈالے اور نجیب الدولہ اُن سے آ کر مل گیا تو کئی سرداروں نے لشکر اور شہر کی محافظت کے لئے وزیر کو دستوری مرحمت کر دی اور خود وہاں سے نکل کر چھ کوس اُدھر خیمے گاڑ دیئے۔"

"چار روز کے بعد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کی فوجیں کوچ پر کوچ کرتی ہوئی دریا پار پہنچ گئیں، دوران کی جنگ جو فوج د مرہٹوں کی، گوشمالی کرنے پر متوجہ ہوئی، روہیلہ فوج کے پیادوں نے پیش قدمی کر کے جنگ شروع کر دی اور خوب کٹ کٹ کر لڑے۔ اِدھر سے دتّا جو مرہٹہ فوج کا سردار تھا، اپنی فوج سے آ ملا اور جی جان سے لڑا۔ اُدھر سے پہلا ہی حملہ ہوا تو ایک تیر دتّا کے پہلو میں بہت کاری لگا۔ مرہٹوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ دتّا کے مُردے کو دریا کے پار لے گئے، انہوں نے بھی دریا کے پار اُتر کر مار دھاڑ شروع کی اور یہ مرہٹے بھاگنے لگے ..... درّانیوں نے بھگوڑی فوج کا تعاقب کیا اور اُن میں سے اکثروں کو قتل کر دیا۔ [3]

---

[1] میر کی آپ بیتی ص ۱۲۰، خزانۂ عامرہ ص ۱۰۲، سرگزشت نجیب الدولہ ص ۱۸۰۱۴، ملخص التواریخ ص ۱۵۱۴، تاریخ مرہٹہ و ابدالی از علی ابراہیم خان ص ۲۹

[2] باڑولی کا میدان شاہجہان آباد کے قرب و جوار میں تھا۔

[3] میر کی آپ بیتی ۱۲۱، خزانۂ عامرہ ص ۱۰۲، ماہ جمادی الآخر ۱۱۷۳ھ میں جنگ ہوئی تھی آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی ہے۔ سه کرد سلطان عمر درّانی + قتل دتّا بہ تیغ دشمن کاہ

گفت تاریخ این ظفر آزاد + نصرت بادشاہ عالی جاہ

ملخص التواریخ ص ۱۵۱۴، ۱۷۴

ص ۱۰۲

بقول علی ابراہیم خاں "دُرّانیوں نے زخم تیر اور بندوق اور تلوار سے سپاہ مخالف کے تئیں مضمحل کیا اور باقی نہ چھوڑا کہ ایک تن اُس میں سلامت میدانِ کارزار سے باہر جاوے" [1]

معرکۂ سکندرہ | میر کا بیان ہے "کہ مرہٹوں کی فوج جو ہار کر بھاگی تھی، اُس لشکر کے ساتھ جو میوات کے علاقے میں بھاگ گئی ہے اور اُن کے ارادے ناپاک ہیں، ابدالی نے یہ خبر سُن کر اُن کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ شاہجہاں ثانی کو جو چند مہینے کی برائے نام سلطنت کا گنہگار تھا، پہلے کی طرح سلاطین میں بھیج دیا اور عالی گہر کے لڑکے جواں بخت کو اس کا ولی عہد مقرر کر کے شہر سے کوچ کر گیا۔۔۔۔ جب شاہ ابدالی میوات کے قرب وجوار میں پہونچا اور مرہٹوں نے دیکھا کہ ہمارا حملہ کارگر نہیں ہوتا اور فوج سہم گئی ہے، تو وہ اپنے قدیم معمول کے مطابق بھگدڑ مچاتے ہوئے شاہجہاں آباد تک آگئے اور دریا عبور کر لیا۔ شاہ نے بھی اُن کا تعاقب کیا، اور رات شہر کے قریب بسر کر کے (صبح کو دریا کے) پار اتر گیا، جو پایاب تھا۔ جب دریا کے اُس طرف لشکر جا لیا اور اس کی فوج کا سردار جہاں خان آگے بڑھا اور سکندرہ آباد کے قریب ملہار کی فوجوں سے بھڑ گیا۔ شاہ (ابدالی) بھی یہاں سے تین ہزار لشکریوں کو لے کر دو گھڑی میں اس سے جا ملا۔ ادھر کے سردار (ملہار) میں مقابلے کی ہمت نہ رہی تو وہ اپنی جگہ مرہٹہ سرداروں میں سے ایک کو سونپ کر خود چپکے سے بھاگ گیا۔ اُس (مرہٹہ) سردار نے بہادری کے جوہر دکھائے اور لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اس کے سپاہی پسپا ہو کر (ابدالی) کے لشکر جرار کے

---

[1] تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص ۳۰

مقابلے سے بھاگ پڑے اور منتشر ہو گئے، شاہ ابدالی کول تک...... ان کے تعاقب میں گیا۔ ان بھگوڑوں نے سورج مل کے قلعوں میں پناہ لی اور دو تین دن کے بعد آگے روانہ ہو گئے۔ شاہی فوج اس کے قلعوں میں سے ایک قلعے پر جو دریائے جون کی دوسری جانب تھا، دھرنا دے بیٹھی اور محاصرہ کر کے لوگوں کا ناک میں دم کر دیا۔ زمیں دار مذکور (سورج مل) نے ان کی مدد کرنے میں اپنا کوئی فائدہ نہ دیکھا تو وہ بھی طرح دے گیا۔ مجبور ہو کر محصورین نے اپنا سفیر بھیج کر صلح کر لی اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔[۱]

سداشیو راؤ اور دیگر مرہٹہ سرداروں کا شمالی ہند میں آنا | جب دتا کے قتل اور ہولکر کے مغلوب ہونے کی خبر دکن پہونچی تو سداشیو راؤ عرف بھاؤ برادر بالاجی راؤ مع نامی گرامی سرداروں اور جرار لشکر و توپخانہ مرہٹوں کی گذشتہ شکست کا انتقام لینے کی غرض سے شمالی ہند آیا۔ طباطبائی کا بیان ہے کہ "بتہیہ تدارک و انتقام کشی از ابدالی و برانداختن بنیاد سلاطین بابری و نشانیدن بسواس راؤ بر تخت سلطنت رہگرای ہندوستان از دکھن گردید"[۲]

میر نے لکھا ہے کہ "ابھی یہ فوج (ابدالی) دوآب ہی میں تھی جو یہ خبر پھیل گئی کہ (مرہٹوں کی) بڑی فوج جنگ کرنے کے ارادے سے دکن سے آئی ہے، اور آگرے تک پہنچ گئی ہے۔ بس یہاں تک آیا ہی چاہتی ہے' نجیب الدولہ

۱؎ میر کی آپ بیتی، ص ۱۲۴، ۱۲۷۔ نیز ملاحظہ ہو، خزانۂ عامرہ، ص ۱۰۲، ۱۰۳۔ ملخص التواریخ ص ۴۱۶، ۴۱۷۔ تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص ۳۱

۲؎ ملخص التواریخ، ص ۴۱۷، تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص ۳۲، خزانۂ عامرہ، ص ۱۰۳

نے پورب کے سرداروں مثل شجاع الدولہ، احمد خان بنگش، اور حافظ رحمت خاں (روہیلہ) وغیرہ کو اپنے ساتھ ملالیا اور سب کو ملک (میں حصّہ) دینے کا لالچ دے کر خلعت دی، اور (مرہٹوں سے) جنگ کرنے پر آمادہ کرلیا۔"

"انہیں دنوں بھاؤ جو مرہٹوں کا بڑا سردار تھا اپنے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ سورج مل کے علاقے سے گزر (وزیر عماد الملک) اور راجا اُسے بہلا پھسلا کر ساتھ لے آئے اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ یعقوب علی خاں، جو شاہ درانی کے وزیر شاہ ولی خاں سے قرابت بھی رکھتا تھا اور ان دنوں دلّی میں شاہی قلعدار تھا یہ سوچ کر کہ شاہی فوج دریا کے اُس طرف موجود ہے، اور وہ مدد میں دریغ نہ کرے گی، (مرہٹوں سے) مصروف جنگ ہوگیا۔ دکنی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کرکے اُسے فتح کرلیا اور اکثر مکانات شاہی کو جو خوبصورتی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، خاک میں ملا دیا۔ چونکہ دریا کا (برسات کے باعث) پار کرنا مشکل تھا، اور شاہ ابدالی وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا، خان مذکور (یعقوب علی خان) نے راجا سے صلح کرلی اور قلعہ سے نکل آیا۔ معاہدے کی رو سے کسی نے اس سے روک ٹوک نہ کی۔" [1]

بقول آزاد بلگرامی اور علی ابراہیم خان "بسواس راؤ داخل قلعہ ہوا اور جو کچھ مال واسباب کارخانجات قدیم بادشاہی میں تھا سب پر قابض و متصرف ہوا، اور چھت چاندی کی جو دیوانِ خاص میں تھی اس کو توڑ کر بہت سی چاندی انبار

[1] میر کی آپ بیتی ص ۱۲۷ / ۱۲۸ نیز ملاحظہ ہو، خزانۂ عامرہ، ص ۱۰۴ - ۱۰۵، تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص ۱۸۱ - ۱۸۴

کر کے سترہ لاکھ روپیہ بنوا کر سکہ اپنا لیے [۱] بعد ازیں قدم شریف، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ اور فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے مزار سے متعلق سونے چاندی کے آلات اپنے قبضے میں کر لئے [۲]

دلی سے میر کا کوچ | اس زمانے میں میر راجا جگل کشور کے ہاں ملازم تھے، مگر دہلی پر آئے دن آنے والی مصیبتوں سے تنگ آ کر انہوں نے شہر چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور راجہ سے رخصت طلب کی،

بقول میرؔ (میں) راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ زمانے کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں۔ چاہتا ہوں کہ شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے انہوں نے میرے ساتھ رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔" [۳]

بال بچوں کو لے کر میرؔ نکل پڑے، دن بھر میں ۸-۹ کوس کی مسافت طے ہو سکی، رات ایک سرائے میں ایک درخت کے نیچے گزارنی پڑی، اگلی صبح کو اُدھر سے راجہ جگل کشور کی بیوی کا گزر ہوا۔ انہوں نے ان مجبوروں کی دستگیری کی اور اپنے ساتھ برسانہ تک لے آئیں اور اُن کے ساتھ طرح طرح کے سلوک کئے۔ [۵]

---

[۱] خزانۂ عامرہ ۱۰۵ تاریخ مرہٹہ واہدالی صفحہ ۲۸۔ ملخص التواریخ صفحہ ۲۲۲ [۲] خزانۂ عامرہ صفحہ ۱۰۵ ملخص التواریخ صفحہ ۲۲۲ اقبال نامہ (قلمی رام پور) صفحہ ۲۴۹ تاریخ مظفری (ق) صفحہ ۸۵ ب۔

[۳] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۲۸، صحیفۂ اقبال (قلمی) ص ۸۷ (الف) و (ب) [۴] یہ مقام ہندوؤں کا تیرتھ اور سورج مل کے قلعوں سے آٹھ کوس اِدھر ایک قصبہ تھا [۵] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۲۸ - ۱۲۹

میر کا مان جانا | راجا جگل کشور کی بیوی کے ساتھ میر کامان[1] گئے، اپنے اہل و عیال کے ساتھ عشرۂ محرم میں وہیں قیام کیا۔ بعدازیں کمھیر گئے[2]۔

کمھیر میں قیام | ایک دن صفدر جنگ کے سابق خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا، بہادر سنگھ میر کے پاس آیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گیا اور ان کی مدد و اعانت کی، کچھ دن سکھ چین سے بسر ہوئے[3]۔

میر کی عسرت اور تنگدستی | میر کے لئے یہ زمانہ بڑی مصیبت اور عسرت کا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اُن کے پاس کھانے پینے کی اشیاء تک نہ ہوتی تھیں ان کا بیان ہے۔

"ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا۔ جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں جو فردوس آرام آگاہ (محمد شاہ بادشاہ) کے عہد میں شش ہزاری امیر اور نہایت کریم النفس انسان تھا، کے لڑکے اعظم خان سے ملا جائے تو شاید (وہ امداد کرے اور) کچھ دن سکھ سے گزر جائیں۔ (چنانچہ) گیا، اور سورج مل کے طویلے میں اس سے ملا جو دہلی کے خانہ خرابوں کی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ اُس عزیز نے خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی، میں نے اپنا دُکھڑا سنایا (تو) سننے والے بہت متاثر

---

[1] یہ مقام برسانہ سے تین کوس پر راجا جے سنگھ والئ جے پور کی سرکار پر تھا۔

[2] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۲۹۔

[3] میر کی آپ بیتی ص ۱۲۹۔

ہوئے رجب قہوہ اور حقّہ لایا گیا تو یہ شعر (میری) زبان پر آیا:

امروز چو کارِ من و عُرفی بہم اُفتاد
باہم نگرستیم و گرسیتیم و گزشتیم

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے، اور دو تین آنسو پلکوں سے گرائے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ خان فکر مند ہے، میں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے، بولا "کچھ نہیں" میں نے کہا: "کچھ تو ہے!" کہنے لگا "جب تم شہر (دہلی) میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے۔ آج عجیب اتفاق ہے کہ کچی کھانڈ بھی میسّر نہیں جو تمہارے لئے ایک پیالہ شربت بنا سکوں"، میں نے کہا میں ان سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں، وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی، آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں، زمانہ بدلتا رہتا ہے وہ شربت و شیرینی کا وقت تھا، یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے۔[1]

اعظم خان خود مفلسی اور عسرت کے شکار تھے، اُن کے پاس نقد تو کچھ نہ تھا۔[2] لیکن اُس نے اصرار کر کے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا، اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا، دو دن اس مٹھائی پر گزر ہوئی۔[3]

تیسرے دن راجا جگل کشور کے چھوٹے لڑکے بشن سنگھ نے میر کو اپنے پاس

---

[1] میر کی آپ بیتی ص ۱۲۹-۱۳۰

[2] 〃 〃 ص ۱۳۰-۱۳۱

[3] 〃 〃 ص ۱۳۱

بلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ "راجا صاحب کے آنے تک میرے پاس رہو" میں نے کہا کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں "ہے" بولا مطمئن رہو، یہاں سب کچھ موجود ہے۔ باغ کرم کے اس گل نو دیدہ نے خدا اُسے خوش رکھے، میری ضرورت کا سب سامان مہیا کر دیا۔ [1]

جنگِ پانی پت ۱۷۶۱ء | جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ بھاؤ نے دہلی کے قلعے پر قابض ہو کر خوب لوٹ مار کی، کچھ دنوں بعد دانہ اور گھاس کی قلت سے تنگ آکر اس نے ۱۹ر تاریخ ماہِ صفر ۱۱۷۴ھ کو شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے شہزادہ جواں بخت کو تختِ شاہی پر بٹھایا اور منصب وزارت شجاع الدولہ کے نام مشہور کر دیا، ایسا کرنے میں اُس کا مقصد یہ تھا کہ شاہ ابدالی نواب شجاع الدولہ سے آزردہ ہو جائے اور ممکن تھا کہ وہ اپنے ملک کو واپس چلا جائے، مختصر یہ کہ بھاؤ اپنا لاؤ لشکر لے کر کنجپورہ کی طرف بڑھا اور عبدالصمد خاں اور قطب خاں کو شہید کر کے قلعہ فتح کر لیا۔ باقیوں کو قید کر کے کنجپورہ کو لوٹ لیا اور تاخت و تاراج کر دیا۔ یہ خبر سن کر شاہ ابدالی کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی، حالانکہ جمنا ندی برسات کی وجہ سے پایاب نہ تھی پھر بھی اُس نے چڑھے ہوئے دریا کو پار کیا، اُدھر بھاؤ کنجپورہ سے آگے بڑھ کر پانی پت کے میدان میں خیمہ زن ہوا اور اِدھر سے شاہ ابدالی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وہاں پہنچا اور مرہٹوں کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اس وجہ سے مرہٹوں کو سب سے بڑی دقت رسد اور روپیہ کی ہو گئی، اسی اثناء میں یہ واقعہ پیش آیا

---

[1] میر کی آپ بیتی ص ۱۳۱

کرناروشنکر جو قلعہ دار دہلی تھا۔ دو ہزار سوار کی جمعیت کے ساتھ خزانہ بھاؤ کے لشکر میں پہونچانے جا رہا تھا۔ اتفاقاً اندھیرے میں راستہ بھول گیا۔ اور شاہ ابدالی شہ کے لشکر کی طرف آن پڑا۔ بہادران شاہ کو جب یہ خبر ملی تو "مانند بھیڑیئے بھوکے کے فوج غنیم پر دوڑ پڑے اور ہزار آدمی مع ناروشنکر جان سے مارے اور باقیوں کو گھیر کر قید کر کے مانند بھیڑوں کے اردوی بادشاہی میں لے گئے، اور خزانہ چھین لیا، بھاؤ یہ خبر سُن کر بہت غمگین ہوا؟

دُرانیوں نے ناکہ بندی کر کے، بجلی کی مانند ہر طرف دوڑ دھوپ کر کے مرہٹہ لشکر میں غلہ و رسد پہونچنے کے راستے بند کر دیئے، اس وجہ سے ان کے لشکر پر عظیم قحط پڑا۔ اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہونچی کہ ہر روز بہت سے آدمی، گھوڑے، ٹٹو، اونٹ اور بیل بھوک سے مرنے لگے، ایک شاعر نے ذیل[1] کے اشعار میں مرہٹوں کی فاقہ کشی کا نقشہ پیش کیا ہے ؎

ہوئی شکل روٹی کی ایسی ہی مشتاق ؟ | کہ نقش پا کو کلیجہ جانتے تھے
نکلتا تھا جو لکڑی میں سے بورا | غنیمت جان اُس کو پھانکتے تھے
سپاہی جو دکن کے تھے دلاور | پڑے تھے راہ میں عریاں لاغر
کوئی مردے پہ گر ہوتا تھا غمناک | خود گرتا تھا مثل اشک بر خاک (دکنا)
فغاں مُنہ سے نکلتا تھا نہ باہر | گذر کوئے خموشاں میں تھا اکثر (دکنا)

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ملخص التواریخ ص ۲۰، ۴۴، ۲۲۳، تاریخ مرہٹہ و ابدالی ص ۴۲-۵۷۔ خزانۂ عامرہ ص ۱۰۶-۱۰۸۔ اقبال نامہ (قلمی رام پور) ص ۳۵۸-۳۵۹۔ صحیفۂ اقبال (قلمی) ص ۸۸ تاریخ مظفری (ق) ج ۲-ص ۸۶ الف تا ۹۰ ب) (الف و ب)

جہاں میں تھے حباب سادہ تھے امید زندگی سے ہاتھ دھوئے (۱)

آخرالامر فاقہ کش مرہٹہ سپاہی بھاؤ کے پاس پہونچے اور انہوں نے لعنت ملامت کی اور کہا "تم نے ایسا سررشتہ تدبیر گم کیا ہے کہ کچھ تجھ سے بن نہیں پڑتا، اور چاہتا ہے تو کہ جتنے سردار نامی اور بہادر لڑنے والے ہیں سب مفت ہلاک ہوں اور بھوک کے مارے مرجاویں کل جس وقت صبح ہوگی اور آفتاب نکلے گا ہم کمر ہمت باندھ کر میدانِ کارزار میں نکلیں گے اور کوشش لڑائی میں کریں گے آگے خدا مالک ہے جا ہے جسے فتح دے" ؎۱

چنانچہ ششم جمادی الآخرہ، روز چہارشنبہ ۱۱۷۴ھ کو ایک ایسی زبردست جنگ ہوئی جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی، چاروں طرف سے "ہر ہر مہادیو" یا علی یا علی کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ؎۲

میر کا بیان ہے کہ:۔

"مرہٹے اگر اپنے قدیم دستور کے مطابق جنگ گریز کرتے تو عین ممکن تھا کہ غالب آجاتے وہ توپ خانے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور شاہی فوج اس فکر میں لگ گئی کہ رسد نہ آنے دے جب رسد نہ آنے سے پریشانی بہت بڑھ گئی تو مرہٹہ فوج جنگ پر آمادہ ہوئی اور اس کے سردار مورچوں سے باہر آکر ڈٹ گئے (ابدالی فوج کے) جگر دار بھی انہیں شکست دینے کے لئے جی توڑ کوشش میں

؎۱ تاریخ مرہٹہ و ابدالی ص ۵۰ - ۵۱

؎۲ ملخص التواریخ ص ۲۲۴ -

لگ گئے، بہادروں نے بڑی تنظیم کے ساتھ ہلا بولا، اور متحد ہو کر تیروں کی بوچھار شروع کر دی، آزمودہ کاروں نے بندوقیں سنبھال لیں، اور دنادن گولیاں برسائیں، کچھ مقابل فوج نے پیادہ ہو کر لڑنا شروع کیا مگر منہ کی کھائی، اُن کے جوانوں کے بڑے کاری زخم لگے اور بہت سے ہلاک ہو گئے، یہ جنگ آور دونوں طرف سے پل پڑے اور تیر و تفنگ سے حملہ کرتے رہے (اب) دکن کا سردار پامردی کے ساتھ میدان میں آیا اور اُس نے شاہی فوج کے بہت سے دستوں کو مار بھگایا لیکن فتح تو شاہ کے لیے مقدر ہو چکی تھی، اِن کوششوں سے کچھ نہ ہوا مرہٹے بندوقیں چلاتے تھے، مگر اُدھر کے ایک آدمی پر اثر نہ کرتی تھی، اُن کی فوج کے بہت سے کارآمد سپاہی اِدھر کی تفنگ اندازی سے زخمی ہو گئے، چنانچہ پہلے ہی ہلّے میں ایک تیر وشواس راؤ کے لگا جو مرہٹہ ریاست کا ولی عہد تھا، وہ خاک و خون میں لوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ بھاؤ بڑا غیور جوان تھا اور وہ دادِ مردانگی دے رہا تھا، جب اُس نے اپنی آنکھوں سے یہ سانحہ دیکھا تو کہنے لگا کہ اب دکن جانے کا منہ نہیں رہا، جان پر کھیل کر (ابدالی کی) فوج کے قلب پر حملہ کیا یعنی جان بوجھ کر اپنے تئیں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔" ؎

؎ میر کی آپ بیتی، ص ۱۴۳ / ۱۴۴

مختصر یہ کہ بڑے نامی گرامی مرہٹہ سردار مثل جسونت راؤ، بھاؤ، تکو جی سندھیا، جنکو سندھیا، ابراہیم خان گاردی، شمشیر بہادر اور انتاجی سب ہلاک ہو گئے، ستاجی کے چالیس زخم آئے اور مہادجی سندھیا کے پیر میں ایسی کاری چوٹ آئی کہ عمر بھر یہ زخم ٹھیک نہ ہو سکا۔

مرہٹوں کی تباہی و بربادی، جانی و مالی نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ:۔

"ملہار راؤ وہاں سے دو تین ہزار سواروں کو ساتھ لے کر بھاگا اور باقی تمام لشکر غارت ہو گیا جو سردار زندہ بچ رہے تھے وہ گداگروں کے حال میں آوارہ پھرتے تھے، ہزاروں بھگوڑے سپاہیوں کے گھوڑے اور ہتھیار اطراف شہر کے زمین داروں کے قبضے میں آ گئے، کیا لکھوں کہ کیسا روز بد اس قوم کو دیکھنا پڑا ہزاروں ننگے سپاہی روتے ہوئے جس راستے سے گزرتے تھے، لوگوں کے لئے عبرت کا سامان نظر آتے تھے، گاؤں کے لوگ بھنے ہوئے چنے سب کو ایک ایک مٹھی تقسیم کرتے تھے، اور اُن کی تباہ حالی کا موازنہ اپنے حال سے کر کے خدا کا شکر ادا کرتے تھے، ایسی عبرت انجام شکست کسی کو کم ہوئی ہوگی، بہت سے بھوک سے مر گئے! اور بہتوں نے ٹھنڈی ہوائیں اکڑ اکڑ کر جان دے دی، وہ فوج جسے یہ قلعے میں چھوڑ کر آئے تھے، شاہی فوج کی لوٹ مار کے خوف سے

رات کے وقت بھاگ گئی. کروڑوں روپیہ کا سازوسامان
داحمد شاہ ابدالی) اور پورب کے سرداروں کے ہاتھ لگا،
جسے انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا، نقد وجنس کے سوا توپخانہ
اور دوسرا جنگی سامان ہاتھی، بیل، گھوڑے اور اونٹ
شجاع الدولہ وغیرہ نے اپنے حصّے میں لے لئے، درّانی سپاہی
جو فقیر محض تھے مالامال ہو گئے، ہر دہ باشی کو سو اونٹوں کا
سامان ملا اور ہر شخص کو دو خروار، بڑی دولت ہاتھ لگ گئی،
ہر شخص پھولا نہ سماتا تھا" ؎۱

سید نورالدین حسین خان نے مرہٹوں کی تباہی کا بڑا دلدوز نقشہ
پیش کیا ہے:۔

"بھاؤ دریں اثنا کشتہ شد، وسر آں را مردم درزیل سرہا بریدند
وتمام لشکر افغانان ومغل ورہیلہ وشجاع الدولہ درپے ایں
مردم افتادند وغارت شروع شد واسباب بے حساب وبے
عدبدست لشکر افتاد وتا شام تعاقب نمودند ہمیں کہ شب شد
دست از تعاقب باز داشتند ودر لشکر ایں قدر غارت بدست
خوانین آمد کہ زیادہ برشمار است ومردم دیگر ایرانی وتورانی
راتا مقدور دست خوانین غارت کردن نمی داد، خود متصرف
می شد مگر بدست لشکر ہندوستان بقیمت یک یک تومان زہائے

؎۱ میر کی آپ بیتی صفحہ ۱۳۵

خوش شکل مزین و اسپ ہائے خوب بدو دو تومان می فروختند و ہر کہ را تا شب یافتند بلا تحاشی سر از تن جدا می کردند و در میان خندق صدہا مردم مرہٹہ مع اسپ افتادہ بود و لاش را شمارے نیست کہ تا چند سال در آن میدان بہ سبب استخوان مردم مرد مزارعان کشت و کار مشکل بود و بسیار مردم لشکر کہ درمیان قصبۂ پانی پت پناہ گرفتند تا دو روز مردم درانی سراغ گرفتہ ہر جا می یافتند بدست آوردہ می کشتند" [1]

---

[1] سرگذشت نجیب الدولہ ص ۲۸-۲۹۔ علی ابراہیم کا بیان ہے کہ "آخر الامر خوں ریزی یہاں تک پہونچی کہ لوگوں کو رسّی سے باندھ کر لاتے تھے اور سر ان کا تلوار سے جدا کر ڈالتے تھے" ص ۵۷

بقول شیو پرشاد لکھنوی "غارت و قتل نمودہ کہ سطح زمین از کشتگان پُر لاش بود قریب یک لک کس آں روز از سپاہ و چہ از میکاہ بقتل آمدہ..... و کم کس جان بر شدہ ورای آں وراہ بدست زمین داراں بسیار کس مرہٹہ از غارت و قتل شدند..... چہ شرح دہر یک یک سوار دہ دہ بست بست شتر پر انبار جنس... کشیدہ آوردند و اسپاں معروفہ را چہ شمار مثل گلہ گوسپنداں بود و افیال خوب و کنیزان و غلامان نیز.... قریب چہل ہزار کس اسیر شدہ آمدند و قریب بست ہزار کس غارت شدہ"

احوال جنگ بھاؤ و احمد شاہ ابدالی (اقبال نامہ۔ قلمی رام پور) ص ۱۷۲،۲۷۳

بقول شیو پرشاد "چنداں مرداں و فیلان و اسپان و شتران و گاوان در آن معرکہ کشتہ و خستہ افتادہ بودند کہ بہایم و سباع و طیور گوشت خواران نواح تا سالہا دراندازہ ای معاش فارغ گشتہ خوش زیست می نمودند" تاریخ فرح بخش (قلمی)، ص ۱۰۴ (الف)

مختصر یہ کہ ــــ "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اُڑ گئی"

سرجادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ "مہاراشٹر میں کوئی گھرانا ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو، سرداروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہو گئی۔"

نتائج | اس جنگ کے نتائج بہت دُور رس تھے بشرطیکہ مغل بادشاہوں میں سے کوئی ایسا ہوتا جو اس فتح سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا، اس جنگ کے دور رس نتائج کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ

"اگر سلطنتِ مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگِ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اُس وقت ایک بے رُوح جسم کے مانند تھی، جنگِ پانی پت کا اصلی فائدہ قائدِ جنگِ پلاسی نے اُٹھایا۔"[1]

ابدالی کے اس حملے کے زمانے میں شاہ عالم ثانی[2] بہار میں تھا، جنگِ پانی پت اور مرہٹوں کے زور کو توڑنے کے بعد ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، جب وہ نہ آیا تو ابدالی نے

---

[1] سیاسی مکتوبات، ص ۱۹، [2] شاہ عالم بن عزیز الدین عالم گیر ثانی ۱۷، ذیقعدہ ۱۱۴۰ھ مطابق ۲۵ جون ۱۷۲۸ء میں پیدا ہوئے تھے، برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مفتاح التواریخ ص ۳۴۳-۳۴۴ - مراۃ الاشتباہ ۵۳ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ صفدر جنگ وزیر کی بداخلاقیوں اور مظالم سے تنگ آکر شاہ عالم دعالی گہر، پورب کو چلے گئے تھے، آئندہ اس کا تفصیلی ذکر آئے گا۔

نے اُس کی والدہ نواب زینت محل سے اُسے ایک خط لکھوایا جس کا مضمون حسب ذیل تھا:۔

"شاہنشاہ (احمد شاہ ابدالی) قلعہ میں آ گئے ہیں، آج تک کہ ۲۰ ررجب ہے میں کئی مرتبہ اُن سے ملی ہوں، وہ تمہارے آنے کے بے حد منتظر ہیں۔۔۔۔ میرے بیٹے! تم یقین رکھو کہ تمہارے آنے پر سارے معاملات طے ہو جائیں گے۔۔۔۔ تیمور شاہ نے خلوص و محبت سے مجھے تحائف بھیجے ہیں، تمہارے بدخواہ بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔۔۔۔ تم اُن کے کہنے اور بہکانے میں نہ آنا، میرے بیٹے تم جلد آ جاؤ، اگر خدانخواستہ شاہ چلے گئے تو پھر تم مصیبتوں میں پھنس جاؤ گے۔"[۱]

ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے اس بارے میں انگریزوں کو بھی لکھا تھا تاکہ وہ لوگ شاہ عالم کو دہلی پہونچانے کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہونچائیں۔ ڈیسی ٹارٹ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا:۔

"اگر شہنشاہ (ابدالی) کی یہ خواہش ہے تو اُس (شاہ عالم) کو دہلی تک برٹش سپاہ کی حفاظت میں پہونچا دیا جائے گا۔"[۲]

گمان غالب ہے کہ شاہ عالم کو دہلی بلانے میں اسے انگریزوں کے اثر سے خلاصی دلانے کا راز پنہاں تھا، اور احمد ابدالی ہندوستان میں اپنے قیام کے

ISLAMIC CULTURE, Vol. XI PP 503-504 ۔ ۱

ISLAMIC CULTURE, Vol. X P 504 ۔ ۲

زمانے میں اس کی طاقت کو دہلی میں مستحکم کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا، کیونکہ شاہ عالم دہلی نہ آیا اور احمد شاہ ابدالی اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

میر کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پانی پت کے بعد جب ابدالی سپاہ دہلی آئی تو اس مرتبہ پھر انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا، "دلی پھر لٹی" کے عنوان سے میر نے لکھا ہے کہ:

"میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا، جوں جوں آگے بڑھتا، حیرت بڑھتی گئی، مکانوں کو شناخت نہ کر سکا، آبادی کا پتہ تھا نہ عمارتوں کے آثار، نہ ان کے مکینوں کی خبر! ؎

از ہر کہ سخن کردم، گفتند کہ ایں جا نیست ٭ از ہر کہ نشاں جستم، گفتند کہ پیدا نیست

گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ، خانقاہیں صوفیوں سے، خرابات، رندوں سے!

یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق و دق! ؎

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ

نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے، اب حسن کہاں جسے تلاش کروں؛ وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے، پیرانِ پارسا چلے گئے، بڑے بڑے محل خراب ہو گئے، گلیاں

ناپید ہوگئیں، اور ہر طرف وحشت برس رہی تھی، اُنس ناپید تھا، ایک اُستاد کی رُباعی مجھے یاد آئی ؎

افتاد گزارم چو بویرانۂ طوس + دیدم چغدے نشستہ بر جائے خروس
گفتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ؟ گفتا خبر این ست کہ افسوس افسوس!

ناگاہ اُس محلے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا جلسے کرتا تھا شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو آہ وزاری کرتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، اُن (کے حسن) کی تعریفیں کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے (معشوقوں) کے ساتھ رہتا تھا، حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لئے بھی اُن سے جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا، محفل سجاتا تھا، حسینوں کو بلاتا تھا، اُن کی مہمان داری کرتا تھا (اور یوں) زندگی گزارتا تھا، اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کرلیتا، کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا، اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آکھڑا ہوا، اور حیرت سے تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات دیکھتا رہا، بہت صدمہ اُٹھایا اور عہد کیا کہ اب اِدھر نہ آؤں گا، اور جب تک رہوں، شہر کا قصد نہ کروں گا"۔ [۱]

بعد ازیں ابدالی فوج نے ہندوستان سے واپس جانے کے بارے میں ہنگامہ برپا کیا اور مجبوراً ابدالی کو واپس جانا پڑا۔ [۲]

---

[۱] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۳۷-۱۳۹۔ [۲] برائے تفصیل، میر کی آپ بیتی ص ۱۳۹، سرگزشت نجیب الدولہ ص ۱۳۱، خزانۂ عامرہ ص ۱۱۲۔ ملخص التواریخ ص ۲۲۵۔

ساتواں حملہ ۱۱۷۵ھ ۱۷۶۲ء | اس حملہ کا خاص مقصد سکھوں کی ہنگامہ آرائی اور شورش کی روک تھام کرنا تھا، کیوں کہ چھٹے حملے کے بعد اپنے ملک کو واپس جاتے وقت اُسے سکھوں کے ہاتھوں کافی جانی و مالی نقصانات اُٹھانے پڑے تھے،[۱]

غلام علی آزاد بلگرامی اور طباطبائی نے لکھا ہے کہ جب ہندوستان کے سرکشوں نے میدان خالی دیکھا تو اس موقع کو غنیمت جان کر لوٹ مار کشت و خون اور غارت گری شروع کر دی، ان سرکشوں کے استیصال کے لئے پھر شاہ ابدالی کو ہندوستان آنا پڑا۔[۲]

بقول میر:-

"اس بار بھی شاہ درانی ستلج کے جو ایک مشہور دریا ہے، اُس طرف تک آیا اور بے حقیقت سکھوں کے ہاتھوں نقصان اُٹھا کر واپس ہو گیا۔"[۳]

طباطبائی کا بیان ہے کہ:-

"قریب بست ہزار کس را طعمۂ شمشیر خون آشام ساخت و متاعی کہ کیفیت آن را غیر علام الغیوب احدی نمی داند بہ غنیمت برد، بعد از آں اطراف و جوانبش تاختہ بقتل و تاراج آں نواح پرداخت"[۴]

۱: میر کی آپ بیتی، ص ۱۴۹-۱۳۹، ۱۴۹، تاریخ حسینی (قلمی)، ص ۱۱۵ (الف) تا ۱۱۶ (الف)

۲: خزانۂ عامرہ، ص ۱۱۳-۱۱۴، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ)، ج ۳، ص ۷۴-۷۵،

اس حملہ کی تفصیل ملاحظہ ہو AHMADSHAH DURRANI 318 ۳: میر کی آپ بیتی ص ۱۵۵

۴: ملخص التواریخ ص ۲۲۸، نیز خزانۂ عامرہ ۱۱۴، صحیفۂ اقبال (قلمی) ص ۹۱ ب تاریخ احمد شاہ ص ۹۱ ب تاریخ مظفری (قلمی) ج ۲ ص ۱۲۳ (الف)

آٹھواں حملہ [1] ۱۷۶۷ء | اس زمانے میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ شاہ ابدالی کا مقصد انگریزوں سے جنگ کرنا اور اُن کو بنگال سے مار نکالنا ہے، اس وجہ سے انگریزوں نے ایک فوجی دستہ الہ آباد بھیج دیا تاکہ اُس سے اودھ میں مقابلہ کیا جائے۔

درحقیقت ۱۷۶۵ء اور ۱۷۶۶ء کے درمیانی زمانے میں شاہ ابدالی اپنے ملک کے انتظامی اور دیگر اندرونی امور میں مشغول رہا اور اس سبب سے اُسے پنجاب کے معاملات کو سلجھانے کا موقع نہ مل سکا اس موقع سے فائدہ اٹھاکر سکھوں نے اس علاقے پر اپنا قبضہ جمالیا اور آخر میں انہوں نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ [2]

شاہ درانی سکھوں کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا اور اس بارے میں اس نے کوشش بھی کی تھی، لیکن اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی، مجبوراً اس نے راجا الاسنگھ کو تین لاکھ سالانہ پیشکش کے وعدے پر پنجاب کا حاکم مقرر کردیا تھا، کیونکہ ابدالی فوج نے بغاوت کردی۔ اُن میں سے تقریباً چار پانچ ہزار سپاہی اپنے ملک کو واپس چلے گئے، کیونکہ کچھ دنوں سے انہیں تنخواہیں نہیں ملی تھیں، اس بنا پر ان میں بے اطمینانی پھیل گئی تھی۔ [3]

آخری حملہ ۱۷۶۹ء | شاہ ابدالی نے آخری بار سکھوں پر حملہ کیا، جب وہ کابل

---

[1] اس حملے کی تفصیل ملاحظہ ہو، AHMAD SHAH DURRANI 308-318

[2] تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص ۹، ملخص التواریخ ص ۲۷۴، خزانۂ عامرہ ص ۱۱۳، تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص ۲۵۲

[3] برائے تفصیل AHMAD SHAH DURRANI 313

اور پشاور کے مابین پہونچا تو اس کی سپاہ نے بغاوت کا پرچم لہرا دیا، تمام لاؤلشکر لوٹ لیا اور کئی سرداروں کو تہ تیغ کر دیا، شاہ ابدالی کو قندھار واپس جانا پڑا[1] اور سارا پنجاب سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔[2]

انگریز

ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کی داستان بہت طویل ہے۔ جسے یہاں اختصار کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہم صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کی سیاسی حیثیت کیا تھی، ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح مند ہو کر انہوں نے مغلیہ سلطنت کے متمول اور خوشحال صوبہ بنگال پر اپنا مضبوط اقتدار جما لیا تھا[3] ۱۷۵۹ء میں شہزادہ عالی گہر[4] جو بعد میں

---

[1] برائے تفصیل۔ AHMAD SHAH DURRANI 319-23

[2] جام جہاں نما (قلمی رامپور)، ص ۵۰۶

[3] THE OXFORD HISTORY OF INDIA (SMITH) PP 494

[4] عزیز الدین عالمگیر ثانی کے بیٹے معز الدین جہاں دار شاہ کے پوتے اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کے پڑپوتے تھے۔ ماں کا نام لال کنور تھا۔ لال کنور کی وفات کے بعد نواب زینت محل نے گود لیا تھا۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی کو فرخ سیر نے جس زمانے میں قید کر دیا تھا اسی حالت میں ۱۷ ذیقعد ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۴ جون ۱۷۲۸ء کو شاہ عالم پیدا ہوئے تھے، اصلی نام مرزا عبداللہ اور خاندانی عالی گہر تھا، بچپن میں لال میاں اور مرزا بلاقی بھی کہلاتے تھے (واقعات اظفری، ص ۲، مفتاح التواریخ، ص ۳۴۴، مرآۃ الاشباہ (قلمی)، ص ۵۳) بادشاہ ہو کر ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی لقب اختیار کیا۔

شاہ عالم ثانی کے لقب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا، دہلی سے نکل کر بنگال اور بہار کے صوبوں کو فتح کرنے کی غرض سے بہار کے حدود پر پہونچا، ا۱ بکسر (۱۷۶۴ء) کی جنگ میں انگریزوں نے شہزادہ، شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ اور میر قاسم۲ کو شکست دی۳، میر نے بکسر کی جنگ کا ذکر کیا ہے :۔

"کہ شجاع الدولہ نے کچھ نا تجربہ کاروں اور نا اہلوں کے سمجھانے سے، جو اس کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے اس لالچ میں کہ اگر صوبہ عظیم آباد ذرا سی تگ و دو سے ہاتھ آ جائے تو مفت برابر ہے، شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے کر اس طرف لشکر کشی کر دی عیسائیوں کے کشیش، یعنی فرنگیوں کے سردار نے شہر کی حفاظت کے انتظامات (مکمل) کر کے (انہیں) لکھا کہ "ہمیں جس سے پرخاش تھی اُسے ہم نے مار لیا، اور اور اس ملک سے نکال دیا۔ اب ہمیں نواب (شجاع الدولہ) اور بادشاہ سے کوئی سروکار نہیں۔ اِس حرکت (فوج کشی) کا سبب معلوم نہیں کیا ہے؟ اور فتنہ و فساد کے سلسلہ کا محرک کون ہے؟ اگر ہم سے اطاعت (قبول) کرانا منظور ہے تو ہم پہلے ہی سے مطیع و منقاد ہیں،

---

۱ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ملخص التواریخ، ص ۴۰۵-۴۰۸۔ مفتاح التواریخ ص ۳۴۰، تاریخ مظفری (قلمی) ج ۲، ص ۸۵ ب ۸۶ الف / تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص ۳۴۴-۳۴۵۔

۲ میر نے میر قاسم کی معزولی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی ص ۱۴۳-۱۴۵

۳ میر کی آپ بیتی ص ۱۵۱، ملخص التواریخ ۴۴۲۔ مفتاح التواریخ کے مؤلف کا بیان ہے کہ

(بقیہ صفحہ ۸۴ پر)

بے فائدہ زحمت اُٹھانے کی کیا حاجت ہے؟ اور اگر کچھ بے سمجھ نو دولتوں کے اکسانے پر ہمارا استیصال (ہی) مقصود ہے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں، بڑے لوگوں کا مزاج سیلاب کی طرح تند ہوتا ہے۔ جدھر کو چل پڑا بس چل پڑا، ہم لوگ خس و خاشاک ہیں، ہماری کیا طاقت اور سر و سامان ہے جو اُس کے سدِ راہ ہو سکیں، سرداروں کی طبیعت کو آندھی سے تشبیہہ دی جاتی ہے، ہم مشتِ خاک ہیں، ہمارے پاس کیا ساز و برگ رکھا ہے جو اُس کا راستہ روک دیں!"

"لیکن شاہی مشیروں نے جو نا معاملہ فہم تھے اور عقل و شعور سے بیگانے، اِس تحریر کو فرنگیوں کی بزدلی اور نامردی پر محمول کیا اور باصرار کوچ کرنے کا مشورہ دیا۔

"جب اُس شہر عظیم آباد کے نواح میں دونوں فریقوں کی ملاقات ہوئی تو فرنگی بندوقیں لے کر لڑائی پر تُل گئے اور نمک حرام مغل آقا کے خزانوں پر جھپٹ پڑے، عیسائیوں نے بڑی جرأت سے مقابلہ کیا، نواب کے ایک چیلے عیسیٰ نامی نے دلیری کا مظاہرہ

بقیہ صفحہ ۸۳) "از ہمیں وقت پایہ دولت کمپنی انگریز بلندی گرا شد و ابتدائی عمل داری کمپنی انگریز را از ہمیں زمان تصویر باید فرمود" بحالے تفصیل ص ۳۴۶ - ۳۴۸۔

نیز ملاحظہ ہو، تاریخ مظفری (قلمی) ج ۲۔ ص ۱۴۲ (الف) تا ۱۴۴ ب ۱۴۹ (الف) تا ۱۷۲ (الف) جام جہاں نما (قلمی) ص ۷۰۵ تاریخ فرح بخش (شیو پرشاد) ص ۱۷ ب تا ۳۳ (الف)

کیا اور لڑتا ہوا مارا گیا، بادشاہ فقط تماشائیوں کی طرح کھڑا دیکھتا رہا انجام یہ ہوا کہ شکست ہو گئی، نواب نے جو شہر کے آس پاس کہیں لڑ رہا تھا، توقف کرنا خلافِ مصلحت دیکھا، اور باقی ماندہ چند لوگوں کے ساتھ اپنے صوبے کی طرف چلا گیا، اتنی لمبی مسافت صرف ڈیڑھ دن میں طے کر کے اپنے ٹھکانے پر آگیا، وہاں سے نقد و جنس اور فوج بقدرِ ضرورت لے کر فرخ آباد روانہ ہوا،"[1]

بعد ازیں میر نے لکھا ہے کہ :-

"اگرچہ یہ دنیا دارِ جزا نہیں، لیکن کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے (کہ بدلہ ہاتھ کے ہاتھ مل جاتا ہے) چنانچہ اس بھاری لشکر کی یہ شکستِ فاش اُسی (غداری) کا بدلہ تھی، جو انہوں نے قاسم علی خان سے کی تھی۔"[2]

اس کے بعد کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ :-

"فتح و نصرت کے بعد نصرانیوں نے خیموں اور آلاتِ جنگ وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر اطمینان کے ساتھ اس طرف عازم ہوئے، آٹھ سات دن کے عرصے میں اودھ پہنچے جو شجاع الدولہ کا مستقر تھا، اور اس فتح کے شکرانے میں جو اُن کے تصور سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی، یہاں کسی شخص کو

---

[1] میر کی آپ بیتی، ص ۱۴۹-۱۵۱ [2] میر کی آپ بیتی، ص ۱۵۱

آزار نہیں پہنچایا، ایک ہفتے کے بعد بادشاہ کا دو لاکھ روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا کہ حضرت بطور خود رہیں، اب ہم جانیں اور ملک۔[1]

اس صلح نامے کی رُو سے شہزادہ عالی گہر نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی تفویض کر دی[2] اور انگریزوں نے بنگال کی مال گزاری میں سے بادشاہ کے لئے ۲۴ لاکھ سالانہ مقرر کر دیئے۔[3]

لارڈ کلائیو نے نواب وزیر (شجاع الدولہ) سے جو اُس زمانے میں مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور پیشوا سمجھے جاتے تھے، مصالحت کر لی اور یہ طے پایا کہ نواب پچاس لاکھ روپیہ صوبہ اودھ کے عوض ادا کرے، اس صوبے سے الہ آباد اور اس کے اضلاع الگ کر کے بادشاہ شاہ عالم کو دیدیئے گئے، شجاع الدولہ کی وفات کا میرؔ نے ذکر کیا ہے۔[4]

اُس کی موت پر ماتم کرتے ہوئے میرؔ نے لکھا ہے کہ:-

"نواب کے ماتم میں سارا عالم سیاہ پوش ہو گیا، یہ حادثہ بہت سخت ہوا، اگر آسمان ہزار سال گھومتا رہے تب کہیں ایسا ہمہ تن جرأت اور سراپا مروّت سردار پیدا ہوتا ہے۔"[5]

---

[1] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۵۱

[2] سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲، ۷۷، نیز ملاحظہ ہو، جارج فارسٹر (انگریزی) ج ۱ ص ۱۶۹۔ ۱۷۰۔

[3] سیر المتاخرین (فارسی) میں ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ لکھا ہے ج ۲، ص ۸۱ مفتاح التواریخ ۳۴۶

[4] شجاع الدولہ کی وفات ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ روز پنجشنبہ کو چار گھڑی باقی رہے پر ہوئی تھی۔ تاریخ اودھ ۲/۲۹۴ میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۷۵

[5] میر کی آپ بیتی ص ۱۵۱۔

دہلی تا پالم | بکسر کی شکست کے بعد بادشاہ کا قیام الہ آباد میں قرار پایا۔ اب گویا بادشاہ انگریزوں کی حراست میں تھے۔

الہ آباد میں شاہ عالم کا قیام تقریباً سات برس رہا۔ پچھلی ناکامیوں اور ناگفتہ بہ حالات نے انہیں پست ہمت اور بہت افسردہ کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں دل بہلانے کی بے حد ضرورت تھی۔ اس زمانے میں بعض کمینہ اور نالایق امیر بھی ان کے دربار میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے ناچنے گانے والی عورتیں پیش کرنا شروع کر دیں۔ ملخص التواریخ کے مولف کا بیان ہے کہ :۔

"بعضی از سفلہ کان ملازم بادشاہ مثل حسام الدین خان و راجہ رام ناتھ و بہادر علی خاں محلی بنا بر مناسبت طبیعت کہ با بادشاہ داشتند تقرب می یافتند خصوصی حسام الدین خان کہ زنکہ ہای نوخاستہ را برقص و خوانندگی تربیت کردہ بخدمت بادشاہ می رسانید۔"[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے دربار میں ہر وقت رقص و سرود کا مشغلہ رہنے لگا۔ اور اس وجہ سے عیش پرستی اور کاہلی ان کا شیوہ بن گیا۔

شاہ عالم الہ آباد میں رہتے رہتے تنگ آ چکے تھے اور دہلی جانے کے لئے بے قرار تھے۔ مگر کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی کہ یہ آرزو بر آئے۔ جب انہیں مرہٹوں کی دعوت ملی تو انگریزوں اور شجاع الدولہ دونوں کی مرضی کے خلاف دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔[2]

---

[1] ملخص التواریخ۔ ص ۴۴۳

[2] ملخص التواریخ۔ ص ۴۴۹۔۴۵۰ وقائع بعد از وفات عالمگیر۔ (قلمی) ص ۱۶۶۔۱۶۷ الف

کچھ دنوں فرخ آباد میں قیام کرتے اور نئے نواب مظفر جنگ بن احمد خان بنگش سے نذرانہ لیتے ہوئے ۔ [1] ۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو دہلی میں داخل ہوئے ۔ [2]

شاہ عالم بادشاہ دہلی کے قلعہ میں پہونچ تو گئے لیکن اب ان کے قبضے میں ملک و مال کچھ بھی نہ تھا۔ حالانکہ اب بھی ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے بادشاہ کہلاتے تھے ۱۱۹۴ھ تک تمام ہندوستان اور مغلوں کے تمام مقبوضات دوسروں کے قبضے میں جا چکے تھے ۔ بقول ہرچرنداس ۔ التمش کے دورِ حکومت سے اس وقت یعنی (اورنگ زیب بادشاہ) کے عہد تک ہندوستان کے بائیس صوبے شاہان مغلیہ کے زیر نگیں تھے ۔ محمد شاہ کے زمانۂ حکومت (۱۱۳۱ھ) سے اسی زمانے تک (۱۱۹۴ھ) اُن صوبوں کا حال ذیل ہے ۔ کابل، قندھار اور پشاور، کشمیر کے تین صوبے احمد خاں (شاہ) ابدالی کے لڑکے کے قبضے میں ہیں ۔ اٹک (ندی) کے اس کنارے سے صوبہ ملتان، ٹھٹھہ اور بھکر کے تینوں صوبے اور علاوہ ازیں کرنال وغیرہ کے بعض محالات پر سکھ قابض ہیں ۔ چھ صوبہ ہائے دکن، گجرات اور مالوہ، یہ آٹھ صوبے مرہٹوں کے قبضے میں ہیں اور ان کے علاوہ جھانسی، گوالیار کا قلعہ اور کالپی بھی مختصر یہ کہ دریائے چنبل کے کنارے تک کے تمام اقطاع مرہٹوں کے تصرف میں ہیں دکن کے صوبوں میں حیدرآباد کا ایک صوبہ میر نظام علی خاں ولد

---

[1] ملخص التواریخ ۔ ص ۵۰۴

[2] جام جہاں نما (قلمی)، ص ۵۰۹ ۔ وقائع عالم شاہی ۔ ص ۷۰

نظام الملک آصف جاہ کے قبضے میں ہے۔ بنگال کے تین صوبوں، بنگالہ، ڈھاکہ اور عظیم آباد پر قاسم علی خاں کی معزولی کے بعد فرنگی قابض ہیں۔ صوبہ اودھ، الہ آباد اور بعض اقطاع مثل سنبھل، مرادآباد اور اٹاوہ وغیرہ جو اکبرآباد اور دہلی کے تعلقہ میں ہیں۔ غرض کہ دریائے گنگا کے کنارے تک کے کل علاقے نواب آصف الدولہ وزیرالممالک بہادر بن نواب شجاع الدولہ کے قبضے میں ہیں۔ اور ان صوبوں میں بھی فرنگی ملازم ہو کر مداخلت کرتے ہیں۔ اجمیر کا صوبہ راجاؤں کے تسلط میں ہے۔ اکبرآباد کا صوبہ اور دہلی کے بعض محالات نجف خاں کے قبضے میں ہیں۔ دہلی کا صوبہ بادشاہ (شاہ عالم) کے زیرنگیں ہے [۱]

سودا نے شہر آشوب میں اس حقیقت کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے،

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند + سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے لپند + جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول [۲]

شاہ عالم کی وفات (۱۸۰۶ء) کے بعد اکبر ثانی [۳] اس کے جانشین ہوئے مگر حالات بدستور سابق رہے۔ بہادر شاہ ظفر (جلوس ۱۲۵۳ھ) کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز دہلوی لکھتے ہیں :۔

"بجز نام سلطانی اختیار ندارد و ہمہ ملک ہندوستان در قبضۂ انگریزاں

---

[۱] چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۴۸۶-۴۸۴

[۲] کلیات سودا ج اوّل، ص ۳۶۷

[۳] ۲۸ رجمادی الثانی ۱۲۵۳ھ (مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو مغرب کے بعد اسّی سال کی عمر میں اکبر ثانی نے رحلت کی۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۹۶

است[1]
۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر کے انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے۔

(ج) مرہٹے

اورنگ زیب نے اپنی عمر عزیز کے آخری تیس سال دکن میں رہ کر مرہٹہ طاقت کا قلع قمع کرنے میں صرف کئے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں تو اس مقصد میں کامیاب رہا لیکن کوئی ایسا بندنہ باندھ سکا جو مستقبل کے لئے بھی اس خطرے کا سدِ باب کر دے۔ اصل میں دکن کی جغرافیائی حالت نے مرہٹوں کا مکمل خاتمہ ناممکن کر دیا تھا۔ عالمگیر نے مرہٹوں کی اجتماعی طاقت اور قوت کو ختم کر دیا تھا اور اگر اس کے جانشین پوری طرح سے جدوجہد کرتے اور اس کی وصیت پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے اور جنگ تخت نشینی میں اپنی قوت ضائع نہ کرتے تو مرہٹوں کی سیاسی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرہٹوں نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو از سرِ نو حاصل کرنا شروع کیا اور انہوں نے دکن کے اُن علاقوں پر دھیرے دھیرے قبضہ کر لیا جو اُن سے مغلوں نے بزورِ شمشیر چھین لئے تھے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر انہوں نے شمالی ہندوستان کی طرف اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ دکن اور گجرات کی صوبہ داری

---

[1] تاریخ عزیزی (قلمی)، ص ۳۰ (الف)

پر امراء آپس میں شمشیر زنی کرتے تھے اور اس طرح مرہٹوں کی طاقت بڑھتی تھی[۱] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مرہٹوں کا طوفان شمالی ہند کی طرف بڑھتا تھا تو اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے حکومت کی طرف سے مرہٹوں کو مراعات دی جاتی تھیں تاکہ وقتی طور پر یہ طوفان رک جائے۔ امیر الامرا صمصام الدولہ اور اعتماد الدولہ قمرالدین خان نے مرہٹوں کو تین لاکھ روپے دے کر ان سے شاہی ملک سے واپس لوٹ جانے کی درخواست کی تھی[۲]

غلام طباطبائی نے مغلیہ امراء کی پست ہمتی اور بزدلی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :۔

ازیں ہمہ امرائے مقتدر مشہور کسے را جرأت نبود کہ خود بر سر مرہٹہ تاختہ و کار را د (بادشاہ) ساختہ نامی بر آورد"[۳]

"امرائے بے مقدور و منصب داران ... اکثرے را لیاقت کاری ہم نبود، ہر یکے آرزو مند مصالحہ با مرہٹہ بودند"[۴]

۱۔ زوال سلطنت مغلیہ (انگریزی) جادو ناتھ سرکار) ج ۱ ص ۷ ۔ ۶

۲۔ سیر المتاخرین (فارسی)، ص ۷ ۔ ۴۶۹۔ تذکرۃ الملوک کا مصنف رقم طراز ہے کہ مغل امراء عیش و عشرت میں اس قدر غرق ہو چکے تھے اور ان کے قوائے عمل اس قدر شل ہو چکے تھے کہ مرہٹوں سے منہ کی کھانے کے بعد بھی ان کی حمیت بیدار نہ ہوتی تھی کہ آگے بڑھ کر ان کے دانت کھٹے کر دیں۔ ص ۱۳۳ (الف)

۳۔ سیر المتاخرین (فارسی) ص ۴۷۴

۴۔ سیر المتاخرین، ص ۴۷۵، ۴۷۴

جب فرخ سیر بادشاہ اور سید برادران میں کش مکش چل رہی تھی تو سید حسین علی خاں نے مرہٹوں کو اپنا مددگار اور معاون بنانے کے لئے بالاجی وشوا ناتھ کو دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا[1] مآثر الامراء کا مصنف رقم طراز ہے کہ جس دن سے مرہٹوں کو دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا پروانہ ملا اس دن سے ان کی طاقت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی[2]

بادشاہ نے مرہٹوں کو یہ حق دینے سے انکار کر دیا تو سید حسین علی خاں نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر دھاوا بول دیا[3] قائم چاند پوری نے اسی واقعہ کو ان اشعار میں بیان کیا ہے :-

کفار سے کیا ہے جو یہ آپ نے ملاپ — حاصل تو کیا ہے اس سے مگر خلق کا سناپ
کیا آج بن سمجھے ہو تم مرہٹوں کا پاپ — پوجا کو کیس گدھو بھی سدھاریں گے کل کو آپ
کہتے ہیں عنقریب " گرد کا کڑا ہے "[4]

میر محمدی بیدار نے اپنے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے کہ جب امرا بذاتِ خود دشمنوں سے ساز باز کر لیں تو اُن کے مطیع سپاہی بھر کیا کر سکتے ہیں۔

" جب اہل ہی مل جائیں کیا سپاہ کرے "[5]

---

[1] منتخب اللباب ج ۲، ص ۸۰، ۷، خزانۂ عامرہ ص/ ۴۲، سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲/۱۰۴۱
[2] مآثر الامراء ۱/۳۲۴ نیز ملاحظہ ہو ۲/۳۵۷-۳۵۸۔
[3] منتخب اللباب ۲/۸۷-۸۶، خزانۂ عامرہ ص/۴۲، سیر المتاخرین (فارسی) ۲/۴۱۲
[4] نقوش (اکتوبر ۱۹۶۱ء) دیوان قائم چاند پوری (قلمی) ص ۱۸۹ الف۔
[5] دیوان بیدار ص/۱۰

مختصر یہ کہ جس دن امیر الامراء حسین علی خاں مرہٹوں کو اپنا معاون بنا کر دارالسلطنت میں لایا، مغلیہ سلطنت کی طاقت، وقار اور سطوت کو بہت بڑا دھکا پہنچا تھا۔[۱]

۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۰ء تک بالاجی وشوا ناتھ، مالوہ اور گجرات کے صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرتا رہا۔[۲] اور آخر میں یہ دونوں صوبے ان کے حوالے کر دیئے گئے۔[۳]

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں :۔

"غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ.... ان میں ایک سردار ہے، اس قوم نے کچھ عرصہ سے اطراف دکن میں سر اٹھایا ہے۔ اور تمام ملک ہندوستان میں اثر انداز ہے۔ شاہان مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دور اندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی بنا پر ملک گجرات مرہٹوں کو دے دیا اور پھر اسی سست اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد کر دیا اور ان کو وہاں کا صوبہ دار بنا دیا........ مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے باج لینا شروع کر دیا۔"[۴]

اس سے مرہٹوں کی ہمت اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور حکومت کی کمزوری

---

[۱] خافی خاں ۲/۸۴، ۸۶-۷۵، ۷۸۴۔ لیٹر مغلس ۲/۱۹۴

[۲] خزانۂ عامرہ ص/۴۳ تاریخ ہندی دقلمی، ص/۵۵

[۳] لیٹر مغلس ۲/۲۷۸

[۴] سیاسی مکتوبات۔ ص ۹۹

کا راز بھی ان پر ظاہر ہوگیا [د مرہٹہ کہ ضعف ارکان سلطنت دریافتہ] بعد ازیں انہوں نے شمالی ہند کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ طباطبائی نے لکھا ہے :۔

بدیں سبب کہ مرہٹوں نے گجرات و مالوہ کو جو تدارک حضور سے ۔۔۔ عمل میں نہ آیا تھا، اور لوٹ مار اور دست ہوس ان کا دراز ہوتا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھانا شروع کیا اور بعد گزرنے ایک زمانہ، ماہ وسال کے انہوں نے رفتہ رفتہ اسہل مدت میں ایک دو محال لیتے ہوئے حصار گوالیار تک جو نہایت قرب و جوار اکبرآباد میں واقع ہے، آپہونچے اور متصرف ہو کر دم استقلال مار رہے تھے، جاگیرات امیرالامرا اور محالات خالصہ کی لوٹ مار میں بھی جرأت کی جب گوالیار سے بھی گزر کر اجمیر و اکبرآباد کے متعلقات میں بھی قدم زن ہوئے[۱]

اس کے بعد مرہٹے اور آگے بڑھے اور سانبھر میں جو کہ شاہجہاں آباد سے سو کوس کی دوری پر واقع تھا۔ ڈاکہ مارا۔ اس وقت وہاں کے فخرو نامی فوجدار نے چار ہاتھی اور تین لاکھ روپے کی لاگت کا مال مرہٹوں کو دے کر امان چاہی۔ مرہٹوں نے اس پیش کش پر توجہ نہ کر کے جس طرح چاہا اس علاقے کو لوٹا کھسوٹا۔ فوجدار مذکور کو صرف اسی لباس میں جو اس کے جسم پر تھا چھوڑ دیا۔ اس قصبہ کے قاضی نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے عیال و اطفال کو مار دیا۔ اس رسم کو اصطلاح ہند میں جوہر کہتے ہیں اور مرہٹوں کا مقابلہ

---

[۱] سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ۲، ۹۰

کرتا ہوا کام آیا۔[1]

کئی برسوں سے دربار میں یہ ہو رہا تھا کہ جب گجرات و مالوہ[2] میں مرہٹوں کی یورش کی خبر دربارِ معلیٰ تک پہنچتی تھی تو محمد شاہ کو دارالسلطنت کے نواحی باغوں اور سیرگاہوں میں سیر و تفریح کے لئے یا شاہی شکارگاہوں میں شکار کھیلنے کی غرض سے بھیج دیا جاتا تھا[3] کیوں کہ عیش پرست اور بزدل امراء مرہٹوں سے آمنے سامنے ہو کر مقابلہ کرنے میں پہلو تہی کیا کرتے تھے اور آپسی جھگڑوں میں اپنے جنگی وسائل ضائع کرتے تھے[4]

غلام طبا طبائی رقم طراز ہے :۔

"امرائے نفاق پیشہ حضور کہ بہرہ از حمیت و ایمان نداشتند چنیں فتنہ ہائے بزرگ مذکور را سہل و خورد شمردہ ہمیشہ در فکر استیصال امثال خود مشغول و بہمیں اعمال مسرور و مشعوف بودند و بشومی کینۂ دیرینہ از قتل مسلمین و سادات پروائی نداشتند"[5]

---

[1] سیر المتاخرین ۹۰/۲۔۹۱ نیز ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۷۶، ۴۴، ماثر الامراء ۴۵۳/۲۔

[2] مالوہ میں مرہٹہ گردی کے لئے ملاحظہ ہو۔ تاریخ شہادت فرخ سیر بادشاہ و جلوس محمد شاہ (قلمی)، ص ۹۶ (الف)، و ۱۰۵ ب

[3] لیٹر مغلس (انگریزی)، ۲۷۸/۲

[4] سیر المتاخرین (فارسی)، ۴/۲،۷۴ نیز احوال الخواقین (قلمی)، ص ۲۰۱ ب تا ۲۰۲ (الف)

[5] سیر المتاخرین (فارسی) ۷۷/۲، ۴

مغلوں کی اس پست ہمتی سے فائدہ اٹھاکر باجی راؤ نے جو ایک مرہٹہ سردار تھا۔ دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں غارت گری شروع کردی اور ۱۷۳۷ء (۱۱۴۹ھ) میں ایک دفعہ تو پھر دلی تک لوٹ مار کرتا ہوا آ گیا تھا۔ اس موقعہ پر کالکاجی کا میلہ ہو رہا تھا اور شہر کے بہت سے لوگ وہاں برائے زیارت اور تفریح جمع تھے۔ مرہٹوں نے لوٹ مار مچائی۔ وہاں سے سراسیمہ بھاگ کر تماشائیوں نے شہر میں آکر اس حادثہ کی خبر پہونچائی تو محمد شاہ اتنا گھبرایا کہ جمنا کے دہلی گھاٹ سے پندرہ سے بیس کوس تک کے گھاٹوں سے کشتیاں منگواکر قلعہ کی کھڑکی کے نیچے جمع کرا دیں تاکہ بوقت ضرورت آسانی سے فرار ہو سکیں۔ [1] شاہی امراء کے مقابلے کے خوف سے مرہٹے آگے نہ بڑھے۔ واپسی میں انہوں نے قصبہ ریواڑی اور پاٹودی کو لوٹا اور گھروں میں آگ لگادی۔ اور وہاں سے گجرات اور مالوہ کی طرف چلے گئے۔ [2]

مرہٹوں کے ایک حملے کا میر نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے [3] ابھی یہ ساری بلائیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ چرخ فتنہ انگیز نے ایک نیا ہنگامہ برپا کر دیا۔ عجب افراتفری پھیل گئی۔ یعنی جنکو نامی سردار بھاری فوج لے کر دکن سے آیا اور اس کا لشکر دہلی کے اطراف میں خیمہ زن ہوا۔ بہتوں کے دل ہل

---

۱ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ)، ۲/۹۹؛ تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی)، ص ۱۹۹-۲۰۰؛ اخبار محبت (قلمی)، ص ۵۵۴؛ مجمع الاخبار (قلمی)، ص ۴۴۹ الف؛ عمادت السعادت (قلمی)، ۲۱ب ۲۲(الف)، ۲ سیر المتاخرین (فارسی)، ۲/۴۷۶؛ مجمع الاخبار (قلمی)، ۴۴۹ (الف)، عماد السعادت،

گئے، ایک ہلڑ مچ گیا امیروں کی سٹی گم ہوگئی، بادشاہ و وزیر نے اُس سے صلح کرلی۔ دتّا نامی سردار کو جو اس بہادر اور جیالے جوان (جنکو) کا مدارالمہام تھا۔ نجیب الدولہ کی طرف بھیج دیا جو جمنا کے کنارے وسطی علاقے میں قدم جمائے بیٹھا تھا۔ وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی [1]

رفتہ رفتہ مرہٹوں نے گجرات سے نارنول اور لاہور تک اپنا تسلّط جما لیا اور چوتھ وصول کرنے کے لئے اپنے افسروں کو مقرر کردیا۔ اب مرہٹوں کے زیرنگیں، بہار، بنگال، اڑیسہ اور بندیلکھنڈ کے صوبے بھی آ گئے تھے [2] بنگال میں مرہٹوں نے جو ظلم و ستم توڑے اس کا حال بنگال کے ایک مشہور شاعر گنگا رام نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"برگیوں (مرہٹوں) نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کیا۔ . . . کچھ لوگوں کے انہوں نے ہاتھ، ناک، اور کان کاٹ لیے۔ خوبصورت عورتوں کو وہ رسیوں میں باندھ کر لے گئے۔ جب ایک برگی زنا بالجبر کر چکتا تھا تو دوسرا کرتا تھا۔ عورتیں چیخیں مارتی تھیں . . . . انہوں نے گھروں کو آگ لگا دی اور ہر طرف

---

[1] میر کی آپ بیتی، ص ۱۱۷، ۱۱۸ یہ واقعہ ۱۱۷۲ھ میں پیش آیا تھا۔ سرگزشت نجیب الدولہ ۱۲۰۱۱ تاریخ مرہٹہ و ابدالی/ص ۲۴-۲۵، ماثرالامراء ۲/۳۵۶

[2] مرہٹوں کے تسلط و اقتدار سے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو۔ سیرالمتاخرین (فارسی)، ۲/۶۲۴، حدیقۃ الاقالیم (قلمی)، ص ۶۲۳، ماثرالامراء (فارسی)، ۲/۳۵۲ تا ۳۵۸، تاریخ شاکرخانی (قلمی)، ص ۱۳ ب، خزانۂ عامرہ ص ۴۶-۴۵، اخبار محبت (قلمی)، ص ۸۶ تا ۸۸، تذکرۃ الملوک (قلمی)، ۱۳۴ ب۔

لوٹ مار کرتے ہوئے گھومتے سنہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں بھاؤ نے دہلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہی حرم اور سرکاری کارخانہ جات پر مرہٹے قابض ہو گئے۔[۱] دیوان خاص کی چھت پر لگا ہوا چاندی سونا نکلوا لیا، اور اس کے بدلے نو لاکھ روپیہ حاصل کئے۔[۲]

جعفر علی حسرت نے اپنے شہر آشوب میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

جواہر اور خزانہ تو سب لٹا یکسر   رہیں تو کس پہ یہ فرقے کے نوکر اوچاکر
رہا نہ مال بجز سنگ، کوٹھوں کے اندر   جو چھت تھی چاندی کی دیوانِ خاص میں زر
سو وہ وزیر نے کی خرچ بھیج کر ٹکسال[۳]

بھاؤ نے نارو شنکر کو قلعۂ شاہ جہاں آباد کا قلعہ دار مقرر کیا۔[۴] اس کی دست درازی اس حد تک بڑھ گئی کہ اُس نے بزرگانِ دین کے مزاروں پر بھی ہاتھ ڈالا۔ اور قدم شریف، مقبرہ شیخ نظام الدین اولیاء اور محمد شاہ بادشاہ کے مزاروں کے سونے چاندی کے اسباب اٹھا کر لے گیا۔[۵] ہندوستان میں مرہٹوں کے ظلم و ستم کا ذکر آنند رام مخلص نے شاعرانہ انداز میں یوں کیا ہے:

بر دلِ ما تیرہ روزان از صفِ مژگاں گذشت

---

۱ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی)، ۲/۸۶-۸۸،
۲ انشائے آنند رام مخلص (قلمی)، ص ۵ (الف)، ۳ نقوش (اکتوبر ۱۹۶۲ء)، ص ۲۴۷۔
۴ سیر المتاخرین (فارسی)، ص ۲/۹۱۲ ۵ تاریخ احمد شاہ (قلمی)، ص ۲۳ ب، سیر المتاخرین (فارسی)، ۲/۱۹۲

آنچہ از فوج دکن بر مُلک ہندوستاں گذشت
در چمن بر برگ گلہا نگذرد صبح از نسیم،
بر گریباں انچہ از دستم شبِ ہجراں گذشت[1]

دہلی کے باشندوں کے دل میں مرہٹوں کا کتنا خوف پیدا ہوگیا تھا اور کس قدر ان کے لئے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ،[2] مرزا مظہر جان جاناں[3]، شاہ عبدالعزیز دہلوی۔[4] اور سلیم اللہ[5] کی تصانیف اور ملفوظات سے ہوسکتا ہے۔

غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ متھرا اور اکبر آباد کے مابین ایک مقام پر مرہٹوں نے مسلمان شہداء کی لاشوں کو ان کی قبروں سے کھدواکر نکلوایا اور اُن کے دانت توڑتے اور باآواز بلند کہتے "انہیں دانتوں سے انہوں نے گائے کا گوشت کھایا تھا"۔[6]

اِن حالات سے مجبور ہوکر شاہ ولی اللہ نے شمالی ہندوستان کے صاحب اقتدار امراء کے اشتراک سے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آکر مرہٹوں کی طاقت توڑنے کے لئے مجبور کیا، ان امراء میں نجیب الدولہ نے[7]

---

[1] انشائے آنند رام مخلص (قلمی)، ۴ (ب)، نیز ملاحظہ ہو۔ دیوان قائم چاند پوری (ق)، ۱۸۸ (الف) تا ۱۹۹ (ب)۔
[2] سیاسی مکتوبات، ص ۴۵۔ ۴۸، [3] کلمات طیبات، ص ۴۴، ۵۳۔ [4] الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر)، ص ۱۲۰۔ ۱۲۱، [5] مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی)، ۱/ ۴۹، ۵۰
[6] عماد السعادت (ق)، [7] ملاحظہ ہو سرگذشت نجیب الدولہ

بہت اہم رول ادا کیا۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی مرہٹوں سے لڑنے کے لیے آیا، اور پانی پت کی وہ مشہور خوں ریز جنگ ہوئی جو "تیسری جنگ پانی پت" کے نام سے مشہور ہے۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر اس سے زیادہ خوفناک اور تباہ کن، جنگ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں اتنے مرہٹے مارے گئے تھے کہ بقول جادو ناتھ سرکار، سارا مہاراشٹر سوگوار ہو گیا تھا۔[1]

جنگ پانی پت کا میر نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[2]
مگر چند ہی برسوں میں مرہٹوں نے پھر اپنا شیرازہ جمع کر لیا۔
۱۷۷۱ء میں دہلی پر دوبارہ اُن کا قبضہ ہو گیا۔[3]

مرہٹوں نے دہلی پر پوری طرح سے اپنا اقتدار جما کر شاہ عالم ثانی کو الٰہ آباد سے بلا کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اور شاہ عالم نے اس کے صلے میں پٹیل کو مختار السلطنت مقرر کیا۔ مرہٹوں کے تسلط کا ذکر کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ،

"چونکہ بادشاہ کے حضور میں نجف خاں کے آدمیوں میں سے جو برسرِ اقتدار

---

[1] جنگ پانی پت اور اس کے نتائج کے لیے ملاحظہ ہو۔ سرگذشت نجیب الدولہ، بیان جنگ پانی پت از کاشی راج، منزل فتوح، تاریخ فیض بخش، از شیو پرشاد خزانۂ عامرہ، میراث احمدی، تاریخ سلطانی گل رحمت۔ تاریخ درانی، گلشن رحمت، [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو میر کی آپ بیتی، ۱۲۱۔۱۲۵ [3] مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی)، ۲۱/۳ تا ۲۳

[4] نجف خاں کا مولد اصفہان تھا، چونکہ مرزا ایران کے بادشاہ سے متوسل تھا، اس لیے نادر شاہ نے اسے قید کر دیا تھا۔ جس وقت محمد شاہ کا ایلچی نواب عزت الدولہ مرزا محسن نادر شاہ

بقیہ صفحہ ۱۰۱ پر

تھے اُن میں سے کوئی باقی نہ رہا۔ مرہٹے جو قریب ہی تھے، حاوی آگئے۔ اور مختار بن کر دندنانے لگے۔ بادشاہ نے تمام اختیارات مرہٹے کو سونپ دیئے۔ اور نجف خاں کے آدمیوں کا زور ختم ہوگیا۔ اب اکثر معاملات میں مرہٹے ہی سے مشورہ کیا جاتا ہے، اور تمام امور اسی کی منشاء کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ مرہٹے کی فوج بھی شاہجہاں آباد پہونچ گئی اور مشہور ہے کہ اس نے پوری طرح قبضہ جمالیا ہے۔ . . . اب مرہٹہ مالک الملک ہے۔ جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے۔ بادشاہ کو دست برداشتہ کچھ دے دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسے لے جاتا ہے۔ چنانچہ شہر میں ایک مہینہ رہا اور پھر علی گڑھ لے گیا۔ . . . . . وہاں سے بادشاہ کو راجپوتوں پر چڑھا کر لے گیا۔ انہوں نے مقاومت کی، کچھ دنوں بعد راجپوتوں سے صلح کر کے بادشاہ شہر دہلی میں آگیا اور مرہٹہ شہر اکبرآباد میں رہ گیا[له]

(بقیہ صفحہ ۱۰۰ کا)

کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے مرزا کی بہن سے عقد کیا تو مرزا کو خلاصی نصیب ہوئی اور وہ اپنی بہن کے ساتھ سولہ سال کی عمر میں ہندوستان آیا۔ مرزا نے کچھ دنوں تک قاسم علی خاں، نواب بنگالہ کے ہاں ملازمت کی۔ قاسم علی خاں کا جب وقت بگڑا تو مرزا منیرالدولہ کے توسط سے شاہ عالم کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ بادشاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد آیا اور کارنمایاں انجام دیئے اور ذوالفقارالدولہ نواب نجف خاں بہادر غالب جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوا اور بعد از یں امیرالامرائی کے عہدے پر سرفراز ہوا۔ ۲۲ راپریل ۱۷۸۲ء کو وفات پائی اور شاہ مرداں کے قریب دفن ہوا۔ مفتاح التواریخ ص ۳۵۸۔۳۵۹۔

[له] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۸۷، ۱۸۶۔۱۸۹

مگر انگریزوں کی روزافزوں طاقت کے سامنے ان کے قدم نہ جم سکے، دھیرے دھیرے شمالی ہند سے مرہٹوں کا تسلّط از خود ختم ہوگیا۔ بعد میں یہ سارا گروہ خود بھی پراگندہ ہوکر افتراق و انتشار کا شکار رہا اور مرہٹہ طاقت مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔

(د) روہیلے

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں افغانوں کے مختلف قبیلے تلاشِ معاش میں ہندوستان آئے اور دوآبہ کے علاقوں میں بس گئے۔ ان میں سے ایک قبیلہ روہیلکھنڈ میں بریلی کے قرب وجوار میں آباد ہوا۔ داؤد خاں نامی ایک افغان سردار نے وہاں روہیلہ افغان حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان روہیلوں نے اٹھارہویں صدی کی سیاست میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ داؤد خاں کے انتقال (۱۷۲۱ء) کے بعد اس کا متبنّیٰ علی محمد خاں جانشین ہوا۔ پہلے مرکزی حکومت نے اسے مرادآباد کی فوجداری کے عہدے پر فائز کیا۔ اس دوران میں اس نے قرب وجوار کے زمینداروں اور جاگیرداروں کو بے دخل کرکے ان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اور تھوڑی مدت میں بریلی کے ضلع میں وہ ایک بڑی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے آنولہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔

اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کرکے مرکزی حکومت کے کان کھڑے ہوئے اور اس کے استیصال کے لئے محمد صالح کو بھیجا گیا۔ اس جنگ میں علی محمد خاں کو فتح ونصرت حاصل ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد اس کا اقتدار اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ دربارِ مغلیہ سے اسے نواب کا خطاب ملا اور نوبت بجانے کی

اجازت بھی دے دی گئی۔ لہ

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، نادر شاہ کے حملے نے مرکزی حکومت کو صرف مفلوج ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ اس کی سیاسی اور فوجی کمزوری کو نمایاں کر دیا تھا۔ اب دربار مغلیہ کی شان و شوکت سیاسی مخالفین کو ہراساں اور خوفزدہ نہ کر سکتی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر علی محمد خاں نے اپنی حکومت سے ملحق گرد و نواح کے علاقوں پر چڑھائی کر کے ان پر تسلط جما لیا۔ مراد آباد کے نائب صوبہ دار، راجا ہرنند آرورا کو شکست دے کر وہ مراد آباد، ہردوئی، اور بدایوں کے علاقوں پر قابض ہو گیا۔ دربار مغلیہ کے امراء آپسی عناد و نفاق کی وجہ سے اس بڑھتے ہوئے فتنے کو دبانے میں ناکامیاب رہے اور انہوں نے بادشاہ سے علی محمد خاں کو کیٹھیر کے علاقے کا جو بعد میں روہیلکھنڈ کہلایا، قانونی گورنر مقرر کرا دیا، مختصر یہ کہ ۱۷۴۰ء میں بدایوں، بریلی اور مراد آباد پر علی محمد خاں کا قبضہ تھا۔

۱۷۴۱ء اور ۱۷۴۸ء کے درمیانی وقفہ میں اس نے پیلی بھیت، کمایوں، اور بجنور پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ کی فوج کشی کی وجہ سے قندھار سے سیکڑوں کی تعداد میں افغانوں نے آ کر علی محمد خاں کے ہاں ملازمت کر لی تھی۔ اس وجہ سے ۱۷۴۲ء میں اس کے پاس تیس چالیس ہزار کی ایک بڑی فوج تھی۔

صفدر جنگ، میر آتش کے اکسانے پر محمد شاہ بادشاہ نے ۱۷۴۵ء میں روہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا، بنگڑھ کے مقام پر شاہی فوج اور علی محمد خاں

لہ سیر المتاخرین (فارسی)، ج ۲، ص ۹۲

کی فوج میں تصادم ہوا ، موسم برسات کی وجہ سے رسد پہونچنے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، لہٰذا وزیر الممالک نظام الملک آصف جاہ کے مشورہ پر محمد شاہ نے روہیلہ سردار سے صلح کرلی اور علی محمد خاں کو سرہند کی فوجداری تفویض ہوئی۔ ^۱

سنہ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر سنتے ہی علی محمد خاں سرہند سے روہیلکھنڈ واپس چلا آیا اور از سر نو اپنے علاقہ پر قبضہ حاصل کیا۔ اسی زمانے میں محمد شاہ بادشاہ فوت ہوا اور ملک میں بدامنی اور بدنظمی پھیل گئی ^۲

سنہ ۱۷۴۸ء میں وفات سے پہلے علی محمد خاں نے روہیلہ سرداروں کو بلاکر حکومت کا کام ان کے سپرد کیا کیونکہ اس کے لڑکوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو امور ملکی و مالی کو انجام دے سکتا۔ لہٰذا حافظ رحمت خاں ^۳ کو جانشین مقرر کیا گیا اور اسی طرح دوسرے سرداروں کو بھی عہدے تفویض ہوئے۔ ^۴

مختصر یہ کہ علی محمد خاں کی ریاست چند امراء کے ہاتھوں میں چلی گئی اور آپس میں انہوں نے اس علاقے کو تقسیم کر لیا۔ حافظ رحمت خاں نے پیلی بھیت کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اور اسی طرح دیگر امراء نے علیحدہ علیحدہ اپنے مرکز قائم کئے۔ ^۵

---

^۱ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سفرنامہ آنند رام مخلص۔

^۲ سیر المتاخرین (فارسی)، ج ۳ ص ۲۳ ۔ تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۷۷ ب۔

^۳ ابتدائی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ حیاتِ حافظ رحمت خان ص۔ ۱۳ - ۱۶۔

^۴ ملاحظہ ہو۔ حیات حافظ رحمت خان۔ ص ۳۴ - ۳۹

^۵ سیر المتاخرین (فارسی)، ج ۳ ص ۲۰۷، گل رحمت ص ۵۴، ماثر الامراء (فارسی) ج ۲، ص ۸۴۱ تا ۸۴۳۔

قائم خان بنگش اور حافظ رحمت خان جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ہندوستان میں آئے ہوئے افغان قبائل میں سے ایک قبیلہ فرخ آباد میں آباد ہوا تھا۔ اس قبیلے نے محمد خان بنگش کی قیادت میں عروج حاصل کیا تھا۔ ان کی حکومت میں مین پوری، ایٹہ، بدایوں کے چند پرگنے اور شاہجہاں پور کا کچھ علاقہ شامل تھا۔ ابتدائی زمانے میں محمد خان بنگش ایک معمولی سردار تھا۔ لیکن فرخ سیر بادشاہ (۱۷۱۳ء، ۱۷۱۹ء) کے عہد میں اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ پہلے اُسے منصب تفویض ہوا۔ بعد ازیں نواب کا خطاب ملا اور آخر میں الٰہ آباد جیسے اہم صوبہ کا اُسے صوبہ دار بنایا گیا۔ اُس کا صدر مقام فرخ آباد تھا۔ اس کے انتقال (۱۷۴۳ء) کے بعد اُس کا بڑا لڑکا قائم خاں اُس کا جانشین ہوا۔[1]

ابوالمنصور خان صفدر جنگ کی بنگش خاندان سے دیرینہ عداوت تھی۔ وہ اس خاندان کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ افغانوں میں بھی پھوٹ ڈالنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی مقصد برآری کی ایک نئی ترکیب نکالی اور روہیلکھنڈ کی صوبہ داری کا فرمان بادشاہ سے لکھوا کر قائم خان کے نام بھیج دیا اور یہ لکھ دیا کہ اس علاقے پر تم قبضہ کر لو۔

اس زمانے میں نواب علی محمد خاں روہیلہ کا انتقال ہو چکا تھا اور حافظ

۱؎ محمد خاں بنگش کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ مآثر الامراء (فارسی) ج ۲، ص ۱۷۷۔

مفتاح التواریخ، ص ۳۴۹

رحمت خان ان کے علاقے کا منتظم تھا۔ جب حافظ رحمت خان کو وزیر کی اس سازش اور قائم خان کی پیش قدمی کا علم ہوا تو انہوں نے قائم خان کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ فتح روہیلکھنڈ کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔ اور صفدر جنگ کے بہکانے میں نہ آئے۔ مگر صفدر جنگ کی شہ پر قائم خان نے پیش قدمی جاری رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں وہ مارا گیا (نومبر ۱۷۴۹ء) کو حافظ رحمت خان نے اس کی نعش فرخ آباد بھجوا دی۔[۱]

میر کا فرخ آباد کا سفر روہیلوں کی جنگ میں قائم خان کے مارے جانے کے بعد صفدر جنگ اس کی املاک کی ضبطی کے لئے فرخ آباد گیا۔ اسحاق خان نجم الدولہ[۲] کے ہمراہ میر بھی وہاں گئے۔ میر نے صفدر جنگ اور قائم خان کے چھوٹے بھائی احمد خان کی جنگ کو بچشم خود دیکھا تھا۔ وزیر کی فوج نے منہ کی کھائی اور اسحاق خان بھی قتل ہوئے۔ اُس شکست خوردہ لشکر کے ساتھ بڑی زحمتیں اُٹھا کر میر دہلی واپس پہنچے۔[۳] بعد ازیں از سر نو تیاری کر کے صفدر جنگ نے دوبارہ لشکر کشی کی اور افغانوں کو پچھاڑ کر فتح و ظفر مندی کے ساتھ دربار شاہی میں حاضر ہوا۔[۴]

---

[۱] وقائع بعد از وفات عالمگیر، (قلمی) ص ۱۵۱ (الف)، ۱۵۲ (الف) مآثر الامراء فارسی، ج ۲ ص ۷۷، حیاتِ حافظ رحمت خان، ص ۴۰ تا ۴۶۔

[۲] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ مآثر الامراء فارسی ج ۲، ص ۷۵-۷۶، [۳] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۴-۱۰۵۔ [۴] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۵، حیاتِ حافظ رحمت خان۔ ص ۵۱ تا ۵۳ وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی) ص ۱۵۶ (الف)، تاریخ فرخ آباد۔ (شاہ ولی اللہ) ص ۶۲ تا ۶۸۔

روہیلہ سرداراوراودھ سے اُن کی کشمکش نواب سعد اللہ خان بن علی محمد خان نے سنہ ۱۷۶۳ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد سرداران روہیلکھنڈ نے علی محمد خان کے کسی دوسرے لڑکے کو اپنا والی تسلیم نہ کیا، اور متفقہ طور پر انہوں نے حافظ رحمت خان کو اپنا سردار منتخب کیا اور انہیں مسندِ حکومت پر متمکن کیا۔[1]

مرہٹے اور حافظ رحمت خاں پانی پت کی مشہور جنگ کو ختم ہوئے ابھی پورے دس سال بھی نہ گذرے تھے کہ مرہٹوں نے از سرِ نو اپنی سیاسی اور فوجی طاقت کو مستحکم کر کے اپنے کھوئے اقتدار کو پھر سے حاصل کرنے کی جان توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ سنہ ۱۷۷۰ء میں انہوں نے نربدا کو عبور کیا اور دوبارہ شمالی ہند کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوئے۔

مرہٹوں نے جاٹوں کو نول سنگھ کی قیادت میں بڑی طرح ہرا دیا اور بعد ازیں انہوں نے پانی پت والے اپنے اصلی دشمنوں مثلاً نواب نجیب الدولہ، احمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد اور حافظ رحمت خان کی طرف توجہ کی۔ وزیر عماد الملک، احمد خان بنگش اور مرہٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا۔ نجیب الدولہ شہر بند ہوگیا۔ مجبوراً نجیب الدولہ نے عماد الملک اور مرہٹوں سے صلح کرلی اور دکنی فوج رخصت کر دی گئی۔[2] اس کے بعد مرہٹوں نے حافظ رحمت خان کی طرف رُخ کیا۔ ان کے درمیان جنگ ہوئی، لیکن فیصلہ کن

---

[1] حیات حافظ رحمت خان۔ ص ۱۲۳۔

[2] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۱۴۔

جنگ سے پہلے ہی حافظ رحمت خان پیچھے ہٹ گئے۔ مرہٹوں نے اٹاوہ اور شکوہ آباد پر قبضہ کر لیا اور بعد میں ان کے اور حافظ رحمت خان کے درمیان ایک صلحنامہ کی رو سے یہ علاقے مرہٹوں کے سپرد کر دیئے گئے۔[۱]

۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے شاہ عالم ثانی کو الہ آباد سے بلا کر دہلی کے تخت پر بٹھایا۔ اور اس طرح مغلیہ سلطنت کے امور ملکی میں پوری طرح دخیل ہو گئے۔ انہوں نے ضابطہ خان[۲] کو شہر دہلی سے مار بھگایا۔ بعد ازیں مرہٹوں نے بادشاہ کو ہمراہ لے کر ضابطہ خان پر حملہ کر دیا اور بغیر جنگ کے ہی اسے بھگا دیا۔ اُس کے اموال، واسباب اور جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ سکرتال میں پیش آیا تھا۔[۳]

بعد ازیں مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر یورش کی۔ علاقوں کو تباہ و برباد کیا۔ لوگوں کو بے حرمت کیا۔ حافظ رحمت خان نے اپنی کمزوری کے سبب

---

[۱] حیات حافظ رحمت خان۔ ص ۱۴۹ تا ۱۵۵ نیز ص ۱۵۷۔۱۵۸۔

[۲] ضابطہ خان، نجیب الدولہ کا لڑکا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ اور دربار شاہی سے منصب عطا ہوا۔ لیکن کچھ الزامات لگا کر اسے معزول کر دیا گیا۔ اور اسکی املاک ضبط کر لی گئی۔ اُس نے سرکشی کی تو شاہ عالم ثانی نے مرہٹوں کی مدد سے سکرتال پر فوج کشی کی اور اُسے دبا لیا۔ ۱۷۸۵ء میں اس کی وفات ہوئی اور اس کا لڑکا غلام قادر روہیلہ جانشین ہوا۔ یہ وہی غلام قادر تھا جس نے اپنے والد کے خون کا بدلہ لینے کے لیے شاہ عالم ثانی کو معزول اور نابینا کر دیا تھا۔

[۳] ملخص التواریخ۔ ص ۴۵۴۔ میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۷۰۔۱۷۱۔

سے ضابطہ خان کے توسط سے شجاع الدولہ، نواب اودھ سے مدد طلب کی۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شجاع الدولہ نے چالیس لاکھ روپے کے عوض سرداران
مرہٹہ سے مصالحت کرانے کا وعدہ کیا اور صلح نامہ کی رو سے یہ طے پایا کہ
حافظ رحمت خاں وہ روپیہ شجاع الدولہ کو ادا کریں گے۔ [1]

شجاع الدولہ اور حافظ رحمت کی جنگ الہ آباد اور کوڑا کے علاقوں کو فتح کرنے کی غرض سے
مرہٹوں نے کوچ کیا۔ انہوں نے حافظ رحمت خاں اور ضابطہ خاں سے
اس مہم میں مدد طلب کی۔ حافظ رحمت خاں نے مرہٹوں کا ساتھ اس وجہ سے
نہ دیا کہ شجاع الدولہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مرہٹوں کا ساتھ نہ دیں
گے تو وہ انہیں چالیس لاکھ روپے کا تمسک واپس کر دے گا۔ چناں چہ حافظ
رحمت خاں نے شجاع الدولہ کا ساتھ دیا اور جنگ میں مرہٹوں کو منہ کی کھانی
پڑی۔ [2]

جب شجاع الدولہ کو مرہٹوں کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا اور آئی
ہوئی بلا ٹل گئی۔ تو اس نے روہیلوں کو ملیا میٹ کرنے کا قصد کیا، اور روہیلکھنڈ
پر قبضہ حاصل کرنے کے منصوبے گانٹھنے شروع کئے۔ اس سلسلے میں اس نے
انگریزوں سے بھی سانٹھ گانٹھ کر لی۔ [3] بعد ازیں شجاع الدولہ نے اپنا

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں۔ ص ۶۹۔ ۷۰۔ نیز ملاحظہ ہو۔ A HISTORY OF THE REIGN OF SHAH AULLAM (1915) PP 45 - 46.

[2] حیات حافظ رحمت خاں۔ ص ۱۸۸۔ ۱۹۱ [3] ملخص التواریخ۔ ص ۵۹۔ ۶۰۔

پہلا وعدہ فراموش کر دیا۔ اور حافظ رحمت خاں سے چالیس لاکھ روپے ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور اسی بہانے سے اس پر حملہ کر دیا۔ کٹرہ میران پور میں حافظ رحمت خان اور شجاع الدولہ کے درمیان جنگ ہوئی، اور حافظ رحمت خاں کام آئے میر نے اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ

"جب جنگ اپنے شباب پر آئی تو حریف کی ساری اکڑ فوں ہوا ہو گئی۔ ادھر سے اتنے گولے برسائے گئے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ جب زمین (رحمت خان پر) تنگ ہو گئی تو اس نے دیکھا کہ نہ بھاگنے کا راستہ ہے، نہ ٹکنے کا موقع، تو دل کڑا کر کے میدان جنگ میں جم گیا۔ اور دنیا سے دل ہٹا کر جان پر کھیل گیا، ایک ہی حلے میں روہیلوں کے ہوش و حواس اڑ گئے، جانوں پر بن گئی بڑے بڑے دلاوروں کے پتے پانی ہو گئے ایک گولا اس (حافظ رحمت خان) کے سینے پر لگا۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں اور دشمن کا سر گیند کی طرح لڑھک گیا"[1] اس کا سارا ملک شجاع الدولہ کے قبضے میں چلا گیا۔

نجیب الدولہ اور ضابطہ خان — نجیب الدولہ اپنے چچا بشارت خان کے ہمراہ پشاور کے علاقے سے ہندوستان وارد ہوا تھا۔ ابتدا میں لوٹ مار کے ہی سلسلے میں نجیب خاں، دوندے خان کے علاقے، بسولی، میں پہونچا۔ دوندے خان نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ دو سو آدمیوں کا افسر مقرر کر دیا۔ پرگنہ دارانگر بطور جاگیر عنایت کیا اور بعد

[1] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۷۲۔ نیز ملاحظہ ہو ملخص التواریخ ص ۵۹۔ ۴۴۔ ۴۔

میں اپنی لڑکی سے اس کا نکاح کر دیا۔

جس زمانے میں صفدر جنگ نے احمد شاہ بادشاہ بن محمد شاہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی اور حافظ رحمت خان سے مدد کا طالب ہوا تھا تو مؤخر الذکر چالیس ہزار سواروں کی جماعت کے ساتھ اسکی استمداد کو گئے لیکن بعد میں حافظ رحمت خان نے بادشاہ کے مقابلے میں صفدر جنگ کو مدد دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے علاقے کو واپس چلے گئے۔ اس دوران میں احمد شاہ بادشاہ کے آدمیوں نے روہیلہ سرداروں کو طرح طرح کا لالچ دے کر اپنی طرف ملانا چاہا اور اس قوم میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ نجیب خان طمع میں آکر بادشاہ سے جا ملا، اور حافظ رحمت خان سے اجازت لئے بغیر دہلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ اُس نے دہلی میں رہ کر صفدر جنگ کے مقابلے میں کئی معرکے سر کئے جس کی وجہ سے اسے روز افزوں ترقی نصیب ہوئی۔ آخر میں بادشاہ نے اسے نجیب الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا اور اضلاع بجنور، سہارنپور اور میرٹھ وغیرہ بطور جاگیر عطا کئے [1]

۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ ہوا۔ واپسی کے وقت احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو وزیر مملکت کے عہدہ پر فائز کیا۔ یہ خبر پاکر غازی الدین خان نے، نجیب الدولہ کو برباد کرنے کی غرض سے جاٹوں اور احمد خان بنگش کی فوج کو ساتھ لے کر دہلی پر فوج کشی کی۔ میر تقی میر نے اس یورش کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، سرگذشت نجیب الدولہ، ص ۱۰-۵

"ادھر راجا ناگر مل دکن کے سردار (مرہٹوں) سے مل گیا۔ وزیر (عماد الملک) اور احمد خان اور اُن (مرہٹوں) کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا۔ وہ (نجیب الدولہ) شہر بند ہو گیا۔ توپ خانے کی جنگ ہوئی۔ ... پایانِ کار نجیب الدولہ سے صلح کر لی اور اسے شہر سے نکال لائے وہ سہارن پور چلا گیا۔ جو اس کی فوجداری میں تھا۔" [1]

دہلی پر اپنا تسلّط جمانے کے بعد مرہٹوں نے نجیب الدولہ پر دھاوا بول دیا۔ چونکہ اس زمانے میں سکھوں نے دوآبہ میں لوٹ مار مچا رکھی تھی، اس سبب سے نجیب الدولہ نے دوآبہ کے کچھ اضلاع مرہٹوں کو دے کر اُن سے صلح کر لی، مگر اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ [2]

نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خان اس کا جانشین ہوا، اور درباری منصب پر فائز ہوا۔ ۱۷۷۱ء میں جب مرہٹوں کو جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، دہلی پر اقتدار حاصل ہو گیا تو انہوں نے ضابطہ خان کو مار بھگایا اور وہ اپنی جاگیر کو چلا گیا۔ چونکہ مرہٹہ سردار سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار جمانا چاہتے تھے، اور ضابطہ خان کی موجودگی میں اُن کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکتا تھا، اس لئے انہوں نے ضابطہ خان سے سکرتال میں جنگ کی، ضابطہ خان کو شکست ہوئی، وہ بھاگ کر شجاع الدولہ کے سایۂ عاطفت میں چلا گیا۔ اس کا مال و اسباب

---

[1] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۱۴، سرگزشتِ نواب نجیب الدولہ۔ ص ۳۶۔

[2] نجیب الدولہ کی وفات ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں ہوئی اور نجیب آباد میں اُسے دفنایا گیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مفتاح التواریخ، ص ۳۵۱۔ سرگزشت نواب نجیب الدولہ ص ۷۱

لُوٹ لیا گیا، اور غوث گڈھ کے علاوہ ان کے تمام مقبوضات پر شاہی قبضہ ہوگیا۔[1]

<u>غلام قادر روہیلہ کا عروج و زوال</u> | اس وقت غلام قادر کی عمر آٹھ یا دس سال کی تھی اور دیگر قیدیوں کے ساتھ بادشاہ نے اُس کو قتل کر دینا چاہا لیکن منظور علی خاں، ناظر، کی درخواست پر اس کی جان بخشی ہوئی، وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس سبب سے وہ بادشاہ کا منظورِ نظر ہوگیا، اور اُسے خصّی کرا دیا گیا۔ قدسیہ باغ میں لاکر رکھا گیا۔ اُس زمانے میں شاہ عالم ثانی عیش و عشرت کا استاد لدادہ تھا کہ ہمہ وقت رقص و سرود کی محفل جمی رہتی تھی اور شاہی حکم کے مطابق غلام قادر زنانہ لباس میں بادشاہ کے سامنے آیا کرتا تھا۔[2]

اطفری کا بیان ہے کہ:۔

"حضرت سلامت نے جب اس نمک حرام کو اپنی مبارک

---

[1] میر کی آپ بیتی، ص ۱۶۰-۱۶۱۔ چونکہ شاہی لشکر کے ساتھ میر بھی سکرتال گئے تھے اس لئے ان کا بیان ملاحظہ ہو: "اس تقریب سے میں بھی (شاہی لشکر کے ہمراہ و درائے بہادر کی معیت میں) اس طرف روانہ ہوا۔ ان لوگوں نے جاکر ضابطہ خان کو بغیر جنگ کے ہی بھگا دیا، اور اس کے اموال و اسباب اور جائداد پر قبضہ کرلیا۔ بادشاہ کو سوائے دو سو مریل گھوڑوں اور چند پھٹے پرانے خیموں کے کچھ نہ دیا۔ بادشاہ (مرہٹوں کی) اس حرکت سے بہت بد دل ہوا لیکن کرتا کیا؟ دکھنیوں کے پاس طاقت تھی اور یہاں نہ زور تھا نہ زر! جب ان مرہٹوں پر زور نہ چلا تو کارپردازوں نے یہاں (اس کے) لوگوں کی جاگیریں دھڑا دھڑ ضبط کرنا شروع کر دیں اور بہت سے انسانوں کو ذلیل و خوار کیا۔" میر کی آپ بیتی ص ۱۶۱۔ نیز ملاحظہ ہو تذکرۂ ہندی (مصحفی)، ص ۱۴۔ [2] جام جہاں نما (قلمی)، ۱۰۷، ص ۱۰۷ (الف) و ۷۷ (الف)، عبرت نامہ (قلمی)، ۲۵۴۔

آنکھوں سے ملاحظہ فرمایا تو نہایت شفقت کی، پورے آرام و
حفاظت کے ساتھ دلّی میں لاکر قدسیہ باغ میں رکھا، اور چوکی
پہرہ مقرر کر دیا۔ روزانہ تین وقت اُس کے لئے قسم قسم کے
کھانوں کے کئی خوان بھجواتے تھے، اور اکثر حضور میں طلب فرماکر
اُس کے حالِ زار پر بیحد رحم اور عنایت مبذول فرماتے تھے،
اُس کی پیٹھ پر محبت سے اپنا مبارک ہاتھ پھیرتے، اس کی تعلیم و
تربیت کے لئے بہت کچھ تاکید فرماتے رہتے، یہاں تک کہ اُسے
اپنا بچہ کہنے لگے اور روشن الدولہ کا خطاب دیا، جب کبھی وہ
اپنے ماں باپ کی یاد میں روتا تو اُس سے رہائی کا وعدہ فرماتے[1]
بعض امرا نہیں چاہتے تھے کہ وہ رہائی پائے اور رفتہ رفتہ ایک ایسا
وقت بھی آیا کہ مجد الدولہ عبد الصمد خاں[2] بہادر، جو شاہِ عالم کے وزیر دوم
تھے۔ غلام قادر کو قتل کرانے کے درپے ہوگیا۔ لیکن چونکہ بادشاہ غلام قادر کو
فرزند خاص سے مخاطب کر چکے تھے۔ اور ایک موقع پر بادشاہ نے اپنی
نوازش خاص سے . . . اُس کے متعلق اُردو زبان میں چند شعر بھی
کہے تھے، وہ اشعار ملاحظہ ہوں،

فرزند خاص ہے یہ اور ہیں غلام سارے — آباد رکھیو یارب قدوی کا گھر ہمارے
پھولا رہے ہمیشہ باغِ مراد اس کا — ہرگز خزاں نہ بھٹکے اس باغ کے کنارے
سائے میں پرورش ہو ظلِ الٰہ کے یہ — ہے آفتاب جب لگ انور فلک کے تارے

---

[1] واقعات اظفری ص ۴ [2] ملخص التواریخ۔ ص ۲۳۴

اس شفقت اور محبت کے سبب سے بادشاہ نے چند خاص راز داروں کی معرفت اس لڑکے کو کافی مصارف اور سامان کے ساتھ رات کے وقت رہا کر کے اس کے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا۔[1]

ضابطہ خان کے انتقال کے بعد غلام قادر خان اپنے والد کی جاگیر کا وارث قرار پایا۔[2] چونکہ مرہٹوں نے اس کے والد کے ساتھ بڑے مظالم توڑے تھے اور غوث گڈھ کی تباہی و بربادی کے باعث ہوئے تھے۔ اس وجہ سے وہ ان کے تحت دشمنی رکھتا تھا، اُدھر منظور علی خان ناظر قلعۂ معلیٰ بھی مرہٹوں سے تنگ آچکا تھا۔ لہٰذا ان دونوں نے دہلی سے مرہٹوں کے نکال بھگانے کا منصوبہ بنایا۔

جب سندھیا، مرزا اسمٰعیل بیگ سے ہار کر گوالیار کی طرف چلا گیا تو اُس دوران میں بادشاہ کے ناظر نے غلام قادر کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اُسے دہلی بلایا کیونکہ بادشاہ اس کے کہنے پر عمل نہ کرتا تھا۔ یعنی مرہٹوں کی طرفداری سے باز نہ آتا تھا، غلام قادر خان نے دہلی کے قلعہ پر قبضہ کر کے اپنا آبائی منصب امیر الامرائی حاصل کیا۔[3]

---

[1] واقعات اظفری ص ۴، ۵ [2] ایضاً۔ ص ۵۔ غلام قادر کی ابتدائی فتوحات کے لئے ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۸۹۔ [3] اظفری نے لکھا ہے کہ "جب غلام قادر کا باپ ضابطہ خان اپنی طبعی موت سے مر گیا اور یہ نمک حرام اپنے باپ کا جانشین ہوا تو بالکل ہی فرعون بن گیا۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی رکھنے لگا۔ کمینہ پن اور شرارت پر زبان کھولی کھلم کھلا کہنے لگا کہ بہت جلد میں شاہجہاں آباد پہنچتا ہوں اور اپنا بدلہ لیتا ہوں،

(بقیہ صفحہ ۱۱۶ پر)

بعد ازیں اُس نے علی گڈھ کا قلعہ مرہٹوں سے بزور شمشیر چھین لیا اور اسمٰعیل بیگ کی مدد سے اکبرآباد کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ مرہٹوں سے زبردست جنگ ہوئی اور روہیلوں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے لیکن اسی اثنا میں سہارن پور کے علاقے میں سکھوں کے گھس آنے کی خبر غلام قادر کو ملی تو اُسے واپس جانا پڑا [1]

اکتوبر ۱۷۸۸ء میں غلام قادر خان دوبارہ دہلی آیا۔ شاہ عالم ثانی نے اپنے مددگار مرہٹوں کو بلایا، اس دوران میں ساری مغل سپاہ غلام قادر کے ساتھ ہوگئی، آخرکار بادشاہ نے غلام قادر کو بلا کر پھر امیرالامرائی کا منصب تفویض کیا۔ غلام قادر نے بادشاہ سے سپاہ کو دینے کے لئے روپے طلب کئے، بادشاہ کی غربت کا یہ عالم تھا کہ توشہ خانہ میں بالکل روپیہ نہ تھا۔ لالہ سیتل داس نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ ابھی کچھ دنوں پہلے شاہی محافظ سپاہ رکھنے کے لئے سونے کی طشتریاں پگھلا کر سونا فروخت کرکے روپیہ حاصل کیا گیا تھا۔ افغانوں کو دینے کے لئے اب بالکل روپے نہیں ہیں۔ یہ بات سُن کر غلام قادر کے

بقیہ صفحہ ۱۱۵ کا۔ جس طرح ہو مکروفریب سے کام لوں گا اور اُس قلعہ کو جمنا میں غرقاب کردوں گا۔ یہ خبریں برابر پہنچتی تھیں، ہر خاص و عام کے زبان زد تھا کہ عنقریب غلام قادر دن پہونچ اور اُسے تہ و بالا کرنے والا ہے۔ آخرکار چند مہینے کے عرصے میں اُس نمک حرام نے اپنی فوجوں کے ساتھ دھاوا کیا، شاہدرہ اور اندھیاؤلی تک پہونچ گیا۔ یہ دونوں موضع دریائے جمنا کے پار واقع ہیں، وہاں سے قلعہ مبارک پر گولے برسنے لگے اسی دوران میں چند شرطیں طے پا گئیں، لڑائی بند ہوئی اور یہ اپنے وطن کو روانہ ہوگیا۔ واقعات اظفری، ص ۶۰۵۔

[1] واقعات اظفری ص ۱۰۶

غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور بادشاہ کے ساتھ وہ درشت کلامی سے پیش آیا۔ اور یہاں تک کہ غصّہ میں آکر ایک مرتبہ اُس نے میان سے تلوار نکال لی، اسمٰعیل بیگ، ناظر، کی درخواست پر بادشاہ زنان خانے میں چلے گئے، تین دن تک بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کو بلا دانہ پانی گزارنے پڑے غلام قادر نے بیدار بخت کو . . . . . تخت پر بٹھایا۔ بیدار بخت کی مدد سے دفینے کھدوائے گئے [۱]

بعد ازیں غلام قادر نے بادشاہ کو حرم سرا سے طلب کیا، شاہ عالم بادشاہ اور شہزادوں کو موتی محل میں گنہ گاروں کی طرح گرم اینٹوں پر کھڑا کروا کر اور مرزا اکبر اور سلیمان کو بندھوا کر فراشوں کو انہیں پیٹنے کا حکم دیا۔ بیدار بخت نے مشکل کشائی کی، اُس کے بعد غلام قادر نے انہیں تیز دھوپ میں بٹھوا دیا۔ شاہی مستورات کے ہاتھوں پاؤں پر کھولتا ہوا روغن ڈالا گیا۔ اور طرح طرح کی سختیاں کر کے اُن سے دفینوں کی نشان دہی کروائی گئی۔ چلچلاتی دھوپ میں بیٹھا ہوا شاہ عالم، غلام قادر کو بُری بُری گالیاں دے رہا تھا۔ اور فریاد و آہ و زاری کر رہا تھا۔ غلام قادر کے حکم کے مطابق روہیلوں نے اُسے زبردستی زمین پر پٹک دیا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لیں۔ مستورات کے جسم سے کپڑے اور زیورات اُتار کر انہیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے اور دریوزہ گری کرنے کے لئے محل سے باہر نکال دیا گیا۔ [۲]

---

[۱] واقعاتِ اظفری ص ۷، عبرت نامہ (قلمی)، [۲] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، واقعات شاہِ عالم (یا عبرت نامہ)، مولوی خیرالدین۔ کلیات قاسم (قلمی)، ص ۴۰۰ نیز ۴۰۱

(بقیہ صفحہ ۱۱۸ پر)

یہ وہ زمانہ تھا جب میر دہلی کی سیاسی اُتھل پتھل اور ذاتی افلاس و تنگ دستی سے تنگ آکر نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ جا چکے تھے، اس بنا پر اس اہم واقعہ کے بارے میں انھوں نے صرف اتنا ہی لکھا ہے:۔

"...اس نے بادشاہ کے ساتھ ناگفتہ بہ سلوک کیا۔ اور تمام قلعے کو غارت کردیا اور شہزادوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیئے تھا، بہت سا زر و مال اس کے ہاتھ آیا، بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور دوسرا بادشاہ بنا دیا" [1]

شاہ عالم نے اِن واقعات کو خود نوشتہ ایک مرثیہ میں بڑے پُر درد انداز میں بیان کیا ہے۔

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما — داد برباد سر و برگ جہاں داریِ ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودیم — بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشم ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد — کہ نہ بینیم کہ کند غیر جہاں داریِ ما
داد افغان بچۂ شوکتِ شاہی برباد — کیست جُز ذاتِ مرہٹہ کہ کند یاریِ ما
کردہ سی سال نظارت کہ مرا داد برباد — زود تر یافتہ پاداش ستم گاریِ ما

بقیہ صفحہ ۱۱۷، حدائق السعادت، ص ۴، مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۶۰

HISTORY OF THE REIGN OF SHAH AULAM: ED. 1798
PP. 175-180. RULERS OF INDIA (OXFORD 1901) PP. 153-164.
FALL OF THE MOGHAL EMPIRE VOL III PP. 302-310.

[1] میر کی آپ بیتی، ص ۱۰۹، قلعہ معلی کی تباہی و بربادی اور افراد شاہی کی حالت کے لئے ملاحظہ ہو، واقعات اظفری، ص ۷-۹، دریائے لطافت (اردو) ص ۱۱۹۔

حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم   کردہ تاراج و نمودند سبک ساری ما
قوم مغلیہ و افغان ہمہ بازی دادند   بسکہ گشتند مجوّز بگر فتاری ما
شیر دادیم افعی بچہ را پروردیم   عاقبت گشت، مجوّز بہ گرفتاری ما[1]

اس کے بعد غلام قادر نے ناظر کو بھی قید کر لیا اور شہر والوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جب اُس کا غلبہ حد سے بھی زیادہ بڑھ گیا تو کسی بات پر مرزا اسمٰعیل بیگ سے بھی ٹھن گئی، اور اُس نے مرہٹوں سے صلح کر لی، اس دوران میں مرہٹہ فوج دہلی کے قریب پہونچ گئی اور اس فرقے کے بعضے سردار شہر میں داخل ہو گئے، غلام قادر قلعہ بند ہو گیا۔ رات کو مع فوج، اسباب نیز والا شاہزادوں اور ناظر وغیرہ کو ساتھ لے کر خضری دروازہ سے نکل بھاگا۔ شاہدرہ کے قریب اپنی فوجیں جما دیں، مادھو سندھیا آ گیا اور اُس نے روہیلوں سے جنگ شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا۔ بعد ازیں علی بہادر نامی ایک سردار دکن سے آیا اور غلام قادر سے فیصلہ کن جنگ کرنے پر تُل گیا۔ اور آخر کار غلام قادر کو اسیر کرنے میں کامیاب ہوا۔ بعد میں اس کو اندھا کر دیا۔ اس کے ہاتھ اور ناک کان کاٹ لئے اور ایک درخت سے لٹکا دیا۔ بعد ازیں یہ تمام ٹکڑے شاہ عالم کی خدمت میں بھیج دیئے گئے۔[2]

---

[1] HISTORY OF THE REIGN OF SHAH AULAM: PP 249 - 54

تذکرۂ گلشن ہند، ص ۲۰۷۔ [2] بحوالہ تفصیل میر کی آپ بیتی، ص ۱۹۰-۱۹۱، مفتاح التواریخ ص ۳۶۲۔ تاریخ ہندوستان، ج ۹، ص ۲۴۳، واقعات اظفری، ۹۰

RULERS OF INDIA (OXFORD) 1901) PP. 139-142;
FALL OF THE MOGHAL EMPIRE, III, PP. 329-330.

اظفری نے غلام قادر کی اسیری اور نہایت سختیوں کے ساتھ اس کے قتل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"آخر قہرمانِ حقیقی کی غیرت کو جوش آیا۔ اور یہ ملعون متمرد اپنی کمینہ اعمال کی سزا کو پہنچا۔ طرح طرح کے عذاب اور ذلت کا مزہ چکھ کر جہنم واصل ہوا۔ مرہٹہ مذکور نے اس کے دونوں کان ناک اور نیچے کا ہونٹ کٹوا ڈالا اور آنکھیں بھی نکلوا کر الگ الگ ڈبیوں میں رکھوائیں، پھر یہ چیزیں تحفۂ مبارک باد کی طور پر اس مجبور بادشاہ کے حضور میں بھجوائیں۔ [۱]

سیندھیا نے شاہ عالم کو پھر تختِ شاہی پر متمکن کیا۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے میرؔ کا بیان ہے کہ بادشاہ صرف نام کو تھا عملی طور پر مرہٹوں کی عملداری تھی۔ مرہٹوں نے

"قلعے کو جاٹوں کو حوالے کر دیا۔ اب سو روپے روز بادشاہ دیتے ہیں اور تمام ملک پر متصرف ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اب مرہٹہ (سندھیا) بادشاہ ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ رنگ کب تک رہتا ہے" [۲]

(۷) جاٹ [۳] مرہٹوں اور سکھوں کے علاوہ ایک تیسری سیاسی طاقت جاٹوں کی تھی جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں اُبھری۔ جاٹ، آگرہ، دہلی کے درمیانی علاقے میں رہتے تھے اور کاشتکاری ان کا آبائی پیشہ تھا، شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں

---

[۱] واقعات اظفری۔ ص ۱۰۱ HISTORY OF THE REIGN OF SHAHAULAM P. 249.

[۲] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۸۱ [۳] جاٹوں کے عروج کے لئے ملاحظہ ہو۔ HISTORY OF THE JATS (QANUNGO) PP. 1-33 VOL. I

انہیں گھوڑے پر سوار ہونے اور گڑھیاں تعمیر کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ وہ اپنے پاس بندوق رکھ سکتے تھے[1] وہ اتنے سرکش تھے کہ فوجی طاقت کا استعمال کئے بغیر اُن سے سرکاری لگان بھی وصول نہ ہوتا تھا۔[2]

اورنگ زیب نے اُن کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کر لیا تھا اور اُس نے اپنے پوتے بیدار بخت کو اُن کی سرکوبی کے لئے بھیجا تھا۔ مگر وہ ہلکی سی گوشمالی کے بعد ان سے اطاعت کا اقرار کرا کر واپس چلا آیا تھا[3]

اورنگ زیب کے کمزور اور عیش پرست جانشینوں نے جاٹوں کی طرف سے غفلت کی اور اس قوم نے اسی فرصت کو غنیمت سمجھ کر بہت سے قلعے اور گڑھیاں تعمیر کر لیں۔ اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا۔ چورامن جاٹ (۱۶۹۵ء۔ ۱۷۲۱ء) نے جنگ تخت نشینی کے دوران میں طرفین کی افواج اور اسباب کو خوب لوٹا۔ چورامن، ایک مدبر اور سیاست داں سردار تھا اس نے بہادر شاہ کی اطاعت قبول کر لی۔ بہادر شاہ نے اس کی گزشتہ خطائیں معاف کر دیں۔ اور اسے پنج ہزاری ذات وسوار کا منصب عطا کیا۔ چورامن اجمیر تک بہادر شاہ کے ہمراہ گیا، اور اس کی معیت میں سکھوں سے مقابلے کے لئے بھی گیا[4]

جہاں دار شاہ (۱۷۱۲ء۔ ۱۷۱۳ء) کے دورِ حکومت میں چورامن جاٹ

---

[1] سیاسی مکتوبات ص ۱۰۱ [2] TWILIGHT OF THE MUGHALS (SPEAR) P5

[3] سیاسی مکتوبات ۱۰۱ HISTORY OF THE JATS. PP 35-48

[4] لیٹر مغلس ج ۲، ص ۳۲۲ [5] لیٹر مغلس ج ۲ ص ۳۲۳

نے جمنا کے مغربی کنارے سے چنبل تک کے علاقے پر قابض ہو کر حکومت کرنا شروع کر دیا۔ محمد فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) کے زمانے میں جاٹوں نے پھر شورش کی۔ اور قطب الملک، وزیر کو ان کی سرکوبی کے لئے اپنی فوجیں بھیجنی پڑیں، چورامن نے معمولی جھڑپ کے بعد صلح کرلی اور اسے بادشاہ کے حضور میں لاکر معافی دلوا دی گئی، یہ عمل سیاسی مصلحت کے بالکل خلاف تھا۔[1]

عہد محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی۔ سورج مل جاٹ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء) کی سرداری میں جاٹوں نے فتنہ برپا کیا۔ اُس نے بیانہ پر زبردستی قبضہ کر کے وہاں کی مسلمان آبادی کو شہر بدر کر دیا تھا۔ درباری امرا میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی، اگر ایک امیر جاٹوں کی سرکوبی کا ارادہ کرتا تو سورج مل اس کے حریف سے ساز باز کر کے اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔

۱۷۵۲ء میں بعہد احمد شاہ، سورج مل جاٹ کو بادشاہ نے سہ ہزاری ذات اور دو ہزاری سوار کا منصب عطا کیا۔[2] اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد وزیر الممالک صفدر جنگ نے عروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور تمام باشندوں کو لوٹ لیا۔

میر نے اس حملہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

---

[1] سیاسی مکتوبات۔ ص ۱۰۱ - ۱۰۲۔ لیٹر مغلس۔ ج ۲ ص ۳۲۶ - ۳۲۷
[2] وقائع شاہ عالم ثانی۔ ص ۷

"پرانا شہر تو سب تاراج ہوگیا" [1]

عمادالسعادت کا مصنف لکھتا ہے کہ وزیر صفدر جنگ کو خود لڑنے میں تامل تھا، اس لئے اس نے سورج مل کو آگے بڑھا دیا۔ اس نے پرانی دہلی کو خوب لوٹا عوام پر سخت مصیبت نازل ہوئی، بہت سے لوگوں نے خودکشی کرلی۔ ۔۔۔ جاٹوں کے اس ہنگامے کو لوگ "جاٹ گردی" کے نام سے یاد کرتے تھے [2]

ہرچرن داس، مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے لوٹ مار کے لئے ہاتھ بڑھایا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، ہزاروں کی جانیں تلف ہوگئیں، اور اونچی اور عالی شان عمارتیں جل کر راکھ کی ڈھیر ہوگئیں، اور شہر نو کے لوگوں نے خوف وخطرے کے عالم میں خانہ بدوشی اختیار کی۔ اور خالص اور قیمتی چیزیں جو اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ اپنے ہمراہ لے گئے، پریشانی کے عالم میں کوچہ و بازار میں مارے مارے پھرتے تھے، مختصر یہ کہ شاہجہاں آباد کے باشندوں کو ایک عجب حالت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور شہر کہنہ اور شہر نو کی خلقت ایک ٹوٹے ہوئے جہاز کے مانند ظالم موجوں کے رحم وکرم پر تھی ہر شخص سراسیمہ اور پریشان نظر آتا تھا۔

شدہ روز قیامت آشکارا — دل مردم شدہ از غم فگارا

خلائق شد سراسیمہ پریشان — دویدند چارسوی چوں گوے چوگاں

پدر را از پسر خبرے نماندہ — زن و شوہر جدا ہر سو فتادہ

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۰۶-۱۰۷

[2] عمادت السعادت۔ ص ۶۴

زنانی پاکہ در پردہ بماندہ   فتاد از خانہ بیروں سر کشادہ
زن و مرداں شدہ در کوے و بازار   سراسیمہ پریشان و دل افگار
جز از جان و مال کس نماندہ   خیالِ مرگ بر دلہا نشاندہ[1]

سورج مل کی قیادت میں جاٹوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے میر کا بیان ہے۔

"سورج مل جو بڑا طاقت ور زمیندار ہے اور اس کے آبا و اجداد (مغلیہ) بادشاہوں کی نوازشوں سے ہمیشہ بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں اکبرآباد (آگرہ) شاہ جہاں آباد (دہلی) کے مابین راہ داری اس سے متعلق تھی۔ اس نے مسلمان امرا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اُن دنوں بغاوت کر دی اور اکثر محالات پر قابض ہو گیا، اور سیہ روزگار قلعدار کی نمک حرامی سے آگرے کا قلعہ بھی ہتھیا لیا۔[2]"

نجیب الدولہ سے مقابلہ کرتے ہوئے سورج مل کام آیا۔ میر نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے۔

"وہ (سورج مل) شاہ جہاں آباد کی طرف بڑی دلیری سے بڑھا۔ نجیب الدولہ نے بے پروائی کے ساتھ شہر کے دروازے بند کرا دیئے اور جنگ کے ارادے سے باز رہا۔ یہ مغرور و متکبر اپنے گھمنڈ میں رہا۔ اور دریا سے پار اتر کر تازہ آفت

[1] چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص ۴۴۲۔ نیز تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۷۹،
خزانۂ عامرہ ص ۱۰۴، ۱۰۵۔ سیاسی مکتوبات ص ۱۵۲
[2] برائے تفصیل۔
میر کی آپ بیتی ص ۱۴۱

پیدا کر دی، اس (نجیب الدولہ) کی انسانیت میں شبہ نہیں۔ اس نے سو بار کہلا بھیجا کہ "میں تم سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس لئے اپنی فوج کو نہیں نکالا ہے۔ شہر کے غریب لوگ مفت میں تکلیف اٹھائیں گے۔ یہاں محاصرہ کرنا مناسب نہیں ہے" لیکن (سورج مل نے) ایک جواب بھی انسانیت کا نہ دیا۔ اور کمین پن کا جواب یہ بھیجا کہ "میں تو نواب کی فوج دیکھ کر واپس آجاؤں گا۔ اگر جلدی شہر سے باہر نکل آئیں تو احسان ہوگا۔ کیونکہ مجھے اور بھی کام درپیش ہیں، نہیں تو یہ فوج جو میرے اختیار میں نہیں ہے، صبح و شام پر دعا واہی کیا چاہتی ہے"

"جب روہیلوں نے کشت و خون شروع کیا تو سورج مل نے اپنے تئیں فوج میں چھپا رکھا تھا اور اس سے غافل ہو کر کہ موت اس کی گھات میں ہے۔ بالا بالا نکل کر اس فوج پر ٹوٹ پڑا جو شہر کی جانب تھی اس پر شور برپا ہوگیا۔ اِدھر (نجیب الدولہ) کی فوج کے قلب سے کچھ فوج ان کی امداد کے لئے بھاگی اور اس مصیبت کو دور کیا۔ اس گرد و غبار میں اس اجل رسیدہ کے ایسا زخم لگا کہ گھوڑے سے زمین پر گرا اور مر گیا" [۱]

سورج مل کی وفات کے وقت جاٹوں کی قلمرو میں آگرہ، دھولپور، مین پوری، ہاتھرس، علی گڑھ، ایٹہ، رہتک، فرخ نگر، میوات، ریواڑی، گڑگانوں، متھرا کے اضلاع کے علاوہ بھرت پور ریاست کے کچھ اضلاع

---

[۱] برائے تفصیل۔ میر کی آپ بیتی ص ۱۴۵، ۱۴۹ نیز ملاحظہ ہو مفتاح التواریخ جو اس ص ۳۴۵ میں اسے آغاز ۱۷۶۴ء کا واقعہ لکھا ہے۔

شامل تھے[1]

سورج مل کے بعد اس کا لڑکا جواہر سنگھ، جاٹوں کا سردار مقرر ہوا،
میر کا بیان ہے کہ "جواہر سنگھ جس کی جان بیوہ نہر سن کر دی) نکل گئی تھی اور بظاہر
خود کو سنبھالے ہوئے تھا، آیا اور مسندِ ریاست پر متمکن ہو کر لشکر جمع کرنے
کی فکر میں لگ گیا۔ ہمت اور شجاعت اور مروّت میں وہ اپنے باپ سے
سوگنا بہتر تھا ع "دولت نہ دہد خدائے را کس بغلط"۔[2]

میر کا بیان ہے کہ جواہر سنگھ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کی غرض
سے ملہار راؤ (ہولکر) کی اعانت سے بھاری لشکر لے کر نجیب الدولہ پر حملہ آور
ہوا، اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اناج کی مہنگائی سے مخلوق تنگ آ گئی، جنگ و
جدال اور کشت و خون کا سلسلہ، قریب دو مہینے تک جاری رہا۔ عماد الملک
جو اس جنگ سے کنارہ کرنے کی فکر میں تھا (اپنی) فوج کے ساتھ بھرت پور
کے قلعہ سے نکلا اور فالتو لوگوں کو فرخ آباد بھیج کر جواہر سنگھ کا شریک ہو گیا۔[3]

مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے سترھویں مکتوب میں اس واقعہ کا ذکر
ان الفاظ میں کیا ہے :

"نواب اور جاٹوں کے درمیان صلح کی خبر مجھ تک پہونچی، جو کچھ مجھے
معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، اس سے مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ راجا بہادر سنگھ

---

[1] جاٹوں کی تاریخ (انگریزی)، ج ۱، ص ۱۶۷
[2] میر کی آپ بیتی ص ۱۴۹
[3] ایضاً ص ۱۵۱، ۱۵۲۔

اور داہر سنگھ کے توسل سے جاٹ لوگ اپنے فائدے کے لئے صلح کر رہے ہیں۔ میں نے نواب کو مشورہ دیا کہ اس نے اپنی افواج کی برطرفی اور سامان حرب کی کمی اور اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اپنے کو گرا لیا ہے۔ اب کوئی بھی اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ اس لئے کیوں کوئی نواب کی طرف سے جنگ کرے؟ نواب کو اپنے دوستوں اور حریفوں دونوں کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ جو کوئی بھی شخص نواب کی طرف سے نمائندہ بن کر جاٹوں کے پاس جاتا ہے۔ وہ اپنے فوائد کو مقدم رکھتا ہے۔ ان دنوں کسی کا بھروسہ نہ کرنا چاہئے [۱]

مرزا مظہر نے نواب کو آگاہ کیا کہ جاٹ صرف تعاون وقتی کی نیت سے صلح کر رہے ہیں یہ خلاف مصلحت عمل ہے۔ لیکن ایک صوفی کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی [۲]

میر نے جاٹوں اور مرہٹوں کی جنگ کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے [۳] اس موقع پر میر راجا ناگرمل کے ہمراہ آگرہ گئے جو جواہر سنگھ سے ملاقات کی غرض سے وہاں گئے تھے [۴]

بعد ازیں میر نے جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ پسر جے سنگھ کے مابین زمین داری کے مسئلے میں جنگ کا ذکر کیا ہے [۵]

---

[۱] کلمات طیبات ص ۸۳-۸۴ [۲] کلمات طیبات ص ۸۴ [۳] میر کی آپ بیتی ص ۱۵۳-۱۵۵ [۴] ایضاً۔ ص ۱۵۵۔

[۵] ایضاً۔ ۱۵۵-۱۵۶۔

میر نے سورج مل کے انتقال کے بعد جاٹوں کی خانہ جنگی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان کا بیان ہے کہ اس آپسی نفاق اور عناد نے ان کی سیاسی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ بقول میر جواہر سنگھ آگرے میں کسی بدبخت کے ہاتھوں، تلوار کے ایک وار میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اب ریاست اس کے بھائی، راؤ رتن سنگھ کو ملی۔ یہ سیہ کار ہمیشہ شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا اور خلق خدا پر حد سے زیادہ مظالم توڑتا تھا۔ چنانچہ دس مہینے کی مدت، ریاست میں اس نے ہر کس و ناکس سے بدسلوکیاں کیں۔ انجام کار کسی ہوس نے اُسے بھی چاقو سے ہلاک کر ڈالا۔ اب سردار اس کے نابالغ بیٹے کے نام سے کیہری سنگھ مقرر ہوا۔ اختیارات ملازموں کے ہاتھوں میں رہے جس کے باعث سارا کام ابتر اور نظام درہم برہم ہوگیا۔

"اب کار پردازوں نے سورج مل کے چوتھے بیٹے نول سنگھ کو جو اس وقت موجود نہیں تھا، اس نابالغ لڑکے کی نیابت میں لے لیا ہے اگر سلیقے سے حکومت چلالیں تو اچھا ہے۔ ورنہ ڈھنگ تو بگڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

"جب اس قوم کے نفاق نے طول پکڑا اور ملک کے انتظام کی نوبت کینوں تک پہونچی تو نول سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی رنجیت سنگھ جس سے کُمہیر کا قلعہ متعلق ہے، دونوں جنگ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ تقریباً پندرہ دن تک توپ و تفنگ کے ساتھ جنگ ہوتی رہی۔ چونکہ قلعہ مضبوط تھا، ناچار نول سنگھ نے صلح کر کے چھوڑ دیا۔ ہر چند بظاہر دونوں بھائیوں میں صلح و صفائی ہو گئی ہے۔ لیکن کینہ و باطن کا

کیا علاج[۱]

بعد ازیں میرؔ کا بیان ہے کہ "جب جاٹوں کی شورش اور فتنہ انگیزی حد سے بڑھنے لگی اور زندگی اُن کے ہاتھوں اجیرن ہوگئی تو راجا ناگرمل نے بیس ہزار دہلی والوں کے گھروں کو لے کر جو اس کی وجہ سے آباد تھے اور ان میں سے اکثر اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ۔ ۔، نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ اب ہم مصیبت کے مارے بھی اس کی نوکری کے تعلق سے اسی قافلے کے ساتھ اقامت گزیں ہیں[۲]"

باوجود اس آپسی نفاق اور تنازعہ کے جاٹوں کی طاقت بڑھتی رہی میرؔ کا بیان ہے کہ "جاٹ یعنی سورج مل کی اولاد درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تک قابض ہو چکے تھے، جو شہر سے تین چار کوس پر ہے۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ اس قوم کی شامت قریب تھی، ایک دن ان کی فوج گڑھی کے میدان میں آگئی، جو درگاہ خواجہؒ کے نزدیک ہی ہے۔ اور وہاں دھما چوکڑی مچانے لگے[۳] نجف خاں اپنی فوج لے کر ان کے مقابلے کو آیا اور میدان مار لیا۔ جاٹوں کا لشکر شکست کھا کر واپس چلا گیا۔[۴]

مختصر یہ کہ سرداری کے لئے خانہ جنگی نے ان کی طاقت کو کمزور کر دیا اور

---

[۱] میرؔ کی آپ بیتی ص ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ یہ واقعہ ۱۷۶۹ء میں پیش آیا۔
[۲] ملاحظہ ہو۔ ہسٹری آف دی جاٹس۔ ج ۱، ص ۲۱۷

[۲] میرؔ کی آپ بیتی ص ۱۵۹۔ ۱۶۰
[۳] میرؔ کی آپ بیتی ص ۱۶۷۔ ۱۶۹
[۴] مفتاح الفتوح ص ۳۵۵

ان کی رہی سہی طاقت کا مرہٹوں اور انگریزوں نے خاتمہ کر دیا۔

(۹) سکھ | گرو گوبند کے بعد سکھوں کی قیادت بندہ بیراگی کے ہاتھ میں آئی۔ اور اس نے مظالم شروع کیے۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمان اس کے تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ اس نے سرہند کو چار دن تک مسلسل لوٹا مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی اور مسلمانوں کے گھروں کو جلا کر خاک میں ملا دیا گیا۔ [1] طباطبائی کا بیان ہے کہ بندہ بیراگی نے مسلمانوں پر بڑے مظالم توڑے، جسے پایا تہ تیغ کر دیا اور ہر طرح سے ان کو ذلیل و خوار کیا، حتیٰ کہ مسلمان حاملہ عورتوں کے شکم پھاڑ کر بچے نکال کر مار ڈالے گئے [2] شیخ قادری کی اولاد کو اس بات

FOR STER: TRAVELS IN INDIA, I. PP. 304-21 [1]

CUNNINGHAM: A HISTORY OF THE SIKHS: P. 129.

[2] سیر المتاخرین (ا۔ت) ج ۱/ص ۹۹ بقول خافی خان، سکھوں نے آٹھ نو مہینے تک شاہجہان آباد سے دو تین منزل تک کے تمام علاقوں اور لاہور کے قرب و جوار کے تمام قصبوں اور مشہور آبادیوں کو تاخت و تاراج کیا۔ اور بے شمار آدمیوں کو جام شہادت پلایا۔ تمام لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مسجدیں مسمار کی گئیں اور بزرگوں کے مزارات کھود ڈالے گئے۔ لاہور سے واپسی پر انہوں نے کرنال اور سادھورہ کے قصبوں اور دیہاتوں کے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور گرفتار شدہ سو سو دو دو سو مسلمان اور ہندوؤں کو ایک جگہ بٹھا کر قتل کر ڈالا گیا۔ منتخب اللباب ۲/ص ۶۹۶ نیز ملاحظہ ہو۔ دستور الانشاء (یار محمد) ص ۸۰ مرزا حیرت، حیات طیبہ ص ۱۳۱، ۱ حوال الخواقین (قلمی) ص ۴۰ (الف)

پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بزرگوں کی قبر کھود کر ان کی لاشیں باہر نکالیں۔ مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے ایک خط میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"از ظلم و ستم کافرانِ سکھ۔۔۔۔ بلدۂ متبرکہ سرہند ویران شدہ مزاراتِ حضرت علیہم الرضوان بشہادت رسید و صاحبزادہا آوارہ ہر شہر و دیار شدند" لہ

تھانیسر میں سکھوں کے ہاتھوں جو تباہی و بربادی ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے بڑے کرب کے عالم میں مرزا مظہر فرماتے ہیں:-

"حق تعالیٰ اسلام را قوی تر گرداند، دریں روزگار الی قوی بدل را یافتہ، در ماہ گذشتہ قلعہ تھانیسر را کفار سکھ بغدر متصرف شدند و قتل و غارت وافر درمیان آمد، مولوی قلندر بخش جیو سلمہ بہ معززن و فرزند غارت خوردہ۔۔۔۔ از غایت بی اسبابی در آں نواح متوقف اند" لہ

میر نے سکھوں کے اُن مظالم و تشددات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جو انہوں نے سرہند کے مسلمانوں اور احمد شاہ ابدالی کی افواج پر کئے تھے، بقول میرؔ چوں کہ اس قوم دا بدالیوں کا غرور حد سے تجاوز کر چکا تھا غیرت خداوندی نے انہیں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کیا۔ جو پنجاب کے نواح میں بے اصلوں، جولاہوں، نداقوں بزازوں، دلالوں، بقالوں، نجاروں، قزاقوں، کسانوں، کم مایہ لوگوں، سفلوں

لہ کلمات طیبات ص ۵۳

لہ کلمات طیبات ص ۴۴

جنگلیوں، بازاریوں، کمینوں، اور تہی دستوں کی ٹولی تھی۔ تقریباً پچاس ہزار سکھوں نے اس لشکرِ جرّار کا مقابلہ کیا۔ کبھی تو ایسے مقابل آتے کہ زخم پر زخم کھاتے مگر پیٹھ نہ دکھاتے۔ اور کبھی اِدھر اُدھر منتشر ہو کر سو دو سو درانی (ابدالی) سپاہیوں کو گھیر کر لے جاتے اور سب کو تہ تیغ کر دیتے، ہر روز صبح کو فتنہ اٹھاتے، ہر شام کو چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے (غرض) انہوں نے (ابدالی کے) لشکریوں کا ناک میں دم کر دیا، انہیں جان بچا کر بھاگنا دو بھر کر دیا، کبھی ظاہر ہوتے اور لشکریوں پر ٹوٹ پڑتے، کبھی قہر بر پا بول دیتے اور اُسے تاراج کر دیتے، پریشان بالوں اور بندھے ہوئے چٹلوں کے ساتھ فوج میں آتے تھے۔ رات بھر شور و شر رہتا) اور سارا دن فریاد و فغاں (کی ہولناک آوازیں آتیں) اُن کے پیادے ابدالی سوار کے تلوار لگاتے اور ان کے گھوڑوں کی زین خون میں لت پت ہو جاتی۔ ان کے معمولی سپاہی ابدالی تیر اندازوں کو پکڑ کر لے جاتے اور طرح طرح کی ایذائیں دیتے" [۱]

ورتید نے مسلمانوں پر سکھوں کے ظلم و تشدد کا موازنہ فرعون کے اسرائیلیوں پر کئے گئے مظالم سے کیا ہے۔ [۲]

سکھوں کی چیرہ دستی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ بقول میر: "وہ گروہ ابدالیوں کے تعاقب میں لوٹ کھسوٹ اور تاراج کرتا ہوا دریائے اٹک تک گیا اور ان کی اچھی خاصی مرمت و گوشمالی کر کے اس صوبے پر قبضہ کر لیا۔ جس کی آمدنی دو کروڑ روپیہ سالانہ تھی۔ کچھ دنوں بعد اس اجل رسیدہ بندہ کو، جو شہر لاہور میں مقیم تھا قتل کر کے بالکل ہی مالک ہو گئے۔ اب چونکہ ملک کا دعویدار کوئی نہ تھا، ان کم اصلوں نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا [۳]

---

[۱] میر کی آپ بیتی ص ۱۱۹ [۲] IRVINE: LATER MUGHALS ۱.P97 [۳] میر کی آپ بیتی ۔ ۱۲۰

باب دوم

(۲) اقتصادی حالات

تقریباً ۲۶ سال تک اورنگ زیب دکن میں مرہٹوں اور دوسری سیاسی طاقتوں سے جنگ و جدل کرتا رہا اور شمالی ہندوستان کی آمدنی کا بڑا حصہ وہاں صرف ہوتا رہا۔ لیکن اس پر بھی اس نے اپنی دوراندیشی اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے اپنی وفات کے وقت چوبیس کروڑ روپیہ آگرہ کے خزانے میں چھوڑا تھا۔ مگر اس کے نا اہل جانشینوں نے اس روپے کو پانی کی طرح بہادیا۔ رفتہ رفتہ آمدنی کے سوت سوکھ گئے اور ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

اکبر بادشاہ نے جاگیرداری نظام کی خرابیوں کے پیش نظر خالصہ زمینوں کو بڑھانے کی پالیسی پر عمل کیا تھا۔ جس زمین کی آمدنی سرکار بذاتِ خود وصول کرتی تھی۔ اس طرح سرکاری آمدنی ہوجاتی تھی۔ اور ان امیروں کا منہ نہ دیکھنا پڑتا تھا۔

---

۱ کلیات قاسم (قلمی)، ص ۴۰ ۲ کلیات نظیر اکبرآبادی، ص ۴۷۰

۳ منتخب اللباب (خافی خان) ج ۲ ص ۵۹۸

جن پر صوبوں کے لگان کی وصولی اور اُس کو خزانے میں بھیجنے کی ذمہ داری تھی، اکبر کے جانشینوں نے اُس کی اِس حکمتِ عملی کو نظر انداز کر کے خالصہ علاقوں میں سے بھی جاگیریں تفویض کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا حکومت نے اپنی آمدنی کا ذریعہ کھو دیا۔ خود اورنگ زیب کے زمانے میں صوبائی گورنر مرکزی سرکار کو روپیہ نہ بھیجتے تھے اور اس سبب سے فوج اور سول افسروں کی تنخواہیں وقت پر ادا نہ کی جا سکتی تھیں [1]

چونکہ اٹھارھویں صدی میں مرکزی سرکار بہت کمزور ہو چکی تھی، لہٰذا دور کے صوبوں مثلاً بنگال اور دکن کے صوبہ داروں نے مرکزی سرکار کو روپے بھیجنا بند کر دیا، جہاں تک دار الخلافہ کے قرب و جوار کے صوبوں کا سوال تھا وہاں سے بھی اُسی صورت میں روپیہ وصول ہو سکتا تھا کہ بادشاہ بہت طاقتور ہو اور اپنی فوجی طاقت کا استعمال کر سکتا ہو، صوبائی حاکموں کے علاوہ جو صرف نام کے لیے ہی بادشاہ کے ملازم تھے، دوسرے سردار بھی آزادی کا دم بھرنے لگے تھے، انھوں نے خالصہ کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور ان علاقوں کی آمدنی کا رُخ انھوں نے اپنے خزانوں کی طرف موڑ دیا۔ نادر شاہ

---

[1] شاہ ولی اللہ نے مکتوب اول میں جو انھوں نے بادشاہ وزیر اور امراء کے نام لکھا تھا، اس بات کی ہدایت کی ہے کہ خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہیئے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد ہے آگرہ، حصار، دریائے گنگ اور حدود سرہند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو، کیوں کہ امورِ سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے سیاسی مکتوبات ص ۴۲، نیز ملاحظہ ہو، احوال الخواقین (قلمی) الف ۱۸۲، ب ۱۸۳۔

کے حملے کے بعد، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سرکش طاقتیں اور بھی زیادہ بڑھ گئیں، خالصہ علاقوں میں بڑی تیزی سے کمی ہو گئی۔ چنانچہ "سلطنتِ شاہ عالم از دہلی تا پالم" مشہور ہے[۱]۔

علاوہ ازیں نادر شاہ ہندوستان کی بہت کافی دولت، مختلف روایتوں کے مطابق ایک سو اسی کروڑ کا مال غنیمت لے گیا تھا[۲]۔ جو کچھ بچ رہا، وہ مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور درباری لوگوں نے برباد و تباہ کر دیا۔ اِن تمام بربادیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے افراد تک کو کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزارنی پڑی۔

اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ اپنی فیاضی کے لئے مشہور تھا[۳]۔ اس نے سلطنت کی مالی حالت اور بھی زیادہ تباہ کر دی۔ اُس کے بعد

---

[۱] تاریخ محمد شاہی (قلمی)، ص ۲۴ ب ۲۵ (الف) نیز ملاحظہ ہو،
THE HISTORY OF THE REIGN OF SHAH AULAM (FRANKLIN)

[۲] تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی)، ص ۲۶۷، اقتباس وقائع بدائع (آنند رام مخلص)، اورنٹیل کالج میگزین (نومبر ۱۹۴۱ء) ص ۸۱۔ تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ "مملکت چہار صد سالہ و سلطنت و فرماں روائی ایں آمد مدت را برابر ساخت" ص الف ۱۲۸، ب ۱۳۵-۱۳۶ (الف) خزانہ شاہی کے متعلق لکھا ہے "گنج ہائے فراواں کہ ہم خزینہ قارونی از شرمندگی بزرگی او بکوچکی رو نمود بنظور مین فرومی روند" ص الف ۱۲۵

[۳] لیٹر مغلس۔ ج ۱، ص ۱۳۹، تواریخ ممالک ہندوستان (قلمی)، ص ۱۲۳ (ب) خافی خان ج ۲، ۶۷۵-۷۸، ۶۷۳-۷۰۶، ۷۴۶، تذکرۃ الملوک، ص ب ۱۱۶-۱۱۷ (الف)

جہاں دار شاہ نے اپنی عیاشی میں بے دریغ دولت لٹائی اُس نے اپنی محبوبہ لعل کنور کو دو کروڑ روپے سالانہ جیب خرچ کے لیے دیا جبکہ اُس کی تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری بادشاہ پر تھی، دربار میں اس قدر جشن منائے جاتے اور محفلیں سجتی تھیں اور اُن ایام میں کثرت سے چراغاں ہوتا تھا کہ دہلی میں تیل اور روغن کمیاب ہو گیا تھا، اور تیل کا نرخ بڑھ گیا تھا، گیہوں سات سیر فی روپے بکنے لگا۔[۱]

فرخ سیر تخت پر بیٹھا تو اُسے گھوڑوں کے پالنے کا شوق تھا، ہزاروں گھوڑے اس کے اصطبل میں بے کار بندھے رہتے تھے اور ہزاروں روپے روزانہ اُن پر صرف ہوتا تھا۔[۲]

محمد شاہ بادشاہ بھی عیش دوست اور فضول خرچ تھا، اور ملک کی کل آمدنی سال کے آخر تک خرچ کر لیتا تھا۔[۳] محمد شاہ کے زمانہ تک اِن سب باتوں کے باوجود حالات ناگفتہ بہ ہوئے تھے۔ اِسی گرے ہوئے اقتصادی نظام پر نادر شاہ کا حملہ ہوا اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ وہ کثیر دولت ہندوستان سے باہر لے گیا۔ اس کے بعد شاہی خزانہ اور امیروں کے مکان دولت سے خالی ہو گئے۔[۴] اور شاہی کارخانہ جات تباہ و برباد ہو گئے۔[۵]

---

[۱] لیٹر مغلس ج ۱ ص ۱۹۲ [۲] لیٹر مغلس ج ۱ ص ۳۹۷ [۳] P.P.36-37 ورا۔

نیز تاریخ شاکر خانی۔ صـ ۳۷

[۴] تاریخ عالمگیر ثانی (قلمی)، صـ ۱۹۰، لیٹر مغلس۔ ج ۲ ص ۳۰۷۔

[۵] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ محمد شاہی ص ب ۱۶۰ تا الف ۱۸۳

احمد شاہ بادشاہ (۱۷۴۸ء، ۱۷۵۴ء) کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ چھتیس چھتیس مہینوں تک ملازمین اور سپاہیوں کو تنخواہیں نہ ملتی تھیں، ایک مرتبہ احمد شاہ کو مجبور ہو کر تمام کوٹھوں، سلاح خانوں، فراش خانوں، باورچی خانوں کے برتنوں، کتب خانہ اور نقار خانہ کی چیزوں کو فروخت کر کے سپاہ کی تنخواہیں ادا کرنی پڑیں[1]۔ شاہی وقار اتنا گر چکا تھا کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کو تیار نہ ہوتے تھے، اُس زمانے میں شہزادوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے تھے۔[2] سودا نے اپنے شہر آشوب میں سپاہیوں کی زبوں حالی کا یوں ذکر کیا ہے:-

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں ہے پر گیری تو بے چلّہ کماں ہے
کہتا ہے نفر عزّہ کو صرّاف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے
یہ سُن کے دیا کچھ، تو ہوئی 'عید' وگر نہ
شوّال سے پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کا ہٹنا اس شکل سے یاں ہے[3]

میرؔ نے "مخمس در حال لشکر" میں شاہی لشکر کی اقتصادی زبوں حالی اور سپاہ کی تنگدستی کا دلدوز انداز میں نقشہ پیش کیا ہے:-

---

۱ تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۳۶ ۲ تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۷، FALL OF THE MUGHAL EMPIRE- II, P 36-37 ۳ کلیات سودا (نولکشور) صفحہ ۱۵ نیز ملاحظہ ہو، دیوان حسرت (قلمی رامپور) ص ب ۱۳۳، الف ۱۳۴

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش　　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کر دیکھی یاں کی طرفہ معاش　　　ہے لب نان پر سو جگہ پہ خراش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب　　　جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگدستی سے سب بحال خراب　　　جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش [1]

ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں　　　لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال [2]

"مخمس در ہجو لشکر" میں میر نے ذیل کا نقشہ پیش کیا ہے:۔

جس کسو کو خدا کرے گمراہ　　　آوے لشکر میں رکھ اُمید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ　　　جس کو دیکھو سو ہے بحالِ تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

جانیے جس کے یاں وہ روتا ہے　　　یا کہے چوبدار سوتا ہے
جو مقدر ہے سو تو ہوتا ہے　　　کون وقتِ عزیز کھوتا ہے
میں تو تھوکوں نہ ایسوں پر واللہ

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اُداس　　　بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس　　　چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس

---

[1] کلیاتِ میر (نول کشور، لکھنؤ ۱۹۴۱ء) ص ۹۵۲

[2] کلیاتِ میر ص ۹۵۰ (نولکشور)

یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ

خاک اڑتی ہے صبح سے تا شام   شام سے صبح تک ہے فکرِ طعام
رحم کی جا ہے حال تنگ انام   ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سیکڑوں کے نہیں جگر میں آہ

مفلسی سے رہا ہے کس میں حال   خورش و خواب ہیں گے خوابؔ خیال
چار دن عمر کے ہوئے ہیں وبال   زندگی اپنے طور پر ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

جاؤ کرنے تلاش جس کے گھر   پہونچنا اُس تلک بہت دو بھر
راہ مطلق نہیں نکلتی ادھر   باعثِ صد فساد و شور و شر
دس تلنگے ہیں در پہ بے گہ و گاہ

فقر و فاقہ کی ہر طرف ہے دھوم   دو تلنگے جہاں ہیں واں ہے ہجوم
لشکر اک ہے خرابہ مردم بوم   زندگی کرنے کی طرح معلوم
کہ رہے جوں خدا ہی ہے آگاہ [1]

سلاطین اور شاہی خاندان کا حال

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ تو بردھاڑ   کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی ورا اپنے پہ آوے مارتا ہے کواڑ   کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھاتی پہ کی پہاڑ
تو چاہیئے کہ ہمیں سب کو زہر دیجئے گھول [2]

---

[1] کلیات میر دیوان کشور، لکھنؤ ۱۹۴۱ء، ص ۸۰۶-۸۰۷

[2] کلیات سودا، ص ۳۶۹

اس کے اوپر ہے شہ تماشائی ــــ اور چاہے ہے خرچ بالائی
ہر طرف جیسی ہے یہ رسوائی ــــ کل چنانچہ ہمیں نظر آئی
لال خیمے کے گرد و سرپال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی ــــ جو د کو چاہیے زمانہ بھی
یاں نہیں شہ کے گھر میں دانا بھی ــــ کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال[1]

شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی ایسی ابتری تھی کہ آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی نے اس کے مزاج میں نازیبا کفایت شعاری اور شاعرانہ حسنِ طلب بھی پیدا کر دیا تھا۔ ایک بار یہ واقعہ پیش آیا کہ شاہی نقارچیوں نے حسب الحکم کوچ کا نقارہ بجا دیا۔ بیگم کے ایما پر بادشاہ نے سفر ملتوی کر دیا۔ نقارچیوں نے حسب دستور سوا سو روپے "تا وانی انعام" کے طلب کیے۔ فراقی کا بیان ہے کہ اُس سلطنت بخش بادشاہ نے سوا سو روپیہ یا کراہ دیا، دوران کے شور و غل اور واویلے پر کہا "یہ بھی ہماری ہمت تھی کہ صدائے طبل پر بیس آنے بخش دیے۔ تمھیں یہ بھی کیا بُرے ہیں، جو زیادہ طلبی کرتے ہو"[2]

میرؔ نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ اس پر آٹھ آنے بھی بھاری تھے

---

[1] کلیاتِ میر ص ۱۵۸

[2] وقائع عالم شاہی (مرتبہ جناب مولوی امتیاز علی خاں عرشی)، ص ۹۷

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری فوج ہے گی تو قحط کی ماری
کیوں نہ جس جا رہے ہیں واں تھا کال[۱]

علاوہ ازیں ہیٹنگ نے ایک مرتبہ پوشاک کی چند کشتیاں مرشدزادوں کے لئے بھیجیں شاہ عالم کو ایک بیٹی بڑی عزیز تھی اور "میاں صاحب" کے نام سے ملقب تھی۔ اُن کے مطلب کا کوئی کپڑا اِن میں نہ تھا۔ یہ دیکھ کر لانے والوں کے سامنے بادشاہ نے فرمایا "چونکہ ہیٹنگ جانتے ہیں کہ ہمیں میاں صاحب سے کتنی محبت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے وہ علیحدہ اچھا سا کپڑا بھیجیں گے" ہیٹنگ نے ارشاد سنا تو فوراً اعلیٰ درجہ کا کپڑا بھجوا دیا۔[۲]

اتنا سب کچھ ہونے پر بھی شاہ عالم نے عیش و عشرت کا دامن نہ چھوڑا۔ اس بڑھاپے اور بصری میں "عزیزن" نامی ایک معمولی درجہ کی کنچنی پر عاشق ہو کر اُسے شرفِ زوجیت سے مشرف فرمایا۔ اور "ملکۂ عالم" خطاب دیا۔ وہ بدذات جب روٹھ جاتی اور اس وقت تک نہ منتی جب تک بادشاہ کو خوب دق اور ذلیل نہ کر لیتی۔ اس صورت میں بادشاہ اس کی ہی نہیں اس کے بھائی بندوں کی بھی خوشامد کرتے اور بالآخر بہر رامنت و

---

[۱] کلیاتِ میر ص ۹۵۷

[۲] وقائع عالم شاہی ص ۲۲۔ شاہ حاتم نے ذیل کے شعر میں شاہ عالم کی غربت اور تنگدستی کا ذکر کیا ہے۔

شاہ عالمگیر کا مصرع ہے حاتم رمزِ عشق ۔ دل میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجیے۔
(دیوان زادہ ص ۲۸۶)

سماجت اُسے راضی کر کے ہی دم لیتے [۱]

اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء۔ ۱۸۳۷ء) کے زمانے میں اسی سے بھی زیادہ بدتر حالت تھی، سر سید احمد خاں نے لکھا ہے :۔

"اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے۔ مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے [۱] شاہزادوں کو جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے، ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں۔ بھوکے مرتے ہیں [۲]"

پروفیسر اسپیر نے اپنی کتاب TWILIGHT OF THE MUGHALS میں ان مغل شہزادوں کی زبوں حالی اور ان کے دردناک مصائب کا بڑا پُردرد نقشہ پیش کیا ہے اور انھوں نے لکھا ہے کہ ان شہزادوں کو مرجانے دیا جاتا تھا لیکن کوئی مزدوری یا ملازمت محض اس وجہ سے نہ دی جاتی تھی کہ یہ کام ان کے شایانِ شان نہ تھا اُن کے حالات جانوروں سے بدتر تھے۔ [۳] مصحفی نے لکھا ہے :۔

گل جائے زبان میری کروں تجھ گراں کی یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کا بیاں ہے

[۱] : تاریخ عالم شاہی ص ۱۱۶ ؛ اس سرکاری کارخانہ جات کی ابتری کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص الف ۱۶۱ تا الف ۱۸۳

[۲] سیرت فریدیہ ص ۲۴۔ ۲۵

[۳] TWILIGHT OF THE MUGHALS. PP62-63

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک　　صاف تو یہ گلشنِ دہلی میں خزاں تھی[۱]

امراء کی اخلاقی حالت

اس عہد کے امراء میں عیش و عشرت اور فضول خرچی جزوِ فطرت بن گئی تھی، میر نے لکھا ہے :-

لعل خیمہ جو ہے سپہرا سا س　　ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے ناز و شراب سے بے وسواس　　رعب کر لیجئے یہیں سے قیاس
قصہ کوتاہ رئیس ہیں عیاش[۲]

ولیم ہوجیج کا بیان ہے کہ جب سلطنت مغلیہ اپنے اقتدار اور تسلط کے شباب پر تھی تو درباری امراء کا خصوصاً اور دوسرے امیروں کا عموماً یہ شغل تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں حسین و جمیل عورتیں ملک کے مختلف علاقوں سے اور خاص طور پر کشمیر کے علاقے سے منگوا کر اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے[۳] قطب الملک عبداللہ خاں عیش و عشرت کا بہت دلدادہ تھا اور دن رات جنسی لذتوں میں مشغول رہتا تھا، اس نے بے شمار عورتیں اپنے حرم میں جمع کر رکھی تھیں، خافی خاں نے لکھا ہے کہ :-

" ازاں کہ سید عبداللہ خاں بجبت زناں و عشرت نساء نہایت رغبت

---

۱ دیوان مصحفی (مرتبہ حسرت موہانی)، ص ۶۶ ۲ کلیات میر ص ۹۵۲،

۳ کلیات میر ص ۹۵۲ ۴ HODGES: TRAVELS IN INDIA PP. 21-22

۵ خافی خان ج ۲، ص ۸۲۱-۲۲ نیز ملاحظہ ہو سیر المتاخرین (ف)، ج ۲، ص ۳۹۶، ۴۰۷، ۴۰۴

داشت. بروایت مشہور دوسہ زن حور لقا از جملہ محرمان حرم پادشاہی پسند نمودہ بتصرف خود در آوردہ. ہر چند کہ از زیادتی حرص و خواہش شہوتانی قریب ہفتاد و ہشتاد زن خوش ادائی حور مثال فراہم آوردہ با آنہا نرد می باخت[1]

شاہ جہاں آباد کے امیروں کے بارے میں طبا طبائی نے لکھا ہے:
"در شاہ جہاں آباد نا اہل بطور امرا بہ نگہداشتن نسوان و خریدن دختران کلاونت و قوالان و نکاح بازی .... اختیار نمودہ[2]

قزلباش خاں امید روزگار کی تلاش میں ایران سے ہندوستان آیا تھا محمد شاہ کے عہد میں اُسے پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا۔ یہ امیر اپنا زیادہ وقت تفریح اور حسینوں کی صحبت اور خوش گپیوں میں صرف کرتا تھا۔[3] مرد پرستی کی طرف اسکی طبیعت بے حد مائل تھی عبدالحی تاباں "یوسفِ ثانی و غیرہ" کم سن لڑکوں کو زنانہ لباس میں ملبوس اور زیورات سے آراستہ کر کے ڈولیوں میں بٹھا کر ہر شام قزلباش خان کے مکان پر بھیجا کرتا تھا اور شب وہاں ان کی صحبت میں بسر کرتا تھا[4]

خود تاباں کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے کہ وہ بے حد حسین تھا،

---

[1] سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲، ص ۶۶۰ [2] نکات الشعراء، ص ۷، تذکرہ الشعرائے اردو ص ۴۶، مخزن نکات ص ۳۱، مجموعہ نغز، ص ۱۷ [3] نکات الشعراء ص ۱۰۸، ۱۰۹، مخزن نکات ص ۵۳ تذکرۂ ہندی ص ۷۴، ۷۸، [4] مجموعۂ نغز ا/ ص ۱۳۲، ۱۳۳، نیز تذکرہ کریم الدین ص ۱۶۷

اس کی تصویریں دہلی کے قہوہ خانوں میں لگی ہوئی تھیں۔ مصحفی نے چاندنی چوک کے ایک قہوہ خانے میں اس کی تصویر دیکھی تھی [1] ایک بار بادشاہ بھی اس کے حسن کا شہرہ سن کر اُسے دیکھنے کے مشتاق ہوئے۔ ہاتھی پر سوار ہو کر گھر سے نکلے اور تاباں کے کوٹھے کے نیچے آکر پانی پینے کے بہانے سے ہاتھی روکا اور اس کی زیارت کر کے آگے بڑھے۔

خان جہاں بہادر کے بھتیجے قدوی خاں کا لڑکا اعظم خاں اپنی دولت حسین لونڈوں کے مہیا کرنے میں صرف کرتا تھا۔ درگاہ قلی خاں نے اسکے متعلق لکھا ہے:۔

اس کی طبیعت امارد پسند ہے۔ اور اس کا مزاج سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار۔ اس کی جاگیر کی آمدنی اس فرقہ کے اخراجات میں صرف ہوتی ہے جس جگہ سے بھی اسے کسی حسین امرد کے متعلق خبر ملتی ہے۔ اس کی ہر خواہش پوری کر کے اُسے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے اور جس طرف سے بھی اُسے کسی خوبصورت لڑکے کا پیام ملتا ہے۔ اس پر احسانات کا بوجھ ڈال کر اپنے دام میں گرفتار کر لیتا ہے۔ ان میں سے بعض ہاتھی اور گھوڑوں کی سواری پر بڑے تجمل اور شکوہ سے نکلتے ہیں۔ غرض کہ جہاں کہیں بھی حسین امرد نظر پڑے وہ اعظم خاں سے ضرور وابستہ ہوگا۔ اس کی تمام زندگی حظِ نفسانی اور لہو و لعب میں گذری [2]

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۸۹ [2] مرقع دہلی ص ۷۲ معتمم خاں بہادر کی عیاشی اور اسکی امرد پرستی کے ذوق کے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے، ماثرالامراء (فارسی) ج ۳۔ ص ۷۹۶

شاکر خاں۔ جہاں دار شاہ کے عہد کے ایک امیر ذوالفقار خاں کے متعلق لکھتا ہے :۔

"بعیش و عشرت بر داشت"[1]

عبدالغفور۔ محمد شاہی ایک امیر صد درجہ عیاش تھا۔ اس کی ایک امنگ یہ تھی کہ وہ خواجہ زنوں کی طرز پر لباس زیب تن کرتا تھا۔ نشے میں مدہوش ہو کر وہ اپنے ٹخنوں میں گھنگرو بندھواتا اور سر پہ شال اوڑھ کر ان کے ساتھ رقص میں شریک ہوتا۔ اس کے مکان سامنے سے جب غریب آدمیوں کی عورتوں کی ڈولیاں نکلتیں تو انہیں زبردستی ٹھہرا کر عورتوں کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اور ان میں سے جو پسند خاطر ہوتیں، انھیں وہاں روک لیا جاتا[2]

مرزا اتو، عہد محمد شاہی کا ایک امیر تھا، درگاہ قلی خان نے اس کی مجلس کا بڑا دلچسپ الفاظ میں نقشہ پیش کیا ہے ؛

"اس کا مکان شداد کی بہشت کے مانند تھا اور اس کے مکان پر پری زادوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ دہلی کے تمام حسین امردوں کا اس کی مجلس سے تعلق تھا۔"[3]

وزیر الممالک کی مجلس یازدھم کا ذکر کرتے ہوئے درگاہ قلی خاں لکھتا ہے کہ اس کا مکان حسینوں کے مجمع کے سبب سے گلشن آباد تھا جس جگہ بھی کوئی حسین امرد تھا وہ اس کی مجلس کی طرف رجوع ہوتا تھا اور حسینوں کی

---

[1] تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۱۰۱ الف [2] لیٹر مغلس (انگریزی)، ج ۲، ص ۲۲۹

[3] مرقع دہلی ص ۲۹ ۔ ۳۰

صحبت کے خواہشمند اس کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے۔ کلاونتوں کے حسین جمیل لڑکے ڈیلیوں میں اس کی بزم میں حاضر ہوتے تھے۔ ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ کو اس کے ہاں ارباب رقص کا اجتماع ہوتا تھا اور اسی طرح قوال اور نقال بھی حاضر ہوتے تھے [۱]

حسین علی خاں رقص و بادہ نوشی میں اتنی دولت صرف کرتا تھا کہ اس کی آمدنی کفایت نہ کرتی تھی [۲]

ایک روز محمد شاہی امیر امین الدین خاں سنبھلی کے متعلق صمصام الدولہ کا بیان ہے :۔

"مشغوف یار باشی و عیش و پرستی بود" [۳]

اس کی عمر کے آخری زمانے کے بارے میں مصنف ہذا لکھتا ہے :۔

"در آخر با امارد پرستی را اعلان و شیوع رسانیدہ۔ از ہیں ہوس پروان سادہ رو و نوخطاں چار ابر دفراہم آوردہ در تقطیع و تزئین آنہا توجہ می گماشت۔ و ہمیں را مصارف ہمت می پنداشت۔" [۴]

وزیر قمر الدین خاں۔ محمد شاہی اپنی زندگی عیش و عشرت و بادہ نوشی میں بسر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ نشے کے عالم میں سیڑھیوں پر سے گر پڑنے کی وجہ سے ایسی چوٹ آئی تھی کہ اس کی وجہ سے زیادہ دیر تک کھڑا رہنا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا [۵]

عہد محمد شاہی کے ایک امیر روشن الدولہ طرہ باز خان نے ایک موقع پر امیر الامرا خاندوراں خاں، سربلند خاں اور سید سعادت خاں کو دعوت پر بلایا۔ ان کے اعزاز میں مجلس رقص و سرود کا اہتمام کیا گیا۔ اس محفل کے بارے میں قاضی مرتضی واسطی نے لکھا ہے :۔

"انداز جشن طوائفان آں چہ نویسد، گوئی خیل پری بودہ یا حوران بہشتی برائے

---

[۱] مرقع دہلی ص ۲۳-۲۴ [۲] ماثر الاوا فارسی ج ۱ ص ۳۲۰

[۳] ایضاً ۱- ص ۳۵۸ [۴] ایضاً ج ۳/۹۶

[۵] سیر المتاخرین (ا-ت) ۳/ص ۲۲

ربودن ہوش مردم از آسمان فرود آمدہ بودند، وخوبی ونغمہ ورقص از تحریر بیرون بودہ[1]

تواریخ کے صفحات سے اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

فضول خرچی اور فیاضی حکومت برطانیہ کے تسلط سے پہلے ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور اپنی دولت کے لئے دنیا میں مشہور تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ایک موقعہ پر محمد شاہی وزیر قمرالدین خاں[2] کی فارغ البالی اور تمول کا ذکر کرتے ہوئے کہا:-

"بخانہ قمرالدین خاں عورات غسل اخیراز گلاب می کردند و بخانہ دیگر نواب سہ صد روپیہ را ہر روز گل و می رفت"[3]

---

[1] حدیقۃ الاقالیم ص ۶۵۴۔ عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی مجلس رقص وسرود کے لئے ملاحظہ ہو۔ دیوان تاباں ص ۲۷۰-۲۶۸

[2] نام میر محمد فاضل تھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں ایک اعلیٰ منصب اور قمرالدین خاں کا خطاب ملا، فرخ سیر کے عہد میں ایک عمدہ منصب کے علاوہ بخشی احدیان کے عہدے پر فائز ہوا۔ محمد شاہ کے دور میں شش ہزاری نواب اور ہفت ہزاری کا منصب اور اعتماد الدولہ قمرالدین کے خطاب کے ساتھ وزارت کا عہدہ بھی ملا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا (فارسی) ج اول ص $\frac{۳۵۹}{۳۴۵}$

[3] ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی ص ۱۱۔ محمد شاہ بادشاہ کے منظور نظر عبدالغفور کا جب انتقال ہوا تو اس کے مکان سے دو کروڑ نقدی کے علاوہ دوسری قیمتی چیزیں بھی نکلی تھیں۔ تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص ۳۶۔ اعتماد الدولہ قمرالدین کی وفات پر اس کے مکان سے بارہ کروڑ روپیہ کا مال واسباب اور نقدی روپیہ برآمد ہوا تھا۔ تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص ۱۸۔ ہندوستان کے امراء کے سلسلے میں لکھتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ پڑھیوں سے وہ لوگ حکمراں رہے ہیں اور ان میں ہر ایک روزانہ کی (بقیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

بقول غلام علی آزاد بلگرامی، اسی دولت نے مسلمانوں کے قوای عمل شل کر دیئے تھے اور اُن کی تمام ذہنی قوتوں کو عیش و عشرت کی طرف منتقل کر دیا تھا۔[1] انشاء اللہ خاں انشاء نے لکھا ہے کہ اس زمانے کے امیر آدھا سیر پلاؤ کی تیاری میں بیس روپے صرف کر دیتے تھے اور ان مرغن کھانوں کے بعد وہ تنہائی میں بیگموں اور طوائفوں کی صحبت میں رہتے تھے، اسی سبب سے ہندوستان کو اس تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔[2]

اس زمانے کے تمام امراء اسراف بے جا کا شکار تھے، کہا جاتا ہے کہ جس پالکی اور ہاتھی پر سوار ہو کر روشن الدولہ[3] نکلتا تھا، اس کی سجاوٹ میں اتنی زیادہ مقدار میں سونا و چاندی صرف ہوتا تھا کہ پالکی اٹھانے والے کہار اور راستہ کے فقیر کئی کئی تولے سونا اور چاندی راستہ سے چُن چُن کر اکٹھا کر لیا کرتے تھے۔[4]

(بقیہ صفحہ کا) زندگی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا، ایک ایسا زمانہ آیا کہ اگر کوئی امیر ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا کمربند باندھتا تھا یا تاج پہنتا تو لوگ اس کے لئے تذلیل کے الفاظ استعمال کرتے، ایک امیر کے پاس شاندار مکان باغات، غسل خانے اور آرام کے لئے خوبصورت پلنگ اور غلاموں کا نہ ہونا اُس کی غربت کی پہچان تھی، وہ بہت زیادہ روپے کھانے اور لباس میں صرف کرتے تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ (اردو) ص ۱۶۲، ۱۶۳

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۴۹ [2] دریائے لطافت (فارسی)، ص ۶۲ [3] ماثر الامراء (فارسی)،
[4] سیر المتاخرین (فارسی)، ج ۲، ص ۲۲۸ نیز چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۲۲۸

قطب الملک عبداللہ خاں[1] ہر ماہ بیس ہزار روپے خانقاہ نشینوں کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ یہی نہیں اُس کی فضول خرچی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مکان سے قلعۂ معلی تک جہاں سے اُس کا مسکن بہت قریب ہی تھا، دو سو روپے بطور کرایہ دیا کرتا تھا۔[2] تاریخ ہندی کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر الامراء حسین علی خاں کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اس کے زمانے میں مفلس اور غریب لوگوں کی تعداد میں بڑی کمی ہو گئی تھی، اُس کے لشکر کا کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جس کے پاس زرِ سفید و سرخ نہ ہو، بلکہ اس کی سرکار کے نقیب، سپاہیوں کے ڈیروں پر جا کر اُن کو تاکید کرتے کہ وہ جا کر اپنا حصہ لے لیں، اکثر سپاہی کہتے کہ ہمارے پاس بہت ہے۔ اب رکھنے کو جگہ نہیں ہے؟ اس کے "بلغور خانہ" میں مسکینوں کے لئے پانچسو روپے کا کھانا پکتا اور اُس کے مطبخ کا روزانہ کا خرچ دو ہزار سے زیادہ تھا۔[3]

مختلف رسوم اور دوسرے تہواروں پر دل کھول کر خرچ کیا جاتا تھا۔ روشن الدولہ نے اپنی لڑکی کی شادی میں ساٹھ لاکھ روپے صرف کئے تھے، تورانی امراء میں سے کسی نے بھی اتنی رقم شادی میں کبھی خرچ نہ کی تھی۔[4] صفدر جنگ[5] نے اپنے لڑکے شجاع الدولہ کی شادی میں اتنا روپیہ صرف کیا تھا کہ عہدِ مغلیہ کے

---

[1] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ [2] تاریخ محمد شاہی (قلمی)، ص ۹۳ ب [3] تاریخ ہندی (قلمی)، ص ۴۶۷، نیز ملاحظہ ہو مآثر الامراء (فارسی)، ج ۱، ص ۳۲۰

[4] تاریخ مظفری (قلمی)، ج اول، ص الف ۱۹۸۔ [5] برائے حالات ملاحظہ ہو، مآثر الامراء (فارسی)، ج ۲، حصہ ۲، ص ۴۶۳-۴۶۷۔

امراء میں شاہجہاں بادشاہ کے وزیر ظفر خانؒ کے علاوہ کوئی اس تک نہ پہونچا تھا۔[۱] راجا جگل کشور نے قریب چالیس لاکھ روپیہ اپنے لڑکے کنور نند کشور کی شادی میں خرچ کئے، کھانے پر دہلی کے تمام ساکنوں کو مدعو کیا گیا تھا۔[۲] اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد جب میر تقی میر اپنی عسرت اور تنگدستی کی بنا پر راجا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو راجا نے بہت شرمندگی کے انداز میں کہا،

"کہ من شالِ کہنہ دارم، اگر دستے می داشتم، چشم نمی پوشیدم"[۳]

روشن الدولہ دوازدہم ربیع الاول کی مجلس بڑی شان وشوکت سے منعقد کیا کرتا تھا، پرانی دہلی سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ تک کے راستہ پر اعلیٰ پیمانے پر چراغاں اور روشنی کی جاتی تھی۔

چراغاں گشت رشک افزای انجم — زمیں ہم چشم شد با چرخ ہشتم
ہوا شد از چراغاں رشکِ گلشن — ذراں پروانہارا چشم روشن
نگہ در دیدنش در ہوش گردید — ہوا گری مرصع پوشش گردید

مختصر یہ کہ اس روشنی اور غربا کو کھانا تقسیم کرنے میں دو دو لاکھ روپیہ

---

[۱] [۲] چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۴ ۳۹ - ۳۹۳، نیز عمادت السعادت۔ ص ۳۶۔ [۲] احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ (قلمی) آصف الدولہ (قلمی)، ص ۴۰۷ نیز مجموعہ نغز۔ ص

[۳] ذکر میر (فارسی)، ص ۸۷، [۴] خواجہ شیخ معین الدین چشتیؒ اجمیری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کا وصال ۶۳۳ھ میں ہوا تھا، مزار مہرولی میں ہے۔ ملاحظہ ہو سیر الاولیا، ص ۴۸، ۵۷، سیر الاقطاب، گلزار ابرار، ص ۳۹، ۴۴)، سفینۃ اولیاء (اردو ترجمہ) ص ۱۳۱ - ۱۳۵

سالانہ صرف کیا کرتا تھا[1] علاوہ ازیں روشن الدولہ اپنے پیر و مرشد شیخ بھیک کا عرس بھی اسی شان و شوکت سے کرتا تھا[2]

[3] محمد شاہ بادشاہ کا مقرب اور منظورِ نظر جاوید خاں یازدہم ربیع الاول کی مجلس بڑے اعلیٰ پیمانے اور تجمل کے ساتھ منعقد کرتا تھا۔ بڑے پیمانے پر چراغاں ہوتا تھا۔ یتیموں اور غرباء میں پکا ہوا کھانا تقسیم کیا جاتا۔ بادشاہ اور امراء ضیافت میں شرکت کرتے تھے۔[4]

نواب جعفر خاں، صوبہ دار بنگال، ہر سال مکہ معظمہ و مدینہ منورہ، نجف اشرف و کربلاء معلیٰ، بغداد، خراسان، جدہ و بصرہ کے جانے والے حاجیوں کے امیر کے ساتھ نذر بھیجا کرتا اور اجمیر جیسے ہندوستان کے متبرک مقامات کے لئے بھی نذور اور اوقاف مقرر کرتا تھا، دو ہزار پانچسو قاری اس کے دربار سے منسلک تھے جو ہمہ وقت قرآن خوانی میں مصروف رہتے، ان لوگوں کو دونوں وقت کھانا نواب کے مطبخ سے ملتا۔ غرہ سے دوازدہم ربیع الاول تک جو حضرت رسول اللہ کی وفات کا دن ہے، ہر روز اکابر، مشائخ، علماء و فقراء و صلحاء کی ضیافت کرتا۔ ان دنوں کی ہر رات کو ماہی نگر سے لعل باغ تک دریا کے کنارے اعلیٰ پیمانے پر چراغاں کرتا۔ کہا جاتا ہے

---

[1] تاریخ مظفری، جلد اول، الف ۱۹۸ برائے تفصیل، مرقع دہلی ص ۳۷ - ۳۹۔

[2] حدیقۃ الاقالیم ص ۵۴ سہ برائے حالات ملاحظہ ہو۔ مآثر الامراء (فارسی) ج ۱ ص ۳۶۲، ۳۶۷

[3] احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ (قلمی)، ص الف ۵

[4] A NARRATIVE IN BENGAL : PP:24-:53

کہ اس کام کے لئے ایک لاکھ سے زیادہ مزدور مامور ہوتے تھے۔[1]

ان فضول خرچیوں کی وجہ سے امراء کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی تھی، شاہ ولی اللہ نے امراء کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، اُن کو چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اُٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔"

بادشاہوں، اور امراء کی عیاشی اور عیش و عشرت کی زندگیوں سے سپاہی اور عوام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آخر کار اقتصادی تنگ دستی کا شکار ہونا پڑا۔ سپاہیوں کو مخاطب کر کے شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:۔

"تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو باآسانی تمہیں اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے۔۔۔۔ دیکھو اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پس انداز بھی کیا کرو۔"

سپاہیوں میں شراب نوشی اور بھنگ خوری کی عام وبا پھیلی ہوئی تھی۔[2] عام پیشہ وروں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

---

[1] اخبار محبت (قلمی)، ص ۱۰۹ [2] تاریخ محمد شاہی (قلمی)، ص ب ۱۸۷

"یہ لوگ ..... خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں، اُن میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے ..... دیکھو اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو"

عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں"

"اسی طرح اور بھی بُری رسمیں تم میں جاری ہیں جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے. مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے [۱]

بہرصورت بادشاہوں، امیروں، سپاہیوں اور عوام کی عیش و عشرت، فضول خرچی اور سیاسی طاقتوں کی لوٹ مار، اور ملک میں بدامنی پھیل جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی سوسائٹی کا ہر طبقہ اور ہر پیشہ در اقتصادی پریشانیوں کا شکار تھا. [۲]

ذیل میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور پیشہ والوں کی اقتصادی حالت کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا.

---

[۱] الفرقان. شاہ ولی اللہ نمبر

[۲] آرام سے کٹنے کا سُنا تو نے کچھ احوال ÷ جمعیتِ خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام ÷ عُقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اُس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے ÷ یہ بات بھی گوئندہ کا محض گماں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر ÷ آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ واں ہے
کلیات سودا نول کشور ص ۱۵۲

کاشتکار، بیوپاری اور پیشہ ور | اس زمانے میں ملکی محاصل کا زیادہ دارومدار کھیتی پر تھا اور ہندوستانی آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ زراعت سے روزی حاصل کرتا تھا۔ کاشتکاری کے لئے آبیاری کے ذرائع بہت محدود تھے۔ اور ان کا مدار زیادہ تر بارانِ قدرتی پر تھا، اگر ملک میں امن و امان قائم رہتا تو آب پاشی کے وسائل بڑھانے کا کام بھی بآسانی ہو سکتا تھا ان کے سوا یہ تھا کہ رسد کو تباہ و برباد کرنے کے لئے فوجیں جدھر سے گذرتی تھیں تیار کھیتیوں کو آگ لگا کر ضائع کر دیتی تھیں تاکہ قحط سے تنگ آکر غنیم ہتھیار ڈال دے اور کچی کھیتوں کو روند ڈالتی تھیں، مجبوراً کسانوں کا بڑا طبقہ فاقوں سے مرتا تھا یا رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیتا تھا، سودا نے کاشتکاروں کی حالت کا بھی بیان کیا ہے وہ کہتا ہے :-

دو بیل کی جا کر جو کہیں کیجے کھیتی ٭ اور مینہ بھی موافق ہی پڑے تو تو سماں ہے

ہیں خشکی و تری کے تفکر میں شب و روز ٭ نہ امن ہے دل کے تئیں نے جی کو اماں ہے[1]

ان کاشتکاروں کی حالت یہ تھی کہ فصل کے تیار ہونے سے قبل ہی پیشگی قرض لے کر اس فصل کی متوقع آمدنی سے زیادہ کھا لیتے تھے، میر نے اس کو یوں لکھا ہے :-

فصل ہوتے ابھی نہیں پائی ٭ پیشگی سب نے قرض لے کھائی[2]

---

[1] کلیات سودا، ص ۲ ۱۵ تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ غریب رعایا سے حکام ایک روپیہ کے بجائے ۲ ۱/۲ اور بعض تو ایک کے بجائے پانچ روپے تک وصول کرتے تھے ص الف ۱۴۲۔ [2] کلیات میر (نول کشور) ص ۸۸۵

سوداگری | سوداگروں کی حالت کا سودا نے شاعرانہ انداز میں یوں ذکر کیا ہے:

سوداگری کیجئے تو ہے اس میں یہ مشقت ٭ دکھن میں بکے وہ جو خرید اصفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل ٭ ہر شام بدل دوسرے سود و زیاں ہے
لیں جو کسی عمدہ کی سرکار میں لے جنس ٭ یہ درد جو سنئے تو عجب طرفہ بیاں ہے
جب سوں شخص ہوا مرضی کے موافق ٭ پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت ٭ کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اور ملد سے ہو آئے تو کہا جنس ہی لے جا ٭ دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس ٭ ہر اک متصدی سے میاں اور تیاں ہے
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے ٭ جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے[1]

سوداگری کا دار و مدار بنجاروں پر تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ضروریاتِ زندگی کے تمام ساز و سامان اور غلہ و جنس پہنچاتے تھے، مگر جنگ اور آشوب کے زمانہ میں راستے خطرے سے خالی نہ رہتے تھے اور رہزنی کا قدم قدم پر خطرہ تھا، ادھر پیدا وار محدود، اُدھر راستے مسدود، پھر عوام کی قوتِ خرید کمزور، خزانے خالی، سوداگری کیا

لہ کلیاتِ سودا، نول کشور، ص ۲۵۱۔ تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر جاگیردار، منصب دار سوداگروں سے محصول راہداری وصول کرتے ہیں۔ اور سوداگروں کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اشیاء کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے اور مہنگائی کی وجہ سے عوام پریشان حال ہیں۔ ص الف، ۲ نیز ملاحظہ ہو دیوانِ حسرت (قلمی) ص الف، ۱۳۵۔ کلیاتِ نظیر اکبرآبادی ص ۲۹۴، کلیاتِ ہدایت (قلمی) ص ۱۵۱۔ تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی)، ص ۲۴۔

ترقی کر سکتی تھی، یہی حال صنّاع اور پیشہ ور لوگوں کا تھا، میرؔ کا مشہور شعر ہے:-

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہُنر آوے

دستکار اور پیشہ ور | اس فتنے اور طوائف الملکی کے زمانے میں یہ دستکار بھی بے کار بیٹھے رہتے تھے کیونکہ ان کی سرپرستی کا مدار بھی امراء کی خوش حالی پر تھا، پیشہ وروں اور اہلِ حرفہ کی بے روزگاری کا حال اس زمانے کی شاعری میں عام طور پر ملتا ہے۔ قصبات اور شہروں میں بسنے والی بڑی آبادی اس عہد میں صنّاع تھی۔

بابر بادشاہ نے اپنے ہندوستان کے تاثرات میں اس کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اس نے آگرے میں پڑاؤ ڈالا ہے اور تعمیرات کا کام شروع کیا ہے تو کتنے سنگ تراش، معمار اور دوسرے ہنرمند اس کے ساتھ کام کرتے تھے، خوش حالی کے زمانے میں ان پیشہ وروں کو روزگار بھی ملتا تھا اور قدردانی بھی ہوتی تھی جس سے فن کی ترقی بھی وابستہ تھی، لوگ ہنر سیکھتے اور اس میں ریاض کرتے تھے اور اپنے کمال کی داد پاتے تھے، لیکن جب سارا نظام حکومت ہی کمزور ہو تو صنّاع اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، ہندوستان میں مختلف پیشہ وروں اور دستکاروں کی ترقی و خوشحالی کا بہترین زمانہ شاہ جہاں کا عہد تھا، اورنگ زیب کی زندگی سپاہیانہ رہی اور اس کی عمر کا بڑا حصّہ مہاتِ جنگی

کے سر کرنے میں بسر ہوا، اس لیے مختلف صنعتوں کی سرپرستی کا اسے موقع نہ ملا، اور بعض کی ترقی میں مثلاً (مصوری، موسیقی وغیرہ) اس کے مذہبی رجحانات حارج ہوئے، اورنگ زیب کے بعد باہمی آویزش اور معاشی بحران کی وجہ سے قلعۂ معلیٰ نے ہنرمندوں کی وہ سرپرستی نہ کی جو مغل بادشاہوں کی روایت رہی ہے، پھر فتنوں کا دروازہ باز ہوگیا اور بساط ہی الٹ گئی، پھر بھی بعض امرا جو اپنے علاقوں میں کسی قدر جمعیت کے ساتھ محفوظ تھے وہ شاہانِ مغل کی روایتوں کو زندہ رکھتے تھے، آصف الدولہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ساٹھ سو خوش نویس اور خطاط ان سے متوسل تھے جو بڑی سے بڑی کتاب کی نقل ایک دن میں تیار کرکے شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا کرتے تھے، نواب نجیب الدولہ کے ساتھ ڈھائی سو علما رہتے تھے اور اسی نسبت سے مختلف ہنروں اور پیشوں کی قدردانی کی جاتی تھی، جعفر خان، صوبہ دار بنگال، کے ہاں دو ہزار سے زیادہ قاری ملازم تھے، بہرصورت یہ سب ترقیاں خوش حالی سے ہوتی ہیں، جب اقتصادی حالت ناقص ہو جائے تو آرٹ کا حسن بھی غائب ہو جاتا ہے، نظیر اکبرآبادی نے اپنے عہد (اٹھارھویں صدی کے اواخر) میں پیشہ وروں کی نسبت لکھا ہے:

مارے ہیں ہاتھ پہ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ ور ہیں سو روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار

چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند[۱]

اس زمانے میں ۳۶ پیشوں کا ذکر ہے، ضروری نہیں ہے کہ یہ تقسیم قطعی اور صحیح ہو لیکن پرانے زمانے کے مؤرخوں نے اس کی تحدید اسی طرح کی ہے، حالانکہ اِن پیشوں کے علاوہ بھی لوگ دوسرے پیشوں سے روزی کماتے تھے، تاریخ محمد شاہی کے مصنف، کے علاوہ میرؔ، سوداؔ، حاتمؔ حسرتؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی نے اپنے شہرآشوبوں میں اُن کی زبوں حالی کا دل دوز نقشہ پیش کیا ہے، اُن میں سے چند پیشہ ور یہ ہیں جن کے بارے میں تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان اختصار و ایجاز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

جوہری۔ چونکہ بادشاہ اور امیر ہی جواہرات کے خریدار ہوتے تھے، بقول میرؔ، جب بادشاہ ہی خود بھیک مانگتا پھرتا ہو اور امیر روٹی کو محتاج ہوں تو پھر جوہریوں کو کون پوچھتا، چنانچہ انہوں نے اس پیشے کو چھوڑ دیا اور روزی کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرنے لگے، نجار، چونکہ ان کو کام نہیں ملتا، اس لئے انہوں نے اس پیشے سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے[۲] اور وہ دُو وقت کی روٹی کے لئے کسی اور کام میں جدوجہد کرنے لگے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ کوئی اِن کی مدد کرے، دوسروں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں، اسی طرح قصّاب اور سبزی فروش بھی بے روزگاری کے شکار تھے، گوشت اور سبزی خریدنے کے لئے کسی کے پاس پیسہ ہی نہ تھا، معاد، جب ملک میں امن و امان اور فارغ البالی ہوتی ہے تو بادشاہ سے

---

[۱] کلیاتِ نظیرؔ اکبرآبادی، ص ۲۶۶

لے کر پرجا تک سب کے سب اپنے لئے اپنی حیثیت کے مطابق مکانات،
حویلیاں، قلعے، اور مقبرے تعمیرات کرواتے تھے، یہ وہ پُر آشوب
زمانہ تھا کہ آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے، گھر تباہ و برباد کر دیئے
جاتے تھے، لوگوں کو گھروں میں رہنے کی نوبت نہ آتی تھی، کہا جاتا ہے
کہ بہادر شاہ کو اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں ایک دن بھی کسی
مکان کی چھت کے نیچے رہنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب بادشاہ کی یہ
حالت تھی تو عوام کا کیا کہنا، لوگوں کو ایک مقام پر قیام کا موقع نہ ملتا۔
جان و مال کو محفوظ رکھنے کے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے،
ایسی صورت میں بیچارے معماروں کو کون پوچھتا، یہ بیچارے روٹی کو محتاج تھے۔
بہر حال یہی حالت، خیاط، علاقہ بند، بخیہ بند، رنگریز، تنبولی، حلوائی،
آہنگر، نداف، بقال، کلال، گل فروش، عطار، تیلی، حجام، چھاپہ گر،
کوفت گر، صیقل گر، زین ساز، مینا ساز، مرصع ساز، دہل خانے کے
ملازمین کی تھی۔

سپاہی پیشہ | مسلمانوں کا پیشہ سپاہ گری تھا، اس زمانے میں سپاہیوں
کی حالت اس درجے خراب تھی کہ اولاً نوکری ہی نہ ملتی اور اگر مل بھی جاتی
تو تنخواہ کا نام و نشان نہ تھا۔ اور یہاں تک کہ چھتیس چھتیس مہینے تک تنخواہ
ادا نہ ہوتی تھی، دانہ دانہ کو محتاج رہتے تھے، جنگی اسلحہ و آلاتِ حرب
بنیے کے ہاں گروی رکھ کر اشیائے خوردنی حاصل کرتے تھے، اور اگر
ادھار کچھ سامان مل جاتا تو کھانا نصیب ہوتا ورنہ ان کے لئے سال کے

بارہ مہینے رمضان سے کم نہ ہوتے تھے اور جس دن کچھ کھانے کو مل جاتا تو اُن کی نظر میں وہ دن عید سے کم نہ ہوتا۔ سپاہیوں میں سے جو لوگ زبردست اور ہیکڑ ہوتے تھے وہ اپنے مالکوں کے سر پر سوار ہو کر کچھ حاصل کر لیتے تھے، باقی لوگ امیروں کی پالکی کے پیچھے گریہ کناں چلتے تھے۔[۱] میرؔ نے "درحالِ لشکر" کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا ہے اور اس میں لشکر کی زبوں حالی اور فاقہ گری کا چشم دید مرقع پیش کیا ہے:۔

شکل اپنی ہوئی جو بود و باش   آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
اُن کے یہاں کی دیکھی طرزِ معاش   ہے لبِ نان پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب + جو سُنا سا ملا سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب بحالِ خراب + جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

---

[۱] یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر ایک پالکی آگے   اس سج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک   کوئی رو دے ہے نہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ہندو و مسلمان کو پھر اس پالکی اوپر   ارتھی کا توہم ہے جنازہ کا گماں ہے
یہ سنجرگی دیکھ کے جو صاحبِ ارتھی   کرتے ہیں جو واں عرض تو نے پھر نہ ہاں ہے

کلیاتِ سوداؔ (نول کشور)، ص ۱۵۰۔ نیز تاریخ محمد شاہی (قلمی)، ص ۲۳ ب۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۷۳، ۷۶۔ دیوان حسرت (قلمی)، ص ۱۳۴ ب۔ کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۶۹۴

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال ÷ کنجڑے جھینکیں ہیں، روتے ہیں بقال
پوچھ کچھ مت سپاہیوں کا حال ÷ ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

جُتّے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر ÷ تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر ÷ کھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

شور مطلق نہیں کسو سر میں ÷ زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں ÷ خانہ جنگی ہے اس لشکر میں
نہ کوئی رند ہے نہ کوئی اوباش

یک بیک گر کسو کی موت آئی ÷ اُس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیوں کہ پہونچی ہے جن کو امرائی ÷ سب وہ اولاد حاتم طائی
کون دے کر کفن اٹھائے لاش

ہو جو اُن لوگوں میں گدا کا گزر ÷ سہم رہ جائیں سب نہ دیکھیں اُدھر
دیر کے بعد یہ کہیں ہل کر ÷ شاہ جی ہے خدا سبھوں کی خبر
سو بھی یہ بات ہے پس از کنکاش[۱]

فوج میں جس کو دیکھوں سو ہے اُداس ÷ بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و سامان ÷ جیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ[۲]

---

[۱] بجائے تفصیل۔ کلیاتِ میر (مرتبہ عبدالباری آسی۔ نول کشور لکھنؤ ۱۹۴۱ء) ص ۹۵۲ تا ۹۵۴
[۲] کلیاتِ میر (مرتبہ آسی)، ۸۰۶

اِس تنگدستی اور افلاس نے سرکاری ملازمین کو چوری ڈکیتی کا کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ ان کا کام چوروں اور ڈکیتوں سے رعایا کو نجات دلانا تھا۔ لہ

یہی وجہ تھی کہ شاہ ولی اللہ نے بادشاہِ وقت کو ہدایت کی کہ:۔

"ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں، اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اُن کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے" ٢ہ

امراء اور منصب دار امراء و منصب داروں کی آمدنی کا ذریعہ اُن کی جاگیریں تھیں، اس زمانے میں مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں نے ملک کے زیادہ تر حصے پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا، اور وہاں سے لگان وصول کر لیتے تھے۔ امیروں اور منصب داروں کے ملازمین جب لگان وصول کرنے جاتے تو اُن کو ایک چھوٹی کوڑی وصول نہ ہوتی۔ اس طرح ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے، شاہی خزانہ خالی تھا وہاں سے کچھ ملنا ممکن نہ تھا، میرؔ نے ان کا مرثیہ یوں لکھا ہے:۔

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں ٭ سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ملکی اور سارے صاحبانِ یتول ٭ پھرتے ہیں مجھ سے خوار و زار و ملول
کہئے حضرت سے کچھ بھی ہو جو حصول ٭ کوڑی دنیا انہیں نہیں ہے قبول
آپ ہی مرتے ہیں اُن کے اہل و عیال ٣ہ

لہ احوال الخواقلین (قلمی) ص ۶۴ ب ٢ہ سیاسی مکتوبات ص ۹۵

٣ہ کلیاتِ میر (مرتبہ عبدالباری آسی) ص ۹۵۷، ۹۵۸

سودا:۔

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری ؛ یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحت جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال ؛ چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے[1]

حاتم نے ذیل کے اشعار میں امراء کی غربت و افلاس کا یوں ذکر کیا ہے:۔

جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں ؛ پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت ؛ روز پھرتے ہیں یہاں، قوت کو اپنی حیراں
جن کے پوشاک سے معمور تھے توشک خانے ؛ سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں
پرچہ نان کے رکھ ہاتھ میں کھاتے ہیں امیر ؛ جس کو دیکھوں تمہیں سو ہے، فکر میں غلطاں پیچاں
خوان الوان کہاں اور کہاں وہ دسترخواں ؛ یعنی چہ میر وچہ مرزا وچہ نواب وچہ خاں

حسرت:۔

امیروں کے تئیں یہ سعی اور تلاش رہے ؛ کہ کوئی پالکی یا نہ دور باش رہے
کسی طرح سے ملے تو یہ نان ماش رہے ؛ نہ گو قناعت ہو ڈیوڑھی حرم کی فاش رہے
دیوان خانے میں ہو پیکدان اور رومال[2]

<u>امراء کے مصاحبوں کی حالت</u>

<u>گر ہو جیسے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب ؛ اس کی تو اذیت ہی بڑی آفت جاں ہے</u>

---

[1] کلیات سودا، (نول کشور)، ص ۵۲، نیز ملاحظہ ہو، تاریخ محمد شاہی (قلمی)، ص ۴۴۲ الف ۴۴۳ ب

[2] دیوان زادہ (قلمی)، ص ۷۰، ۸۱، نیز ملاحظہ ہو، دیوان حسرت (قلمی)، ص ۴۳، ۱۳ الف، کلیات نظیر آبادی ص ۶۹، کلیات ہدایت (قلمی)، ص ۱۵۰، ۱۵۱، دیوان مصحفی (مرتبہ مولانا حسرت موہانی)، ص ۹۳، دیوان تاباں، ص ۱۴۱، ۱۱۱، ۲۱۷، [3] دیوان حسرت، ص ۴۳ الف۔

نہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو ۔۔۔ کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہو لیے تئیں بھوکھ ۔۔۔ سو کیا کہوں تجھ سے مصیبت کا بیاں ہے
گھڑیاں کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں ۔۔۔ اور ریح خلا در دو دل میں جو اسپ دواں ہے
خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور حیرت اوپر حیرت ۔۔۔ منہ صورت سوفار مگر قفل، دہاں ہے[1]

طبیبوں کا حال

صیغے پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر ۔۔۔ سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہے
صحبت ہے یہ اس سے، کہ گر آقا کے تئیں چھینک ۔۔۔ آوے تو وہ اس کو منجم نت نگراں ہے
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اس کے ۔۔۔ ٹھنڈی ہوا آنے کا اس وقت گماں ہے
اور ماحضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے ۔۔۔ کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہے
مطبوخ پہ ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ ۔۔۔ ہے دود پہ مچھلی تس اوپر گاؤ زباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی ۔۔۔ اس سب پہ تنقیہ کے لیے بھینی ناں ہے
اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں ان کے ۔۔۔ پھر بو علی سینا ہے تو وہ ہیچ مداں ہے
رکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی ۔۔۔ گر نوکری سمجھو یہ طبابت کہاں کی ہے[2]

پیشۂ وکالت

گر خان و خوانین کی لے کوئی وکالت ۔۔۔ اور اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
ہر عمدہ کے دروازے پہ زیں پوش پہ بیٹھا ۔۔۔ پوچھے ہے اجی مردھے جی نواب کہاں ہے
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں فوارہ سا چھوٹوں ۔۔۔ ہر کوچہ میں جوں آب چکا بودہ دواں ہے[3]

معلموں اور مولویوں کی حالت معلمی کا پیشہ بڑی عزت و قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، بادشاہ اور امیروں کی طرف سے ان کو جاگیریں ملتی تھیں اور اس کی آمدنی

---

[1] کلیات سودا ص ۱۵۱ [2] کلیات سودا ص ۱۵۱ نیز ملاحظہ ہو دیوان حسرت ص ۲۱ ب تا ۲
تا ب نیز ص ۴۵ ا ب۔ [3] کلیات سودا ص ۱۵۲

سے طلبا کی مدد کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جب بادشاہ کے قبضۂ اقتدار سے ملک ہی نکل گیا تو اُن کی وہ آمدنی رہی کہ فراغت سے مشغلۂ علمی جاری رکھ سکیں، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ معلّموں کی جاگیریں ضبط ہوگئیں، طلبا کا روزینہ بند ہوگیا اب انہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑ رہی ہیں معلّموں نے روزی کمانے کے دوسرے ذرائع اختیار کر لئے ہیں۔[1] سودا نے اُن کی زبوں حالی کا یوں ذکر کیا ہے:

مُلّا جی اگر کہئے مُلّا کی ہے یہ قدر ÷ ہوں دُور وے اس سے، جو کوئی لکھنؤ کی خواں ہے
اور ماحضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں ÷ یک کاسۂ دال عدس وجو کی دو ناں ہے
دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے ÷ شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اس کے ÷ لڑکوں کی شرارت سے، سدا خار نہاں ہے
بھاگے یہ عمل کر کہ جو شیطان کا لشکر ÷ دیوانے کو سے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے
اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات ÷ آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے[2]

پیشۂ خطاطی

جس روز سے کاتب کا لکھا حال میں تب سے ÷ ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے
وہ بیت کہ سکڑ سے، لکھنے کو ہے محتاج ÷ خوبی میں خط اب جس کا بہ از خطِ بتاں ہے
یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں دگرنہ ÷ آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے

---

[1] مآثر الکرام (مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء) ووظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یک قلم ضبط شد وکار شرفا بجا بہ پریشانی کشید واضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشۂ سپاہگری انداخت و رواج تدریس وتحصیل بہ آں درجہ نہ ماند و مدارسی کہ از عہد قدیم معدن علم وفضل بود یک قلم خراب افتاد وانجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خوردہ برائے تفصیل ص ۲۲۱-۲۲۲

[2] کلیاتِ سودا ص ۱۵۲-۱۵۳

احیا ہو جو موتیؔ کا زمانے میں نئے سر ✦ خطّاطوں کی اتنی ہی رہی قدر جہاں ہے
ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گز ریمیں آکر ✦ یاقوت پکارے جو لکاؤ قرآں ہے
دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ ✦ بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے[1]
جو خط کے لکھنے میں میر علی کے تھے ثانی ✦ قلم کو راک میں دن رات خون لی خانی
لکھیں ہیں دمڑی کو خط ہشت لب کی مثال[2]

مشائخ اور متوکلوں کا حال | اس زمانے کے زیادہ تر مشائخ اور متوکلین کو پیری مریدی کے ذریعے روزی حاصل ہوتی تھی۔ جب عوام ہی معاشی تنگدستی میں مبتلا تھے تو پیروں کو نذرانے کہاں سے پیش کئے جا سکتے تھے، علاوہ ازیں اس زمانے کے مشائخ دنیا دار ہو چکے تھے، ان کی قدر لوگوں کی نظر سے گر چکی تھی۔

چاہے جو کوئی شیخ بنے، بہر فراغت ✦ چھٹے شعرا ہی کے وہ مطعون زباں ہے
دیتا ہے ذُم خر سے کوئی شملے کو نسبت ✦ گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
اور اس کو جو دیکھے کوئی ذرہ بہر معیشت ✦ اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر ✦ ہے آج کدھر عرس کی شب ارو کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی ✦ لے خیل مریداں کو گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب ہوا وجد ✦ کوئی کو دے ہے کوئی دوڑے کوئی نعرہ زناں ہے
بے تال ہوئے شیخ جو ٹک وجد میں آکر ✦ سرگوشیوں میں پھر بد اصولی کا بیاں ہے

---

[1] کلیات سودا، ۳۰۱۵، کلیات میر ص ۹۲۳۔ دیوان حسرت ص ۱۳۵، الف۔
[2] دیوان حسرت ص ۱۳۵، الف

گر تال سے پڑتا ہے قدم تو بھی ہنس ہنس ۔۔۔ کہتے ہیں کوئی حال ہے یہ رقص زناں ہے
اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو ۔۔۔ ڈالا ہوا واں دال نخود، قلیہ و ناں ہے
سب پیشہ یہ تج کر، جو کوئی ہو متوکل ۔۔۔ جو ردتو یہ سمجھے کہ نکھٹو یہ میاں ہے[1]

آمد نہ خادموں کے تئیں مقبروں کے بیچ ۔۔۔ باہمن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں علم والے بھی سب مدرسوں کے بیچ ۔۔۔ حیران پیرزادے بھی اپنے گھروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند[2]

پیشہ منجمی | عہد مغلیہ میں پیشہ منجمی کی بڑی قدر تھی، برنیر کا بیان ہے کہ مغل بادشاہ اور امیر نجومیوں پر اتنا عقیدہ رکھتے تھے کہ بغیر ان کے مشورے کے نہ تو میدان میں جاتے اور نہ جنگ شروع کرتے اور یہاں تک کہ ان سے وقت متعین کرائے بنا لباس تک نہ بدلتے تھے، کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے نجومیوں کو دربار سے برطرف کر دیا تھا مگر اس کے جانشینوں کے زمانے میں اس پیشے کو پھر سے فروغ حاصل ہوا،[3] اور بادشاہ سے لے کر ایک غریب فرد تک اُن کے اثر سے خالی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ دیگر پیشہ وروں کی طرح نجومیوں کو بھی اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہونا پڑا،

جنہوں نے شوق سے اپنے پڑھا تھا علم نجوم + انہوں کی اختر اس دور میں پڑے ہیں سوم

---

[1] کلیات سودا، ص ۳۶۶/ دیوان زادہ، ص ۱۷۷

[2] کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۴۶۹ نیز کلیات قاسم (قلمی) ص ۲۰۰ کلیات ہدایت (قلمی)، ص ۱۵ ۔ [3] ص تذکرہ ۔ مرقع دہلی۔

انھوں کے نوکری ملی زمعتدبہ ہے معلوم ÷ مگر کہ قرعہ کو لئے اپنے فن سے ہو محروم
بیاض دحمرہ کو پڑھ کہ بنے ہیں وہ رمال[۱]

مرثیہ خوانی کا پیشہ | اٹھارھویں صدی میں ہندوستان میں شیعی فرقہ کا غلبہ بڑھ گیا تھا، اور تعزیہ داری کا عام رواج تھا، اس وجہ سے ایامِ عاشورہ میں شہداء کربلا کے منظوم حالات مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔[۲] اس سبب سے مرثیہ گوئی نے ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی تھی،

ابتدائی زمانے میں سودا نے اور آواخر میں انیس اور دبیر نے اس فن کو نقطۂ عروج پر پہونچایا، اٹھارھویں صدی میں کئی مشہور مرثیہ خواں گذرے ہیں اُن میں سے لطف علی خاں، مسکین، غمگین اور حزیں، میر عبداللہ، شیخ سلطان، میر ابو تراب مرزا ابراہیم، میر درویش حسین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، حسرت نے مرثیہ خوانوں کی زبوں حالی یوں بیان کی ہے :۔

جنہوں کو مرثیہ پڑھ آیا تھے غلامِ امام + انہوں نے چھوڑ دیا اور سب جہاں کا کام
جہاں سنا کوئی شیعہ ہوا ہے ہوگا طعام + چلے وہ کرتے تبرا وہیں سے نام بنام
پھرے ہیں مردہ شو مولودیوں میں بالمغال[۳]

پیشۂ مصوری | عہدِ مغلیہ میں دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح فن مصوری کو بڑا فروغ حاصل ہوا، سیکڑوں مصور دربارِ شاہی سے وابستہ تھے، اور اپنے کمال کی داد پاتے

---

[۱] دیوانِ حسرت (قلمی)، ص ۱۴۲ ب [۲] مرزا ماتی، بڑے جوش و خروش سے مرثیہ پڑھتے تھے، ایک مرتبہ مرثیہ پڑھتے ہی اُن کا انتقال ہوا، برائے تفصیل۔ تذکرہ شعرائے اردو میر حسن، ص ۱۵ [۳] دیوانِ حسرت (قلمی)، ص الف ۱۳۵

تھے، مگر اورنگ زیب کے زمانہ سے اس فن کے زوال کا آغاز ہوتا ہے ۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کو نہ تو اتنی فرصت ہی تھی اور نہ دل چسپی کہ وہ لوگ اس فن کی سرپرستی کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اس فن کو اپنی روزی کا ذریعہ بنایا تھا، انہیں روزی ملنی مشکل ہو گئی ۔

مصوّران میں جو تھے، کھینچتے ہیں حیرانی ؞ ٹکے کی کھینچ دے تصویر گرچہ ہو مانی[1]

پیشہ شاعری اٹھارھویں صدی میں پیشۂ شاعری "فنِ شریف" سمجھا جاتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس دَور میں جتنے شاعر نظر آتے ہیں اتنے کسی اور عہد میں نہیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو شعر و شاعری سے دل چسپی تھی۔[2] خود لوگ، اپنے گھروں پر مشاعرے منعقد کرتے۔ اور دوسروں کی مجلسِ مشاعرے میں شرکت کرنے جاتے، شاعروں کی بادشاہِ وقت اور امراء سرپرستی کرتے، روزینہ مقرر کرتے

---

[1] دیوانِ حسرت دقلمی) ص ۱ الف ۱۳۵،

[2] اس عالم میں جو ہے ہند سو اس میں یہی سخن + کہتے ہیں فارسی کو طور پہ دہلی کے مقیم
جب سے یہ شہر کیا شاہ جہاں نے آباد + وہاں کے باشندوں نے سیکھا سخنِ ہفت اقلیم
پھر تو ایسے ہی سخن سنج ہوئے وہاں کے فصیح ؞ کہ نہ دم مار سکے بلبلِ گلزارِ نعیم
اٹھ گیا سب ولی، ناجی، مضموں کا کلام + شعرِ صائب کے کریں ان کے سخن کی تعظیم
پہنچے شیراز میں جیسے سخنِ طوطیِ ہند ؞ وہاں کے بلبل کا اٹھا فخر کے سب تکریم
یہ فلک دیکھ سکا وہاں کی نہ جمعیت کو ؞ لوٹ گئی جوں دلِ عشاق اُسے فوجِ غنیم
برائے تفصیل، دیوان حسرت دقلمی، ص ۵ ب تا ۶ الف

اور ہر طرح سے ان کے کلام کی قدر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس زمانے کے شاعر ایک ہی وقت میں کئی فنون پر ملکہ رکھتے تھے، مگر شاعری ہی ان کی روزی کا ذریعہ تھی،

ہر طبقے کے لوگ اپنے پیشے کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے۔[1] اس کا بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پیشہ وروں کی طرح ان شاعروں کی بھی مٹی پلید تھی، بلند پایہ شاعروں کی کوئی قدر نہ کرتا تھا، اس زمانے کے شاعروں نے اپنی زبوں حالی خود اپنے مخصوص انداز میں بیان کی ہے:

سودا:

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال ۔ دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یہاں ہے
مشتاقِ ملاقات انہوں کا کس و ناکس ۔ ملنا نہیں اُن سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ ۔ نیّتِ قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے
تاریخ تولّد کی رہے آٹھ پہر فکر ۔ گر رحم میں بیگم کے نُسخۂ نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا ۔ پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے[2]

سیاسی حالات میں ضمناً میرؔ کی اقتصادی زبوں حالی کا ذکر کیا جا چکا ہے یہاں تفصیل سے ذکر کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ میرؔ نے خود بڑی تفصیل سے اپنی معاشی اور اقتصادی[3] بدحالی کا ذکر مخمس در شہر کا ماحسبِ حال خود کیا ہے ملاحظہ ہو:

---

[1] شاعری کے زوال کے لئے ملاحظہ ہو میرؔ کی مثنوی تنبیہ الجہال۔ کلیاتِ میر د آسی، ص ۹۱۹، ۸۲۳ [2] کلیاتِ سودا۔ ۱/ص ۳۶۵ [3] ملاحظہ ہو۔ مثنوی در ہجو خانۂ خود کلیاتِ میر د آسی، ۸۱۰، ۸۱۷

کاما سے تلخ کام اٹھایا مرے تئیں ÷ دل میں بیدلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں ÷ حاصل کر بیس سرمہ بنایا مرے تئیں

میں مشتِ خاک مجھ سے لے اس قدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش ÷ یاں آ کے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش ÷ اس واقعہ سے آگے اجل پہونچی ہوتی کاش

ناموس رہتی فقر کی جاتا نہ اعتبار

مدت رہا تھا ساتھ جنہوں کے خراب حال ÷ دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انہوں میں نپٹ ملال ÷ یہ زندگی سہل ہوئی جان کی وبال

اس جمع میں کسو کو میں پایا نہ دستیار

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا ÷ ضعفِ قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا ÷ چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا

اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پہ ہر اک دنی کے سماجت مری گئی ÷ نالایقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا منت ہائے شانِ شرافت مری گئی ÷ ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی

مشہور شہر اب ہوں سبکبار و بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اٹھا کے نیم جاں ÷ پوچھا نہ مجھکو یک لبِ ناں سے کنھوں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں ÷ آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں

برسوں کا راز مجھ سے ہوا آ کے آشکار

پروا نعمت میری ہو نہ سکی اک امیر سے ÷ عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے

رنجنے ہمیشہ آتے رہے سرپہ تیر سے ✤ ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے یک نگاہ ✤ نکلے ہے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ ✤ اسلوب اپنے جینے کا ہو کس طرح سے آہ
ہم ایک ناتوان و ضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دلِ پُر درد نے نہ کی ✤ تاثیر اشکِ سُرخ و رُخِ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دمِ سرد نے نہ کی ✤ دل جوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں ✤ آشفتگیِ حال کی تعبیر کیا کروں
خوننا بہائے چشم کی تقریر کیا کروں ✤ زردیِ رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ ✤ دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ✤ ہے نام مجلسوں میں میرا میر بے دماغ
از بس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار[1]

جبکہ بادشاہ سے لے کر عوام تک اسی اقتصادی پریشانی میں مبتلا تھے اور بقول میر بادشاہ وقت کو آٹھ آنے بھی بھاری تھے تو میر کو ایسی حالت میں وہ روزینہ کیسے مل سکتا تھا جو انہیں بادشاہ کی طرف سے ملتا تھا۔ ایسی صورت میں بہت ممکن تھا کہ میر پھر وطنِ مالوف آگرہ واپس چلے جاتے مگر

---

[1] کلیاتِ میر دآسی؛ ص ۹۵۰-۹۵۱۔

آگرہ کی حالت دہلی سے بھی بدتر تھی، جاٹوں کے ہاتھوں وہ شہر بھی برباد و تباہ ہو گیا تھا۔[1] میر نے آگرہ کی بربادی کا بڑے دلدوز انداز میں ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

"آہ وطن! میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لئے جاتا تھا جو بہت اچھی جگہ واقع ہے (یعنی) اُس طرف باغ ہیں۔ اِدھر قلعہ اور امراء کی حویلیاں گویا بہشت کی نہر ہے، میری آفرینی کا شہرہ تو عالم گیر تھا۔ القصہ حسین سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب اور پاکیزہ طینت شاعر مجھے نہیں چھوڑتے تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما، وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا (لیکن) کوئی ایسا مخاطب نہ ملا جس سے دو بات کر کے دلِ بیتاب کو تسلی ہو، میں نے سوچا خدا کی شان۔ یہ وہی شہر ہے جس کی ہر گلی میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی، دانش مند، فقیہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدث، مدرس، درویش، متوکل، شیخ، مُلا، حافظ، قاری، امام، مؤذن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہمان سرا، مکان اور باغ تھے۔ (اور) آج مجھے ایسی جگہ نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر خوش ہو جاؤں ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے گفتگو کر سکوں۔ (شہر کو) ایک وحشت ناک ویرانہ پایا (اور) نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا (اس طرح) چار مہینے وطنِ مالوف میں گزارے۔ رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں۔"[2]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ HISTORY OF THE JATS (CALCUTTA 1925) PP. 46، 50، 61، 165، 143-144، 269.

[2] صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱

اس تباہی و بربادی کی وجہ سے آگرے کا اقتصادی نظام درہم برہم ہوگیا تھا، ہر شخص چاہے وہ ملازم پیشہ ہو یا کوئی اور پیشہ کرتا ہو، معاشی تنگی اور افلاس کا شکار تھا۔ نظیر اکبرآبادی نے تمام پیشہ وروں کی حالت خجستہ کا نقشہ ایک پُردرد مرثیہ میں پیش کیا ہے :

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی — کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی — ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی

پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

کڑیاں جو سال کی تھیں بکیں تو اگلے سال — لاچار قرض و دام سے چھپّر لیے ہیں ڈال
پھوس اور ٹھٹھیرے ایسے ہیں جوں سر بکھرے بال — اس بکھرے پھوس سے ہے یہ ان چھپّروں کا حال

گویا کہ اُن کے بھول گئے ہیں چمار بند

دنیا میں اب قدیم سے ہے زر کا بندوبست — مفلس جو مفلسی میں کرے گھر کا بندوبست

مکڑی کے تار کا ہے وہ نا استوار بند

کپڑا نہ گٹھڑی بیچ نہ تھیلی میں زر رہا — خطرہ نہ چور کا نہ اُچکّے کا ڈر رہا
رہنے کو بن کواڑ کا چھوٹا کھنڈر رہا — کھٹکا رجا گئے کا نہ مطلق اثر رہا

آنے سے بھی جو ہو گئے چور و چکار بند

حاشیہ صفحہ ۹۵ا۔ لہ میر کی آپ بیتی / ۱۴۲، ۱۴۳ ا؎ ۱۷۹۴ء میں جب تھومس ٹیوننگ کا گذر آگرہ سے ہوا تو اس نے اس عظیم الشان شہر کو، جو اکبر اور شاہجہاں کے عہد میں اپنی آبادی دولت اور خوبصورتی کے لیے ہندوستان کے شہروں میں سب سے زیادہ مشہور تھا، تباہ و برباد پایا تھا۔
برائے تفصیل :۔ TRAVEL IN INDIA A HUNDRED YEARS AGO
(1796) LONDON
(1893) P.190.

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ　　آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے بُرے وقت سے پناہ　　وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

پیشہ ور دستکار

صرّاف، بنیے، جوہری اور سیٹھ، ساہوکار　　دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب اُدھار
بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بیشمار　　بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنے دُکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

سوداگر اور دلّال

سوداگروں کو سود نہ بیوپاری کو فلاح　　بزّاز کو ہے نفع نہ پنساری کو فلاح
دلّالوں کو ہے یافت نہ بازاری کو فلاح　　دُکھیا کو فائدہ نہ پسنہاری کو فلاح
یاں تک ہوا ہے آن کے لوگوں کا کار بند

دست کار و پیشہ ور

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار　　اور جتنے پیشہ ور ہیں سو روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لُہار تو پیٹے ہے سر سُنار　　کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا کاروبار بند

زرگری و تارکشی کا پیشہ

زر کے بھی جتنے کام تھے وہ سب دبک گئے　　اور ریشمی قوام بھی یک سر چھلک گئے
زردار اُٹھ گئے تو بٹیٹے سرک گئے　　چلنے سے کام تارکشوں کے بھی تھک گئے
کیا بال بال کھینچے جو ہو جاوے تار بند

بساطی، نان بائی، بھڑبھونجے، دُھنیے و درائی وغیرہ

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں — جلتے ہیں نان بائی تو بھڑبھونجے بھنتے ہیں
دُھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دُھنتے ہیں — روتے ہیں وہ جو مشروع و دارائی بُنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بُنیں تھے ازاربند

کاغذی

گر کاغذی کے حال سے کاغذ کو دیکھئے — مطلق اُسے خبر نہیں کاغذ کے بھاؤ سے
ردّی قلم دُکان میں نہ ٹکڑے ہیں ٹاٹ کے — یاں تک کہ اپنی چھٹی کے لکھنے کے واسطے
کاغذ کا مانگتا ہے ہر اک سے اُدھار بند

ملّاحی

لوٹیں ہیں گرد و پیش جو قزّاق راہ مار — بیوپاری آتے جاتے نہیں ڈر سے زینہار
کُتوال۔ رو میں خاک اُڑاتے ہیں چوکیدار — ملّاحوں کا بھی کام نہیں چلتا میرے یار
نادیں ہیں گھاٹ گھاٹ کی سب وار پار بند

کمان گر، صحّاف، مینا ساز، مصوّر و نقاش

ہر دم کمانگروں کے اُوپر پیچ و تاب ہیں — صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں مینا ساز مصوّر کباب ہیں — نقّاش اُن سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند

پھول بیچنے والے

بیچیں تھے وہ جو گوندھ کے پھولوں کے بدھی ہار — مُرجھا رہی ہے دل کی کلی جی ہے داغ دار
جب آدھی رات تک نہ بکے جنس آب دار — لاچار پھر وہ ٹوکری اپنی زمیں پہ مار
جاتے ہیں کر دکان کو آخر وہ ہار بند

حجامی

حجام پر بھی یاں تئیں ہے مفلسی کا زور　　　بیسا کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر بگوئے ہوئے اس کی پور پور　　　کیا بات ایک بال کٹے یا ترا شے کور
یاں تک ہے اُسترے ونہرنی کی دھار بند

زہر کے اُتارنے کے پیشہ ور

ڈمرو بجا کے وہ جو اتارے ہیں زہر مار　　　آپ ہی وہ کھیلتے ہیں پلا سرزمیں پہ مار
منتر تو جب چلے کہ جو ہو پیٹ کا اُدھار　　　جب مفلسی کا سانپ ہو اُن کے گلے کا ہار
کیا خاک پھر وہ باندھیں کہیں جا کے مار بند

مختصر یہ کہ آگرے کے تمام پیشہ ور بے روزگاری کی پریشانیوں میں مبتلا تھے
اور دانہ دانہ کو محتاج تھے۔

کیا چھوٹے کام والے وکیا پیشہ ور نجیب　　　روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے آ شام عنقریب　　　اُٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند[۱]

ابھی تک دِلّی اور آگرہ کی اقتصادی ربون حالی کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے کیوں کہ ان ہی دونوں مقامات سے میر وابستہ تھے مگر دِلّی اور آگرہ ہی نہیں، شمالی ہندوستان کے ہر علاقے کی ایسی ہی خراب وخستہ حالت تھی۔ ان سیاسی اور اقتصادی حالات سے تنگ آکر جب میر نے دِلّی چھوڑنے اور لکھنؤ جانے کا مصمم ارادہ کر کے سفر اختیار کیا تو جن مقامات سے میر کا گذر ہوا تو وہاں کی معاشی تنگی اور اقتصادی انتشار کا

۱؎ کلیات نظیر اکبرآبادی، ص ۴۶۵ تا ۴۷۱

تفصیل سے ذکر انہوں نے ''مثنوی لسنگ نامہ'' میں کیا ہے، دلّی سے روانہ ہونے کے بعد میر شاہ درا پہونچے، وہاں کے حالات میر کی زبانی ملاحظہ ہوں :۔

پار کا گنج تھا جو شاہ درا — سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا
سو نہ جا گہ تھی نہ مکان مبیت — چار دو کانیں ایک چھوٹی مسیت
گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ — جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ
ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے سرا پائی — ویسے گھر چھوٹے ویسی جا پائی
رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان — جو کہا اُن نے ہم گئے سب مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا — میں نے اظہار اپنا حال کیا
سُن کے اک دل سے کھینچی ان نے آہ — اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے — ہم کچھ ان کے سبب سے پاویں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم — ہو گدا جیسے شاہ عالم تم
کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات — دیکھیے کس طرح سے گزرے رات

شاہ درا سے کوچ کر کے یہ قافلہ میرٹھ پہونچا۔ وہاں کی حالت ملاحظہ ہو :۔

ایک گڑھی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں نے کھائی
چھوٹی پھائی سی چار دیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
پھر نہ میدان بھی برابر تھا — ہر قدم ایک غار و چھچھر تھا
کھنڈرے اس میں تین چار مکان — جن کا گرنے پہ سخت ہے میلان
وہ گڑھی ساری کھتے ناج کے تھے — برسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے
خاک مٹی سے اُن گڑھوں کو بھرا — بنگلا اک لا کے اس کے بیچ دھرا

اس نگر کی تباہی و خستہ حالی کے ذکر کے بعد وہاں کے لوگوں کی زبوں حالی یوں ذکر کرتے ہیں:-

ہم کو کھانے ہی کا تردد ہے / صبح بقال کا تشدد ہے
بندیا منہ کو چھپائے جاتا ہے / روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے
حال کب پوچھنے کے ہے قابل / ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل
کس کو موسیں کہاں سے کچھ لاویں / دال آٹا جو تم کو پہونچا دیں
تم کہو دال ماش کی ہے زبوں / یاں بہم پہونچے ہے جگر کا خوں
تم کہو آٹا کرکرا کھایا، / یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا
اور دو چار روز یہ بھی ہے / ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے
فصل ہونے ابھی نہیں پائی / پیشگی سب سے قرض لے کھائی
ماش کی دال کا نہ کر ہیے گلا / گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا
بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس / کھاؤ دال اور پاؤ دبے وسواس
جی اگر چاہے کوئی ترکاری / گول کدو ملے بصد خواری
بھنڈی بینگن کے ناؤں ڈھینڈس تھا / اروی توری بغیر جی بس تھا
جز کدو پاوے کلو مدھو کیا / یعنی کچھ اور واں تھا کدو کیا
وار و گوٹی کے کچھ نہ تھے اسباب / ماش کی دال کھاتے تھے احباب
آدمی کی معاش ہو کیوں کر / کتوں میں بود و باش ہو کیوں کر
بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد / کہ بیاباں سخت سے دے یاد
چار چھپر کہیں چماروں کے / سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے

پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ   ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھولی پھالی کوئی حویلی ہے   سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مُردے سے بڑے ہیں واں   زرد ہو ہو گئے ہیں بے لب نان
لوگ ایسے مکان سب ایسے   ایسی جاگہ سے اُچٹیں دل کیسے
اور جو چار گھر نظر آئے   ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کولی چمار بستے کوئی   فاقوں کے زیر بار بستے کوئی
صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے   سارے کنگال اور بھوکے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں   جان کھا جائیں کچھ نہ جبتک لیں
اس سے آگے بڑھے تو ڈھینور تھے   اُجڑے پجڑے انھوں کے گھر تھے
بازار
اور آگے گئے تو تھا بازار   اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا   تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے   چھبڑ دل میں خاک دھول ایک کنے
جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال   نانوں کو کہتے تھے اُسے بقال
ایک کنجڑے کے چار گٹھی پیاز   تس پر اُس کو ہزار فخر و ناز
کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی   اُس مچھندر میں کچھ بھی بھدرک تھی
ایک دوکان تھی پساری کی   اُن نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اس سے جا کر جو مانگئے ہلدی   زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے   بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں   میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں

مانگو اس سے جو مرچ یا دھنیا   دیوے نچا وہی بتا دھنیا
اُن میں دو دانے اور سب کنکر   دیئے کاغذ میں ہاتھ لنبا کر
لونگ چورا نفر سے منگوایا   لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا یہیں سے کر لے قیاس   آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس

عام حالت

اور دس بیس گھر گنواروں کے   اور دو چار فاقہ ماروں کے
چھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں   یہی خانۂ خطیب کا تھا واں
نہ تھی قید صلوٰۃ و رسم صوم   اس پہ سید امام واں کی قوم

ایک فقیر کا حال

ایک تکیہ نہ جس میں فرشِ کاہ   حالِ درویش قابل صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اس کو   مرضِ جوع لاعلاج اُس کو
برسوں چلّے کے ناامید ہوا   چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا
آتے جاتے سے اُن نے جو پایا   اُسی پر رہ گیا وہی کھایا

چوں کہ سکھوں کے حملے میرٹھ تک ہوتے رہتے تھے اور لوٹ کھسوٹ اور مار کاٹ اُن کا پیشہ تھا۔ اس سبب سے اس علاقے کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت خراب تھی، میر کہتے ہیں ؎

پڑی کثرت خطر تھا سکھوں کا   کیوں کہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آجائے تو قیامت تھی   مال و جان غرض سب کی رخصت تھی[۱]

مختصر یہ کہ شمالی ہندوستان کے سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی اور بیروزگاری کا شکار نہ ہو۔ بقول قاسم شاہ سے

[۱] بڑے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنوی شکار نامہ۔ کلیاتِ میر (آسی)، ص ۹۵۹-۹۶۷

گداتک انہی معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔

کش مکش میں ہے ہر ایک شاہ و گدا   ہے ستم عالم پہ شاہا برملا
خلق پر یہ چرخ بے مہر و وفا   دم بدم پہونچی ہے تازہ بلا[1]

بقول نظیر اکبر آبادی:۔

کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہئے بات ۔ روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند[2]

---

[1] کلیات قاسم (قلمی) ص ۴۰
[2] کلیات نظیر اکبر آبادی، ص ۴۷۰

باب سوم

عہد میر کے سماجی حالات

اٹھارھویں صدی میں بھی سیاسی اور اقتصادی انحطاط کے باوجود دہلی کو وہی مرکزیت حاصل رہی جو زمانۂ سلطنت اور عہد مغلیہ میں اس کا طرۂ امتیاز تھی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے دہلی ہی ہندوستان کا واحد مرکز تھی۔ جہاں کی زبان اور کلچر مستند سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو شاعر دہلی کی

---

۱ میر نے دہلی کے شعراء اور وہاں کی زبان کی یوں تعریف کی ہے:۔

اس فن میں کوئی بے تہ کیا مرا معارض   اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ یا جنہوں نے دہلی کی تباہی و بربادی کا مرثیہ لکھا ہے، اور ان شعرا میں حاتم و سودا سے داغ و حالی تک سینکڑوں شاعر آئے ہیں۔ انہوں نے دراصل ایک تہذیبی علامت کے زوال کا مرثیہ لکھا ہے۔ حاتم نے دہلی کی تعریف یوں کی ہے:۔

نہیں ہے شہر دہلی ہے گلستاں — چمن سے جس کا خوشتر ہے بیاباں
جدہر دیکھو تدھر ہر کوچہ و بازار — ہوا ہے گل رخاں سے صحن گلزار
ہراک دوکاں پہ چشمک باز عیار — کہ جن کی ہر نگہ پر سو خریدار
ہر ایک جا سبزہ سرو قد دلجو — ہر یک نازک میان و عنبریں مو
گلوں کے کان میں کہتے ہیں کہ بلبل — یہی کشمیر ہے اور یہی ہے کابل
وہ بے شک وقت کا شاہ جہاں ہے — جو کوئی متوطن ہندوستاں ہے[1]

جعفر علی حسرت لکھنوی نے دہلی کی تعریف میں لکھا ہے:۔

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب جبیں گل سے — اور اُن کی زلفیں فزوں تر تھیں جعد سنبل سے
چمن کہ رشک تھے رخسار و خط و کاکل سے — دراز اس پہ جو دست ستم تطاول سے
دریغ مٹ گیا نقشا رہا نہ وہ خد و خال
ہر ایک سنگ تجلی طور جس سے عیاں — ہر ایک خشت عمارت تھی صاف آئینہ ساں
تمام آئینہ خانہ وہ شہر اور اُس کے مکاں — ہر ایک کوچے میں نہر اور اس میں آب رواں

---

[1] دیوان زادہ (قلمی) ص ۳۹۳-۳۹۴

اور اُس میں عکس عیاں آئینہ (میں) جوں تمثال[1]

دہلی کا ماتم کرتے ہوئے سودا نے لکھا ہے:-

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا — مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا — عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول[2]

خواجہ میر درد نے شہرِ مبارک دہلی کی تباہی و بربادی کا یوں ماتم کیا ہے:-

"شہرِ مبارک دہلی کہ روضۂ مقدسہ حضرت قبلۂ کونین قدسنا اللہ بنصرہ سترہ دراں است وخدایش تا قیامت آباد دارد۔ عجب گلستاں بود و حالا پامالِ خزانِ حوادثِ زمانہ گشتہ و طرفہ انہار و اشجار آبادیہای مردمانِ ہر جنس داشت واکنوں تاراجِ صدماتِ دہر شد بہر وجہ در تمام روئے زمین چوں روی محبوبانِ مہوش و مانند سبزۂ خطِ ایشاں دل کش بود۔ ۔ ۔ ۔

دہلی کہ خراب کردہ اکنوں دہرش
چون خطِ بتاں بود سوادِ شہرش

---

[1] "مخمس دراحوال دہلی" نقوش (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ص ۲۴۵

[2] کلیات سودا (نول کشور ۱۹۳۲ء) ج ۱، ص ۳۷۰-۳۷۱

جاری شدہ اشکہا بجای نہر شش
بودست ایں شہر مثل رُودی خوباں[1]

میرؔ نے اپنی غزلوں میں جا بجا دل اور دلّی کے مرثیے لکھے ہیں یہاں دل ان کی شخصیت کی داخلی فضا کا استعارہ SYMBOL ہے اور دلّی گویا اٹھارھویں صدی کے اس تہذیبی ماحول کی علامت ہے جس نے ہندوستان کے حکمراں مسلمانوں کا ایک خاص ہندایرانی مزاج بنایا تھا، اور ایک ایسی تہذیب وضع کی تھی جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول و معروف رہی۔ میرؔ نے دلّی کے سیاسی زوال ہی کا ماتم نہیں کیا، اس کی تہذیب، ۱
اس کے باشندے اس کی زبان، یہ سب انھیں عزیز تھیں۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں — یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا — کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
یا ہر گلی میں سیکڑوں جس جا ملیح تھے — یا زلف و خط کو دیکھتے ہیں خال خال ہم
اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں — سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم
اب خرابا ہوا جہان آباد — ورنہ ہر قدم پہ یہاں گھر تھا

---

[1] رسالۂ نالۂ درد، ص ۲۰

یہاں میر کے سماجی ماحول کو سمجھنے کے لئے دہلی کے رسم ورواج، میلے ٹھیلے لباس وزیورات، محلات، مدرسوں، خانقاہوں، بازاروں، ادبی مجلسوں کا ایک اجمالی بیان کیا جائے گا جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اس معاشرے کی ترکیب کن اجزا سے ہوئی تھی جس میں میر نے آنکھ کھولی، اور جہاں ان کے ذہن نے ابتدائی اثرات قبول کئے، اُن کی شخصیت کا سانچا بنا اور اُن کی فکر کو خام مواد حاصل ہوا، اس ماحول کا عکس یا تلمیحات ان کے کلام میں بھی بکثرت دستیاب ہوتی ہیں، اس طرح یہ تہذیبی مطالعہ اُن کی شاعری اور شخصیت کے مرقع کا FRAME کہا جاسکتا ہے۔

رسوم ورواج (الف) ولادت۔

مختلف رسوم ورواج انسان کی سماجی زندگی کا نظام بناتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کی رسمیں مذہبی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے خواہ قابلِ اعتراض ہوں (اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی اصل اسلامی نہیں تھی، لیکن وہ ہندوستان کے مشترک تہذیب وتمدن کی نمائندگی کرتی ہیں) یہ رسوم استقرارِ حمل سے لے کر انسان کی موت کے بعد تک جاری رہتی تھیں، چنانچہ پیدائش سے پہلے ستوانسا کی رسم، نویں مہینے میں بی بی کی صحنک، اور پیدائش کے وقت رات جگا، اُس دور میں ہر طبقے میں ہوتا تھا، پیدائش کے تیسرے دن، چھٹی کی رسم ادا ہوتی اور اس کے بعد چھٹی[1] ساتویں دن عقیقہ[2] کی

[1] چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات :: کہ دن عید اور رات تھی شب برات ہے
مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۲۶

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، قانونِ اسلام انگریزی، ص ۲۳، ۲۴،

بقیہ صفحہ ۱۸۸ پر

کی رسم ادا ہوتی تھی، اور چودھویں دن چلّہ ہوتا تھا جس میں زچہ غسل کرتی تھی۔
امراء پہلی سالگرہ خصوصاً اور ہر سال گرہ عموماً بڑے دھوم دھام سے
مناتے تھے۔

اِس جشن کے سلسلے میں شاہ عالم بادشاہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

آج بھئی اے بھلی برس گانٹھ جہاندار شاہ پیارے کی
ساتھ سکھی مل بن بن آؤ، دیہو مبارک باد اللہ نیارے کی[۱]
گاوت منگل چار بے تیہ آپس میں مل زات جگائی
باجت تال ٹھپک پکھاوج، گائے گنی، نوچھاور پائی
لاکھوں سال بلاس بلاس سوں، راج کرو سکھ سوں سکھ دائی
اکبر شاہ کی سال گرہ، شاہ عالم کو سب دیت بدھائی[۲]

پانچ برس کی عمر میں لڑکے اور لڑکی کی تعلیم شروع کی جاتی تھی، اسے بسم اللہ
خوانی کہا جاتا تھا۔

آج مہندی لگاؤں کو اکبر شاہ پیارو لاڈلو
انہیں رنگیلی مہندی بسم اللہ کی جنیا بیگم کے گھر رچایو[۳]

(بقیہ صفحہ ۱۸۸) نادرات شاہی، ص ۴، ۱۱، ۱۲۲، ۹۵[۵] ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔
ص ۸، قانون اسلام (انگریزی) ص ۳۰، S ۹ و ۱۱

[۱] نادرات شاہی، ص ۹۲ [۲] نادرات شاہی ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۱۰۔

برس گانٹھ جس سال اُس کی آئی دل بستگان کی گرہ کھل گئی

مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی، ص ۲۶ [۳] نادرات شاہی ص ۱۰۵ (بقیہ ص ۹۰ پر

لڑکے کے ختنہ کی رسم عام طور پر نویں برس میں ادا کی جاتی تھی اور اس موقع پر بھی ضیافتیں ہوتی تھیں، ماہِ رجب کی بائیسویں تاریخ اس کے لئے متبرک سمجھی جاتی تھی، [1] نواب میر جعفر خاں، صوبہ دار بنگال کے لڑکے مبارک الدولہ نے اپنے فرزند کی تقریب ختنہ میں پینتیس [35] ہزار روپیہ صرف کیا تھا، وہ خلعتیں جو اس موقع پر تقسیم کی گئیں اس کے علاوہ تھیں [2].

(ب) شادی بیاہ | امیر گھرانوں میں منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی. [3] اس رسم کو شادی کی لگن دھرنا بھی کہا جاتا تھا [4] محرم کے مہینے میں خاص طور پر اور کچھ منحوس دنوں اور مہینوں میں مسلمان شادی کی رسومات ادا کرنے میں گریز کرتے تھے. [5] اگر منگنی کے بعد کسی وجہ سے شادی ملتوی کرنی پڑتی تو ایسی صورت میں ایک رسم ادا کی جاتی تھی جس کو

(بقیہ صفحہ ۱۸۹ کا) نیز مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۳۱ - ۱۳۲ سیر المتاخرین (فارسی)، ج ۲ ص ۶۳۵، رسالۂ نو بادہ (قلمی)، ص ۸۴ ب

---

[1] دیوان رشید (قلمی)، ص ۲۵ (الف)، ۲۵ (ب)، ۲۶ (ب)، [2] سیر المتاخرین (فارسی)، ج ۲، ص ۸۲۲

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، کلیات سودا، (نول کشور ۱۹۳۲ء) ج ۲ ص ۱۰۶؛ واقعات اظفری، ص ۸۱

[4] تفصیل کے لئے، کلیات سودا، ج ۲، ص ۱۴۳، ۱۷۰ - ۱۹۰، ۲۰۸، ۲۰۹، مثنوی سحر البیان (نول کشور، ۱۹۲۵ء)، ص ۱۲۱ تاریخ بلدۂ نجیب آباد ص ۵

[5] مثنوی سحر البیان، ص ۱۹۷، کلیات سودا، ج ۲ - ۱۴۴، ۱۹۱،

دہلیز کروانا کہتے تھے۔[1] شادی کی آخری رسموں کے ادا ہونے میں تین
دن اور تین راتیں لگتی تھیں، پہلی رسم ساچق، دوم مہندی اور سوم برات
رسم ہوتی تھی۔[2] ساچق وہ رسم کہلاتی تھی جس میں شادی کے تحائف دولہا
کی طرف سے بڑی شان و شوکت سے دلہن کے گھر بھیجے جاتے تھے۔[3]
مہندی کی رسم میں دولہا کے گھر پسی ہوئی مہندی بھیجی جاتی تھی۔[4] برات کے
دن دولہا کو گرم پانی سے منڈوا کے نیچے بٹھا کر نائن غسل کراتی تھی،
اور اس موقع پر اس کے بدن پر تیل ملا جاتا تھا۔ یہ رسم "تیل چڑھانا"
کہلاتی تھی۔[5] پھر دولہا کے ہاتھ میں کنگن باندھا جاتا تھا۔ یہ "شادی کا
ڈورا" کہلاتا تھا۔[6] بری کی رسم کے مطابق دولہا کے کپڑے دیا جوڑا)

---

[1] قانون اسلام (انگریزی) ص ۹۵، ۹۶ [2] OBSERVATIONS ETC, P373

[3] کلیات سودا ج ۲، ص ۱۴۴، ۱۹۰، نیز ملاحظہ ہو مثنوی میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی،
تذکرۂ گلزار ابراہیم (قلمی رامپور) ص ۱۵۵ (الف)۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص ۵۰۸

[4] نادرات شاہی

اے ای مالن رگائے بجائے آنند سوں رچھاؤ
اکبر شاہ کی مہندی اینک جتن سوں رچاؤ۔

ص ۱۰۸، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۲

[5] کلیات سودا، ج ۲، ص ۱۴۲، ۱۶۲

[6] باندھا کنگن تیرے سکھ کرنے کو ہاتھ
کیا میں جانے تھی کہ یوں بچھڑے گا ساتھ
کلیات سودا

دلہن کے گھر سے آتے تھے، کپڑے پہنانے کے بعد اس کے سر سے سہرا باندھا جاتا تھا۔ دولھا کے سر پر پگڑی اور کاندھوں پر شال ڈالی جاتی، سہرا باندھنے والوں کو نیگ کی رسم کے مطابق کچھ انعام دیا جاتا۔[1]

امیر الامرا حسین علی خان کی شادی میں جو سہرا تیار ہوا تھا، اس کی تیاری میں پچیس ۲۵ ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔[2]

برات کی روانگی کے ساتھ آتشبازی کثرت سے چھوڑی جاتی تھی۔[3] ناصر جنگ کی شادی میں ایک ماہ تک آتشبازی کے چھوڑنے کا سلسلہ جاری رہا تھا

---

[1] آگے یہ آنکھیں گلے کی ہار ہی رہتی تھیں روز
اب جگر میں خوں نہیں دے سہرے سے آنسو کہاں
سہرے کہاں تک ٹپ پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر
گر سر گلے ہی کا ہار دیکھئے کب تک رہے

کلیات میر ص ۲۹۹، ۶۷۶

لاکے اے مالنیاں رن کی چمن سے پھلوار
گوندھ نوشہ کے لئے آج گل زخم کے ہار
تار گھتنے کا کرو سہرا کے لوہو کے دھار

گاڑ دروازے پر تم باندھو کے یہ بندھوار کلیات سودا ج ۲، ص ۱۹۷،

نیز ملاحظہ ہو۔ قانون اسلام (انگریزی)، ص ۱۰۹، ۱۱۰۔ نادرات شاہی، ص ۹۰، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۰۳

[2] تذکرۂ آزدو (قلمی)، ص ۱۷۰ [3] مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی، ص ۱۲۳؛ عماد السعادت ص ۲۲

[4] احوال الخواقین (قلمی)، ۲۲۱ ب شہزادوں اور امیروں کی براتوں کی دھوم دھام

بقیہ صفحہ ۱۹۳ پر

جب برات دلہن کے دروازے پر پہونچ جاتی تھی تو ایک رسم ادا کی جاتی تھی جو دھنگانا کہلاتی تھی۔ [۱] اٹھارھویں صدی کے مسلمانوں کے ہاں عام طور پر اس رسم کو ادا کیا جاتا تھا، نکاح قاضی پڑھاتا تھا اور مہر حیثیت سے زیادہ دیا اسلامی طریقہ کے خلاف) ہی طرفین کی رائے سے قرار پاتا تھا۔ [۲] شاہی گھرانے کے افراد اور امیروں کے مہر بہت بڑے ہوتے تھے، محمود شاہ بادشاہ کا مہر پچاس لاکھ روپے تھا۔ [۳] فرخ سیر بادشاہ کی شادی میں قطب الملک عبداللہ خان نے پچاس لاکھ کی لاگت کے ہیرے جوا ہرات کا ایک کنٹھا اور امیر الامرا حسین علی خاں نے بیس ہزار روپے نقدی اور جڑاؤ کٹار، جس کی قیمت تیس ہزار روپے تھی، بادشاہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ [۴] توہمات پرستی کے عمل ایسے موقع پر بالخصوص اہمیت رکھتے تھے اور لازمی سمجھے جاتے تھے، میر حسن دہلوی نے لکھا ہے :۔

وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم وہ آپس میں دولھا و دلہن کی رسوم
کسی نے پسائی سر دیخ آن کر کوئی گالیاں دے گئی جان کر

(بقیہ صفحہ ۱۹۲ کا) شان وشوکت اور رقص وسرود کی محفلوں کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو مثنویات میر حسن دہلوی، ص ۱۲۱ تا ۱۲۵۔

[۱] مثنوی۔ ج سوم، ص ۱۵۱، ۲۵۲ [۲] نکاح کے بعد مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ ؎

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان پلا سب کو شربت دیئے خاصدان

صحیفۂ اقبال (قلمی) ص ۱۳ ب مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ۱۲۶

[۳] صحیفۂ اقبال (قلمی)، ۱۳ ب [۴] تاریخ مبارک نامہ (قلمی)، ص ۹۷ ب

لگی ہر کوئی واں گال سے کچھ لگا — گئی کوئی دولہن کی جوتی چھوا
کھلائی نبات اس کو اس گھات سے — کہ ڈہکا دیا ہر گھڑی بات سے
عجب طرح کی رنگ رلیاں ہوئیں — کہ باتیں وہ مصری کی ڈلیاں ہوئیں
وہ سب ہو چکیں جبکہ رسم و رسوم — سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم[1]

مصحف آرسی کی رسم

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال — دھرا بیچ میں سر پر آنچل کو ڈال[2]

اب دلہن کے گھر کا منظر ملاحظہ ہو

ادھر کا تو یہ رنگ تھا اور یہ راگ — محل میں ادھر گھوڑیاں[3] اور سہاگ
وہ گھبر گھی سی شادی مبارک وہ ڈھول — وہ ٹونے[4] سلونے وہ میٹھے سے بول
اترنے کی واں سمدھنوں کی پھبن — کھلیں پھول جیسے چمن در چمن
گلوں میں پہنانا وہ ہنس ہنس کے ہار — شاشت وہ پھولوں کی چھڑیوں کی مار
دکھانا دو بن بن کے اپنا بناؤ — وہ آپس کی رسمیں وہ آپس کے چاؤ
قہقہے[5] ہنسی شور و غل تالیاں — سہانی سہانی نئی گالیاں[6]

---

[1] برائے تفصیل۔ مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۲۷

[2] برائے تفصیل مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی، ص ۱۲۶ [3] گھوڑیاں ایک قسم کا گیت جو عورتیں شادی و بیاہ کے موقع پر گاتی ہیں۔ [4] ٹونے سلونے ایک قسم کے گیت جو مراسنیں شادی میں گاتی ہیں اور وہ فحش بھی ہوتے ہیں۔

[5] قہقہے

[6] مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۲۵

دولہن کا لباس وغیرہ

عروسی وہ گہنا وہ سوہا[1] لباس ۔۔۔ وہ مہندی سوہانا وہ پھولوں کی باس
ملا سُرخ جوڑے پہ عطر وہ سہاگ ۔۔۔ کھُلے مل کے آپس میں دونوں کے بھاگ[2]

رخصتی | رخصتی کے وقت دولہا یا دلہن کا بڑا بھائی دُلہن کو اپنی گود میں اُٹھا کر چنڈول پر سوار کرتا اور دولہا گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوتا۔ اس کی سواری کے پیچھے پیچھے وہ چنڈول ہوتا جس پر دلہن سوار کی جاتی تھی، دولہا کے گھر والے اس چنڈول پر بطور نچھاور روپے پیسے پھینکتے اور بڑی شان وشوکت سے برات واپس آتی۔[3] بعد ازیں شب عروسی کے بعد دولہا کے گھر ولیمہ کا کھانا ہوتا، اس ضیافت میں[4] اہلِ ثروت دل کھول کر خرچ کرتے تھے، اپنے لڑکوں کی شادی کے موقع پر مہابت جنگ نے بہت لذیذ اور قیمتی کھانے پکوائے اور اس ضیافت کا سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا۔ ایک تورہ کی لاگت پچیس[25] روپے تھی اور اسی طرح کے ہزاروں تورے تقسیم کئے گئے تھے[5] شادی کی رسموں میں آخری رسم چوتھی کی ہوتی تھی اس دن دولہن کو سسرال سے پہلی بار میکے لایا جاتا تھا۔[6]

مختصر یہ کہ اس دور میں اپنے جاہ وجلال کی نمائش کے لیے امراء بہت فضول خرچی کرتے تھے۔ مثلاً شجاع الدولہ کی شادی میں ساٹھ لاکھ روپے خرچ کیے

---

[1] سوہا، سُرخ۔ [2] مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی، ص ۱۲۶ [3] مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۸، ۱۲۹۔ [4] صوبہ دار بنگال۔ [5] سیر المتاخرین (فارسی) حصہ دوم ص ۵۵۲۔ برائے طعام ولیمہ ملاحظہ۔ مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی (قلمی) ۱۴۰ (الف و ب)
[6] مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۸

گئے تھے۔[1] آصف الدولہ نے اپنے متبنّیٰ وزیر علی خاں کی شادی میں پچاس لاکھ روپے خرچ کئے تھے۔[2] اس کا اثر یہ تھا کہ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بھی اسراف کی وجہ سے مقروض ہو جاتے تھے۔

لباس (۱) مردانہ

(الف) بادشاہ اور امراء کے لباس: اس دور میں طبقۂ امراء اور "اشراف" اپنے لباس میں بہت اہتمام کرتے تھے، عام طور سے ریشم، مخمل اور کمخواب استعمال ہوتا تھا، اکبر بادشاہ کے عہد میں شاہانہ لباسوں میں یہ نام تاریخوں میں ملتے ہیں "تکوچیہ، پیشواز، دوتاہی، شاد، جیرہ، سوزنی، قلمی قبا، گدر، فرجی، فرگل، چکن، شلوار" ان میں سے ہر ایک جامہ مختلف شکل کا ہوتا تھا، علاوہ ازیں رومال، دستار، تہمد اور دوپٹہ وغیرہ بھی اس میں شامل تھے[3] شاہجہاں بادشاہ کے عہد تک یہی لباس استعمال ہوتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ اُس کے لباس بہت قیمتی اور بھڑکیلے ہوتے تھے[4] اورنگ زیب اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتا تھا۔ ایک سادی پگڑی، اور کمر بند (دوپٹہ) اس کا معمولی لباس تھا اور کندھے پر ایک معمولی کشمیری شال ڈال لیتا تھا۔[5] شاہجہاں اور اورنگ زیب نے موزوں

---

[1] تاریخ مظفری (قلمی)، حصہ دوم ص ۲۸ ب [2] واقعاتِ اظفری (اُردو ترجمہ) ص ۸۸،

[3] ان لباسوں کی بناوٹ وضع قطع اور اُن کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آئینِ اکبری (اُردو ترجمہ) ج اول ص ۱۶۹ تا ۱۷۲ نیز SOCIETY AND CULTURE IN MUGHAL AGE P.4

[5] منوچی، ج ۴، تصویر نمبر ۱۳، نیز برنیر، ص ۹۸

اور دستانوں کا استعمال بھی ترک کر دیا تھا۔[1]

مگر اٹھارھویں صدی میں شاہانِ مغلیہ نے پھر فضول خرچی اور عیاشی سے لباس میں بہت تکلّف شروع کر دیا تھا اس زمانے کے بادشاہوں کے لباس میں چیرہ یا دستار، جامہ، کمربند، گگھیا، اور جوتے شامل تھے۔[2] یہ لباس بہت رنگین اور پُر تکلف ہوتے تھے، اُن کی آستینوں پر سنہری کام ہوتا تھا[3]

محمد شاہ بادشاہ کو زنانہ لباس زیب کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ زنانی پیشوازہ اور جوتیاں پہنا کرتا تھا[4] شاہی خاندان کے شہزادے بھی یہی لباس پہنتے تھے، یعنی پیراہن، پائجامہ، پگڑی اور جامہ، مگر اٹھارھویں صدی کے نصف آخر کے بادشاہ اور شہزادے اپنے آبا و اجداد کی طرح بہت قیمتی اور بھڑکیلے لباس نہیں پہن سکتے تھے[5] کیوں کہ اُن کی اقتصادی زبوں حالی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔

امراء کا لباس | مغل امراء اپنی طرزِ معاشرت میں بادشاہوں کے نقشِ قدم پر تھے،[6] ٹیوننگ، اودھ کے نواب آصف الدولہ کے بھڑکیلے اور قیمتی لباس کو دیکھ کر بہت

---

[1] برنیر۔ ۹۸۔ [2] خزانۂ عامرہ، ص ۲۵۵ تا ۲۵۷ نیز مثنوی میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی، حدیقۃ الاقالیم ص ۴۴، مجمع الاخبار (قلمی)، ص ۵۴۳ (الف)، [3] خزانۂ عامرہ، ص ۲۵۵۔

[4] تاریخ شاکر خانی (قلمی)، ص ۶۷

[5] شاہ عالم ثانی کا لڑکا اور ولی عہد اکبر ثانی پائجامہ کی بجائے جانگھیہ کمربند کی جگہ لنگھی، سر پہ ایک اونی پگڑی اور کلاہ کے مانند ایک ٹوپی اور کندھوں پر ایک شال ڈالا کرتا تھا۔ شہزادوں کے لباس اور زیورات کے لئے ملاحظہ ہو، مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۳۶۔

[6] اس سلسلے میں برنیر کا بیان ملاحظہ ہو۔ برنیر، ص ۲۲۴۔

متاثر ہوا تھا۔[۱] کلاہ کے ساتھ نواب سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ اور کاندھے پر شال پڑی ہوئی تھی، پیر میں جڑاؤ جوتی تھی۔[۲] قبا، پاجامہ اور جامہ بھی امراء پہنتے تھے۔ آنند رام مخلص نے لکھا ہے کہ جاڑے کے موسم میں امراء نیم آستین کا استعمال کرتے تھے جس کے کالر پر لومڑی کی کھال مع بالوں کے لگی ہوتی تھی۔[۳] اہلِ ثروت سنہری کام کی جڑاؤ جوتیاں پہنتے تھے۔ عام جوتیوں سے اُن کا وزن بہت کم ہوتا تھا، اور اس وجہ سے صرف قالینوں پر چلنے کے کام آسکتی تھیں۔[۴] ایک امیر کا پورا لباس، جامہ، انگرکھا، دستار، کمربند پر مشتمل تھا۔[۵]

عوام کا لباس ڈیلا ویلا پیٹرو کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے[۶] لیکن اٹھارھویں صدی میں اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ان کے لباس میں بڑی تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ اس زمانے کے عوام کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ ٹوننگ دہلی کے باشندوں کے لباس کا بہت اچھا نقشہ پیش کرتا ہے۔

"زیادہ تر لوگ ٹخنوں سے ذرا نیچے تک ایک لمبا سفید لباس پہنے ہوئے اور ایک سوتی کمربند باندھے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ روئی کے کپڑے بھی پہنے ہوئے تھے کیوں کہ سردی کا موسم آپہنچا تھا، حالانکہ لوگوں کے

---

۱ TRAVELS IN INDIA: TWINING P. 167

۲ P. 273

۳ مرأۃ الاصطلاح دہلی، ص ۸۸ (الف)؛ ۴ TRAVELS IN INDIA: TWINING

۵ TWINING: P 231 ۶ حدیقۃ الاقالیم، ص ۴۴-۴۵

۷ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ڈیلا ویلا پیٹرو۔ ج اول۔ ص ۴۳-۴۴

لباس اور پگڑی کا رنگ عام طور سے سفید تھا۔ کچھ لوگ رنگ برنگ
اور طرح طرح کی چھینٹ بھی لباس کے لئے استعمال کرتے تھے۔ [۱]
نیمہ، کرتہ، قبا بھی اس دور میں عوام کا لباس تھا، یہ بدھیوں سے باندھا جاتا تھا،
یہ بدھیاں ہندوستان میں دائیں طرف باندھی جاتی تھیں جاڑوں میں مرزائی پہنی جاتی تھی [۲]
جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مسلمان عام طور پر نوکری کرتے اور سپاہی پیشہ ہوتے
تھے اور علاوہ ازیں اٹھارہویں صدی میں نظام سلطنت کے درہم برہم ہو جانے کی
وجہ سے ہر وقت جان و مال کا خطرہ رہتا تھا۔ جیسا کہ سودا نے لکھا ہے :-
بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں ؛ بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں [۳]
ٹیوننگ نے دہلی کے لوگوں کو عام طور پر ہتھیار لے کر باہر نکلتے دیکھا تھا، اور
وہ لکھتا ہے کہ یہی فوجی منظر شمالی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی دیکھنے میں
آتا ہے [۴] رومال کا استعمال بہت عام تھا۔ [۵]

---

[۱] TRAVELS IN INDIA-TWINING : P. 241 [۲] نکات الشعراء ص ۲
تذکرۂ گلزار ابراہیم (ق) ص ۱۴۴ (الف)۔ کارنامۂ عشق (قلمی) ص ۱۱ (الف)
[۳] کلیات سودا (نول کشور) ص ۲۸۰۔ میر نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔
پانوں پر سے اپنے میرا سر اٹھانے مت مجھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف
[۴] TRAVELS IN INDIA-TWINING: P. 242
[۵] کلیات سودا۔ ص ۱۴۴۔ کلیات انشاء ص ۶۴

مسلمان اپنے لباس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ آنند رام مخلص نے ایک مسلمان کا حلیہ اس طرح پیش کیا ہے:۔

"کپڑے ایسے تنگ اور بدن سے چپکے ہوئے کر کرپین سینے کے قریب تک چڑھ جاتی تھی اُس پر ایک ایک بیچ کا چہرہ۔ کمر بند اتنا طویل کہ پشتے پشتے بغل تک پہنچتا ہے۔ اس میں حکیم خانی کٹارا۔ وہ بھی اتنا لمبا کہ اس کی نوک ٹھوڑی سے جا ملے، ہاتھ میں سادہ رنگین یا منقوش چھڑی بھی ہوتی تھی، نادر شاہ کے حملے کے بعد ایرانیوں کی تقلید میں "چوب مختصر بشکل چساق" (ڈنڈا) جس کا سرا چوگان کی طرح خمدار ہوتا تھا، عوام و خواص سب کے ہاتھ میں نظر آنے لگی، اس زمانے میں یہ "کھنڈی" کے نام سے مشہور تھی۔ اس کی تزئین میں بھی لوگ کافی نفاست برتتے اور اس پر بہت روپیہ صرف کرتے تھے، چنانچہ دولت مندوں کی کھنڈی، سونے چاندی سے لدی ہوتی تھی۔"[1]

میر جس لباس میں لکھنؤ پہونچے تھے، اُس لباس سے دہلی والوں کا حلیہ سامنے آجاتا ہے۔

اُن کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا ایک رومال پڑی دار تہ کیا ہوا۔ اس میں آویزاں مشروع کا پاجامہ، جس کی عرض کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں

[1] مراۃ الاصطلاح۔ سفرنامہ آنند رام مخلص۔ ص ۱۹

جریب، ۱؎

سپاہیوں کا لباس | سپاہیوں کا لباس، انگرکھا، سفید پاجامہ اور ایک اونچی ٹوپی (کلاہ) تھا، وہ جُبّہ بھی پہنتے تھے۔ ۲؎

میرؔ کے ذیل کے اشعار میں اسی زمانے کے مردانے لباس پر روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ ہوں:۔

شال | سرد مہری کی بسکہ گلرو نے — اوڑھی ابرِ بہار نے شال

رُومال | دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میرؔ — لکۂ ابر ہے میرا رومال

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابرِ تر رہے ہے

میرؔ یہ کیا رونا ہے جس سے آنکھوں پر رومال رکھا
دامن کے ہر پاٹ کو اپنے گریۂ وزاری سے دریا کیا

جامہ | کیا تجھکو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میرؔ — سب کچھ بچا ہے ایک گریبان ہی نہیں

آلودہ کر نہ مستی سے جامہ کو جسم کے — ہشیار رہ یہ عاریتی ہے لباس پاس

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا — اُگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

پگڑی یا دستار

یار کے بالوں کا بندھنا قہر ہے پگڑی کے ساتھ — ایک عالم دوستاں اس پیچ میں مارا گیا

اگلے کیا پیچ تمہارے نہ تھے بس عاشق کو — بال جو اور گھرنے لگے دستار کے بیچ

کیوں سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے — مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھرس ظالم

۱؎ آبِ حیات (لکھنؤ ایڈیشن)، ص ۱۵۲ ۲؎ نالۂ عندلیب، ص ۱۱۴

قبا | سو عقدے فرطِ شوق سے پیش آئے دل کو وں — واں بند اس قبا کے نہیں ہوتے وا ہنوز
گل پیرہن نہ چاک کریں کیوں کہ رشک سے — کس مرتبے میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ
کلاہ | سر گل نے اٹھایا تھا اس باغ میں سو دیکھا — کیا ناز سے یاں کوئی کج کر کے کلہ بیٹھے

لباس (۲) زنانہ

اٹھارہویں صدی کی عورتیں سر کو دوپٹہ یا اوڑھنی سے ڈھکا کرتی تھیں[۱] مگر متمول اور شاہی گھرانے کی عورتیں ٹوپی بھی پہنا کرتی تھیں[۲]۔ جسم کے درمیانی حصّے کے لیے کُرتی[۳]، چولی، انگیا[۴] یا سینہ بند ہوتا تھا اس کے ساتھ پشواز، جو مردوں کے جامہ کی طرح ہوتا تھا، بس یہ فرق تھا کہ یہ رنگین ململ کا ہوتا تھا اور ٹخنوں کے نیچے[۵] تک پہنا جاتا تھا، اس کے دونوں پلّوؤں کو جگہ جگہ پر ڈوریوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ شرفاء اور

---

۱ سترھویں صدی کی عورتوں کے لباس کے لئے ملاحظہ ہو، ویلا پیٹرو۔ ج ۱ ص ۴۴-۴۶، اٹھارہویں صدی کی عورتوں کے لباس کے لئے مثنوی سحر البیان، نول کشور ۱۹۴۸ء، ص ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۲۰، ۳۱، ۳۲، ۴۴، ۴۸، ۵۸، ۴۹، دریائے لطافت (فارسی) ص ۵۴، ۵۵۔

۲ MANDELSO ALBERT'S TRAVEL P. 50 ۳ قانون اسلام (انگریزی) مثنوی سحر البیان ص ۵۵، ۔ ۵ اسکے اس کی بناوٹ وضع قطع کے لئے، قانون اسلام ص ۷ ×

۶ میر حسن دہلوی نے چولی کی تفصیل یوں بیان کی ہے "در ہندوستان رسم است کہ برائے پوشیدن پستان اکثر زنان دامن بگریبان می کشند" تذکرۂ شعرائے اردو ص ۴۴؛ نیز مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۵۵، ۴۸، ۵۶؛

۷ قانون اسلام (انگریزی) ص ۷ × مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۵۴۔

امراء کی عورتیں قبا بھی پہنتی تھیں، منوچی نے لکھا ہے کہ یہ سردیوں کا لباس تھا۔[۱] قبا کے سامنے کے دونوں پلوؤں کو قیمتی اور بیش بہا پتھروں کے بٹنوں سے جوڑا جاتا تھا۔ نیمہ یا نیم آستین جاکٹ کی شکل کا لباس ہوتا تھا، اور جسم کے درمیانی حصے میں پہنا جاتا تھا۔ غالباً اس کی شکل موجودہ زمانہ کے بلوز کی سی ہوگی، عورتوں کی شلواریں[۲] اور پائجامے[۲] مردوں کی طرح ہوتے تھے لیکن ان کی نسبت زیادہ رنگین اور قدرے مختلف ہوتے تھے، منوچی کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں بھی ساڑھی پہننے لگی تھیں[۳]، دریائے لطافت اور دیوانِ فائز میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں کہ اس زمانے میں مسلمان عورتیں بھی ساڑھی پہننے لگی تھیں[۴]۔ لہنگا خادمائیں اور نچلے طبقہ کی عورتیں پہنا کرتی تھیں[۵]

پردے کی بہت سخت پابندی تھی، صرف اہلِ حرفہ اور نچلے طبقے کی مستورات پردہ نہیں کرتی تھیں ورنہ مسلمانوں کے تمام طبقوں میں پردہ بہت سختی سے رائج تھا، اور اس کا اثر بعض ہندو خاندانوں نے بھی قبول کر لیا تھا، عورتیں گھروں سے باہر بہت کم نکلتی تھیں، اگر باہر نکلنا ہی ہوتا تو صاحبِ استطاعت برقع[۶] اور کم مقدرت کی

---

۱ برائے تفصیل۔ منوچی، ج ۲، ۱۴۳، ۲ مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی۔

وہ پائجامے کا ایڑی تک ڈھلکنا   مغرق کفش کا چلتے چمکنا۔ ص ۱۵۷

مغرق زری کا وہ شلوار بند   ثریا سے تابندگی میں دوچند، ص ۹۸

۳ منوچی۔ ج ۲، ص ۱۴۳ ۴ دریائے لطافت (فارسی)، ص ۱۲۸، دیوان فائز۔ ص ۲۰۲

۵ مثنوی سحر البیان (نول کشور ۱۹۴۶ء) ص ۱۴۸، نیز ملاحظہ ہو قانونِ اسلام (انگریزی)، ص ۷ ×

آئینِ اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ۲۸۳ ۶ برائے تفصیل۔ قانونِ اسلام، ص ۷۱ ×

عورتیں چادر استعمال کرتی تھیں۔

ا پاپوش یا جوتی عورتوں کے پیروں کا لباس ہوتا تھا۔ ہندوستان کی مسلمان عورتیں دستانے یا موزے کا استعمال نہیں کرتی تھیں، عورتوں کی جوتیاں بہت خوبصورت اور منقش ہوتی تھیں۔ جوتیوں کی تعریف میرحسن دہلوی نے یوں کی ہے :۔

مغرق جواہر سے ایک جفت کفش نہ دہ معنت پا بلکہ مفت کفش [1]

کبھی کبھی بادشاہ وقت کی اجازت سے شہزادیاں سر پہ پگڑیاں بھی باندھ لیا کرتی تھیں، لیکن صرف کسی جشن کے موقع پہ[2]۔ خادمائیں اور کنیزیں سر پہ پگڑی اور کمر پہ پٹکا باندھتی تھیں۔[3]

عورتیں موسموں کے لحاظ سے رنگین لباس زیب تن کرتی تھیں، بسنت کے زمانے میں زرد رنگ کے کپڑے ہوتے تھے۔[4] چنانچہ میر نے کہا ہے :۔

بسنتی قبا پر تری مرگیا ہے کفن میر کو دیجیو زعفرانی

رقاص زنانے لباس پہن کر محفلِ رقص وسرود میں اپنے کرتب دکھاتے تھے، یعنی دوپٹہ، چولی، انگرکھا، شلوار اور مغرق اور مزین جوتیاں[5]

اٹھارہویں صدی کے خوبصورت اور حسین لونڈے زنانہ لباسوں کی طرف مائل نظر آتے ہیں سودا نے ایک لونڈے کی اپنے والد سے خواہش کا یوں ذکر کیا ہے :۔

---

[1] مثنوی سحرالبیان ص ۱۳۳ [2] منوچی ۔ ج ۲، ص ۱۴۴ [3] دیوان مصحفی (قلمی)، ج ۶ ص ۵۴ ب نیز مثنوی سحرالبیان ص ۱۳۴ [4] کلیاتِ انشا، ص ۷۴

[5] دریائے لطافت (فارسی) ص ۵۳، ۵۴

موٹے جامے سے مجھ کو ذوق نہیں   چھوٹے چیرے کا دل کو شوق نہیں
پٹکا گاڑھے کا کب تلک باندھوں   موٹی شلوار تا کجا پہروں
جوتی چمڑے کی مجھ کو نہیں بھاتی   سوکھ کر پانوں میں نہیں آتی
نیمہ تن زیب کا بنا دو تم   کٹی محمودیاں دلا دو تم
تو میں جامہ بھی اس کا بنواؤں   اونچی چولی کا تنگ سلواؤں
پٹکا بل دار تین تھان کا ہو   تب کمر پتلی میری ہو جون ہو
چیرا میں تیس گز کا باندھوں گا   سُرخ ہی باندھنوں کا پہروں گا
ایک توڑا بھی دے تو منگوا کر   پر کنارے میں اس کے سلوا کر
اور کمخواب ہو ایک پُر زر   پھولے گلزار جس سے ٹانگوں پر
جفت پاپوش ایک ستارہ دار   سُرخ بانات کا منقش کار ۱؎

اسی زمانے میں گھاگھرا پہننے کا رواج تھا۔۲؎

مستورات کے لباس کے سلسلے میں میرؔ کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

دوپٹہ | جلوۂ ماہ تہِ ابرِ تنک بھول گیا   اُن نے سوتے میں دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانکا
چولی | چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں چھپکیں   جب پیرہن گل بھی اس چولی سے چھپ جاوے
گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے   رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں
مونڈھے چلے ہیں چولی چپی ہے بھری بھلنی ہے بند کسے   اس اوباش نے پہناوے کی ایسی آئی نکالی طرح
تنگ چولی سو جگہ سے کسمساتے ہی چلی   تنگ درزی سے کبھی ملتا نہیں وہ تنگ پوش

۱؎ کلیاتِ سودا، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸ ۲؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو :-
THE COSTUMES AND TEXTILES OF INDIA P.P. 37-38

برقع | یہ چاند کے سے ٹکڑے چھپتے نہیں چھپائے — ہر چند اپنے منہ کو برقع میں تم چھپاؤ — سا
کاش کہ برقع رہے اس رخ پہ میر — منہ کھلے اُس کے چھپا جاتا ہے جی
سرکا ہے جب وہ برقع تب آپ سے گئے ہیں — منہ کھولنے سے اس کے اب جی چھپا کرے ہے

پردے کے متعلق میر کے شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی بیگانہ گر نہیں موجود — منہ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے — سا
وجہ پردے کی پوچھیے ورنہ — ملیے اس کے کسو جو محرم سے
کل راہ میں ملا تھا سو منہ ڈھانپ کر چلا — ہم سے تکلف اُس کا چلا جائے ہے وہی

عورتوں کے زیورات و جواہرات | ہندوستانی عورتیں ہمیشہ سے مختلف بیش بہا سونے اور چاندی کے زیورات سے سنگار کرتی چلی آرہی ہیں[۱] ابوالفضل نے عہد اکبری کے ۳۷ زیورات کا ذکر کیا ہے[۲]۔ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ایک زیور "جہانگیری" کے نام سے ایجاد ہوا[۳]۔ اٹھارہویں صدی میں ۱۲۵ قسم کے زیورات کے نام ملتے ہیں جو عورتیں زیب و زینت کے لیے پہنتی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں۔ ٹیکا۔ مانگ ٹیکا، کرن پھول، فیروزی، جھمکا، چمپا کلی، دولڑی، پنچ لڑا۔ کان کا موتی، لونگ، بلاق، نتھ، دولڑی، طوق، زنجیر، تعویذ، گلو بند، دھگدھگی، حمائل، چندن ہار، بازو بند، نورتن، کڑا، چھڑا، چھڑی، چوڑیاں، پہنچیاں، دست بند، جوشن، گوکھرو، کنگن، توڑا، انگوٹھی، آرسی، چھلا

---

[۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ برنیر ص ۲۲۴، منوچی۔ ج۔ ۲۔ ص ۳۰ اور ونگفٹن ص ۳۲۰۔
[۲] آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ص ۲۸۲ تا ۲۸۶۔ [۲] برائے تفصیل، آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲ ص ۲۸۲ - ۲۸۶۔
[۳] برائے تفصیل INDIAN JEWELLERY, ORNAMENTS EHEF.73

بدھی کمر، ہیکل کمر، توڑے، کڑے، پائے زیب، لچھے، پہنچی وغیرہ [1]

میرؔ کے کلام میں ذیل کے زیورات کا ذکر ملتا ہے :-

آرسی
دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا — خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا
ابر سا روتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے — آرسی جا دیکھ گھر برسے ہے منہ پر نور کیا
داغ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو — عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا

ہار
ہار کر شب گلے پڑے اس کے — ہم بھی پھولوں کے ہار کے مانند
تیری چھاتی سے لگتا ہار کا اچھا نہیں لگتا — مبادا اس وجہ سے گل رو گلے کا ہار عاشق ہو

کان کا موتی
دیکھی تھی تیرے کان کے موتی کی اک جھمک — جاتی نہیں ہے اشک کے رخسار کی ڈھلک

موتی کی لڑی
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تار نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

زنجیر اور توڑا
ہو گئے دیوانے ہم ہوئے زنجیر — دیکھ کر اس کے پاؤں کا توڑا

کڑے
آکڑوں کی پاؤں میں بیڑی ہوئی — ہاتھ میں سونے کی وہ زنجیر یار

بلاق
دم ناک میں بقول زناں شوق کے ہے — ہلنا بلا ہے موتی کا اس کے بلاق میں

بالیاں
حیزوں [2] نے ریختہ کو دوں ریختہ بنایا
جوں ان دنوں میں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں

کان کا گوہر
گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے — ہل گیا جو صبح کو گوہر کسی کے کان کا

---

[1] ان زیورات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ فرہنگ زیورات۔ از سید محمد، اس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو کی علی گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[2] حیز، ہیجڑا

بالا

لگنے نہ دے بس ہو تو اُس کے گوہر گوش کو بالے تک   اس فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے[۱]

سنگار اور آرائش

ابوالفضل کا بیان ہے کہ عورت کے سنگار (سولہ) ہیں: غسل کرنا، تیل ملنا، چوٹی گوندھنا، تالو کو زیور سے آراستہ کرنا۔ چندن کا لیپ کرنا۔ لباس پہننا، (اور یہ لباس طرح طرح کا ہوتا ہے، بعض کی آستین انگلیوں تک اور بعض کہنیوں تک ہوتی ہیں)۔ قشقہ لگانا۔ کاجل کو سُرمہ کی طرح استعمال کرنا۔ بندے پہننا ناک میں سونا اور موتی پہننا، گلے میں زیور، پھول یا موتی کا مالا پہننا، ہاتھوں میں مہندی ملنا۔ کمر بند، پاؤں میں سونا پہننا، پان کھانا، ناز و ادا کے حرکات۔[۲]

ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی سنگار کی بہت شائق تھیں۔ اکثر وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو مہندی لگاتی تھیں[۳] آنکھوں میں کاجل یا سُرمہ اور دانتوں میں مِسّی لگاتی تھیں۔ کاجل اور مِسّی کا رواج مردوں میں بھی تھا۔ ہونٹوں کو سُرخ کرنے کی خواہش کی وجہ سے عورتوں میں پان کھانے کا عام رواج تھا۔[۴] چہرے پر ملنے

---

[۱] مندرجہ ذیل بالا زیورات کے علاوہ دیگر اقسام کے زیورات کے لئے ملاحظہ ہو مجموعۂ قنویات میر حسن دہلوی ص ۲۴، ۲۶، ۳۱، ۵۲، ۶۸، ۶۹، ۸۲، ۹۵، ۱۰۸، ۱۵۱۔ [۲] آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳ [۳] برائے تفصیل منوچی، ج ۲، ص ۲۴۱، ۳۴۰ [۴] اٹھارھویں صدی کے لٹریچر میں اس سلسلے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

کے لئے غازہ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ؎

بالوں کے سنوارنے کا مسلمان عورتیں بالخصوص اہتمام کرتی تھیں، بالوں کو چوٹی یا جوڑے کی شکل میں گوندھا جاتا تھا۔ جوڑے کے ساتھ وہ ایک سنہری پٹی باندھتی تھیں جسے موباف کہتے تھے۔ ؎ پھولوں کے ہار بھی گلے میں ڈالنے کا رواج تھا۔ عطر اور پھول سماجی حیثیت کے موافق ضرور استعمال کئے جاتے تھے، آنند رام مخلص نے لکھا ہے کہ عورتیں ایک قسم کی چیز بناتی تھیں جس سے اپنے ماتھے اور بھنویں مزین کرتی تھیں۔

خوشبوؤں میں ارگجا عام طور سے استعمال ہوتا تھا اور یہ ایک قسم کی مرکب خوشبو تھی، جس سے استقبال بھی کیا جاتا تھا، مخلص کا شعر ہے:۔

دھوم آونے کی کس کی گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

میر نے لوازمات حسن اور سنگار کے حسب ذیل طریقوں کا ذکر کیا ہے:۔

پان۔ غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا ۔۔۔ ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا
کیا کہئے ایک عمر میں وے لب ہلے تھے کچھ ۔۔۔ سو بات پان کھاتے ہوئے وہ چبا گیا
دیکھا نہ ہم نے چہرے میں یاقوت کی کبھو ۔۔۔ تھا جو سماں لبوں کے ترے رنگ پان پر
لب سرخ کر کے ٹک دکھاتے نہیں ۔۔۔ طرح پان کھانے کی تھی کچھ جب اور

؎ کلیات قاسم۔

وہاں غازہ ملنا ہے یا ہے سنانہ سمر نا، بناوٹ کے ایسے بہانے بہت ہیں۔ ص ۴۸۹

؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مجموعۂ مثنویات میرحسن دہلوی۔ ص ۶۱ - ۶۴۔

سُرمہ

شکوہ سیاہ چشمی کا سن ہم سے یہ کہا — سُرمہ نہیں لگانے کا میں تم خفا نہ ہو
دم رُکتے ہیں سیاہیٔ مژگاں ہی دیکھ — سُرمہ لگا کے اور ہمیں مت خفا کرو
سُرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم — دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم
سُرمہ سے ایسی آنکھیں تمہاری نہیں لگیں — احوال پر ہمارے تمہیں کب نگاہ ہے

حنا یا مہندی

دے حنا نے پا مری آنکھوں میں پھرتی ہے میر — یعنی ہر دم اس کی زیر پا ہے چشم گریہ ناک
حنا لگی تیرے ہاتھوں سے میں گیا پیسا — جگر تمام ہے خوں مجھ کو تیرے پا کی قسم
مت حنائی پانوں سے چل کر کہیں جایا کرو — دلّی ہے آخر نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں
حنا سے یار کا پنجہ نہیں ہے گل کے رنگ — ہمارے اُن نے کلیجوں میں ہاتھ ڈالا ہے

شانہ، آئینہ

ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منھ تکتا — دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا

اس صورت کا ناز نہ تھا کچھ دب چلتا تھا ہم سے بھی
جب تک دیکھا اُن نے نہ تھا مُنھ خوب اپنا آئینے میں

یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی — سُرمہ و آئینہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکر آراستگی شام و سحر تجھ کو نہ تھی — زلفِ آشفتہ کی سُدھ دو دو پہر تجھ کو نہ تھی

شانہ تھا نا بلد کوچۂ گیسو تیرا
آئینہ کا ہے کو تھا حیرتی رو تیرا

ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا　　جو دیکھیں ہم نے یہی خودنمائیاں دیکھیں
مسّی | انہیں دیکھے مسّی ملے دندان　　برق ابرِ سیہ ہے تب خنداں
پان سے شوق نہ تھا کیسا مسّی کا مذکور　　غصّے ہو جاتے تھے ایسی کسی کا مذکور
شانہ اب ہاتھ میں ہے زلف بنا کرتی ہے　　مسّی دانتوں میں کئی بار لگا کرتی ہے
پاس سرمے کی سلائی بھی رہا کرتی ہے　　آنکھ رعنائی پہ اپنی ہی پڑا کرتی ہے

ماکولات و مشروبات

بقول انشاء اللہ خان انشا، اٹھارھویں صدی کے امرا آدھ سیر پلاؤ کی تیاری میں بیس روپے تک صرف کر دیا کرتے تھے۔[2] محمد شاہ بادشاہ کے باورچی خانے میں مختلف طریقوں سے گوشت تیار کیا جاتا تھا، مثلاً قلیہ سادہ، قلیہ چاشنی دار، قلیہ دوپیازہ، قلیہ ماہی، قلیہ سا موسہ، قلیہ بادام اور کباب[3] اور کباب کی دو قسمیں، کباب شامی اور کباب ہندی، ہوتی تھیں[4] یہ عمدہ اور مرغن کھانے زیادہ امیروں اور متمول لوگوں میں پسندیدہ خاطر تھے، استعمال اور تیاری میں خرچ

---

[1] برائے تفصیل مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ، ۱۲۷
[2] دریائے لطافت (فارسی)، ص ۶۵
[3] ان کھانوں کی تیاری کے طریقوں کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ رسالہ در تحسین اطعمہ در مطبخ محمد شاہ (قلمی)، ص ۶ (الف) تا ۱۳ (ب)،
[4] مراۃ الاصطلاح (قلمی)، ص ۱۸۰ الف۔

ان کی مالی حیثیت پر منحصر تھا۔

بادشاہوں، امیروں اور عوام سب کو چاول مرغوب تھا، محمد شاہ بادشاہ کے مطبخ میں تر بیّن طریقوں سے چاول پکایا جاتا تھا۔ [1]

اسی طرح کئی قسم کی روٹیاں تیار کی جاتی تھیں، باقرخانی سخت باقرخانی نرم نان شیرمال، نان بادام، نان بیسنی، نان داقی، نان بیدھوال، نان وارقی، نان جوار دولتمند اور متمول لوگ کھاتے تھے، ہندوستانی کھانوں میں پوری، کھچڑی بہت مرغوب تھیں، شاہجہاں بادشاہ اور اس کے جانشین ان دونوں اشیا نے خوردنی کو اپنے شوق اور چاؤ سے کھاتے تھے۔

مختلف طریقے کے حلوے، حلوا رکباہ، حلوا ادرک، حلوا بادام، اور پستہ حلوا شمس، حلوا شیر، حلوا ناخد، حلوا نشاستہ، فالودہ، فرنی، کھجور، گلگولا شیر گلگولا جوار، گلگولا انبہ، مغل کھانوں میں داخل تھے۔

عوام کی غذا دال روٹی تھی۔ [2]

میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی گلزار ارم میں تفصیل سے ان کھانوں کا ذکر کیا ہے، پکا ہوا کھانا بازاروں میں ملتا تھا۔ [3] میر نے کبود جامہ کے سیرابہ پیڑ کا ذکر کیا ہے جو اُن کے والد سے ملنے کے لئے آیا تھا، وہ ان کے بیان کے مطابق

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسالہ در تحسین اطعمہ در مطبخ محمد شاہ بنگال کے باشندوں کے کھانے کی اشیاء کے لیے ملاحظہ ہو، ریاض السلاطین (انگریزی ترجمہ) ص ۲۱

[2] ایضاً بحوالہ ص ۱۹۸؛ نیز FOSTER'S TRAVEL I, P. 230

[3] بحوالہ مثنویات میر حسن دہلوی، ص ۱۵۰ FORSTER'S TRAVEL I, P. 19

کھانے ہی کی دوکان کرتا تھا۔[1]

آم ہندوستان کا بہت مرغوب پھل رہا ہے۔ اس کے علاوہ خربوزے باہر سے آتے تھے۔ سردہ، سیب اور انگور بھی ولایت سے منگوائے جاتے تھے، باہر سے آئے ہوئے ایک خربوزہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تک ہوتی تھی۔ جسے صرف دولتمند لوگ کھا سکتے تھے۔[2] دہلی کے ایک بازار کا ذکر کرتے ہوئے برنیر لکھتا ہے:۔

"وہاں کی دوکانوں میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے، اور اس میں بہت سی دوکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران، بلخ، بخارا، اور سمرقند کے خشک میووں، بادام، پستہ، فندق، کشمکش، بیر، اور زرد آلو اور جاڑوں میں سیاہ اور سفید نہایت عمدہ تازے انگوروں سے جو روئی کی تہ میں لگائے ہوئے اُن ملکوں سے آتے ہیں۔ اور ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ سردوں سے جو جاڑے بھر بکتے رہتے ہیں، بھری رہتی ہیں"[3]

شمالی ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں پھلوں کا الگ بازار ہوتا تھا[4]
میر کے کلام میں ذیل کے ماکولات کا ذکر ملتا ہے:۔

---

[1] میر کی آپ بیتی ص ۶۷ [2] وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر۔ ج ۲، ص ۲۴۳، مرقع دہلی۔ ص ۶، خلاصۃ التواریخ۔ ص ۳۰

[3] نکلے بازار میں وہ جیب چہ بوز ✤ سرہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز کلیات میر ص ۳۴

[4] خلاصۃ التواریخ۔ ص ۳۰

کباب | بھنتے ہیں دل اک جانب سکتے ہیں جگر یک سو — ہے مجلس مشتاقاں دکان کبابی کی

حلوا | ہیں جوزی کی تو دونا ہے چڑھا وہ بد معاش — کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

قند | قند کا توت اس قدر مائل ہے میاں — جو ہے اُن ہونٹوں ہی کا قائل ہے میاں

دوپیازہ | کیا وہ دوپیازہ کھائے بہت تازہ — ایک نوالا ملا ہے دوپیازہ

پلاؤ | نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ — مُنھ ہے مُنھ بیٹھا گرچہ کھاوے گاؤ

روٹی | اُٹھل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی — منھ سے چھیپوں سے جیسے روٹی جلی

دلیہ اور گاجروں کا قلیہ

چار من گاجروں کا قلیہ تھا — دہ منی دیگ بیچ دلیہ تھا

منشیات | بالعموم مغل بادشاہ شراب نوشی، اور دیگر منشیات کے استعمال کے عادی تھے۔ اورنگ زیب کے جانشینوں میں بہادر شاہ[1] اور عالمگیر ثانی[2] کے سوا باقی سب بادشاہ شراب یا بھنگ اور افیون کھانے کے شائق تھے، یہی حال عوام کا تھا بھنگ، چرس، گانجا، مدک، کوکین، چانڈو اور افیون کا اکثر رواج تھا، قہوے خانے بھی کھلے ہوئے تھے، عوام دیسی شراب پیتے تھے، اور اس کے گھروں میں بنانے کا بھی انتظام تھا۔[3]

اعتماد الدولہ قمر الدین خاں[4]، ہر وقت شراب کے نشہ میں دُھت رہتا تھا۔

۱؎ لیٹر مغلس (انگریزی) ج ۱، ص ۲۴۶، ۲؎ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج ۲، ص ۱

۳؎ شراب بنانے کی تراکیب کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ ASIATIC RESEARCHES V. I. PP 309 312

۴؎ سوانح کے لیے ملاحظہ ہو، مآثر الامراء (فارسی) جلد اول حصہ اول ص ۳۵۸۔۳۶۱

کہا جاتا ہے ایک رات اُس نے اتنی پی لی تھی کہ وہ اپنے مکان کی دوسری منزل سے گر پڑا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔[1] غلام قادر روہیلہ شراب کے علاوہ بھنگ کھانے اور چرس اور گانجا پینے کا بھی عادی تھا۔

پٹنہ کے صوبہ دار میر جملہ کے سپاہیوں کے متعلق شیو داس لکھنوی لکھتا ہے:۔

"مغلیہ چوں مایہ بسیار داشتند، ہر لحظہ بہ عیش و عشرت پرداختند، در کوچہ و بازار و شارع عام از شراب مست و شیشہ و پیالہ در دست ......"[2]

عام مسلمان شراب نوشی کے اتنے عادی تھے کہ اُن میں سے بعض تو اپنی تمام دولت اس کی نذر کر دیتے تھے اور گداگری کے شکار ہو جاتے تھے، جارج فاسٹر نے ایک افغان رئیس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افغان لکھنؤ سے اپنے وطن واپس ہو رہا تھا، لکھنؤ کے دوران قیام میں اُس نے اپنی تمام دولت اور منقولہ جائداد عورتوں کی صحبت اور شراب نوشی میں تباہ و برباد کر دی تھی، شراب کا بے حد شوقین تھا اور ڈھائی گھنٹے میں اس نے ڈیڑھ بوتل پی لی تھی، آخر کار جب جیب میں پھوٹی کوڑی بھی باقی نہ رہی تو اُس نے اپنے گھر کے برتن تک بیچ ڈالے اور جتنے پیسے ملے تھے شام تک اس کی شراب لے کر پی ڈالی۔[3]

بازاروں میں کھلے عام شراب، بھنگ، چرس اور افیون بکتی تھی۔[4]

---

[1] تذکرۃ الشعراء، ص ۷۰۹۔ [2] تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی)، ص ۱۱۔ [3] جارج فاسٹر (انگریزی)، ج ۱، ص ۱۰۴۔ [4] تذکرۃ الملوک (قلمی)، ص ۱۳۴

قہوہ خانے | شمالی ہندوستان میں قہوہ[1] پینے کا بہت چلن تھا، عوام بڑے شوق سے قہوہ پیتے تھے۔ قہوہ کی ہردل عزیزی سے متعلق خان آرزو کا بیان ذیل بہت اہم اور دلچسپ ہے۔

جہاں دیکھو وہاں ہر آن قہوہ ہے بزم عیش کا سامان قہوہ
قبولِ بارگاہِ بادشاہاں شکوہِ دستِ صاحب دستگاہاں[2]
جہاں میں زندگی عالم دو دم ہے ادھر قہوہ اُدھر حُقّہ کا دم ہے

ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں کے بازاروں میں قہوہ کی دوکانیں ہوتی تھیں جہاں صاحبِ ذوق لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا، دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں بھی قہوہ کی دو تین دوکانیں تھیں، عوام کے علاوہ ان قہوہ خانوں میں شعراء کا بھی اژدہام ہوتا تھا، وہاں وہ لوگ بیٹھ کر اپنا تازہ کلام سناتے اور داد و تحسین حاصل کرتے۔[3]

آنند رام مخلص نے یہ رباعی قہوہ کی تعریف میں کہی ہے۔ ؎

ہرچند شراب انبساط افزاید لیکن اقسام فتنہ زاں می زاید
میلم با قہوہ زیں جہت ہست کزو بوی جگر برشتہ می آید[4]

مجلسوں اور جشنوں کے موقعوں پر مہمانوں کی تواضع قہوہ سے کی جاتی تھی،

---

[1] قہوہ سے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو، مراۃ الاصطلاح۔ آنند رام مخلص دق، ص ۱۰۶ ب [2] دیوان زادہ (قلمی)، ص ۸۰۳ نیز ملاحظہ ہو، دیوان تاباں، ص ۲۰۰، وقائع آنند رام مخلص دق، حصہ دوم، ص ۶۴ دالف

[3] مرقع دہلی، ص ۱۸، مراۃ الاصطلاح، ص ۱۰۷ الف۔ [4] مراۃ الاصطلاح، ص ۱۰۷ الف۔

دہلی میں سرائے عرب کے رہنے والے عرب بڑی دھوم دھام سے دوازدھم ربیع الاول کی مجلس منعقد کرتے اور قہوہ سے مہمانوں کی تواضع کرتے۔ درگاہ قلی خاں نے چشم دید منظر یوں بیان کیا ہے:۔

"دو پیالہ ہائے کلاں قہوہ خوری کہ گاہے شیرینی ہم داخل می کنند علی الاتصال بمردم تکلف می نمایند، چوں تہورع آں راست مہمان در قبول سخت اذیت می کشند، فقیر برفاقت خاں صاحب سرو فتر اشفاق کیشاں سید حشمت خان وارد گردیدہ بود، معنی ایں شعر را دریں محل صادق یافتہ بود، بیت:

روزے بخانۂ عربی مہمان شدم چنداں خوراند قہوہ کہ من قہوہ داں شدم[1]

قہوہ صرف مہمانوں کی تواضع ہی کے لیے نہیں بلکہ دور دراز مسافت کے بعد تھکن رفع کرنے کی غرض سے بھی پی جاتی تھی۔[2]

مخلص بیان کرتا ہے:۔

قہوہ حمام سفر اش خمار تریاک برطاؤس نفرا فشر تبنا کو[3]

سواریاں | اٹھارہویں صدی میں گھوڑے، خچر، اونٹ، ہاتھی، گدھے، پالکی، بہلی، چھکڑا، رتھ، چوپالہ، اور بیل گاڑی برائے سواری کام آتے تھے، بادشاہ عام طور پر

---

[1] مرقع دہلی، ص ۲۹۔ نیز ملاحظہ ہو، دیوان زادہ (ق)، ص ۲۷۸ ۔ ۲۷۹

[2] وقائع آنندرام مخلص، ج ۲، ص ۹۱ الف

[3] مراۃ الاصطلاح (ق)، ص ۱۷۹ (ب)، چہار چمن (آنندرام مخلص) ص ۲۹ (ب)

تخت رواں، ہاتھی اور گھوڑے پر سفر کرتے تھے۔[۱] مستورات ڈولی اور رتھ پر مسافت طے کرتی تھیں۔[۲]

مسلم جشن، تہوار اور تقریبات

عیدالفطر | عید کے چاند کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا، لوگ صبح سویرے غسل کر کے رنگا رنگ، زرد، سنہری، سفید اور سقرلاطی لباسوں میں ملبوس ہو کر عیدگاہ، جو عام طور پر شہر کے باہر ہوتی تھی، نماز پڑھنے جاتے تھے؛ نماز کے بعد ایک دوسرے سے گلے مل کر اظہارِ خلوص و محبت کرتے، خود بادشاہ عیدگاہ تک[۳]

۱۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہوں کلیات نظیر اکبرآبادی (حصہ دوم) ص ۳۲۵، ۳۲۷، سیاحت نامہ برنیر ص ۲۷۰، منوچی، ج ۲، ص ۳۶۳، تاریخ شاکر خانی (ق) ۲۰، واقعات عالم شاہی (ق) ص ۱۹۰ الف، TWINNING'S TRAVEL, P.186، عیار الشعراء ص ۸۳ الف، مخزن نکات ص ۶۲۔ سیر المتاخرین (فارسی) ص ۳۷۹، ۳۹۸، ۴۱۷، ۴۳۵، ۵۰۴، نادر الحادث (ق) ص ۳۱ ب، چہار گلزار شجاعی ص ۱۰۴، کلیاتِ میر، ص ۹۴ ۵، کلیات سودا ص ۱۵۲، ۱۵۳-۱۵۴، ماثر الامراء ج اول، ص ۳۰۸ ۲۔ ——— HODGES'S TRAVEL P-5

۳۔ نظیر اکبرآبادی نے عیدگاہ کا منظر ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے دھوم آج مدرسہ و خانقاہ میں ۔۔۔ تانتے بندھے ہیں مسجد جامع کی راہ میں
گلشن سے کھل رہے ہیں ہر اک کج کلاہ میں ۔۔۔ سو سو چمن جھکے ہیں اک اک نگاہ میں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں ۔۔۔ (باقی صفحہ ۲۱۹ پر)

تجمل شاہی کے ساتھ جانا، اور اُسی شان و شوکت سے واپس آنا، پھر دربار عام

(بقیہ حاشیہ ص۲۱۸)

جھمکا ہے ہر طرف کو جو آباد لاازری   پوشاک میں جھمکتے ہیں سب تن زری زری
گھرو چکنے پھرتے ہیں جوں ماہ و مشتری   ہے سب کے عید عید کی دل میں خوشی بھری
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

آتے ہیں گھر سے اپنے جو بن بن کے کج کلاہ   صحنِ چمن ہے جتنی ہے سب صحنِ عیدگاہ
چھاتی سے لپٹے جاتے ہیں ہنس ہنس کے خواہ مخواہ   دل باغ باغ سب کے ہوتے ہیں فرحت سے واہ واہ
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

کچھ بھیڑ سی ہے بھیڑ کہ بے حد و بے شمار   خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہیں بندھے ہر طرف ہزار
ہاتھی و گھوڑے بیل و رتھ و اونٹ کی قطار   غل شور ہائے ہوئے کھلونوں کی ہے پکار
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

پہنے پھرے ہیں شوخ کڑے اور ہنسلیاں   پھولوں کی پگڑیوں میں ہیں شاخیں اُڑس لیاں
کرتیں سبھوں نے ملنے کی خاطر ہیں کسلیاں،   ملتے ہیں یوں کہ چھاتی کی کڑکے ہیں پسلیاں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

آتے ہیں ملتے ملتے جو عاجز پری رُخاں   دیتے ہیں ملنے والوں کو گھبرا کے گالیاں
تس پر بھی لپٹے جاتے ہیں جوں گڑ پہ مکھیاں   دامن سے ٹکڑے اُڑتے ہیں ٹکتی ہیں چولیاں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

ہیں ملتے ملتے تن جو پسینوں میں تربتر   ملنے کے ڈر سے پھرتے ہیں چھپتے اِدھر اُدھر
چھپتے پھریں ہیں لوگ بھی جاتے ہیں وہ جدھر   ٹھٹھا ہنسی و سیر تماشے جدھر تدھر
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

ہیں کرتے وصل شہر کے سب خورد اور کبیر   ادنیٰ غریب امیر سے لے شاہ تا وزیر
ہر دم گلے لپٹ کے مرے یار دل پذیر   ہنس ہنس کے مجھ سے کہتا ہے یوں کیوں میاں نظیر
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ص ۴۲۱۔ ۴۲۳۔

منعقد ہوتا تھا، درباری امرا اور دیگر عہدہ داران شاہی اُس دن کی مبارک باد پیش کرتے اور اس موقع پر روزہ و نماز کی مقبولیت اور فضیلت کا ذکر ہوتا۔ نذریں پیش کی جاتیں، اور بادشاہ پر دھن وارا جاتا، شعراء تہنیت نامے لکھ کر حاضر ہوتے اور بھرے دربار میں بڑے جوش و خروش سے انہیں سنا کر انعام و اکرام حاصل کرتے، رقص و سرود کی محفل سجتی، گھروں میں عورتیں بناؤ سنگار کرتیں، آنے والوں کی تواضع سوّیوں سے کی جاتی تھی۔ [1]

اُس دن شہر میں جگہ جگہ اور خاص طور پر عیدگاہوں میں میلے لگتے۔ شاہجہانپور میں اسی موقع پر جو میلہ لگتا تھا وہ میلہ چنار (چنور) کہلاتا تھا[2]

بکرید یا عید الضحیٰ | اس دن بادشاہ عیدگاہ کی سیڑھیوں کے نیچے اونٹ کی قربانی کرتا تھا۔ عید الفطر کی طرح اس دن بھی لوگ سج دھج کر عیدگاہ نماز ادا کرنے کے لئے جاتے تھے، نماز کے بعد گلے ملتے اور واپس آکر گھروں میں قربانیاں کرتے۔ بادشاہ کا دربار ہوتا۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، نذریں پیش کی جاتیں، تہنیت نامے پڑھے جاتے اور مبارک باد دی جاتی [3]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ نادرات شاہی ص ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۸۱، ۸۴، ۸۵۔ کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۴۱۸-۴۲۱۔ دیوان مصحفی (قلمی)، حصہ ششم۔ ص ۴۹ ب۔

[2] اخبار محبت (قلمی)، ص ۲۸ ۵۔ [3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ نادرات شاہی ص ۷۷، ۷۹، ۸۲، ۸۸ وغیرہ منوچی ۲/ص ۲۵۰-۲۴۹، ۱۹۰ اسلامی تہوار ص ۸۷ دیوان مصحفی (قلمی) ج ۶/ص ۱۵۵ ب کلیات سودا ۲/ ص ۷۴، ۷۷، ۱۰۸

عیدین کے متعلق میر کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :۔

عید آئندہ تک رہے گا گِلا — ہو چکی عید تو گلے نہ ملا
گئے مل عید قرباں کو سبھوں سے — ہمارا آہ! تم کاٹو گلا مت
اب عید بھی بغیر ملے اس کے ہے دیا — رہتا تھا جو ہمارے گلے ہی لگا ہمنشیں
کرتے ہیں بس از سارے دل شاد گلے لگ کر — سو میر وہ ملنا بھی اب ترک ہے عیدوں کا
گئے روزے اب دید و دید ہے — گلے سے ہمارے ملو عید ہے

محرم | مسلمانوں کا سالِ نو محرم کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے، لہٰذا یہ خوشی کا موقع ہونا چاہیئے تھا، مگر واقعۂ کربلا نے اس ماہ کو عام طور پر مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص شیعہ حضرات کے لئے غم واندوہ کے مہینہ میں مبتدل کر دیا۔ بقول ڈونالڈسن "شیعوں کے تمام رسوم ورواج میں محرم اپنی نمایاں اہمیت رکھتا ہے"[1]

باوجودیکہ مغل بادشاہ سنی عقائد کے پیرو کار تھے مگر انہوں نے اس رسم کی ادائیگی پر کسی قسم کی پابندی کبھی عائد نہیں کی[2]۔ اپنے سخت مذہبی رجحانات کے تحت اورنگ زیب نے حالانکہ اپنے تمام ممالک محروسہ میں محرم کے سوگ پر پابندی لگادی تھی[3] مگر اس کی وفات کے بعد شمالی ہندوستان میں عام طور پر اور دربارِ مغلیہ میں خاص طور پر اہلِ تشیع کا اقتدار بڑھ جانے کی وجہ سے ہر سال محرم کا جشن بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا تھا۔[4]

---

[1] DONALDSON: THE SHIITE RELIGION: P 277

[2] اسلامی تہوار ص ۴۰ [3] خافی خان ۲/ص ۲۱۴ [4] مجمع الاخبار ص ۴۷۶ ب، ہدایت المومنین (ق)، ص ۷۰

۱۹۴۷ء تک اُسی دھوم دھام سے ہندوستان میں محرم کا سوگ منایا جاتا تھا مگر اب اس میں پہلے سی بات باقی نہیں رہی۔ چونکہ حالات ساز گار نہیں رہے۔ لکھنؤ کی معاشرت کے ضمن میں تعزیہ داری کا تفصیلی ذکر آئے گا۔

محرم اور اس سے متعلق رسموں سے شیعہ حضرات کی والہانہ عقیدت مندی اور وابستگی کا بخوبی اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید کے ساتھ پیش آیا۔

ساتویں محرم کو شدے نکالے جاتے تھے۔ خاص و عام ان کا احترام کرتے تھے۔ چونکہ مرزا مظہر نے اس احترام کا خیال نہ کیا۔ لہٰذا ان کو شہید کر دیا گیا۔ ۱؎

مجالسِ مرثیہ خوانی | ماہِ محرم کے پہلے دس دنوں میں امام باڑوں میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور مرثیے پڑھے جاتے تھے جن میں شہدائے کربلا کا ذکر مذکور ہوتا تھا۔ دہلی میں کئی ایسے امام باڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ اکبر شاہ ثانی نے شاہِ مرداں کے مزار کے قریب دہلی میں ایک امام باڑہ تعمیر کروایا تھا۔ جہاں ہر سال ماہِ محرم میں مسلمان جمع ہوتے اور مرثیہ خوانی کرتے تھے ۲؎ اس زمانے میں بھی شیعہ حضرات وہاں مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔ ان امام باڑوں کے علاوہ دہلی کے بازاروں میں بھی کچھ مخصوص مقام تھے جہاں معزز لوگ منبروں پر کھڑے ہو کر مناقبِ شہدائے کربلا بیان کرتے تھے۔ درگاہ قلی خاں ان الفاظ میں چوک سعد اللہ خاں کی مجلسوں

۱؎ برائے تفصیل۔ گلشنِ ہند (لاہور) ص ۱۵۹ ۔۔ ۱۶۰ نیز ملاحظہ ہوں۔ مقاماتِ مظہری ۔ ص (۱)، معمولاتِ مظہری ص ۱۰۰، نتائج الافکار۔ ص ۶۷۵، عقدِ ثریا۔ ص ۵۶ سفینۂ ہندی ۱۸۸ ۲؎ مفتاح التواریخ ص ۲۷۹

کا منظر پیش کرتا ہے۔

"زوریان معتبر مثل ارباب عمائم جزیں جاگرسی ہائے چوبین از قبیل منابر نصب کردہ مناسب ہرماہ دیرروز مثلاً در ماہ رمضان المبارک فضائل سوم دو در ذیحجۃ الحرام مناسک حج وعمرہ و در ماہ محرم مقدمات روضۃ الشہدار با دائے فصیح کردہ ذہن نشین عوام می کنند و این جماعت را بہ رقت می آرند و مبلغ معتد بہ بایں تقریب تحصیل می نمایند[1]

اٹھارھویں صدی میں مرثیہ خوانی کا اتنا رواج ہوگیا تھا کہ اس نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس زمانے میں سرزمین دہلی میں کئی مشہور و نامور مرثیہ خوان پیدا ہوئے اور انہوں نے فن مرثیہ خوانی کو نقطۂ عروج پر پہونچا دیا، مثلاً مسکین، غمگین، حزیں۔ میر عبداللہ، شیخ سلطانی، ابوتراب، مرزا ابراہیم، مرزا درویش، حسین خاں، جانی حجام اور محمد نعیم وغیرہ[1]
سنی مسلمان بھی، مرثیہ خوانی کی مجلسیں کرتے تھے۔ خواجہ میر درد کے ہاں بھی مجلس ہوتی تھی[2]

اس زمانے میں اردو شاعری کے دیگر اصناف سخن کے علاوہ، جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، مرثیہ نویسی کی صنف درجۂ کمال پر پہونچ گئی تھی۔ حالانکہ میر نے بھی مرثیے لکھے مگر سودا نے اس صنف کو جامعیت کے درجے تک پہونچا دیا۔

---

[1] مرقع دہلی ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۱۵۔۴۰۔ دیگر مرثیہ خوانوں کے لیے اس عہد کے تذکرے دیکھیے [3] تذکرہ طبقات الشعراء ہند ص ۱۸۱۔

بقول اظفری، حسن نامی ایک شخص ایران سے ہندوستان وارد ہوا تھا، وہ دہ مجلس[1] سے مرثیے پڑھا کرتا تھا۔ میر امانی کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ وہ اتنے جوش و خروش اور رقت آمیز لہجے میں مرثیے پڑھا کرتے تھے کہ مرثیہ پڑھتے پڑھتے ہی منبر پران کی روح پرواز کر گئی[2]

تعزیوں کے سامنے شربت، ریوڑی، الائچی دانہ اور ملیدہ رکھ کر فاتحہ ہوتی تھی شہادت کی شب کو کونڈوں میں حلوا بھر کر علموں کے سامنے رکھتے تھے۔ اور دوسری صبح کو غربا و مساکین میں وہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ عشرۂ محرم میں پکا ہوا کھانا مسکینوں اور غریبوں میں تقسیم ہوتا تھا[3] ان رسومات کی ادائیگی میں سُنی مسلمان اپنے شیعہ بھائیوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ رہتے تھے۔ حافظ رحمت خاں عشرۂ محرم کا بہت احترام کرتا تھا[4]

چونکہ اٹھارہویں صدی؛ خلاقی اور مذہبی دونوں نقطۂ نظر سے انحطاطی دور تھا اس لیے اس تہوار کے زمانے میں بھی اخلاقی بدعنوانیاں ہونے لگیں۔ اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ بڑی آزادی سے عورتیں امام باڑوں میں جاتی تھیں اور رسومات کی ادائیگی میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ مولوی سید حسن قنوجی کا بیان ملاحظہ ہو۔

---

[1] یہ کتاب اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ اور زمانۂ تصنیف ۱۲۴۶ھ ۱۱ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ٹیوبن گن جرمنی میں ہے۔ اسپرنگر نے کتب خانۂ شاہانِ اودھ کی فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔

[2] تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۱۵ [3] رسالہ تعزیہ داری دق، ص ۲۲-۲۱ نیز چہار گلزار شجاعی ص ۵۲۵ [4] واقعات شاہ عالم ص ۲۴ [5] کاشف الاستار ص ۲۶-۳۸ [6] حیات حافظ رحمت، ص ۲۲۵

"تعزیہ کے سبب سے بڑے بڑے گناہ ہونے لگے، اور شیطان کا بازار گرم ہوا... بڑا گناہ زنا ہے جس کا یہ حال ہے کہ جتنے حرام کار سال بھر میں اپنی مرادیں پاتے ہیں اس قدر تعزیہ کی بدولت میں رات میں کماتے ہیں... وہی بیبیاں تعزیہ کے دنوں میں دس راتوں بھر ہزاروں آدمیوں کے روبرو جہاں ہر طرف سے روشنی ہو رہی ہے اور جہاں سب لوگ اچھے بڑے موجود تمہاری بہو بیٹیاں سینہ سے سینہ رگڑتی اور کندھے سے کندھے پکڑتی کھڑی خوانوں زیارت کے بہانے پھرتی ہیں[1]

جس طرح کسی مسلمان کے انتقال کے بعد تیجا، دسواں، اور چالیسواں کی رسم ادا ہوتی ہیں، اسی طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کے چالیسواں وغیرہ کی رسمیں ہوتی تھیں،

شب برات | اس تہوار کی سب سے اہم رسم یہ تھی کہ اس رات حلوے اور چپاتیوں پر مردوں کی فاتحہ ہوتی تھی اور مفلسوں میں یہ کھانا تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ تفریحی مشاغل میں، آتشبازی اور چراغاں اس کی مخصوص خصوصیات تھیں۔ شاہ عالم ثانی نے شب برات کے مضمون پر بہت سے اشعار کہے ہیں۔ مثلاً۔

ایسی نیکی شبرات تا میں آتشبازی اور چھوٹت ہست پھول بات

جاہی، جوہی، پھلجھڑی، مہتاب، ستارہ سے اور ایسی ہی پھول رہی چاندنی سب من بھات باتی دیوٹ روشن کر آنند سوں پھر پھر جری سر پا و سلیتے ہیں ابھو کن کی

[1] ہدایت المسلمین دق، ص ۱۰۹

جوت جگمگات چہ چہر شاہ عالم گنج سہت تا کے دیکھے تیں انکھیاں
سب کی سہات [1]

اس موقع پر بادشاہ کا دربار ہوتا، اس کو مبارکباد دی جاتی اور رقص و سرود کی محفل سجتی تھی[2] لیکن پرہیزگار اور متقی حضرات ہر شب بیداری میں بسر کرتے اور گناہوں سے توبہ کرتے تھے[3]

دوازدھم ربیع الاول | باوجود اختلاف رائے بالعموم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ۱۲ ویں ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ماہ ربیع الاول کے پہلے بارہ دنوں میں جشن منائے جاتے تھے۔ درگاہ قلی خاں نے دہلی کی دوازدھم ربیع الاول کے دو جلسوں کا خاص[4] طور پر ذکر کیا ہے۔ سرائے عرب[5] کے جلسے کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"تمام ماہ ربیع الاول میں اور خاص طور پر بارہ ربیع الاول کو یہاں عجیب بہار ہوتی ہے اور بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ تقریباً دو ہزار عرب مسجد میں جمع ہوتے ہیں ... سب عرب اور تمام جہان ساری رات بڑی خوش الحانی سے مولود خوانی

---

[1] نادرات شاہی ص ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۲۱

[2] برائے تفصیل نادرات شاہی۔ کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۲۱۸-۲۱۹۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی، ص ۲۴۷، ۲۴۶، دیوان عیشی، دق، ص ۴۳، ۱۰۴۔ دیوان مصحفی ۲ ردیف الف ۵۲،

[3] رسالہ نوبادہ ص ۱۳۵ الف

[4] برائے تفصیل، واقعات دار الحکومت دہلی ۲/۰۹۰۔ ۶۹۱ آثار الصنادید (۱۹۶۵) ص ۲۴۸

کرتے ہیں اور حضرت سرور کائنات کی مدح میں عربی قصائد پڑھے جاتے ہیں۔ یہ قصائد بہت پرتاثر اور شعراء عرب کے منتخب ہوتے ہیں۔ اُن عربوں کی آواز بہت دلکش ہوتی ہے۔ جب عرب قصائد پڑھتے ہیں اور مولود خوانی کرتے ہیں تو صوفی لوگ وجد و حال میں آتے ہیں اور تمام مسجد میں ہر طرف درود کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور ہر جانب تسبیح اور تہلیل کا شور ہوتا ہے ساری رات مولود خوانی اور قصائد پڑھنے میں گذرتی ہے اور صبح کے آثار نمودار ہوتے ہیں تو سب عرب اور حاضرین ختم قرآن میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ تمام عرب حافظ اور قواعد تجوید کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اس لیے جب وہ قرآن پاک کو عربی لب و لہجے میں پڑھتے ہیں تو سننے والوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے ..... اہل شہر اور صلحاء اور علماء اس مسجد میں مجلس کے وقت دعائیں مانگتے ہیں..... رات کے وقت انواع و اقسام کے کھانوں سے مہمانوں کی ضیافت ہوتی ہے۔ اور ان کی خدمت میں قہوے کے بڑے بڑے پیالے پیش کیے جاتے ہیں"۔ [۱]

یازدہم پیر دستگیر عبدالقادر جیلانی | بالعموم مسلمان اور بالخصوص قادری سلسلے کے لوگ حضرت عبدالقادر جیلانی[۲] کی وفات کے دن مجلسیں منعقد کرتے تھے۔ دہلی کے میرن نامی ایک صاحب فردوت کے جلسے کی شان و شوکت کا درگاہ قلی خاں نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

۱۔ مرقع دہلی۔ ص ۲۷-۲۸

۲۔ برائے تفصیل۔ قانون اسلام (انگریزی) ص ۲۲۷-۲۴۱

"اس کے ہاں ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ کو ایک شاندار مجلس منعقد ہوتی ہے..... جوق در جوق ناچنے اور گانے والیاں شرکت کرتی ہیں۔ صبح سے لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا ہے اور قوال ونقال بھی اپنے کمالِ فن کی نمائش سے لیے کثیر تعداد میں آتے ہیں۔ میرن مہمانوں کے لیے بڑے بڑے اور اعلیٰ اور قیمتی خیمے نصب کرتے ہیں اور دھنک عمدہ قالین اور رنگین فرش بچھواتے ہیں اور تمام شہر کے لوگوں کے لیے شرکت کی عام اجازت ہوتی ہے.... میرن کی طرف سے تمام حاضرین کے لیے عمدہ عمدہ مدارات اور سامان طرب اور لطف و تماشہ بالکل مفت ہے۔ جب محفل شروع ہوتی ہے تو ہر ایک بڑے سلیقہ سے بیٹھ جاتا ہے اور رقص و سرود اور ناچ ورنگ کو اطمینان سے دیکھتا اور سنتا ہے...میرن ہر مہمان کی خدمت میں عمدہ کھانے میوے اور عطریات پیش کرتا ہے اور جو لوگ شراب پیتے ہیں ان کو اس کی بھی آزادی ہوتی ہے۔"[1]

شاہانِ مغلیہ کے دربار میں یہ جشن منایا جاتا تھا اور متعلقہ رسومات ادا ہوتی تھیں[2]

---

[1] مرقع دہلی ص ۲۳۔۲۴ [2] ملاحظہ ہو نادرات شاہی، امیر الامرا حسین علی خاں کا حکم تھا کہ ہر ماہ کی گیارھویں کو ایک جلسہ منعقد ہو اور ایک ہزار ایک سو ایک روپیہ کی لاگت کا کھانا تیار کرا کر غرباء و مساکین میں تقسیم ہو۔ مشائخ علماء اور صلحا کو اس موقع پر مدعو کیا جاتا تھا اور بڑے ادب و احترام سے ان کی ضیافت کی جاتی تھی۔ تاریخ ہندی ورق ص ۴۹۴ ۴۹۵ نیز مآثر الامرا۔ ۱/ ۳۲۸ آثار الصنادید ص ۱۹۹

جشنِ نوروز | اورنگ زیب نے مذہبی نقطۂ نظر کی وجہ سے یہ جشن ممنوع قرار دیدیا تھا اور اس کی بجائے رمضان کے مہینے بھر ایک جشن جاری کیا تھا جس کو نشاط افروز کہتے تھے [۱] اس کے جانشینوں نے جشنِ نوروز کو دوبارہ رائج کیا۔ فرخ سیر نامہ کے مصنف نے عہد فرخ سیری میں اس جشن کی شان و شوکت کا بہت دلچسپ منظر پیش کیا ہے۔ [۲] ۱۸۵۷ء تک دربار مغلیہ اور عوام میں یہ جشن جاری و ساری تھا۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں یہ جشن بڑے کر و فر سے منایا جاتا تھا۔ اس دن بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا۔ اس کو سالِ نو کی مبارکباد دی جاتی اور نوروز کے دستور کے مطابق اس دن کپڑے پہنے جاتے اور رقص و سرود کی محفلیں بھی ہوتیں [۳]۔

میلے ٹھیلے اور بزرگانِ دین کے عرس

میلہ بسنت | دہلی اور شمالی ہندوستان میں بسنت کا میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس دن لوگ پیلے لباس زیب تن کرتے تھے۔ سات دن تک یہ میلہ جاری رہتا تھا۔ درگاہ قلی خان نے اس میلے کا بالتفصیل ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ بسنت کے مہینے کی پہلی تاریخ کو تمام دہلی والے حضرت سرور کائنات کے قدم شریف پر حاضر ہوتے تھے اور صبح سے شام تک وہاں قیام

---

[۱] خافی خان، ۲/ص ۷۹-۸۰ مآثر عالمگیری (ا-ت) ص ۴۳-۴۴ آئین اکبری (ا-ت) ۱/۱۰۴-۱۱۴ [۲] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ فرخ سیر نامہ (ق) ص ۱۲۳-۱۲۴

[۳] دیوان قائم چاندپوری ص ۱۱۵-۱۱۶ الف؛ رسالہ نو بادہ ۱۱۰ الف و ب؛ دیوان حسرت ص ۱۸ الف؛ میراۃ الاصطلاح ص ۴۴ ب؛ نادرات شاہی؛ بزم آخر

کرتے تھے۔ قدم شریف کے قرب وجوار کے باغات اور میدان و مکانات آدمیوں سے بھر جاتے ہیں۔ تمام لوگ زرق برق پوشاکوں میں ملبوس بڑے اہتمام سے آراستہ پیراستہ آتے تھے۔ قدم شریف کے صحن اور ارد گرد کے تمام مقامات پر ڈیرے ڈال کر رہتے تھے۔ اپنے ساتھ خورد نوش کا سامان بھی لاتے تھے۔ اور اعلیٰ اور قیمتی فرش بچھاتے تھے جس کے سبب سے ہزاروں رنگارنگ کے فرش میدانوں، باغوں اور قدم شریف کے صحن میں نظر آتے تھے۔ جن پر لوگ ٹولیوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے اور تفریح میں منہمک رہتے تھے ..... قدم شریف کے اندر اور باہر تمام دن قوالیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ہزاروں قوال اور ہزاروں مجرا کرنے والے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔

زائرین پھولوں کے گلدستے اور خوشبوئیں اور مٹھائیاں قدم شریف پر چڑھاتے تھے اور بہت ایسے بھی خوش اعتقاد لوگ ہوتے تھے جو مجمع پر گلاب پاش سے عرق گلاب، عرق بید مشک، عرق بہار، اور عطریات چھڑکتے تھے اور لوگوں کے کپڑوں پر عطر لگاتے تھے۔ جب خوبصورت لڑکیاں اپنے ہاتھوں میں گلاب پاش اور پھولوں کے گلدستے اور نذر و نیاز کی مٹھیاں لے کر قدم مبارک پر آتی تھیں تو مجمع میں ایک خاص ہلچل مچ جاتی تھی۔

"ہر طرف شور و غل سنائی پڑتا۔ کیونکہ ہر جانب حسینوں کے جگمگھٹے، قوالوں کا شور، مطربوں کا رقص و سرود، نقالوں کی نقل بازیاں ایک ایسا سماں ہوتا تھا جس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ صبح کو نماز کے بعد سے ظہر تک یہی حال رہتا تھا۔ اس کے بعد لوگ فاتحہ پڑھ کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے

اسی طرح دوسرے دن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، تیسرے دن حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی، چوتھے دن حضرت شاہ رسول نما پانچویں دن حضرت شاہ ترکمان شاہ کے مزاروں پر نشاط وانبساط کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ چھٹے دن لوگ حضرت بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور بسنت کی مبارکباد دیتے تھے۔ ساتویں دن اہل دہلی حضرت عزیزی کے مزار پر حاضر ہوتے تھے۔ بحیثیت مجموعی بسنت کا یہ پورا ہفتہ بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اس میں سیر و تفریح وحسن پرستی کے سارے سامان موجود تھے[۱]

میلہ ناگل | ہر ماہ کی، ۱۷ دیں کو ناگل کا میلہ ہوتا تھا جہاں دہلی کے تماشہ بین اور آوارہ عورتیں خوب بن سنور کر جوق در جوق ناگل نامی بزرگ کی زیارت کو آتی تھیں اور نوجوان زرق برق پوشاک پہن کر اپنے آپ کو خوبصورت اور دل کش بنا کر آتے تھے۔ یہ جوان مرد و عورت ہر قسم کی عیاشیوں میں ملوث ہوتے تھے[۲]

اعراس | اٹھارہویں صدی کے بزرگوں میں شاید ہی کوئی ایسا بزرگ ہو جس کے مزار پر سالانہ عرس کی رسمیں ادا نہ ہوتی ہوں۔ درگاہ قلی خان اور دوسرے ہمعصر مصنفوں نے ان عرسوں کی محفلوں اور اس زمانے کے میلوں ٹھیلوں اور وہاں کے ماحول سے بہت دلکش مناظر پیش کیے ہیں جیسا کہ ہم بعد میں لکھیں گے اس عہد میں مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں اور مزاروں پر لوگوں کے ہجوم نظر آتے تھے۔ مذہب سے دوری اور قبر پرستی اور افعال شرک سے قربت اس زمانے کے خصوصیات تھیں۔

---

[۱] مرقع دہلی ص ۱۳۱ و ۳۰ نیز دیکھئے نادرات شاہی بزم آخر [۲] مرقع دہلی ۴۴ ۴۰

قدم شریف[1] | یہ وہ مقام تھا جہاں حضرت سرور کائنات کے قدم مبارک کا نشان بتایا جاتا تھا۔ یہ مقام نہ صرف دہلی کے باشندوں کے لیے متبرک تھا بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ جمعرات کے دن دہلی اور گرد و نواح اور دور دور کے باشندے "قدم شریف" کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ درگاہ کا صحن خلقت سے بھر جاتا تھا۔ اتنا بڑا مجمع ہوتا تھا کہ لوگوں کو قدم شریف کی زیارت کرنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ تمام سال ہر جمعرات کو خلقت کا یہی حال ہوتا تھا۔ ربیع الاول کے مہینے میں بالخصوص اطراف و اکناف ہی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستان سے مشتاقان زیارت آتے تھے اور اس کثرت سے آتے تھے کہ قدم شریف کے آس پاس کے میلانوں میں آدمی ہی آدمی دکھائی پڑتے تھے[2]

قدم گاہ حضرت علیؓ[3] | ۱۲ محرم کو جو کہ حضرت خامس آلِ عبا کی زیارت کا دن تھا۔ اہلِ عزا اور راسخ الاعتقاد حضرات کا وہاں بڑا ہجوم ہوتا تھا اور زائرین اور حاجتمندوں کی کثرت ہوتی تھی۔ تمام چھوٹے بڑے راستے اور آس پاس کے سب مقامات سواریوں اور پاپیادہ آنے والوں سے بھر جاتے تھے۔ اور ایک زبردست میلہ لگ جاتا تھا۔ اہلِ حرفہ اپنی دکانوں کی خوب آرائش کرتے تھے۔ ہر قسم کا سامان وہاں مہیا ہوتا تھا۔ اور دکاندار بہت منافع کماتے تھے۔ قدم گاہ کے متصل ایک چوکی خانہ تھا جہاں اہلِ ذوق اور صاحبانِ وجد و حال جمع ہوتے تھے

---

[1] دیرانہ تفصیل۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۰۰۔ یہ مقام اسی نام سے اب بھی موجود ہے گر بڑی کس مپرسی کے حالت میں ہے [2] مرقع دہلی ص ۱۰۲ [3] تفصیل نوٹ کے لیے دیکھیے، مرقع دہلی (اردو ترجمہ) ص ۸

اور بلند آواز سے منقبت اہلبیت کرتے تھے اور مرثیہ خوانی کرتے تھے۔[۱]

درگاہ حضرت قطب الاقطاب بختیار کاکیؒ[۲]۔ ربیع الاول کے مہینہ میں عرس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں تقریباً تمام دہلی کے باشندے دو دن کے لیے درگاہ شریف میں چلے آتے تھے۔ زیارتیں کرتے، مرادیں مانگتے، نذریں چڑھاتے اور بعد میں خوب سیر و تفریح کرتے تھے۔ ہر زمانے میں اور بالخصوص عرس کے زمانے میں دور دور سے قوالوں کی چوکیاں آتی تھیں جو دور سے مزار مبارک کی جانب رُخ کر کے کبھی کھڑے ہو کر اور کبھی بیٹھ کر گاتے اور لوگوں پر وجد و حال کی کیفیت طاری کرتے تھے۔[۳]

اسی طرز پر حضرت سلطان المشائخ[۴] محبوب الہیؒ، حضرت امیر خسروؒ[۵]، حضرت نصیر الدینؒ[۶] چراغ دہلی حضرت ترکمان شاہ بیابانیؒ[۷][۸]، حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت شاہ رسول نما[۹]، شاہ بایزید اللہ شاہ عزیز اللہ، مرزا بیدلؒ[۱۰] خلد منزلؒ

---

[۱] مرقع دہلی ص ۴۰۲ ۔ [۲] برائے سوانح عمری، سیر الاولیا، سیر العارفین، فوائد الفواد

[۳] مرقع دہلی ص ۵۰۴ ۔ [۴] متوفی ۱۳۲۵ء۔ برائے حالات ملاحظہ ہو، سیر الاولیا، فوائد الفواد

افضل الفوائد، تاریخ فرشتہ (ا۔ت) ۲/ص ۲۱۲۔۲۰۷ [۵] WAHID MIRZA:

LIFE AND TIMS oF HAZRAT AMIR KHUSRAU

[۶] خیر المجالس۔ از حمید قلندر، تاریخ فرشتہ (ا۔ت) ۲/ص ۴۱۴۔۴۱۲

[۷] دہلی کا ترکمان دروازہ انہی کے نام پر ہے [۸] خزینۃ الاصفیا ۱/ص ۲۰۵۔۲۰۷

[۹] سفینۂ خوشگو، ص ۱۰۳۔۱۲۷، سفینۂ ہندی ص ۲۸۔۲۹، مخزن نکات ص ۱۰،

نکات الشعراء ص ۳۰۲

(بقیہ صفحہ پر)

میر مشرف وغیرہ بزرگوں کے مزاروں پر عرس ہوتے تھے اور دور دور کا سفر طے کر کے زائرین وہاں حاضر ہو کر مجلس سماع کا حظ اٹھاتے۔ نذریں چڑھاتے مرادیں مانگتے اور سیر و تفریح کر کے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے تھے[۱]

کھیل تماشے

قدیم کھیلوں میں مسلمانوں کو بالخصوص شطرنج کھیلنے میں دلچسپی تھی۔[۲] تمام شاہان مغلیہ کو اس کھیل سے شغف تھا۔ امرا بھی اپنے حاکموں کی تقلید میں کھیلتے تھے۔ دیگر کارخانجات کی طرح شطرنج کا بھی ایک علیحدہ شعبہ تھا جس کا فرض اس کھیل کے متعلق انتظامات کرنا تھا۔ شاہ عالم ثانی اور محمد شاہ رات کے وقت اپنے حرم کی مستورات کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔[۳]

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں چوپڑ دربار کے مرغوب ترین کھیلوں میں تھا۔ زیب النساء (اورنگ زیب کی بڑی بیٹی) اپنا بہت سا وقت چوپڑ بازی میں صرف کرتی تھی۔[۴] عشاء کی نماز کے بعد محمد شاہ بادشاہ چوپڑ کھیلا کرتا تھا[۵]

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: [۱] ان بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے جلسوں اور وہاں کے مناظر کی تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو مرقع دہلی ص ۷ - ۱۵

[۱] بہارستان غیبی (انگریزی ترجمہ) ۲/ص ۶۳۷ دیوان حسرت۔ ص ۱۰۰ ب، دیوان مصحفی (ق) ۲/ص ۱۵۰ الف کلیات نظیر اکبرآبادی، ص ۲۴۹ کلیات انشا ص ۲۱۱

[۲] منوچی ۲/۱۱۰ [۳] وقائع عالم شاہی ص ۱۳۶ [۴] SARKAR. P.82 STUDIES IN MUGHAL INDIA کلیات سودا ۲/ص ۲۹

[۵] صحیفۂ اقبال (ق) ص ۴۳ ب

پتنگ بازی | اس زمانے میں پتنگ بازی عوام و خواص میں دفع الوقتی کا سب سے زیادہ پسندیدہ ذریعہ تھی۔ آنند رام مخلص "کاغذ باد" کے زیر عنوان لکھتا ہے :۔

"شاہ جہاں آباد میں اس کھیل کا عام رواج ہے۔ ہر روز صاحب جمال معشوق صفت لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر آتے ہیں اور رنگ برنگے پتنگ ہوا میں اڑا کر ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں [1]

آگرے میں کنکوے اور پتنگ بازی کے عام شوق کا اندازہ اس نظم سے بخوبی ہو سکتا ہے جو نظیر اکبرآبادی نے اس بازی کی تعریف میں لکھی ہے۔

اس آگرے میں یہ بھی تماشا ہے دلپذیر   ہوتے ہیں دیکھ شاد جسے خرد و کبیر
کیوں کر نہ دل پتنگ کی ہو ڈور میں اسیر   خوباں کے دیکھنے کے لیے کیا میاں نظیر
ہے یہ بھی ایک طرفہ بہانا پتنگ کا [2]

مختلف عہد میں شعرائے اردو نے پتنگ کے مضامین خیالی کا موضوع بنایا ہے۔

کبوتر بازی | کبوتر بازی بھی تفریح طبع کا دلچسپ ذریعہ تھا۔ امراء و عوام دونوں کو اس بازی سے دلچسپی تھی۔ آگرے کے لوگوں میں اس شوق اور وہاں کی کبوتر بازی کی نظیر اکبرآبادی نے تعریف کی ہے [3] جوشش نے ایک کبوتر باز کا یوں ذکر کیا ہے

ایک محلے میں تھے کبوتر باز   اپنے فن میں سبھوں سے تھے ممتاز
ٹھاٹ ان کے کبوتر کا   گھر نہ تھا ان سے کیہ تھا پھکا

---

[1] ملاحظہ ہو۔ مراۃ الاصلاح ص ۷۹ اب، نیز سفرنامہ آنند رام مخلص ص ۵۴، چمنستان ۲۶ب میرالمتاخرین دتی ۲/۴/۶۵۴ ء، برائے تفصیل کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۲۶۲-۲۶۴
[2] کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۲۷۲، ۲۷۳ نیز دیکھئے۔ سوت جواہر ۲۵ ب- ۱۲۷ الف

چپٹیاں رہتی جعفری کے ساتھ ۔۔۔ ماریں تھیں نت کبوتر پر ہاتھ[1]

درگاہ قلی خان کا بیان ہے کہ چاندنی چوک کے بازار میں کبوتروں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور "روز بازار"[2] لگتا تھا۔ جامع مسجد دہلی کے شمالی دروازے پر بھی کبوتر بکتے تھے[3]۔ غالب نے بھی اپنے ایک قطعہ میں اس کا ذکر کیا ہے آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ شعرائے اردو میں مصحفی نے اپنے ایک پورے قصیدے کا پس منظر کبوتر بازی اور اس کی اصطلاحوں پر رکھا ہے۔ "دلگیر ہوا پڑھ تا ثیر ہوا پر"[4] اس کے ردیف قوافی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصحفی کو بھی کبوتروں سے اور اس کی فنی اصطلاحوں سے خاصی واقفیت تھی۔ کبوتر بھی اردو شاعری کی رمزیہ علامات میں سے ایک ممتاز علامت رہی ہے۔

مرغ اور بٹیر بازی | مرغ اور بٹیر بازی بھی عام تھی[5] مگر دہلی سے متعلق اس کی مثالیں کم ملتی ہیں مگر چونکہ یہ بازی عام تھی لہذا قابلِ ذکر نہ سمجھی گئی۔ بہر حال امیر خاں عمدۃ الملک انجام (محمد شاہی امیر) کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ اس کے ہاں مرغ بازی کا تماشا ہوتا تھا۔ لوگ اپنے مرغ لے کر آتے تھے۔ اور بازی پر مرغ لڑائے

---

[1] دیوان جوشش ص ۲۳۶

[2] بازار کا دن:۔ جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے ❊ روز بازار جانسپاری ہے۔ دیوان غالب ص ۲۲۴۔ عرشی [3] مرقع دہلی ص ۱۷

[4] دیوان قصائد مصحفی (نسخہ رام پور)

[5] تاریخ بے خزاں۔ از فضل علی دقّی ص ۴۷، نیز دیکھئے۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۳۴

جاتے تھے[۱] اس فن نے بعد میں لکھنؤ میں بہت ترقی کی جس پہ ایک مثنوی کلیات میر میں بھی ملتی ہے۔

کشتی | عہد مغلیہ میں کشتی، صرف تفریح کا سامان نہیں تھی بلکہ جسمانی ورزش کی غرض سے بھی لوگ کشتی لڑتے تھے۔ بادشاہ امرا، اور عوام سب کو اس سے دلچسپی تھی۔ بادشاہوں کی سرپرستی میں کشتی کے دنگل ہوتے تھے۔ اور بازی جیتنے والوں کو انعام ملتے تھے۔[۲]

زیر مطالعہ زمانے میں کشتی کے ماہرین فن کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل نہ رہی لہذا شوقین لوگوں نے خود اپنے یہاں اکھاڑے قائم کیے[۳] فاضل خاں کے مکان پر ایک اکھاڑہ تھا جہاں پہلوان جمع ہوتے اور پکڑیں ہوتی تھیں۔ فاضل خاں کے لڑکوں کو اس فن کی مشق کرائی جاتی تھی۔[۴] درگاہ قلی خاں نے مہابت خاں کے اکھاڑے کا دلچسپ بیان کیا ہے۔

"ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں کشتی کے شوقین نوجوان اور فیل تن

---

۱ جانوروں کی کشتی لڑنے اور اس پہ شرط لگانے کا تفصیلی مطالعہ کیجیے۔ آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱۔ ح ۱، ص ۲۲۳ - ۲۲۲ ۲ برائے تفصیل۔ آئین اکبری (ا۔ت) جلد اول، حصہ اول۔ ص ۲۷۲ - ۲۷۳، منوچی ۱/ ص ۱۹۱ کلیات جرأت (دلی)، ص ۴۳۳

R.N. CHOPRA: SOCIETY AND CULTURE IN MUGHAL AGES: P. 62.

۴ برائے تفصیل۔ کلیات سودا ۱/ ص ۲۸۶۔ ۲۸۹، سفرنامہ آنند رام مخلص ص ۶۶، دریائے لطافت ص ۶۹

۵ انفاس العارفین ص ۵۷

پہلوان اور رنگین مزاج تماشہ بین کثرت سے جمع ہوتے ہیں اور آپس میں زور آزمائی اور کشتی گیری کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس طرح لڑتے ہیں کہ تماشائیوں کو حیرت ہوتی ہے۔ یہ نظارہ بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے: کیوں کہ پہلوانوں کی سیکڑوں جوڑیاں اِدھر اور کچھ لوگ ان کی کشتی دیکھنے میں مشغول ہوتے ہیں اور جب سب کشتیاں ختم ہو جاتی ہیں تو حاضرین کی ضیافت مٹھائیوں سے کی جاتی ہے۔ ہر یک شنبہ کو یہ دنگل ہوا کرتا ہے اہلِ دہلی دنگل دیکھنے کے بہت شوقین ہیں اور اکثر اس لیے بھی آتے ہیں کہ حسینوں سے نظارہ بازی کریں، جو یہاں کثرت سے جمع ہوتے ہیں [1]

گھوڑ دوڑ | شہزادوں اور امیرزادوں کو گھوڑ دوڑ کا فن خاص طور پر سکھلایا جاتا تھا۔ [2] اور انہیں گھوڑے اور ہاتھی کی سواری کی مشق کرائی جاتی تھی کیوں کہ اس عہد میں ان دونوں جانوروں کو میدانِ جنگ میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے اسپ شناسی اور شہسواری باقاعدہ ایک فن بن گیا تھا۔ اور اس کے جاننے والوں کی طبقۂ امرا میں بڑی قدر ہوتی تھی۔

پٹے بازی اور تیر اندازی | بادشاہوں، امیروں اور عوام کے لئے پٹے بازی اور تیر اندازی ورزش اور تفریح طبع کے مرغوب ترین ذریعے تھے۔ ان جلسوں

---

[1] مرقع دہلی ص ۰۴۔ ان اکھاڑوں میں جو بد اخلاقیاں ہوتی تھیں۔ ان کے لیے ملاحظہ ہو، کلیاتِ سودا ا، ص ۳۸۹ ۔ ۳۸۹

[2] مآثر الامرا ۳۰، ص ۸۲۴، دریائے لطافت ص ۶۵

کے افراد کو بالخصوص اس فن کی مشق کرائی جاتی تھی۔[1]

شکار شاہانِ مغلیہ اور ان کے امراء شکار کے بہت شوقین تھے۔ بادشاہوں کے شکار کھیلنے کے لیے محفوظ شکار گاہیں ہوتی تھیں۔ باز اور کتوں کو شکار کی مشق کرائی جاتی تھی۔[2] شاہانِ مغلیہ کے مختلف جانوروں سے شکار کھیلنے کے طریقوں کا برنیر نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[3]

سیاسی اور انتظامی کاموں کی مصروفیات کے باوجود بہادر شاہ شکار کھیلنے کے لیے وقت نکال ہی لیتا تھا۔ اسی طرح اس کے جانشین جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ بھی شکار کھیلنے کے بڑے شائق تھے۔[4] محمد شاہ کے عہد میں تال کٹورہ اور رمنہ بدلی اور پالم بہت اہم شکار گاہیں تھیں۔ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی نے بھی اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں شکار کھیلنے کا شوق جاری رکھا۔ شاہ عالم ثانی کو کلنگ کے شکار کا بہت شوق تھا۔[5]

امراء کا بھی یہی حال تھا۔ عمدۃ الملک امیر خاں اور دیانت خاں اپنا زیادہ تر

---

[1] دریائے لطافت ص ۷۲ [2] [3] وقائع سیر و سیاحت (د۔ ت) ۲/ص ۳۵ - ۴۲۰ منوچی ۱/ص ۱۹۱ - ۱۹۲ [4] سیر المتاخرین (ق) ۲/ص ۳۷۷، ۴۱۳ ، تذکرۃ الملوک (ق) ص ۱۱۳ مراۃ الاصطلاح ص ۷۵ ب فرخ سیر نامہ ص ۷۲ ب

[5] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین ۲/ص ۴۱۳، ۴۲۳، ۴۲۶، ۵۹۹، تاریخ مبارک نامہ ص ۷۹ الف، تاریخ مظفری ۱/ص ۱۷۴ الف، احوال محمد شاہی (ق) ص ۲۹ سفرنامہ انند رام مخلص ص ۴، رقعات مادھو رام، صحیفۂ اقبال ص ۴۳ ب، مراۃ الاصطلاح ص ۱۵۸ ب

وقت برنوں اور بارہ سنگوں کے شکار میں صرف کرتے تھے[۱] جعفر خاں، نواب بنگال، سے متعلق طبا طبائی نے لکھا ہے کہ جب وہ شکار کھیلنے کے لیے روانہ ہوتا تھا تو اس کے ساتھ ارباب طرب اور ساز ندے بھی ہوتے تھے[۲] ہندوستان میں شکار کھیلنے کے کئی طریقے تھے۔ انند رام مخلص نے ان میں سے بالخصوص منہا چوری، شکار جرگہ، اور شکار کنہاری کا تفصیلی ذکر کیا ہے[۳] سودا نے اپنے شہر آشوب میں امرا کے ذوق شکار کا بھی حوالہ دیا ہے۔

ٹک دیکھنا منصور علی خاں جن کا احوال ہے
چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر وہاں ہے[۴]

<u>غبارہ بازی</u> | احوال کرم شب چراغ" کے تحت انند رام مخلص نے بیان کیا ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ کاغذ کے غبارے بنا ہوا میں اُڑاتے تھے۔ کبھی کبھی ان میں زندہ جانور رکھ کر بھی اُڑاتے تھے۔ جسے "کرم شب چراغ" کہتے تھے[۵]

<u>قصہ خوانی</u> | تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں وقتاً فوقتاً قصص، سوانح عمریاں، حکایات اور نثر و نظم کی ادبی کتابیں سن کر وقت گزارتی تھیں۔ فارسی کتابوں میں گلستان اور بوستان اور فارسی شعراء کے اشعار سننے میں خاص طور پر دلچسپی تھی۔[۶]

---

۱ ماثرالامرا ۲، ص ۷۸، ۲۷۸ ۲ سیر المتاخرین (فارسی) ۱، ص ۶۵۱

۳ برائے تفصیل۔ مرآۃ الاصطلاح ص ۱۵۸ب، ۱۴۹ الف و ب، ۳۵۰ب چمنستان ص ۲۱ الف

۴ کلیات سودا ۱، ص ۲۶۷

۵ مرآۃ الاصطلاح ص ۱۸۱ب ۶ مثنوی ۲، ص ۲۳۱

علی وردی خاں (نواب بنگال) جب تمام امور ملکی سے فارغ ہوکر اپنی خوابگاہ میں پہونچتا تو اس کی خدمت میں قصہ خوانوں کی منڈلیاں حاضر ہوتی تھیں اور وہ مختلف قصے سنا سنا کر اسکا دل بہلایا کرتے تھے سلہ دہلی کے بازار چاندنی چوک میں کھلے عام بہت سے قصہ خواں لوگوں کو قصے سنا کر محظوظ کرتے تھے۔ سلہ اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ بادشاہ کے دربار میں بھی قصہ خواں ملازم تھے۔ شاہ عالم ثانی کے دربار سے حسن علی آغا وابستہ تھا سلہ ان قصہ خواں یا داستاں گویوں کو عموماً خلوت خانے یا حمام میں باریابی ملتی تھی۔ یہ اپنی چرب زبانی اور شیوا بیانی سے نوآب اور قصے سنا کر بادشاہ اور امراء کے ذہن کو سکون پہنچاتے تھے۔ قصہ گوئی کا یہ رواج بہت پرانے زمانے سے ہے اور سماج کے ساتھ ساتھ اس میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ ابتداء میں بہادر اور اولوالعزم بادشاہوں کے قصے پسند کئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ عشقیہ داستانیں اور جذبات حیوانی برانگیختہ کرنے والے قصے پسند کیئے جانے لگے آخر میں میر باقر علی داستان گو اس فن کے خاتم تھے۔ ان کا تفصیلی خاکہ اشرف صبوحی نے دلّی کی چند مستیاں میں پیش کیا ہے۔ اب یہ فن بالکل ناپید ہو چکا ہے ان داستان گویوں کو ہر فن اور ہر علم کی مصطلحات اس کثرت سے یاد ہوتی تھیں اور انہیں اپنی داستانوں میں اتنی تفصیل سے اور ایسے دلچسپ پیرائے میں پیش کرتے تھے کہ جاہتے تو ایک داستان کو مہینوں تک طول دے سکتے تھے کہتے ہیں کہ عربی کی مشہور داستان الف لیلہ ولیلہ بھی اسی طرح وجود میں آئی تھی کہ بادشاہ کو ایک کنیز

سلہ سیر المتاخرین [illegible] برائے تفصیل مرتبہ [illegible] سلہ مجموعۂ نغز [illegible]

شہزادے نے ایک ہزار ایک راتوں تک مسلسل یہ داستان سنائی تھی۔ یہ واقعہ تو نہیں ہے لیکن داستان گویوں کے فن کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن تھا۔

حقہ اور پان | اسی زمانے میں حقہ پینے اور پان کھانے کا عام رواج تھا [1] ہندوستان میں طرح طرح کے پان کے پودے پیدا کیے جاتے تھے۔ بھنڈاری نے پان کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

"از نعمت ہائے بے بدل برگ تنبول سبزہ ایست سرسبز ساز انجمن سبز بختان برگی است، ابرگ بخش و لبای برگ طلبان رنگ آرائے مجلس ارباب دول۔ نگہت پیرائے شام اہل محفل مرغوب طبع غنی و فقیر، عزیز دلہائے صغیر و کبیر فیض بخش لبیعت پیر و جوان گوارائے مزاج ہر تندرست و ناتوان بدرقہ ہاضمہ طعام ازالہ علل اقسام سازگار جمیع امزجہ مددگار تمامی ادویہ سیماب کشتہ کہ دم مساوات بآب زندگی می زند۔ اعانت از دمیخواہد سبزان ہند از و سرخروئی حاصل نمودہ خوں ریزی و عاشق کشی می نمایند" [2]

تقریبات اور شادی بیاہ کے موقعوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ مہمانوں کو پان پیش کیے جاتے تھے۔ پان کے بیڑوں پر سونے چاندی کے ورق لگائے جاتے تھے [3]

---

[1] آئین اکبری (ا۔ت) ۲/ص ۲۸۲

[2] خلاصۃ التواریخ ص ۱۲-۱۳۔ نیز میراۃ الاصطلاح ص ۴۴ (الف)، حدیقۃ الاقالیم ص ۱۷، اسیر المتاخرین (فارسی) ۲/ص ۵۴۰

[3] میراۃ اصطلاح ص ۴۴ الف

شاہان مغلیہ کے ہاں "برگ تنبول" یا "تمبول خانہ" نام کا ایک الگ شعبہ تھا جشنوں اور دوسری تقریبات کے ایام میں یہ شعبہ پان کا انتظام کرتا تھا۔ بادشاہ سلامت بذاتِ خود اپنے دستِ مبارک سے امراء کی تواضع کرتے تھے اور ان کو پان پیش کرتے تھے[1] نادر شاہ کے حملے کے بعد دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ کی زبوں حالی کا ذکر رسالہ محمد شاہ و خانہ دوراں میں بڑے دل دوز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔[2]

پان کے لوازمات میں چھالی، کتھا، چونا شامل ہیں۔ حاتم نے ان تمام لوازمات کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

چنگیز و پاندان و جو گھڑی سب — گل دپان وسپاری سے بھرے سب[3]

اسد بیگ (عہد اکبری کا ایک امیر) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ کے عہد سے پہلے شمالی ہندوستان میں حقہ پینے کا رواج نہ تھا۔ اسد بیگ جنوبی ہند سے کچھ حقے اور تمباکو لایا۔ اس کے بعد سے حقہ کا پینا عام ہو گیا۔[4] اٹھارھویں صدی میں حقہ پینا اہل دول اور غربا، دونوں میں عام تھا۔ شعراء اور ادباء دونوں نے تمباکو کی بہت تعریف کی ہے۔ ہندو، مسلمان دونوں اس کا شغل کرتے تھے اور محفلوں میں مہمانوں کی تواضع بھی حقے سے کی جاتی تھی۔ حاتم کا بیان ہے۔

---

۱ حدیقۃ الاقالیم ص ۴۵

۲ برائے تفصیل۔ رسالہ محمد شاہ و خان دوراں خاں ص ۴/۱۷ الف و ب

۳ دیوان زادہ ص ۱۰۵ نیز ملاحظہ ہو سانحۂ عجیب ص ۱۴۲ الف

۴ برائے تفصیل۔ رسالہ تاریخ اسد بیگ (قلمی) ص ۳۶۔۳۷

ہے سب کے مذہب و مشرب سے آگاہ ۔۔۔ ہے ہر ایک محفل اندر اس کے تئیں راہ
وحقہ کا آشنا دونوں سے یکساں ۔۔۔ طلب گار اس کے ہیں ہندو مسلماں [1]

سفر و حضر دونوں حالتوں میں امراء شاہان اور عوام کے ساتھ حقہ ہوتا تھا [2]

سفر میں ہر قدم ہے یار سب کا ۔۔۔ شب تنہائی میں غم خوار سب کا
قبول خاطر شاہ و گدا ہے ۔۔۔ بہفتاد و دو ملت آشنا ہے [3]

حقّے دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک کلی اور دوسرا جو بڑا ہوتا تھا، حقہ کہلاتا تھا [4]

بنگال کے نواب علی وردیخان کی مجلس کے بارے میں طباطبائی نے لکھا ہے کہ نواب مذکور اپنی مسند پہ جلوہ افروز ہوتا، اس کے فوراً بعد اس کے مصاحبوں مثلاً میر محمد علی فاضل، نقی قلی خان، حکیم ہادی خان اور مرزا حسین صفوی کے سامنے حقے لاکر رکھ دئے جاتے تھے [5]

عوام بھی حقے سے خاص شوق رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی میر خود بھی حقہ پیتے تھے۔ مرقع شعراء میں ان کی جو تصویر دی گئی ہے۔ اس میں میر کے ساتھ حقہ بھی دکھایا گیا ہے [6] اگرچہ اس تصویر کے مستند ہونے کے شواہد قوی نہیں ہیں۔

چند دیگر کھیل آہو بازی، جھولنا [7] اور گل بازی وغیرہ معمولی قسم کے تفریح طبع ذرائع تھے

---

[1] دیوان زادہ ص ۳۸۹، نیز مرقع دہلی ص ۲۹ [2] TWINING: TRAVELS IN INDIA P.136
[3] دیوان زادہ ص ۳۸۷
[4] وقائع انند رام مخلص ۱۲/ ص ۱۶۱ الف
[5] سیر المتاخرین ج ۲/ ص ۴۹
[6] برائے تفصیل، خاکسار کا مضمون، مسلمانوں میں حقہ نوشی در جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۸ء)
[7] برائے تفصیل ملاحظہ ہو نجم السلاطین (قلمی) ص ۵۷، میراة الاصلاح ۔ ۱۹۴ الف)

تیراکی | اٹھارھویں صدی میں دہلی اور آگرے میں پیراکی کا عام رواج تھا فرصت کے دن لوگ جمنا میں تیراکی کے مقابلے کیا کرتے تھے، اشرف علی صبوحی نے لکھا ہے

> تیراکی کا یہ عالم تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے، دھواں اڑاتے اور طبار سنتے چلے جاتے ہیں، قلعہ (دہلی) کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی، گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں، اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو جانوں ''

میر مچھلی تیراکی کے فن کے خاتم تھے[۱] جمنا کے کنارے ایک بڑا شاندار میلہ لگتا تھا جس میں ہزاروں تماشبین جمع ہوتے تھے۔[۲]

اسی طرح آگرہ میں بھی تیراکی کے مقابلے ہوا کرتے تھے، اور اس موقع پر میلہ لگتا تھا، نظیر اکبرآبادی نے ایک نظم اسی موضوع پر لکھی ہے، چند مناظر ملاحظہ ہوں:-

جب پیرنے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں ہوشیار پیرتے ہیں

۱؎ دلی کی چند عجیب ہستیاں۔ ص ۱۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۱۰۲ (دلی میں اب بھی "قومی لشکری فنو تیراکی" کے نام سے ایک تیراکی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ امسال ۳۰ راگست ۱۹۷۲ء کو یہ مقابلہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کی باؤلی میں ہوا تھا، آج کل دلی میں خلیفہ عبدالجبار قریشی فنو تیراکی کے مشہور استاد ہیں)

پیر و جوان و لڑکے عیّار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
جھرنے سے لے کے یارو سہجان کا تا نالہ

چھتری سے برج خونی دارا کا جو نترا کا
مہتاب باغ سید تیلی قلعہ و روضا
غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا
ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

باغ حکیم اور جو شیو داس کا چمن ہے
اُن میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوہ مٹھائی کھاتے اور ناچ دل لگن ہے
کچھ پیرنے کی دھو میں کچھ عیش کا چلن ہے
ہر اک مکان میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

برسات میں جو آکر چڑھتا ہے خوب دریا
ہر جا کھڑی[1] و چادر[2] بند اور نا ند جھکوا[3]

---

[1] کھڑی لگانا پیراکی کی اصطلاح ہے اس میں کھڑے ہو کر پیرتے ہیں، اسی طرح دوسرے الفاظ بھی پیراکی کی مختلف قسموں کے نام ہیں [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

مینڈا بھنور اُچاٹن چکر سیمٹ مالا مینڈا کھیر تختہ کشتی پچھاڑ کرتا

واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ناؤں میں وہ گلرو ناچوں میں چمک رہے ہیں
جوڑے بدن میں رنگین گہنے جھبک رہے ہیں

تانیں ہوا میں اُڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں
عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں .

سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ہر آن بولتے ہیں "سید کبیر کی جے! پھر اس کے بعد اپنے استاد پیر کی جے!"
موروکٹ کنھیا جمنا کے تیر کی جے! پھر غول کے سب اپنے خورد و کبیر کی جے!

ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کیا کیا نظیر یاں کے ہیں پیرنے کے بانی
ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن بانی

استاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی سب خوش رہیں ہے جب تک جمنا کے بیچ پانی

کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

۱؎ تابع۔ گفتار و نکتہ۔ کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ص ۳۴۸ تا ۳۵۱

میرؔ:

گریۂ زار میں بیتابیِ دل طرفہ نہیں　　　سیکڑوں کرتے ہیں پیراک ہنر پانی میں

رقص و سرود: رقص و سرود بادشاہوں، امیروں اور عوام کے لئے اندرون خانہ تفریح تھی، تقریبات اور خوشیوں کے مواقع پر ناچنے والوں اور والیوں کو بلایا جاتا تھا۔ تقریباً سارے ہی بڑے شہروں میں پیشہ ور رقاصائیں اور امرد بآسانی مل جاتے تھے۔ درگاہ قلی خاں نے چوک اسد اللہ خاں میں حسین و جمیل زیورات سے مزین امردوں کے رقص کا دلچسپ منظر پیش کیا ہے[1]۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ کا بیان ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی[2] کے عرس کے موقع پر وہاں املی کے درختوں کے

---

[1] مرقع دہلی: "ہر طرف رقص امار دخوش رو قیامت آباد" ص ۵۱ - [2] قطب صاحب قصبہ اوش جو ماوراء النہر کے پرگنے میں واقع ہے میں بتاریخ ۲۳ رماہ رمضان المبارک ۵۶۹ھ بروز پنجشنبہ بعد نماز عصر تولد ہوئے۔ والد کے انتقال کے وقت اُن کی عمر پانچ سال کی تھی۔ والدہ نے پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اصفہان میں جا کر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مرید ہوئے۔ اپنے پیر کے حکم کے مطابق دہلی تشریف لائے۔ اور بہ ہدایت خلق اللہ مشغول ہو گئے۔ آپ کا وصال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو ہوا۔ مزار مبارک مہرولی میں ہے جہاں ہر سال عرس کی رسم ادا ہوتی ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے زائرین آکر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان دنوں میں جب خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے عرس کا زمانہ ہوتا ہے۔ عوام کا یہی عقیدہ ہے کہ خواجہ اجمیری کے مزار پر حاضر ہونے سے پہلے ان کے خلیفہ خواجہ قطب صاحب کے مزار پر حاضری دینا لازمی ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر الاولیاء ص ۵۰ - ۵۵ سفینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۱۳۰ - ۱۳۱ - اخبار الاخیار (اردو ترجمہ) ص ۵۵ - ۵۸



اٹھارہویں صدی کے دربارِ مغلیہ میں رقص و سرود کی ایک جھلک

نیچے لونڈوں کے ناچ کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"لونڈے بھی ایسے کتنک کے کہ جن کو دیکھے پری بھی ہچک رہ جائے سارے سر میں بال۔ کسی کے گلے میں خاختائی جوڑا، ______ کسی کے گلے میں طوقکی اور کسی کے گلے میں لال۔ قطب صاحب کی املیوں کے چھاؤں تلے جہاں دس بیٹھ کر اس کو بلایا اور ناچ شروع ہوا، تہاں ہر ایک طرف ناچتے ناچتے سین بتا کے روبرو آکر بیٹھ گیا۔ ہر ایک نے ڈب میں سے پیسے نکال کر دینا شروع کیے۔ مثلاً چار فلوس جو تم نے دیئے تو پانچ فلوس میں نے بھی دیئے، اسی طرح سے ہر ایک پھیرے بارہ ٹکے بلکہ پندرہ ٹکے کما لیے اور بیٹھے بیٹھے اُسی عالم بیچ دو ٹکے تم نے ڈب میں سے نکالے تو تین ٹکے میں نے بھی نکالے اور کسی یار نے چھ پیسے، کسی یار نے تین پیسے۔ آٹھ نو ٹکے تلنگری دمڑی ٹکے کی پاؤ سیر کے حساب سے لے کے آدھی اُس لونڈے کے حوالے کی، اور آدھی میں ٹکڑا ٹکڑا سب یاروں نے کھایا۔"

اورنگ زیب کے جانشین تمام شاہانِ مغلیہ ناچنے والے رقاصاؤں اور گویّوں کی سرپرستی کرتے تھے، انھیں دربار میں ملازم رکھا جاتا تھا اور عمدہ مناصب بھی دیئے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں رقص و سرود کا فن نقطۂ کمال پر پہنچ گیا تھا۔ جس کا کچھ اندازہ مرقع دہلی کے مطالعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ درگاہ قلی خاں نے دہلی کے اسبابِ طرب کی ایک طویل فہرست دی ہے جس میں یہ نام شامل ہیں:۔

نعمت خاں بین نواز، نعمت خان کا بھائی، تاج خان جہانی و غلام رسول، باقر طنبورچی، حسن خاں ربابی، غلام محمد سارنگی نواز، رحیم وتان سین، قاسم علی بین نواز، معین الدین قوال، برہانی قوال، برہانی امیر خان، رحیم خان جہانی، شجاعت خان، ابراہیم خان، سوادخان، گھانسی رام پکھاوجی، حسین خان ڈھولک نواز، تہنا، شہباز دھمدی نواز، شاہ درویش سبوچہ نواز، نا جیلئے تنگم نواز، تقی، شاہ دانیال، خواصی اور انوٹھا، سبزہ ومزہ، یاری نقال، جٹا قوال، معشوقہ، ابوالحسن، رحیم خاں، گیان خان، دولت خاں اور ہنڈو۔

رقاصائیں اور امرد رقاص | اللہ بندی، رجی امرد، بینگا امرد، سلطانہ امرد، ددگا ہی، رنگولہ نوان، چنگ نواز، سروپ روپ، نور بائی، چمنی، امر بیگم، رام جنی، چگنگ، دمانی، کالی گنگا، زینت وبھی، گلاب، رمضانی، رحمانی بائی، بیتا بائی، کمال بائی، اعابائی، کنور، پتا وتنو وغیرہ[1]

محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں ۲۲ رقاصائیں اور ۲۴ گوئیے ملازم تھے[2]۔ نور بائی بھی اسی کے دربار سے منسلک تھی، کہتے ہیں کہ اس نے حسن وجمال کی دولت کے علاوہ بڑا رسیلا گلا بھی پایا تھا، اور اپنی اس خوبی کے باعث امرائے دربار کے دلوں پر قابض تھی۔ ایک دن نواب روشن الدولہ طرۂ باز خاں کے ہاں وہ بیٹھی تھی کہ اُن کے پیر و مرشد میراں سید بھیک بھی آ گئے۔ نواب صاحب نے انھیں دیکھ کر نور بائی کو کمرے میں چھپا دیا۔ دروازے پر چلمن ڈلوا دی۔ میراں صاحب دیر تک بیٹھے رہے، نور بائی نے کچھ دیر تک تو برداشت کیا لیکن پھر تنہائی کی سنگینی سے تنگ آ کر باہر آ گئی اور

---

[1] برائے تفصیل۔ مرقع دہلی ص ۳۔۶۲-۸۲ [2] تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص ۱۱۴ الف۔

میراں صاحب کے حضور میں جھک کر مجرا پیش کیا،

"حضور کی اجازت ہو تو لونڈی کچھ سنائے"

نور بائی کی درخواست پر شیخ خاموش رہے۔ نور بائی نے اس کو "الخاموشی نیم رضا" سمجھا اور یہ رباعی بڑے پُرسوز لہجے میں شروع کی:۔

شیخے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی | کز خیر گسستی و بشر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم | تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

شیخ کی حالت یہ رباعی سُن کر متغیر ہو گئی۔ معتقدین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹنے لگے اور انھیں بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔

نادر شاہ کی آمد پر قلعۂ معلیٰ دہلی میں محمد شاہ بادشاہ نے ایک مجلسِ رقص منعقد کرائی اور بادشاہ نے اپنی منظورِ نظر نور بائی کو اس محفل میں بلوایا۔ نادر شاہ اس کے حُسن و جمال اور مظاہرۂ کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے اپنے ساتھ ایران لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ سُن کر نور بائی بے ہوش ہو گئی اور محمد شاہ بادشاہ کے چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ کیوں کہ وہ نور بائی کی جُدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مرزا مہدی کے بیان[ا] کے مطابق نادر شاہ نور بائی[۱] اور حکیم علوی خاں[۲] کو اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا۔

امرا کے درباروں کا بھی یہی حال تھا۔ چوں کہ جنگ و جدل سے وہ منہ موڑ چکے تھے اور اپنا بیشتر وقت انہی تفریحی لہو و لعب کے مشاغل میں صرف کرتے تھے، وہ نور بائی اور دیگر طوائفوں کے مکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے۔ انھیں نذر اور روپیہ پیش کر کے اپنے ہاں دعوت کیا کرتے تھے۔ درگاہ قلی خاں رقمطراز ہے:۔

---

[۱] سوانحات سلاطین اودھ ۱/ص ۴۲۔ [۲] سفینۂ ہندی۔ ص ۱۲۸۔ ۱۲۹۔

"رفعت شانش (در زیبائی) بمرتبہ کہ امرا بدیدنش اشتیاق دارند و برسفے
بخانۂ اش می روند خانہ اش چوں خانہ ارباب دول سامان ہزار رنگ
تجمل و بہار...... در خانہ عمدہ ہا کہ وارد می شود یک رقم جواہر رونما
تواضع می کنند و مبلغ معتد بہ بخانہ اش می فرستند کہ قبول دعوت می
کند۔ رفعت او را از ہمیں قیاس باید کرد"[1]

رقص و سرود اور طوائفوں کی ہم جلیسی کا یہ شوق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ جب امرا برائے شکار یا کسی مہم کے لیے جاتے تو اُن کے ساتھ گویّوں اور طوائفوں کی منڈیاں بھی ہوتی تھیں[2]

ایک محمد شاہی امیر، عمدۃ الملک امیر خان انجام کی محفلِ رقص و سرود کا منظر ملاحظہ ہو:-

سدا صحن میں اس کے رہتا تھا رنگ — سدا تھی نوائے دف و نے و چنگ
کلاونت و قوال سب مل کے واں — بموسیقی استاد تھے بے گماں
جو قوال قول و غزل خواں تھا واں — طرب محو مدہوش اسرار تھا واں
کوئی ٹپہ و دھرپت کو گاتا تھا واں — ترانے سے دل کو لبھاتا تھا واں
جب مل کے سازوں سے ہوتا تھا رنگ — کہ تھی واں فلاطوں کی بھی عقل دنگ
کہیں بجتے تھے ستار و منہ چنگ — کہیں کھنجری اور کہیں جل ترنگ
کہیں نے کہیں تھا جلاجل کا شور — بجاتا تھا قانون کو کوئی زور

---

[1] مرقع دہلی ص ۷۳۔ [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی)، ص ۲۰۱/ب
نیز سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲۔ ص ۱۵۱۔

غرض راگ، سازوں کا یہاں تک تھا شور — کہ پہنچے ہے کب شور یوم النشور
کہیں رقص کرتے تھے مہ طلعتاں — کہیں دید کرتے تھے ساغر کشاں
یہ سب خوبرویانِ ہندی نژاد — نمک ازادو نمک سار ساز
خوشی ہوکے آتے تھے جب رقص میں — انھیں دیکھ آتے تھے سب رقص میں
غرض کیا کہوں بزم میں اسکی کی بات — کہ اِندر کا بھی واں اکھاڑہ تھا مات[۱]

اس عہد کے ادب اور مرقع دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں مذہبی اور غیر مذہبی کوئی ایسی تقریب نہ تھی جس میں رقص و سرود کو لازمی نہ قرار نہ دیا جاتا ہو۔ میلے ٹھیلوں میں ناچ گانے کا خاص طور پر انتظام کیا جاتا تھا۔ بادشاہ سے لے کر رعایا تک ہر شخص اس رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا۔ اکثر بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام بھی اس سے مستثنٰی نہیں تھے۔ شاہ وارث الدین، وارث کے دولت کدہ پر اکثر و بیشتر ناچ رنگ کی محفل منعقد ہوا کرتی تھی[۲]

قوالی قوالی کا بھی بہت رواج تھا۔ چشتی سلسلہ کے صوفیاء قوالی کو روحانی غذا سمجھتے تھے اور قوالوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ عوام میں بھی اس کا ذوق سرایت کر گیا حالانکہ صوفیاء کے نزدیک عوام کے لیے قوالی ممنوع تھی[۳] مختصر یہ کہ اٹھارھویں صدی میں عرسوں کی مجلسوں[۴] کے علاوہ شاہانِ مغلیہ سے لے کر عوام تک ہر طرح کے لوگ یا تو اپنے یہاں مجلسِ قوالی منعقد کرتے تھے یا دوسروں کے یہاں جا کر سنتے تھے۔

---

۱ دیوان تاباں - ص ۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲ برائے تفصیل - مجموعہ نغز - ص ۲۵ - ج ۱ - ص ۲۹۱ -
۳ سیر الاولیا ص ۴۹۱ - ۵۳۴ - ۴ مرقع دہلی - ص ۱ - ۱۱ -

شاہ عالم ثانی (۱۷۵۶ء — ۱۸۰۶ء) قوالی کا اتنا دلدادہ تھا کہ شاہی آداب کے خلاف وہ خواجہ میر درد کے تکیہ میں جا کر قوالی کی محفل میں شریک ہوا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کے ہاں ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو محفلِ سماع ہوتی تھی۔ اور شہر کے عوام و خواص حاضر ہوتے تھے۔ مصحفی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ علالت کی حالت میں بھی محفلِ قوالی سے محروم رہنا نہیں چاہتا تھا اور محفلِ سماع میں شرکت ضرور کرتا تھا۔ ایک دن وہ حالتِ علالت میں خواجہ صاحب کی محفل میں شریک ہوا۔ کافی دیر دو زانو بیٹھنے کے بعد اسے کچھ کمزوری محسوس ہوئی اور اس نے اپنے پیر دراز کر دیے۔ خواجہ صاحب کو بادشاہ کی یہ حرکت محفلِ سماع کے آداب کے خلاف معلوم ہوئی۔ ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے بھی بادشاہ کی طرف پیر پھیلا دیے۔ بادشاہ نے خواجہ صاحب کے اس طرزِ عمل سے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دو زانو بیٹھ گیا[1]

شاہ بھیک کے مرید و خلیفہ اور محمد شاہی امیر، روشن الدولہ کو بھی قوالی کا شغف تھا۔ وہ قوالی کی مجلسیں کرتا اور قوالوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا[2] جنا قوال، نواب صمصام الدولہ کی سرکار سے وابستہ تھا۔ برہانی امیر خان اور رحیم خاں جانی، نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام کی سرکار سے منسلک تھے[3]

تمہ خان قوال دہلی کے نامی گرامی قوالوں میں سے تھا۔ وہ شاہ بھیک کا مرید تھا ہر ماہ کی ساتویں کو اپنے مکان پر قوالی کی محفل کرتا۔ برہانی قوال کے ہاں ہر سوموار کو قوالی ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں چھوٹے بڑے۔ امیر و غریب، تاجر اور پیشہ ور ہر طبقے کے لوگ

---

[1] تذکرۂ ہندی۔ ص ۹۲ - ۹۳۔ [2] چار گلزار شجاعی۔ ص ۲۲۴۔
[3] مرقع دہلی۔ ص ۲۳۔

شریک ہوتے تھے۔[1]

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جہاں اٹھارھویں صدی میں سیاسی بدامنی، معاشرتی انحطاط، فقر وفاقہ، اقتصادی زبوں حالی اور بے روزگاری کا دور دورہ تھا وہاں فنِ موسیقی اپنے نقطۂ عروج پر پہونچا ہوا تھا۔ مثالیں اس زمانے کے فارسی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔

صوفیا کے ہاں مجلس قوال سے متعلق میر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو　　مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
پھرتے ہیں چنانچہ لئے خدام سیلاتے　　درویشوں کے پیراہن صد چاک قصب کو

اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا
پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی

شب بازی :- یہ عوام کے لیے تفریح طبع کا بہت مروج ذریعہ تھا، اٹاوہ اور دہلی کے شب باز اپنے فن میں مشہور ومعروف تھے۔ اپنے سفر کے دوران میں محمد شاہ کا جب گذر اٹاوہ شہر کے قریب سے ہوا تو وہاں کے شب باز بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے کرتب دکھائے۔ بطور انعام بادشاہ نے پانچ روپے دئے۔[2]

بھگت بازی :- شمالی ہندوستان میں بھگت باز نامی ایک پیشہ ور طبقہ پایا جاتا تھا اور اس فن سے اپنی روزی کماتا تھا۔ ان تماشوں میں ہندو مسلمان دونوں برابر

---

[1] مرقع دہلی، ص ۵۰، ۱۰۰۔ [2] فارسی میں شب بازی سوانگ اور کٹھ پتلی کے تماشے کے معنی میں مستعمل ہے۔

بے نمود شد وقت صورت بازی کو آئینہ است　　ہست [illegible] هنر آن را که شب بازی کند

[illegible]

شرکت کرتے تھے۔ اپنے ڈراموں میں یہ لوگ مہابھارت کے مناظر پیش کرتے تھے ان میں سے ایک شخص مردانہ لباس زیب تن کر کے کرشن (کنہیا) کا کردار پیش کرتا تھا اور دوسرے لوگ زنانہ لباس سے ملبوس اور زیورات سے مزین گوپیوں کا کردار ادا کرتے تھے۔ سوانگ کے دوران میں نقال (ACTORS) کبیر داس کے کلام سے موقع کی مناسبت سے گیت بھی گاتے جاتے تھے[۱] یہ سوانگ ہندوستان میں فن ڈرامہ کے ارتقا کا پیش خیمہ تھے۔ اور رفتہ رفتہ فن ڈرامہ مغربی ڈرامہ نگاری سے متاثر ہوا اور اب ہندوستان میں یہ فن کافی ترقی کر چکا ہے۔

دہلی کے مشہور ترین بھگت بازوں میں تقی نامی شخص کا شمار ہوتا تھا اور وہ محمد شاہ کا منظور نظر بھی تھا۔ بڑے بڑے امراء اسے اپنے مکان پر مدعو کرتے اور بڑے شوق سے اس کی کرامات دیکھتے[۲] قاسم نے ذیل کے شعر میں دہلی کے بھگت بازوں کی تعریف کی ہے:۔

باندا ز بھگت بازان دہلی   بھگت کا سانگ لایا کوئی بھی[۳]

نقال | مغل بادشاہوں کے دربار سے نقالوں اور لطیفہ گریوں کی منڈلیاں بھی وابستہ ہوتی تھیں[۴] عمدۃ الملک امیر خان انجام نے لطیفہ گوئی ہی کے فن کے ذریعہ محمد شاہ بادشاہ کے دربار تک رسائی پیدا کی تھی اور نمایاں ترقی بھی کی تھی۔ آخر میں الہ آباد کا صوبہ دار بھی مقرر ہوا تھا[۵] امیرزادہ لطیف خان کے دولت کدہ پر نقالوں کی

---

۱ ملفوظ ہند دلی۔ ص ۹۴، ۴۳۔ ۲ مرقع دہلی ص ۶۵-۶۶۔ ۳ تاریخ فرخ سیر بادشاہ حقہ ص ۲۲۶۔ ۴ کلیات قاسم (ق) ص ۱۱۰۔ ۵ حدیقۃ الاقالیم ۴۴۔ ۶ حالات چندا اختاسی مرزا یادگار لذت، سنہ ... بادشاہ محمد شاہ کے درباری نقال تھے۔ تاریخ شاکر خانی (ق) ص ۱۴۴ الف۔ ۷ سفینہ ہندی۔ ص ۱۰۔ حالات چند لطائف ملاحظہ ہو۔ تذکرہ طبقات الشعراء ص ۱۰۳۔

ایک محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔ شہر کے نامی گرامی نقال شرکت کرتے تھے۔ اس مجلس میں عوام و خواص کا ہجوم غفیر حاضر ہوتا تھا۔[1]

دہلی کے بازاروں اور بالخصوص چاندنی چوک میں شہر کے منتخب نقال اور مسخرے جمع ہوتے اور جگہ جگہ پر اپنی دکان سجا کر ناظرین کو محظوظ کرتے تھے۔[2] عرسوں میں بھی وہ لوگ موجود ہوتے تھے، اٹھارہویں صدی کے نقالوں میں ثنا دانیال، الو تھا اور یاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[3]

دوسرے کھیل اور تماشے۔ انشاء اللہ خان انشاء نے چند کھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں بچے اور بوڑھے دونوں دلچسپی لیتے تھے۔ مثلاً چنڈول، گداگر، بول، کاٹھ کٹول، بانسلی، بھنبیری، میرا ناٹو، کالی پیلی ڈلو، چدر چھپول، گھوڑ رکھنڈے، چوہے لنڈے، مونگ چھاڈ گڈ دنی ڈو، چھلا چھپول، کانے پیلے دیو، شیر بکری یا باگھ بکری، ایڑن کبڈی، وزیر بادشاہ، آنکھ مچولی، گڑا تیل بتی پادے دہی، چلیل چھائیں مائیں، گول گھمائیں، راجہ گھر بیٹھا ہوا، دوڑے آئیو کوئی ایسا بھی ماتا ہو، چڑیا کے بند چھڑا دے، لوڑھی ٹیسو رائے وغیرہ۔ لوہڑی کا کھیل، دہلی سے کابل تک مروج تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے:۔ ہولی کے تہوار سے کچھ دنوں پہلے بچے کچھ جوانوں کو اپنے ساتھ لے کر محلہ محلہ گشت لگاتے پھرتے تھے۔ اور ہر گھر سے نقدی زر یا ایندھن حاصل کرتے تھے اور ہولی کی مقررہ شب کو اس ایندھن کے انبار میں آگ لگاتے تھے۔ ان ٹولیوں میں مسلمان بچے بھی ہوتے تھے۔[4]

---

[1] مرقع دہلی ص ۲۵۔ [2] مرقع دہلی ص ۱۰۰۔ [3] ایضاً ص ۹۵ تا ۹۸۔ [4] دریائے لطافت (اردو ترجمہ) ص ۱۲۱، ۱۳۱، ۱۳۲،

آنکھ مچولی۔ | کم سن لڑکے اور لڑکیاں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اور آج بھی دیہاتوں اور قصبوں کے لڑکے اور لڑکیاں یہ کھیل کھیلتے ہیں۔ حسرت کے اشعار ہیں۔

اگر شوق تجھے آنکھ مچولی سے ہے — مجھ کو بھی کھیلنا تجھ اچپل سے ہے
کر بند میری آنکھ اور تو چھپ جا — میں ڈھونڈوں تجھے یہ کھیل اول سے ہے[1]

گلی ڈنڈا | یہ بھی ہندوستان کے مشہور کھیلوں میں سے ہے۔ شہر اور دیہات وقصبات میں یکساں مقبول تھا۔[2]

آہو بازی | آہو بازی[3] اور گل بازی[4] امرار اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے تفریحی مشاغل تھے۔

جھولا | قدیم زمانے سے ہندوستان کی عورتوں میں جھولے کا رواج تھا ساون کے مہینے میں آج بھی یہ نظر آجاتا ہے۔ عام طور پر لڑکیاں گھروں کی کڑیوں میں رسّی ڈال کر جھولا بنالیا کرتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں تہوار اور عرسوں کے مواقع کے میلوں میں بچے اور جوان سبھی جھولا جھول کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ انشار اللہ خاں انشار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے عرس کے موقع پر درگاہ کے قریب دیوار کی املیوں پر جھولے ڈالے جاتے تھے۔ اور وہاں پریزادوں کا ہجوم غفیر ہوتا تھا۔[5]

محلاتِ شاہی | نادراتِ شاہی، جو شاہ عالم ثانی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اور

---

[1] دیوانِ حسرت (ق) ص ۱۲۹ (الف) [2] برائے تفصیل دریائے لطافت (فارسی) ص ۱۱۰۔ [3] ہرنوں کی لڑائی۔ [4] پھولوں سے کھیل۔ [5] دریائے لطافت (اردو ترجمہ) ص ۱۰۰۔

بزمِ آخر، جس میں منشی فیاض الدین نے دہلی کے دو آخری بادشاہوں یعنی اکبر ثانی (۱۸۰۶ء – ۱۸۳۹ء) اور بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۹ء – ۱۸۵۰ء) کے طرزِ معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محلات کی زندگی میں عیش و عشرت، آرام و آسائش اور دفع الوقتی کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ دن رات جشن میں گذرتے تھے، آخری چہار شنبہ، بسم اللہ خوانی، سالگرہ، بسنت، بکرید، جلوس کا جشن، چھٹی، دوالی، رتجگا، ساچق، عید، گوردھن پوجن، مہندی، شب برات، سرستی پوجن، عرس (پیر دستگیر عبدالقادر جیلانی)، ہر بیٹے کی شادی، ہولی کا جشن، بیاہ کی مہندی، نوروز کا جشن، پیروں کی نیاز کا جشن، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، سلونو، پھول والوں کی سیر[۱]، دن عید اور رات شب برات ہوتی تھی گویا بزم ہی بزم تھی، رزم کا نام تک نہ تھا۔

دہلی کے بازار) دہلی کے بازاروں کے بارے میں میر کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے، کہیں   دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

دہلی کے دو بازار، چاندنی چوک اور چوک سعد اللہ خان، گویا سارے شہر کی

---

۱ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے گزشتہ سال اس جشن کا احیاء کیا تھا کیونکہ اسے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اس سال (۱۹۶۷ء) ۲۰ ستمبر کو یہ جشن منایا گیا۔ صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم اور شہر کے دوسرے ہندو مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔

جان تھے اور دہلی کی طرزِ معاشرت کا اصلی نمونہ ان بازاروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ چونکہ سعد اللہ خان کی رونق کا یہ عالم تھا کہ اس کو دیکھ کر مرغ نظر حیرت کا شکار ہو جاتا تھا۔ درگاہ قلی خان رقمطراز ہے :۔

"نظر از ملاحظہ محسوسات رنگا رنگ دست و پا گم می کند، و نگاہ بتماشا
تجدد امثال در تماشا دنگ، از تمثال مواد متنا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند"[1]

ایک طرف : "رقص اماردِ خوش رو قیامت آباد"

تھا تو دوسری طرف "کرسی ہائے چوبیں از قبیل منابر نصب کردہ" جن پر کھڑے ہو کر پیشہ ور اور شیریں مقال واعظ ہر ماہ اور موقع کی مناسبت سے مضامین پر وعظ کہتے نظر آتے تھے۔ مثلاً ماہ رمضان المبارک میں اس ماہ کے فضائل اور روزے کے فوائد۔ حج کے مہینے میں حج کے مناسک، محرم الحرام میں ذکرِ شہادت اس طرح یہ واعظ عقیدت مندوں سے کافی دولت کما لیتے تھے۔ یہ رواج غدر سے پہلے تک تھا۔ غدر سے پہلے فوراً سے پر عیسائی مبلغ بھی وعظ کہا کرتے تھے، کسی گوشے میں اہلِ تنجیم اور رمال اپنی دوکان جمائے دکھائی دیتے۔ تو کسی کونے میں آتشک اور سوزاک کی دوا کی دوکان بھی نظر آتی، جہاں لوگوں کا اجتماع لگا ہوتا۔ ایک جانب اسلحہ فروشوں کی دوکانیں تھیں تو دوسری طرف میوہ فروشوں کی۔[2]

میر حسن دہلوی نے چاندنی چوک کی یوں تعریف کی ہے :۔

پُر دل چسپ بازار تھا چوک کا | کہ ٹھہرے جہاں پر وہیں دل لگا
جہاں تک رستے تھے بازار کے | کہے تو کہ تختے تھے گلزار کے[3]

---

[1] مرقع دہلی ص ۱۴-۱۵ [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مرقع دہلی۔ ص ۱۱-۱۴ [3] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۵۔

مختصر یہ کہ چاندنی چوک دہلی میں سب سے زیادہ دلفریب اور دل کش مقام تھا۔ اس بازار کے وسط میں ایک نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف کپڑے، جواہرات، عطریات، ظروف، سامانِ آرائش، آلاتِ حرب اور حقّوں وغیرہ کی دکانیں تھیں جن پر لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ درگاہ قلی خاں لکھتا ہے کہ ایک موقع پر ایک یتیم امیرزادہ چاندنی چوک کی سیر کو جانا چاہتا تھا۔ بیوہ ماں نے اپنے لڑکے کی خواہش پوری کرنے کی غرض سے تہیدستی کے عذر کے ساتھ ایک لاکھ روپے اُسے دیئے اور اس سے کہا

"ہرچند ازیں مبلغ نفائس و نوادر ایں چوک تحصیل نمی تواں کرد لیکن

چوں طبیعت عزیز القدر مصروف این معنی است ایں وجہ مختصرے را صرف

ضروریات پسند خاطر باید نمود"[۱]

اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ چاندنی چوک کی دوکانوں میں لاکھوں روپے کا ایسا نفیس اور نادر سامان مہیا رہتا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ بھی وہاں کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔

قہوہ خانے، چنڈو خانے: اس بازار میں قہوہ خانے بھی تھے۔ جہاں دہلی کے شعراء جمع ہوتے تھے، چنڈو خانے بھی تھے جن میں بے فکرے بیٹھ کر عالم بالا کی سیر کرتے تھے اور یہاں سے پھر افواہیں پھیلتی تھیں۔ جن کے نتائج نادر شاہ کے قتلِ عام کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے۔

مدرسے: مغل بادشاہوں کو علم و ادب سے بڑی دل چسپی تھی۔ اور انھوں نے اس کو فروغ دینے میں حتی الوسع کوششیں بھی کی تھیں جس کے تفصیل سے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب نے سارے ملک میں مدرسے قائم کئے تھے۔

---

[۱] مرقع دہلی ص ۲۲ -

سجان رائے بھنڈاری کا بیان ہے:-

"در کوچہ و بازار و ہر محلہ و ہر برزن مساجد و معابد و خوانق و مدارس کہ بہ عالمیان ازاں بہرہ دنیا و عقبیٰ و فائدہ صورت و معانی حاصل نمایند تعمیر یافتہ"[1]

اساتذہ اور طلبا کو ماہانہ وظائف سرکار کی طرف سے دیے جاتے تھے۔ اس طرح بطور امداد سرکار اچھی خاصی رقم علم و ادب کو فروغ دینے پر صرف کرتی تھی۔[2] لیکن اٹھارہویں صدی کے سیاسی انحطاط اور اقتصادی زبوں حالی و بد امنی کے سبب بقول مصنف تاریخ محمد شاہی:-

"نہ مدرس را شغل کتاب و نہ مدرسہ طالب علم و ذکر نے و اصحاب خانقاہ ویران و درویشان خراب، از مسجد مؤذن و خطیب را بنا بر فکر روزی احتساب"[3]

مگر ان تمام نامساعد حالات کے باوجود دہلی میں چند مدرسے قائم تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو خانقاہوں اور مسجدوں سے منسلک تھے۔ اور کچھ علیحدہ تعلیم گاہوں کی شکل میں تھے۔ شمالی ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں علیحدہ مدرسے تھے ویسے تو ہر مسجد سے مکتب منسلک تھا چاہے وہ مسجد دیہات ہی میں کیوں نہ ہو۔

مدرسہ رحیمیہ۔ اس کے بانی شاہ ولی اللہؒ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم تھے۔ یہ محلہ "مہندیان" کے قریب تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں اب مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارت ہے۔ شاہ عبدالرحیم نے اس مدرسہ میں حدیث کی تعلیم دینا شروع کی۔

---

[1] خلاصۃ التواریخ۔ ص ٣١۔ [2] برائے تفصیل۔ تاریخ عالم گیر (ی)، ص ۵ ب۔

[3] تاریخ محمد شاہی (ق) ١٥٥ الف۔

دور دور سے طالب علم اس مدرسے میں تحصیلِ علم کے لئے آتے تھے۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد شاہ ولی اللہ نے اس مدرسہ کی نگرانی شروع کی اور اُن کی حیات میں یہ مدرسہ تعلیم حدیث کا شمالی ہندوستان میں واحد مرکز بن گیا تھا۔ طالب علموں کی کثرت کی وجہ سے محمد شاہ بادشاہ نے شاہ صاحب کو ایک حویلی مدرسہ کیلئے عنایت کی تھی۔ ۱۸۵۷ء تک یہ مدرسہ قائم رہا۔ غدر میں برباد ہوگیا۔ ترکمان دروازہ اور حبشی قبر کے درمیان یہ محلہ آج بھی مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے[1]
اس مدرسہ کے سیکڑوں طلباء کو حافظ رحمت[2] خان کی سرکار سے وظائف ملتے تھے[3]
نجیب الدولہ[4] علم و علماء کی بہت سرپرستی کرتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے کہ اس کے دربار سے نو سو (۹۰۰) علماء وابستہ تھے۔ اور اُن کے وظائف پانچ روپیہ سے پانچ سو روپیہ تک مقرر تھے[5]

مدرسہ بازار خانم | حضرت شاہ کلیم اللہ[6] دہلوی کی خانقاہ دہلی کے مشہور بازار خانم[7] میں تھی۔ جس سے منسلک ایک مدرسہ بھی تھا جو علم و ادب اور روحانی احیاء کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دہلی کے گرد و نواح میں شاہ صاحب کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔

---

[1] برائے تفصیل، واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۲۰۶، نیز حیات ولی ص ۲۳۱ [2] برائے سوانح حیات ملاحظہ ہو۔ حیات حافظ رحمت خان۔ مولفہ سید الطاف علی۔ [3] گلستان رحمت ص ۲۳۱ الف، ب۔ [4] برائے سوانح ملاحظہ ہو نجیب الدولہ (انگریزی) مولفہ پروفیسر شیخ عبدالرشید (علی گڑھ) [5] ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی ص ۱۰۱، نیز مجموعہ ملفوظ (مقدمہ) ص ک سط۔ [6] برائے سوانح ملاحظہ ہو تذکرہ مشائخ چشت۔ مولفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۳۶۶-۳۲۲ [7] بازار خانم لال قلعہ کے بالمقابل۔ برائے تفصیل واقعات دار الحکومت دہلی۔ ج ۲۔ ص ۱۱۱

اور بڑی تعداد میں وہاں طلباء آتے تھے۔ اس مدرسہ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں شجرۃ الانوار کے ایک بیان سے اس مدرسہ کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ:-

"بسیار طلبۂ علم آمدہ سکونت می نمودند و سبق کتب با شتہ خواندند و بار چہ نیز از سرکار یافتند" [1]

یہ مدرسہ ملک پور، علاقہ غدر کے بعد منہدم کر دیا گیا، اور وہاں کی آبادی تباہ و برباد ہوئی۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:-

"در سال غدر چوں نصاریٰ بر اہل اسلام دہلی فتح یافتند مکانہائے کہ قریب لعل قلعہ بودند ہمہ را منہدم کردند" [2]

غالب ایک خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:-

"شیخ کلیم اللہ جہان آبادی مقبرہ اجڑ گیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب یک جنگل ہے، اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں" [3]

اب یہ علاقہ پریڈ گراونڈ کہلاتا ہے۔ اور اب وہاں مولانا آزاد کا مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اس علاقے کے منہدم ہونے کا بیں ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ

---

[1] شجرۃ الانوار (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ علی گڈھ [2] مناقب المحبوبین۔ ص ۲۰۵۔ [3] اردوئے معلیٰ، حصہ اول۔ ص ۱۸۳۔

کچھ دنوں پہلے دہلی کارپوریشن نے اس علاقے کی کھدائی کروائی تو وہاں مکانوں کی دیواریں اور مضبوط بنیادیں ملیں علاوہ ازیں دو مزار بھی مٹی میں دبے ہوئے نکلے۔ چوں کہ لوح مزار کو فوراً لال قلعہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ مزارات کن بزرگوں کے تھے۔

مدرسہ غازی الدین خان: نواب غازی الدین خان فیروز جنگ نے یہ مدرسہ اجمیری دروازہ کے متصل تعمیر کردایا تھا۔[۱] جب شاہ فخر الدین۔ اورنگ آباد (دکن) سے دہلی آئے تھے تو انھوں نے اسی مدرسہ میں قیام فرمایا تھا۔ اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔

شجرۃ الانوار کے مصنف کا بیان ہے:۔

"مدرسہ خورد غیاض (غازی) الدین خان مرحوم کو بیرون اجمیری دروازہ واقع است سکونت ورزیدند و ارشاد و تدریس اشتغال نمودند مرجع خاص و عام شدند"[۲]

مندرجہ بالا مشہور مدرسوں کے علاوہ ہم عصر ادب میں دوسرے مدرسوں کے صرف حوالے ملتے ہیں، دہلی کی جامع مسجد سے بھی ایک مدرسہ وابستہ تھا، نادر شاہ کے قتلِ عام میں جامع مسجد کو بہت نقصان پہونچا تھا،[۳] ہزاروں کی تعداد میں علماء، صوفیاء اور طلباء شہید کر دیے گئے تھے، مرزا محمد کام بخش کہتا ہے:۔

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) ص ۱۸۔ [۲] بحوالہ سوانح ملاحظہ ہو۔ تاریخ چشت۔ ص ۲۰۰۴۔ ۵۲۹۔ [۳] چہار گلزار شجاعی (ق) ص ۱۳۰۔

"باکمل سکنۂ آں کہ اکثر از آنہا اولیاء اللہ و علماء و فضلای ملت اسلام بودند و ہر کدامی در رکنی از ارکان مسجد مقام طاعت و عبادت الٰہی و صلوٰۃ و دُرود حضرت رسولؐ پناہ و مدرسہ تدریس علوم شرعی از تلاوت قرآن و احادیث شریف و فقہ مذہب حنیف ساختہ شب و روز تبلیغ خلق اللہ در آں زاویہ عزلت مشغول ... بودند صغیر و کبیر شاگرد و استاد و مرید و مرشد را بقتل رسانیدہ و شہید ساختند"[1]

مدرسہ اعتماد الدولہ محمد امین خاں، اجمیری دروازہ کے باہر اسی مقام پر تھا۔ جہاں اُس کی قبر ہے[2] کوچہ بلاقی بیگم میں ایک مدرسہ تھا جو اس کوچہ کے نام سے مشہور تھا[3] مدرسہ محمد غیاث الدین خاں، دہلی کے محلہ مغل پورہ میں ۱۱۴۸ھ میں قائم کیا گیا تھا[4] اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

خانقاہیں: ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے دہلی روحانی تعلیم و تربیت کا بہت بڑا مرکز تھی۔ اور ہر سلسلے کے بلند مرتبہ بزرگ اور مشائخ یہاں جلوہ افروز تھے۔ رشد و ہدایت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا شاہ عبد العزیزؒ کا یہ قول بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ :-

"در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند و این چنیں اتفاق کم می شود"[5]

---

[1] تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ بادشاہ (ق) ج ۲ - ص ۲۶۲ ب -
[2] تاریخ ہندی (ق) ص ۳۹۴ - [3] کلیات عزیزی (ق) حصہ اول ص، الف ۷۵
[4] مآثر الامراء (فارسی) ج ۳ ص ۱۰۰ - [5] ملفوظات شاہ عبد العزیز دہلوی ص ۴۴ -

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی، شاہ فخرالدین دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، سعد اللہ گلشن وغیرہ کی ایسی خانقاہیں تھیں جہاں سے رشد و ہدایت کے چشمے جاری تھے، غدر سے کچھ زمانے پہلے تک یہ خانقاہیں بارونق رہیں، ان خانقاہوں کے بارے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ ان میں:

"تزکیۂ باطن و تہذیب نفس کے درس دیئے جاتے تھے، اور باطنی زندگی کو سنوارنے کے لئے رات دن کوششیں جاری رہتی تھیں"۔[۱]

ادبی مجلسیں اور مشاعرے وغیرہ | اٹھارھویں صدی، شمالی ہندوستان میں اردو زبان کی ترقی اور فروغ کا نہایت سنہری اور اہم دور تھا۔ اگرچہ فارسی سرکاری زبان تھی اسکا عام رواج تھا۔ مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی تعلیم برابر جاری تھی۔ فارسی پڑھنا لکھنا، علم و فضل ہی کے لئے نہیں، تہذیب و شائستگی کے لئے بھی لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ فارسی شعر و سخن کے کتنے دلدادہ تھے، اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے اور تمام کتابیں فارسی زبان ہی میں لکھی گئیں، لیکن اردو زبان رفتہ رفتہ فارسی کا مقام حاصل کرتی جا رہی تھی اور فارسی میں کہنے والے شعراء کو بھی بالآخر اس زبان کی طرف مائل ہونا پڑا۔ حالانکہ ابتدا میں انہوں نے اس زبان میں شعر کہنا اپنے لئے کسر شان سمجھا اور اس زبان میں شعر کہنے کو فن بے اعتبار جانا۔ مصحفی نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے کہ:

"بمقتضائے رواج زمانہ آخر کار خود را منصرف بہ ریختہ گوئی داشتہ بہانۂ این کہ رواج شعر فارسی اندر ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زمانہ بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ ازو بہتر گردیدہ"۔[۲]

خان آرزو کے بارے میں میر تقی میر نے لکھا ہے:

---

[۱] تاریخ چشت۔ ص ۳۳۵ [۲] تذکرۂ ہندی۔ ص ۴۸ [۳] عقد ثریا۔ ص ۲۔

"گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ" این فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند[۵]

انعام اللہ خان یقین کا قول ہے:۔

کہا نہیں ہے ریختہ کا خیال | ہوا واجب امر کا امتثال
بخت نے مجھ کو کیا لاجواب | دگر نہ میں اور ریختہ کیا حساب[۲]

بہرحال، رواج زمانہ سے مجبور ہو کر شعراء نے اس زبان کو اپنا لیا اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں اُن ۱۰۳ شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ مصحفی کے "تذکرہ ہندی" (مصنفہ ۱۲۰۹ھ) میں ۲۰۰ شعراء اور ۵ شاعرات کا ذکر ہے، اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری کو کتنا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اپنے فارسی تذکرہ "عقدِ ثریا" (مصنفہ ۱۱۹۹ھ/۱۲۰۴ھ) میں کل ۱۱۹ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی میں شعر کہنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں کئی اردو شعراء کے تذکرے تصنیف ہوئے۔ مثلاً نکات الشعراء، تذکرۂ گردیزی، مخزنِ نکات، تذکرۂ شورش، تذکرۂ مسرت افزا، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا، گلزارِ ابراہیم، تذکرۂ عشقی، تذکرۂ طبقات الشعراء، تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی)، مجموعۂ نغز وغیرہ۔

دکنی کی تقلید میں دہلی کے شعراء مثلاً: آبرو، آرزو، شاکر ناجی، مضمون، میر، سودا، حاتم، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانِ جاناں نے پہلے تو تفننِ طبع

۵؎ نکات الشعراء ص ۳ ۔ تذکرہ ریختہ گویان (گردیزی) ص ۔ ۲؎ دیوانِ یقین ص

کی غرض سے اردو میں شاعری کی لیکن جب عوام کو اس زبان سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور اردو شاعری کو قبول عام حاصل ہوا تو ان بزرگوں نے اردو زبان کو صاف ستھرا بنانے کی کوشش کی۔ چونکہ اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی اہذا اس پر ہندی الفاظ غالب تھے۔ شاہ حاتم کو اپنے ابتدائی کلام پر نظر ثانی کرنی پڑی کیونکہ اس پر ہندی الفاظ کی اکثرت تھی۔ جس کی وجہ سے کلام میں ایہام غالب تھا مختصر یہ ہے کہ خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم نے اردو زبان میں ہندی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ و محاورے داخل کیے۔ طبقۂ سوم کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد قیام الدین قائم نے لکھا ہے کہ :-

> "طرز کلام اینها مانا بروبہ فارسی است چنانچہ جمیع صنائع شعری کہ قرار دادہ اساتذہ اسلاف است بکار می برند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق اردوئے معلی مانوس گوش می یابند منجملہ جواز الابیان می دانند"[۱]

مختصر یہ کہ ان بزرگوں نے اردو زبان کو پروان چڑھایا اور اس لائق بنایا کہ شعرا بھی اس زبان میں شعر کہہ سکیں کیونکہ دکھنی زبان ایسی نہ تھی کہ اس میں شعر کہے جا سکتے، بقول قائم :-

> قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
> ایک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

اردو زبان کی داغ بیل پڑی اور ہر دلعزیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سماج کے

---

[۱] مخزن نکات ص۔ ۳۰۔

ہر فرد "ہندو مسلمان" نے اس زبان میں شعر کہنا طرۂ امتیاز سمجھا۔ لہٰذا اس زمانے کے شعراء میں ہر پیشے اور طبقے کے لوگ شاعروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً

"میر آخر خوش اوقات و نیک سیرت و درویشے است موقر و صاحب سخنے است مؤثر، عاشق، در علم تاریخ و شمشیر شناسی و لطیفہ گوئی دستے بہم رسانیدہ، رائے پریم ناتھ خطاب بے نظیر "آلگاہ"، بوسیلۂ قصہ خوانی بسر می برد، "میر شیر علی افسوس" داروغہ توپ خانہ عالی جاہ حشمت سپاہی پیشہ"...... رنگین سپاہی پیشہ جوان محمد شاہی، خط نستعلیق خوب می نویسد، قزلباش خان، رند" مجلسے رنگیں و بزم ارم تزئین داشت "سجاد" در لطیفہ گویان طاق، در ہر امرے کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ علم طب ہم حاصل نمودہ...... طلسمات و انشاء، و خوشنویسی و شعر فہمی بمراتب اعلیٰ رسانیدہ شوق مرد سپاہی پیشہ صاحب دیوان۔ مدتے در سرکار نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر بوسیلۂ سپہ گری بسر بردہ" شاعر بزرگ و بزرگ زادہ نواب عماد الملک غازی الدین خان بر جمیع علوم قادر و در فنون سخن ماہر...... ہفت اقلیم و ہفت زبان فغان لطائف و ظرائف او مشہور است "گریان" سپاہی پیشہ" وحشت "وصف دارد در فن سپہ گری استوار"[1]

جوشش نے اپنے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر شخص شعر و شاعری کے میدان میں نظر آتا تھا۔

شاعری کا فن بھی جوشش نرد فن ہے کچھ نہ پوچھ
ہر کس و ناکس نظر آتا ہے اس فن کا حریف[2]

---

[1] برائے تفصیل۔ تذکرۂ شعرائے اردو۔ میر حسن دہلوی [2] دیوان جوشش۔ ص ۱۵۱

شعر و شاعری کا چرچا اتنا عام ہو گیا تھا کہ طفلان مکتب بھی بازار سے جا کر شاعروں کا کلام خرید لاتے، اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، کمترین اپنی غزلیں فروخت کر کے گذر اوقات کرتے ہیں۔

قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ:-

"اطفال مکتب نشین و نوجوان فرحت قرین باشتیاق تمام بہ بہائے تمام خریدی کردند"[1]

چوں کہ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے کے لوگوں نے شعر گوئی شروع کر دی تھی، لہٰذا ہر شخص نے اپنی طبیعت اور رجحان کے مطابق تخلص بھی اختیار کیے تھے۔ مثلاً اوباش، عیاش، عشاق، کافر، پنجا، کھٹو، آرام، آزاد، افسوس، امید، پروانہ، بیدار، دیوانہ، بے ہوش، بے قرار، بیخود، تاباں، پیام وغیرہ[2]

اردو زبان کے فروغ میں بادشاہوں اور امیروں کا حصہ

حالانکہ اٹھارہویں صدی کا سیاسی ماحول ادبی کارناموں اور دلچسپیوں کے منافی تھا۔ پھر بھی شاہان مغلیہ اور امرا نے ادبی سرگرمیوں میں پوری دل چسپی لی۔ عہدِ محمد شاہی کا ذکر کرتے ہوئے شاکر خان نے لکھا ہے کہ اس دور میں شیخ علی حزیں، سراج الدین خاں آرزو، مرزا مظہر جان جاناں، قزلباش خاں، امید، عمدۃ الملک امیر خاں انجام، نعمت خاں عالی، حکیم شیخ حسین شہرت، میمنت خاں، فصاحت خاں، معز خاں واجد، علی قلی خاں والہ، محمد پناہ قابل، مرزا گرامی، صلابت جنگ غیرت، محمد افضل ثابت، سید شمس الدین فقیر، میاں فقیہ، مرزا رفیع سودا، میاں حاتم، میاں آبرو[3]

---

[1] مجموعۂ نغز، ج ۱، ص ۱۲۳ [2] مجموعہ نغز، [3] تاریخ شاکر خانی، قلمی ص ۱۱۱ الف - ۱۱۲ الف۔

اور مرزا علی عظیم پسر ناصر علی مرحوم ادبی مجلسوں کی زینت تھے۔

فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ اور شاہ عالم ثانی، اُردو، فارسی اور ہندی زبان میں شعر کہتے تھے۔ شاہ عالم ثانی، آفتاب تخلص کرتے تھے۔ ان کا ہندی اور اُردو زبان کا کلام نادراتِ شاہی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے شاہ عالم ثانی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"بریں تخلص شریف کہ عبارت از ین کار شاعری است، فارسی باشد یا ریختہ، سنسکرت بودہ خواہ بھاکا اوقات صرف می شود"[۵]

وہ شاعروں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ مصحفی کا بیان ہے کہ:۔

"در آں وقت اکثرے از کیسشران ریختہ گویان پایۂ تخت حاضر می باشند و وقتِ خواندن خوشخوان غلغلۂ تحسین و آفرین بلندی می سازند"

سفر و حضر دونوں حالتوں میں بادشاہ کے ہمراہ درباری شعراء ہوتے تھے اور ہر وقت شعر و شاعری کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس کے عہد کا "ملک الشعراء" ہونے کا فخر سید الشعراء میر منشی غالب علی خاں سید کو حاصل تھا۔[۶] شاہ عالم ثانی نے ایک شاعر کو، جس کا تخلص "شہوت" (پسر شاہ معصوم) تھا۔ "معز الدولہ قزلباش خاں بہادر پھکڑ جنگ" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ خواجہ میر درد نے اس بادشاہ کی

---

[۱] سفینۂ ہندی ص ۱۸۰ [۲] برائے تفصیل مجموعۂ نغز ج ۱، ص ۹۱ [۳] تذکرۂ ہندی، ص ۱۴۰ تذکرۂ شعرائے اُردو (میر حسن دہلوی) ص ۴۰۔ [۴] تذکرۂ ہندی، ص ۴۔
[۵] برائے تفصیل وقائع عالم شاہی، ص ۶۰-۶۱۔ [۶] مجموعۂ نغز ج ۱، ص ۳۳۴۔

شعرا پروری اور فن شاعری کی قدردانی کی تعریف میں ذیل کا شعر کہا ہے۔

قدردان ہنر ہے ذات اس کی   تفصیل سے بھری ہے بات اس کی[۱]

شاہ عالم ثانی کا ولی عہد مرزا جوان بخت، متخلص جہاں دار خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ مہینے میں دو مرتبہ اس کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا۔ اور دہلی کے نامی گرامی شاعر مدعو کیے جاتے تھے[۲]۔ شہزادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ تخلص سلیمان، دہلی سے فرار ہو کر لکھنؤ پہونچا اور وہاں شعر و شاعری کی بساط بچھائی۔ اس کے دربار سے انشا، جرأت سوز اور مصحفی وغیرہ وابستہ تھے۔ اور انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور نامی گرامی شعرا بلائے جاتے تھے[۳]۔

دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد فرخ آباد، اودھ، مرشد آباد، رام پور، اور ٹانڈہ وغیرہ میں خودمختار صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی، بے روزگاری، طوائف الملوکی اور معاشی تنگی کا بازار گرم تھا۔ فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا۔ بادشاہ اور امیر دونوں تنگ حال تھے۔ خود انھیں اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان میں اب سکت کہاں تھی کہ شعرا کی پرورش کرتے نتیجہ یہ ہوا ہنرمندوں کی کوئی قدر باقی نہ رہی تھی۔ میر نے شعرا کی بے قدری کی بارہا شکایت کی ہے[۵]

۱؎ سنگھاسن بتیسی (ق)، ص ۸ - شاہ عالم ثانی کے دربار میں شعر و شاعری کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فراقی نے لکھا ہے کہ - الحمد للہ کہ ہیچمدان کو شعر و شاعری کہ ہیچ ذاتی نشہ دلہم تا آگاہی و اندکی بیان نمی سید۔ ۲؎ ہمتلاً گل عجائب، تذکرہ شعرا ص ۱۱ ۳؎ مجموعہ نغز، ج ۱ ص ۲۰ تذکرۂ ہندی ص ۲۰ گلشن ہند، ص ۱۲ ۵؎ تذکرۂ ہندی، ص ۱۲۰ - ۱۲۱۔

صنائع ہیں سب خوار از اں جملہ میں بھی

ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے،

کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں — اس فن میں نظیری کا بدل تھا

بدیں سبب دہلی کے شعراء نے تلاش معاش اور سرپرستی اور قدردانی کی امید میں ان صوبائی حکومتوں کی طرف رخ کیا جہاں ان کی امید بر آئی اور ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ حسب استعداد ان کی قدردانی ہوئی۔ فرخ آباد کے دربار میں انشاء، مصحفی، عظیم بیگ عظیم، فاخر مکیں، اور محب علی محب جاکر جمع ہوئے[1] ٹانڈہ کے نواب نے مصحفی اور قائم چاندپوری کو پناہ دی۔ رام پور کے نواب فیض اللہ[2] خان نے اپنے عہد کے شعراء کے سوا قائم چاندپوری کی بھی سرپرستی کی۔[3] لکھنؤ کی سرکار میں سودا، میر اور خان آرزو کے علاوہ دوسرے بہت سے شاعروں کو ملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

مختصر یہ کہ بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی اور ہنر پروری اُردو زبان کی ترقی و فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ بہت سے امیر فارسی زبان کے علاوہ اردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ مثلاً قزلباش خان امید اشرف علی خاں[4] فغاں، نواب عمدۃ الملک امیر خاں[5] انجام، نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف[6] تخلص

---

[1] مجموعہ نغز ۱۵، ص ۲۰۲، ۲۰۴، [2] مخزن نکات (مقدمہ) ص ۳ [3] نکات الشعراء ص ۸۰۔ تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص ۶۴۔ [4] نکات الشعراء۔ ص ۴۵، تذکرہ ہندی ص ۱۲۰-۱۵۸۔ مخزن نکات۔ ص ۴۴۔ [5] مخزن النکات۔ ص ۳۲۔ [6] تذکرۂ ہندی ص ۵۔

نواب یار محمد خاںؔ[1]، خلف نواب علی محمد خان روہیلہ، نواب عمدۃ الملک غازی الدین خاںؔ[2]

دہلی کے شاعرے یا مراختے[3] | سیاسی انتشار، طوائف الملوکی اور تنگئ حالی کے ہوتے ہوئے بھی ادبی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ بقول قدرت اللہ قاسم :-

"از حال این زمانہ چہ بطرازم و از قال و مقال این دوران چہ بنگارم کہ دریں ماتم خانۂ سینۂ چاک نمودہ سیاہ می کند و کاغذ جگر پارہ فرسودہ شکن پریشانی می افگند"[4]

لیکن اس پر بھی شہر کے گوشہ گوشہ میں شعر و ادب کے چرچے تھے[5]۔ قدرت اللہ قاسم لکھتا ہے :-

"بہر سو کہ می نگرم شاعرے می بینم و بہر طرف کہ گوش فرا می کنم زمزمۂ شعری شنوم، و طرفہ این ست کہ باہمہ نا اہلیہا ہر اک دم از ملک الشعراء می زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایان می شمرد"[6]

میرؔ نے اپنے تذکرہ میں مجلس مشاعرہ کے لیے مراختہ یا مجلس ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے[7]

---

[1] تذکرۂ ہندی۔ ص ۱۳۱-۱۳۲۔ تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص ۱۲۶۔ [2] تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۱۳۱۔ [3] دہلی میں اردو شاعری کے فروغ و ارتقا کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو۔ دلی کا دبستان شاعری۔ از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ [4] مجموعۂ نغز۔ ۱، ص ۲۔ [5] مجموعۂ نغز ۱، ص ۲۔ نیز ملاحظہ ہو۔ دستور الفصاحت (یکتا)، ص ۱۲۲۔ [6] نکات الشعراء، ص ۱۱۲-۱۲۲۔

اٹھارہویں صدی کی ادبی سرگرمیوں کی مشاعرے جان تھے۔ خاص طرح سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور آداب مجلس کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں بوڑھے، جوان، بچے اور پیشہ ور لوگ شریک ہوتے تھے۔ اور اچھا کلام سن کر دل کھول کر تحسین و آفرین اور مکرر مکرر کے نعرے بلند کئے جاتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مشاعرہ کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"روزے در مجلس شعرا کہ بخانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انعقاد یافت، بابسیارے از تلامذہ خود رسیدہ (جرأت) غزلبا برخوانده بحدے مورد تحسین و آفرین خاص و عام گشت کہ شنیدن شعر مشکل شد تا بفہمیدن خود چہ رسد"[1]

نکات الشعراء میں میر نے چھ ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کے ہاں مجلس مشاعرہ[2] منعقد ہوتی تھی۔ میر سجاد[3]، میاں صلاح الدین[4] (ان کے ہاں ہر ماہ کی پندرہ دیں کو مشاعرہ ہوتا تھا) میاں کمترین[5]، میاں علی نقی[6]، حافظ حلیم[7]۔ میر تقی میر خود بھی ہر ماہ کی پندرہویں کو اپنے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے[8]۔ خواجہ میر درد ہر ماہ کی ۲۳ ر تاریخ کو مشاعرہ کا اہتمام کیا کرتے تھے اور اس میں دلی کے مشہور و معروف اور مستند شاعر شرکت کرتے تھے۔ یہ مشاعرہ بعد میں میر کے ہاں ہونے لگا تھا[9]۔ مرزا عبد القادر بیدل کے عرس کے دن ان کے مزار پر ایک مشاعرہ ہوتا تھا

---

[1] مجموعہ نغز ج ۱ ص ۱۵۵ - ۱۵۶۔ [2] نکات الشعراء - ص ۹۲-
[3] ایضاً - ص ۱۰۲، [4] ایضاً - ص ۱۰۳۔ [5] ایضاً - ص ۱۰۸
[6] ایضاً - ص ۱۰۸۔ [7] ایضاً - ص ۵۰ - ۵۱ - ۶۹ - ۸۰، ۸۶، ۱۱۲
[8] ایضاً - ص ۵۰، ۵۱

بیدلؔ کے تمام شاگرد، دہلی کے باذوق اشخاص اور شعراء جمع ہوتے تھے۔ فاتحہ کے بعد، ان کے شاگرد اور شعراء دہلی مزار کے اردگرد حلقہ بنا کر بیٹھتے اور یہ رباعی پڑھ کر مشاعرہ کا افتتاح کرتے تھے۔

اے آئینۂ طبع تو ارشاد پذیر　　در کسب فوائد نمواتے تقصیر
مجموعۂ فکر ما صلائے عام است　　سیری کن و بر سمت تسلی برگیر[1]

نکات الشعراء کے بعد لکھے گئے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری ترقی کی طرف گامزن تھی، کیونکہ مشاعروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں بہت سے مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔

درحقیقت یہ مشاعرے اپنی موزونیٔ طبع اور استعداد کے مظاہرہ کے اکھاڑے تھے اور ان کی وجہ سے اردو شاعری کی ترقی اور فروغ میں بہت مدد ملی۔ ان مشاعروں کی افادی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں۔

"اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلس مشاعرے تھے۔ جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے۔ بڈھے بوڑھے، نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے۔ باکمال سخنوروں کی دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور گتھم گتھا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی، نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے۔ جو شعراء کے لئے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا۔

---

[1] مرقع دہلی ص ۱۰۰- ۲- کلیات سودا۔ ص- ۱۳۰- خزانۂ عامرہ۔ ص ۱۵۳- سفینۂ خوشگو ص ۱۳۱-

تو اُن کے دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لیئے صرف کسی استاد کا شاگرد ہونا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔[۱]

میر کی ایک رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنؤ کے لیئے رخصت ہونے سے قبل ہی دہلی کی علمی اور ادبی مجلسوں پر جمود کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ فکر معاش و تنگ حالی نے لوگوں کے ذہن کو علمی و ادبی مشاغل سے تحصیل معاش کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ مشاعروں میں اب وہ پہلی سی رونق باقی نہیں رہی تھی۔

کیا رہا ہے مشاعروں میں اب — لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر — کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں[۲]

دہلی میں میر کے احباب | میر نے نکات الشعراء میں بہت سے ایسے شاعروں کا تذکرہ کیا ہے جن سے اُن کے براہِ راست تعلقات تھے۔ یا کسی مشاعرہ میں اُن سے ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ تعلقات بڑھ گئے۔

قزلباش خاں امید[۳] | ایک دن میر اپنے دوستوں کے اصرار پر حضرت سید حسن رسول نما کے عرس میں شرکت کرنے گئے۔ وہاں امید بھی موجود تھے اُس پہلی

---

[۱] گلشنِ ہند (مقدمہ) ص ۱۱۔ [۲] کلیاتِ میر (آسی ایڈیشن) ص ۱۱۰۔ [۳] اصلی نام مرزا محمد رضا تھا۔ ہمدان وطن تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے۔ بہادر شاہ نے قزلباش کے خطاب کے ساتھ ہفت ہزاری کا منصب عنایت کیا۔ ۱۱۵۹ھ میں وفات پائی۔ برائے تفصیل، گلشنِ ہند، ص ۱۱-۲۲، سفینۂ خوش گو، ص ۲۵۰۔

ملاقات کے موقع پر امید نے ریختہ کے دو تازہ کہے ہوئے شعر میرؔ کو سنائے۔[۱]

میاں شرف الدین مضمونؔ | اکبر آباد کے نواح میں واقع قصبہ جاجمئو کے باشندہ، اور سپہ گری پیشہ تھا۔ حریف ظریف، بشاش وبشاش اور مجلسوں کو گرما دینے والے، حالانکہ شعر بہت کم کہتے تھے، مگر جو شعر کہتے تھے اس میں بلند پروازی اور جدت لفظی بدرجۂ اتم ہوتی تھی۔[۲] یہ مضمونؔ کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ جب میرؔ کی ان سے ملاقات ہوئی۔[۳]

محمد شاکر ناجیؔ[۴] | شاہ جہاں آباد وطن۔ عہد محمد شاہی میں سپہ گری پیشہ کرتے تھے۔ شعرائے ایہام گو میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا دیوان مصحفیؔ کے زمانے تک دہلی میں موجود تھا۔ اشعار دلفریب ہوتے تھے، طبیعت ہزل گوئی کی طرف مائل تھی۔ میرؔ کی اُن سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ ہزل کہہ کر سامعین کو ہنساتے تھے لیکن خود کبھی نہیں ہنستے تھے۔[۵]

اشرف علی خاں پیامؔ | اکبر آباد کے رہنے والے تھے[۶]، اپنے عہد کے مستند شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ ریختہ میں صاحب دیوان تھے۔ میرؔ کی اکثر و بیشتر اُن سے ملاقات رہتی تھی، اُس موقع پر شعر خوانی اور گپ بھی ہوتی تھی۔[۷]

۱؎ نکات الشعراء۔ ص ۷۰۔ ۲؎ نکات الشعراء ص ۱۲ گلشن ہند۔ ص ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۳؎ نکات الشعراء۔ ص ۱۵۱۔ ۴؎ برائے تفصیل۔ نکات الشعراء ص ۲۲ مخزن نکات ص ۲۱ تذکرۂ ہندی ص ۵۸ ۲، گلشن ہند ۱۷۳۔ ۵؎ نکات الشعراء ص ۲۳۔ ڈاکٹر فضل حق نے شاکر ناجی کا دیوان 'دیوان شاکر ناجی' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ ۶؎ برائے تفصیل مخزن نکات ۲۲، ریاض الفصحاء ص ۵۵۔ نکات الشعراء۔ ص ۲۶۔ ۷؎ نکات الشعراء۔ ص ۲۶۔

محمد حسین کلیم | شاہ جہاں آباد کے باشندے اور سپاہی پیشہ تھے۔[1] ریختہ کے مستند شاعر تھے، قصائد، مخمس اور رباعیات پر مشتمل ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔ میر کی ان سے قرابت داری بھی تھی مگر اس کے قطع نظر وہ میر سے دلی خلوص اور اُنس بھی رکھتے تھے۔ اور ان کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آتے تھے۔[2]

خواجہ میر درد | نالۂ عندلیب کے مصنف شاہ محمد ناصر کے بیٹے تھے۔ ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے۔ آخر میں مستعفی ہو کر سجادۂ درویشی پر جلوہ افروز ہوئے اور رشد و ہدایت کا شغل اختیار کیا۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حالاں کہ اُس زمانے میں دہلی پر آئے دن بلائے ناگہانی اور فتنہ ہائے آسمانی نازل ہوتے رہتے تھے، مگر خواجہ درد ہی دہلی کی بزرگ ہستیوں میں منفرد تھے جنھوں نے ایک دن کے لئے بھی دہلی سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ چوں کہ فنِ موسیقی میں پوری قدرت رکھتے تھے۔ اس فن کے اکثر استاد اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کا نقشبندیہ سلسلے سے تعلق تھا لیکن انھوں نے اپنا علیحدہ سلسلۂ محمدیہ مروج کیا۔ تصوف میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اُن کی مشہور تصنیف علم الکتاب ہے۔ ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو اُن کے والد کے مزار پر محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی۔ اور دہلی کے بیشتر گویّے وہاں حاضر ہوتے تھے۔[3] میر کو خواجہ درد سے بے حد عقیدت تھی، اُن کے ارشاد پر میر نے اپنے ہاں مشاعرہ شروع کیا تھا۔ چونکہ ناسازگار حالات کی وجہ سے درد نے اپنے ہاں مشاعرہ بند کر دیا تھا۔[4]

---

[1] مخزن نکات۔ ص ۴۳-۴۴۔ [2] تذکرۂ ہندی۔ ص ۱۹۰، گلشن ہند۔ ص ۲۲۴۔ [3] نکات الشعرا ص ۴۲۔ [4] برائے تفصیل میر کی آپ بیتی (فٹ نوٹ) ص ۹۰۔ [5] نکات الشعرا ص ۲۸۔

میاں سعادت علی سعادت | امروہہ (ضلع مراد آباد) کے سیدوں میں سے تھے[1]۔ سلیم الطبع، کم سخن اور متواضع تھے۔ ان میں درویشی کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی۔ اشعار لطیف ہوتے تھے۔ میرؔ سے اُن کے بہت اچھے تعلقات تھے[2]۔

میر سجاد | اکبر آباد کے باشندے تھے[3]۔ تحصیلِ علم سے شغف تھا۔ اور ریختہ کے اچھے شاعر تھے۔ میاں آبروؔ[4] کے شاگرد اور شاکر ناجی اور میاں شرف الدین مضمون کے ہم عصر تھے۔ اُن کے کلام میں ایہام پایا جاتا تھا۔ اپنے مکان پر مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے۔ میرؔ ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اور یہ ربط و ضبط بہت دنوں تک قائم رہا[5]۔

میر محتشم علی خاں حشمت | شاہ جہاں آباد کے باشندے اور میر باقر کے بیٹے تھے۔ دہلی کے محلہ مغل پورہ میں انکا مسکن تھا۔ پیشہ سپہ گری تھا۔ آخری زمانے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ کبھی کبھی کچھ اشعار کہہ لیتے تھے[6]۔ میرؔ کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے[7]۔

کرم اللہ خاں دردؔ | نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے بھانجے تھے۔ کلام درد سے لبریز ہوتا تھا۔ طبیعت میں بے حد شوخی تھی۔ میرؔ کی ان سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی[8]۔

۱؎ برائے تفصیل تذکرۂ ہندی۔ ص ۹۲۔۹۳۔ مخزن نکات۔ ص ۳۰، گلشن ہند۔ ص ۹۸۔ ۹۹
۲؎ نکات الشعراء۔ ص ۹۴، ۵۱۔ ۱۲۸۔ ۳؎ مخزن نکات۔ ص ۲۹۔ گلشن ہند ص ۱۱۹ ۴؎ نکات الشعراء۔ ص ۹ تذکرہ ریختہ گویاں از گردیزی ص ۸۔ مخزن نکات۔ ص ۱۴ ۵؎ نکات الشعراء ص ۶۰۔۶۱ ۶؎ مخزن نکات۔ ص ۲۷۔ تذکرۂ ہندی ص ۸۲ ۷؎ نکات الشعراء ص ۸۳ ۸؎ ایضاً ص ۸۳۔۸۴۔ مخزن نکات۔ ص ۴۵۔

میر کے بقیہ احباب کے یہاں صرف نام درج کئے جاتے ہیں۔

اشرف علی خاں فغاں، انعام اللہ خاں یقین، یکرو، شاگرد میاں آبرو، میاں صلاح الدین عرف مکھن۔ محمد اسمٰعیل بیتاب، میاں ثاقب، سید عبدالولی عزلت، میر عبدالحی تاباں، میاں حسن علی شوق محمد قائم، فضل علی دانا۔ محمد عارف، ہدایت اللہ ہدایت، میاں نجم الدین علی سلام، لالہ ٹیک چند بہار، میر عبدالرسول نثار میر حسن حسن، میاں مجگن، محمد حسن سلمہ اللہ محسن، بندرابن راقم، میاں ضیاء الدین ضیا، میر علی نقی کافر، میر گھاسی، جیون مل عشاق اور شاغل وغیرہ

دہلی کے دبستان شاعری کا زوال : نادر شاہ (۱۷۳۹ء) کے حملے کے بعد سے مغلیہ سلطنت کے زوال اور اختلال کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ اور دہلی سے امن و امان اور فارغ البالی مفقود ہو چکی تھی۔ ان حالات میں روزی کی تنگی نے اُن باکمال سخنوروں کو بھی دہلی کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا جن کے دم سے دہلی، دہلی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کرکے اعلیٰ پایہ کے شاعر اور ادیب وہاں سے رخصت ہو گئے، وہ صحبتیں جو شعر و شاعری کی جان تھیں۔ درہم برہم ہو گئیں۔

مرزا جعفر علی حسرت نے دلی کے دبستان شاعری پر ایک مرثیہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے دہلی کی شاعری اور اس کے زوال کا نقشہ آجاتا ہے :-

اس نظم میں جو ہے ہند سو اس میں ہو سخن
کہتے ہیں فارسی کے اور یہ دہلی کے مقیم

جب سے وہ شہر کیا شاہ جہاں نے آباد
وہاں کے باشندے نے سیکھا سخن بہ جنت قلیم

پھر تو ایسے ہی سخن سنج ہوئے وہاں کہ فصیح
کہ نہ دم مار سکے بلبل گلزار نعیم

اٹھ گیا سب دلی، ناجی، مضموں کا کلام — شعر صائب کے کریں اُن کے سخن کی تعظیم
پہنچے شیراز میں جیسے سخنِ طوطیٔ ہند — واں کے بلبل کا اُٹھا فخر کیے سب تکریم
یہ فلک دیکھ سکا واں کی نہ جمعیت کو — لُوٹ گئی جوں دلِ عشاق لُٹے قوم عظیم
جا پڑے وہاں کے سبھی لوگ بیابانوں میں — ہوئے ہر قصبے میں چھوڑا اپنا وطن وہاں کے مقیم
اب سخن اُن کے ہر شخص کو لگتے ہیں عجیب — اہلِ رضوان کے سمجھتے ہیں سخن اہلِ جحیم
شعر جب اُنکا پڑھا جائے تو یا کہیں ذو قند — گفتگو اپنی نہ سمجھیں کہ وہ کتنی ہے سقیم
لفظ نکلے نہ مزاج ان سے کبھی غیر مجاز — زے کا مخرج ہو جہاں بولیں ذ اس جا پہ جیم
صبح کو بولیں صبح عقل ہے حیران اس جا — نورِ عرفان کے ایجاد کو سمجھیں نہ ذحیم
چار دو چار کہیں بجز وہ جوشن یا دیں — لفظ ثابت (؟) جو نہ بیٹھے کریں اس کو ترخیم
جلنے کیا عیب قوافی کے وہ ایطا اکفا — غیم قافیہ پوچھو تو وہ بتلا دیں میم
معنے صدمہ رکھیں کر کے وہ مشتق سو کبھی — مولوی جامی سے بھی حل نہ ہو معنی صدیم
اور کا شعر پڑھا جائے تو تحسین نہ کریں — اور کہیں پھر پڑھو جیسے کہ سنے کوئی صمیم
باری آوے جو اُنھوں کو تو وہ میں کھینچ گرہ — شعر پڑھنے لگیں روتا ہو کوئی جیسے یتیم[1]

دہلی کے دبستانِ شاعری کے زوال کے دو اہم وجوہ تھے۔

پہلی وجہ تو سیاسی زبوں حالی۔ عام طور پر شعرا دربارِ شاہی یا کسی امیر کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اٹھارھویں صدی میں بادشاہ اور امیر دونوں اقتصادی تنگی اور افلاس کے شکار تھے۔ اس بنا پر اب وہ شعرا کی قدردانی کہاں سے

---

[1] دیوانِ حسرت (ق) رام پور۔ ص ۵ ب تا ۱۶ الف۔ اُردو کی ارتقا کے بارے میں قائم کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو۔ کلیاتِ قائم (ق) ص ۴۰۸۔

کرتے۔ لہٰذا انہیں مجبوراً ایسے مقامات کی طرف رُخ کرنا پڑا جہاں اُن کو قدردانی کے ساتھ مفلسی اور تنگ دستی سے بھی آزادی حاصل ہو سکتی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ابتدائی زمانے میں شاعری کو "فنِ شریف" سمجھا جاتا تھا۔ عوام کو اس میدان میں قدم رکھنے کی مجال نہ تھی۔ لیکن سلطنتِ مغلیہ کے آخری زمانے میں بقول جوشش ہر طبقہ اور پیشہ کے افراد نے اس میدان میں دخل حاصل کر لیا۔ بدین سبب شاعری کا معیار گر گیا۔ اہلِ علم و فن کی قدر جاتی رہی۔ میر اور دیگر شعرا نے اہلِ فن کی خواری کا گلہ کیا ہے۔ شاہ فقیر اللہ آزیں کا ذیلی شعر ملاحظہ ہو:۔

عزتے نیست ہنرمند حوادث زدہ را
ہست بے قدر چو آں نسخہ کہ ابتر باشد[1]

---

[1] تذکرہ مردم دیدہ۔ ص ۲۰۰۔

باب چہارم

مذہب اور اخلاق

اٹھارھویں صدی کی دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت پستی اور زوال کے آخری حدوں تک پہونچ گئی تھی۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی[1]

"فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار سب پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا۔ زندگی شکرِ دوام، میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اور ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اس کے بعد جو اخلاقی زوال کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جارہی تھیں، اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ بگڑ رہا تھا۔ عالمگیر (اورنگ زیب) نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کرا کر جس گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا۔"[2]

[1] تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۳۵۴-۱ ستوڈرڈ نے لکھا ہے کہ مذہب بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زوال پذیر تھا۔ حضرت محمدؐ کا بتایا ہوا توحید محض کا تصور توہمات اور طفلانہ تصوف کی وجہ سے مسخ ہو گیا تھا مسجدیں ویران اور برباد پڑی تھیں۔۔۔۔ جاہل، چالاکوں اور تعویذ گنڈوں پر بے پناہ اعتقاد رکھتے تھے۔ بزرگوں کے مزارات کی زیارت کو حج کے برابر سمجھتے تھے ان کی پرستش جان کر ان سے استمداد کرتے تھے چونکہ (ان کے خیالات کے مطابق) اللہ تعالیٰ دور تھا اور بزرگ لوگ سے قریب تھا۔"

[2] THE NEW WORLD OF ISLAM (NEW YORK. 1921) P.26.

اخلاقی قدروں کے انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے اسٹوڈرڈ لکھتا ہے کہ :-

"قرآن کے اخلاقی احکام کی خلاف ورزی ہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ انکو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ شراب نوشی اور افیون خوری عام تھی۔ فحش کا بازار گرم تھا۔ بدترین افعال بڑی بے شرمی سے اور کھلے بندوں عمل میں آتے تھے" [1]

بادشاہوں اور امراء کی اخلاقی مذہبی زندگی،

حضرت مجدد الف ثانی رحؒ نے صحیح کہا ہے کہ :-

"سلطان روح کے مانند ہے اور رعایا جسم کی طرح اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح رہتا ہے۔ اگر روح فاسد ہو جاتی ہے تو بدن میں بھی فساد پڑ جاتا ہے" [2]

اگر اس قول کی روشنی میں اورنگ زیب کے جانشینوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ مغل بادشاہوں کی ہر بے راہ روی سے عوام اثر پذیر ہوتے تھے۔ اور دربار مغلیہ میں عیش و عشرت کی جو مجلسیں سجتی تھیں ان کے ہلاک جراثیم دور دراز واقع جھونپڑوں تک اپنا کام کرتے تھے [3]

بہادر شاہ اول (۱۷۰۷ء - ۱۷۱۲ء) اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشین تھا اس کی ابتدائی تعلیم، رواج زمانہ کے مطابق اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ ایام اسیری میں

---

[1] THE NEW WORLD OF ISLAM P26

[2] مکتوبات مجددی-۲۶-۴۷-۱۳۵۵ھ

[3] Fall of The Mughal Empire, 4 PB.

اس کا تمام وقت عبادت اور ریاضت میں گذرتا تھا[1] لیکن تخت نشینی کے بعد اس کے مذہبی عقائد متزلزل ہو گئے اور شیعہ عقائد کی طرف قوی تر رجحان ہو گیا تھا، اس کی بے راہ روی اور آزاد خیالی کے سبب سے ملک میں متعدد بلوے ہوئے[2]
طباطبائی، جو خود بھی شیعہ تھا، بڑے فخر کے ساتھ لکھتا ہے کہ:-

"بادشاہ . . . . . در ترویج و تقویت مذہب شیعہ می کوشید"[3]

حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ خطبوں میں "وصی مصطفیٰ" کا اضافہ کروا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور، احمد آباد، گجرات اور دوسرے مقامات پر مذہبی نزاع کے باعث فسادات بھی ہوئے۔ حاجی یار محمد نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ بادشاہ کو اس بے راہ روی پر ٹوکا[4]

بہادر شاہ کے بعد جہاں دار شاہ (۱۷۱۲-۱۷۱۳ء) تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ ایک ڈومنی لال کنور پر ایسا فریفتہ ہوا کہ خود ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا۔

---

[1] تاریخ ہندی (قلمی) ص ۲۲۳-۲۲۴ - [2] سیر المتاخرین (نول کشور) ج ۲ ص ۱۰۱ - یحییٰ خان کا بیان ہے کہ "در ابتدائے سال پنجم بسبب بعضے مصاحبان طبع بادشاہ از عقیدہ طریق سنت و جماعت در ظاہر برگشت و بعضے امور خلاف شرعی را خواست کہ شائع کند" تذکرۃ الملوک ورق ۱۱۲ الف تاریخ ہندی - ورق ص ۲۲۴-۲۲۳ - تاریخ مظفری (قلمی) ص ۹۵ الف

[3] سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲ - ص ۳۰۲ - [4] برائے تفصیل - منتخب اللباب (فارسی) ج ۲ - ص ۶۲۲-۶۲۳ - ۶۲۵ - تذکرۃ الملوک - ص ۱۱۲ الف و ب سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲ - ص ۳۸۱ -

اور حکومت کی باگ ڈور اس رقاصہ کے ہاتھ میں دے رکھی تھی [1]

غرض کوئی ایسی بد اخلاقی اور سماجی گناہ نہ تھا جو اس عورت کے اثر میں نہ کیا گیا ہو۔ حضرت ظلِ سبحانی لال کنور کے ساتھ بازاروں اور باغوں میں سیر و تفریح کرتے پھرتے تھے۔ شراب خانوں میں جاتے تھے۔ بزرگوں کی خانقاہوں اور مزاروں پر اولادِ نرینہ کی تمنا لے کر حاضر ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مزار سے ملحق جھرنے میں لال کنور کے ساتھ، ایک ہی چادر میں ملبوس غسل کرتا تھا [2]

اس کے حکم سے ایک مینا بازار کا انتظام کیا گیا جہاں اہل حرفہ کی لڑکیاں جمع ہوتی تھیں اور بادشاہ انھیں اپنی ہوسناکیوں سے آلودہ کرتا تھا [3]

اس بے راہ روی کا عوام و خواص پر جو اثر ہوا اس کا ذکر خافی خان نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"در عہد ناپائیدار جہاندار شاہ کہ بنائے ظلم و فسق را استحکام تمام شد، چنانچہ بازار رود و سرود قوالان و کلاونت و ڈھاڑی گرم شد کہ نزدیک بود کہ قاضی قرابہ کش و مفتی پیالہ نوش گردد" [4]

جہاں دار شاہ کے بعد فرخ سیر (۱۷۱۳ء - ۱۷۱۹ء) تخت نشین ہوا

---

[1] تاریخ چہار گلشن (ق) ص ۲۰ الف - ۲۱ ب، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۲ - ص ۱۳ - [2] تذکرۃ الملوک (ق) ص ۱۱۹ الف - تاریخ مبارک نامہ (ق) ص ۱۹ ب - [3] تاریخ مبارک نامہ (ق) ص ۱۹ ب - [4] خافی خان (فارسی) ج ۲ / ص ۶۸۹ -

انتظامی امور میں بہت کمزور تھا۔[۱۵] یہ حضرت شاہ عبدالرحیم کا روحانی اثر تھا کہ وہ اتنی مدت تک تخت حکومت پر متمکن رہ سکا۔[۱۶]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ:۔

"شاہ صاحب نے صرف اس غرض سے کہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار کہیں ان آئے دن کی تبدیلیوں کی نذر نہ ہوجائے، اس کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کمزوری ایک ایسا مرض تھا جس نے اسے کبھی حالات پر قابو نہ پانے دیا"[۱۷]

اس عہد میں ایک بڑا مذہبی فتنہ بھی برپا ہوا یعنی میر محمد حسین مشہدی نے جو عمدۃ الملک امیر خان عالمگیری صوبہ دار کابل کا داروغہ خوشبو خانہ اور اس کی لے پالک کا شوہر تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں اپنا نام "نمود و المنود" رکھا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد گذاری کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے مرید "فربود" کہلاتے تھے۔ اور ان کے نام کے ساتھ "نمود" کا لفظ لگا ہوتا تھا۔[۱۸]

فرخ سیر اس ریاکار کا استغنا دیکھ کر اس کا معتقد ہو گیا تھا۔ وہ ایک دن

---

۱۵ لیٹر مغلس (انگریزی) ج ۱ ص ۹۶ و ۳ ۔ ۱۶ برائے سوانح ملاحظہ ہو۔ انفاس العارفین۔ ۱۷ انفاس العارفین۔ ص ۲۲۔ ۱۸ تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۳۵۰، ۳۵۱۔ ۱۹ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۱ ص ۳۰۷، ۳۰۸۔ غالباً اس فرقے کے کسی شخص سے مناظرہ کرنے کیلئے میر تقی میر کے عم محمد علی عرف علی متقی نے [illegible] کا سفر کیا تھا۔ "وہ خشاں نمود کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے فارسی کا [illegible] پیدا کر رکھا تھا تاہم لوگ جو اس کی ریاکاری کو پہچانتے تھے، اس کے سائے تک سے [illegible] کھینچتے تھے۔" ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی۔ ص ۳۶ تا ۳۹۔

چھپ کر اسکے حجرے میں آیا اور قدمبوس ہوکر نذر پیش کی۔[1] ہادی علی خان بن امیر علی خان جو اس عہد کے امیروں میں تھا۔ اور نواب قمرالدین خاں وزیر کا باپ محمد امین خاں بھی اس کے دام فریب کا شکار تھا۔[2]

اس کے "زہرودوں" کی تعداد بیس ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ لیکن اپنے خلیفۂ اول "دوجی بار" سے اختلاف ہوجانے کی وجہ سے اس کے فریب کا بھانڈا پھوٹ گیا اور محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں یہ تحریک ختم ہوگئی۔[3]

فرخ سیر کی عقیدت کی وجہ سے "منوود المنود" کا اثر عوام پر اس قدر بڑھ گیا کہ ہزاروں کی تعداد میں اس کے مرید ہوگئے۔ بقولِ طباطبائی :-

"یہ حرکت (بادشاہ کی) زیادہ تر موجب اعتقاد ہوئی اور عموماً لوگوں پر اس کی مکاری نے اثر بہم پہونچایا۔"[4]

فرخ سیر کے بعد محمد شاہ (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) کا دور آیا تو اسے عیش و عشرت کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اپنے ۲۰ سالہ دورِ حکومت میں اگر کبھی وہ محل سے باہر نکلتا تھا

---

[1] برائے تفصیل سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج ۲ - ص ۶۰ - ۶۲ -

[2] ایضاً ص ۶۲ - [3] ایضاً ص ۶۳ - ۶۴ - آخر میں اس گروہ کے کچھ افراد مرشد آباد چلے گئے تھے، جہاں اُن کو نواب کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور سرکار کی طرف سے بسر اوقات کے لئے وظیفے ملتے تھے۔ وہ لوگ علاحدہ ایک محلے میں سکونت رکھتے تھے۔ برائے تفصیل دیکھئے تاریخ عبد القادر خانی ۱/ ص ۱۵۵ - [4] سیر المتاخرین۔ (اردو ترجمہ) ج ۲ - ص ۸۸ -

تو لونی پارک میں سیر و تفریح کے لیے یا گدھو کا میلہ دیکھنے کے لیے[۱] شاکر خان کا بیان ہے کہ اس دور میں فسق و فجور اور لہو و لعب کا یہ عالم تھا کہ اسے قلم بند کرتے ہوئے قلم کی زبان شق ہوتی ہے، اور اس کے بیان سے زبان کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اخلاقی زبوں حالی کا یہ حال تھا کہ تمام فرقے اور رسالے لال قلعہ کے دروازے پر ایک گدھے کا بچہ اور ایک کتیا باندھ کر دربار میں جانے والے امیروں سے کہتے تھے کہ وہ اُن جانوروں کو سلام کریں کیوں کہ اُن میں سے گدھا نواب بہادر تھا اور کتیا نواب قدسیہ (والدۂ محمد شاہ)۔[۲]

تاریخ محمد شاہی کے مصنف نے اس دور کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسجدیں برباد اور خطیب بے حال تھے، علماء اور فضلاء پژمردہ، خانقاہیں ویران تھیں اور شریعت زوال کی طرف مائل تھی۔[۳] آخر میں یہ مصنف لکھتا ہے:۔

"بنیاد اسلام سست شد و عمارات کفر استحکام پذیر فت"[۴]

---

[۱] مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج ۱۔ ص ۶۔ اس کی وجہ اظفری نے یوں بیان کی ہے کہ محمد شاہ نزول الماء کے مرض میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے وہ گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتا تھا۔ لکھنو کے ایک زین ساز نے ایک مخصوص زین بنائی تھی۔ اسے بادشاہ نے بہت انعام دیا تھا۔ اُس زین کے تیار ہونے کے بعد وہ کبھی کبھار گھوڑے کی سواری کرنے لگا تھا، ورنہ عام طور پر پالکی میں سوار ہوتا تھا۔ واقعات اظفری۔ ص ۱۵۰ [۲] تاریخ شاکر خانی (ق) ص ۳۲۔ ب ۔ ۳۳۔ الف [۳] تاریخ محمد شاہی (ق) ص ۱۹ الف و ب ۲۵ الف و ب [۴] تاریخ محمد شاہی۔ (ق) ۲۸ الف۔

محمد شاہ کے دور میں شاہ جمال نامی درویش نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، وہ کھلے بندوں شراب پیتا تھا، ہزاروں آدمی اس کے معتقد ہو گئے تھے۔[1]

محمد شاہی دربار کا ذکر کرتے ہوئے حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ:-

اب ہم محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں آتے ہیں جو انتہائی درجے کا ملکی اور مذہبی پہلو سے تاریک تر اور ناپاک تھا۔ شریعتِ محمدی پر مضحکہ خیز نکتہ چینیاں میں دربار میں ہوتی تھیں اور مے نوشی کی لذتوں اور سرخوشانہ اور بیہودانہ حالتوں کے آگے احادیثِ نبوی پر قہقہے اڑائے جاتے تھے۔۔۔۔ وہ ڈوم ڈھاری جو محمد شاہ کے ارکانِ دولت تھے اور مذہبی نقلیں کرتے تھے، اور ان نقلوں میں خدا اور اس کے پاک نبی کی توہین کی جاتی تھی۔"[2]

چنانچہ ایک بار محمد شاہ کے دربار میں گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ جمنا ندی جو پہلے قلعے کی دیوار سے متصل بہتی تھی، اب دور کیوں ہٹتی جا رہی ہے؟ ایک عالمِ دین نے کہا کہ "جہاں پناہ یہ فسق و فجور اور گناہوں کا اثر ہے جو قلعہ میں کئے جاتے ہیں" تو بادشاہ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو ہم یہ حرکتیں جمنا کے اس پار جا کر کریں تا کہ ندی پھر اس طرف کھینچنے لگے۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ (۱۷۴۸ء-۱۷۵۴ء) تخت پر بیٹھا، ایک میل لمبا چوڑا اس کا زنانہ محل تھا، ہفتوں تک شاہی محل سے باہر نہ نکلتا تھا، تاریخ احمد شاہی کا مصنف کہتا ہے کہ

---

[1] تاریخ ہندی - ص / ۱۹۴ - ۱۹۵ - [2] حیاتِ طیبہ - مرزا حیرت دہلوی - (مطبع فاروقی دہلی) ص ۱۰-

"چوں احمد شاہ . . . . . از طفولیت تا این وقت کہ سن عمرش
بہ بست و یک سالہ رسیدہ بود در میان عورات حرم می گذرانید . . .
. . . و علاوہ آں فراہم آمدن اسباب انتعاش در ہنگام جوانی چوں ہر یکی
ازیں فریق برائے گرمی بازار بحضور آں نونہال گلشن خلافت وجہاں
داری آمدہ بکسب کار خود مشغول شدند۔ مزاج بادشاہ بلہو و لعب
مائل شد" [1]

احمد شاہ کو فنِ موسیقی میں پوری دسترس حاصل تھی۔ خلوت کی رقص و سرود کی محفلوں کا اختتام خود وہ اپنا گانا سنا کر کرتا تھا۔ بقول ظفری:-

"(آہ) مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب کہ دلّی کے باکمال استادوں
سے کیسے کیسے گانے سننے میں آتے تھے، خاص کر ایک بار خلوت میں احمد شاہ
بن محمد شاہ فردوس آرام گاہ اور شاہجہاں ثانی یعنی محی الملۃ ابن کام بخش
اور شاہزادہ محمد ہمام بخش بن شہزادہ محمد کام بخش، موصوف سے ایسے
ایسے گانے سُنے ہیں کہ پھر اُن کی جیسی رس بھری اور دل گداز آوازیں
آج تک ہمارے کانوں کو سننے میں نہیں آئیں" [2]

شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) بن عالمگیر ثانی نے اپنی زندگی کا

---

[1] تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص ۱۳ ب۔ [2] واقعاتِ اظفری۔ ص ۱۸۶-۱۸۷۔ [3] ایک مصنف نے شاہِ عالم بادشاہ کو اس وجہ سے دین دار بتایا ہے کہ وہ خواجہ میر درد کی مجلسِ سماع میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتا تھا۔ حالانکہ مجلسِ سماع میں شرکت کرنا ایک فیشن تھا۔ کسی شخص کے دین دار ہونے یا نہ ہونے سے اس بات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مرتب کی

(بقیہ حاشیہ بر ص ۲۹۴)

شب بابت اپنی اس رباعی میں پیش کیا ہے۔

صبح تو دم سے گذرتی ہے　　　شب دلآرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　　اب تو آرام سے گذرتی ہے[1]

بادشاہ کے حرم کا ذکر کرتے ہوئے پولیر رقمطراز ہے کہ اس کے محل میں پانچ سو [۵۰۰] سے زائد عورتیں تھیں اور اسے عورتوں سے بے حد رغبت تھی[3]

کنور پرتھم کشور فراقی نے شاہ عالم کے بڑھاپے کے زمانے میں عزیزن نامی کنجنی سے اس کے عشق کا ذکر کیا ہے، اس کا بیان ہے کہ بادشاہ اس حد تک اس کا گرویدہ تھا کہ اگر وہ کبھی روٹھ جاتی تو اس کے منانے میں ہر طرح کی ذلت و رسوائی برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

"شب تب بسبب کوفت در بخش که از خفگی با عزیزن ملکهٔ عالم که معشوقهٔ خلیفهٔ روزگار است و جہان پناہ را بوی عشقی پیدا گردیده، و سالی چند است که او بوضع لولیان اوقات بسر کردی۔ و از یاری بخت منظور نظر گردیده، و مشکوی اقدس جا یافته۔ بوجود مقدس شده مجرائیان بار یاب گشتند، از بے قراری و غلبهٔ عشق قلق بمزاج

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹۳) مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں بلا تفریق مذہب و ملت ہندوستانی سماج کا ہر فرد محفلِ سماع میں شرکت کرتا تھا۔ لہٰذا ایسے اعمال کے حوالے دے کر بادشاہوں کی دینداری ثابت کرنے کی کوشش پر تعجب ہوتا ہے۔

[1] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) ص ۲۰۔ [2] وقائع عالم شاہی، ص ۱۲۱۔

Shah Alam II And His Court: P 70 [3]

وباج بود گاہی بجرم سرا رفتہ، اگرچہ تکلم از طرفین نمی شد، بدیداری تسلی خاطر فاتری نمودند وگہی بیروں خرامیدہ بابر اور انش بامیدیم مخاطب می شدند بعلہ و فعلہ ادمی فرمودند باد بفہمانند کہ براہ آید"

اس مایوسی اور یاس کے عالم میں بادشاہ ذیل کے شعر پڑھا کرتا تھا۔

مُردم از حسرت، بہ پیغامے دلم را شاد کن۔
ای کہ ہیگفتی ا۔ د فراموشت نسازم، یاد کن

ان منتوں اور سماجتوں کے بعد بھی اگر وہ معزور وطنّاز راہ راست پر نہ آتی تو بدرجہ مجبوری بادشاہ سلامت یہ شعر لکھ کر اس کی خدمت میں بھیجا تے۔

دیکھیو پھر کبھو ایدھر کو جو کرتا ہو نظر
دیدہ بازوں کے تیہاں سر کو جدا کرتے ہیں[1]

دہلی کے بازاروں، قہوہ خانوں اور چنڈو خانوں میں قلعہ معلّٰی کی ان داستانوں کا چرچا ہوتا تھا، لوگوں کی نظروں سے بادشاہی وقار تو گرتا ہی تھا، عوام کے اخلاق پر بھی اس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔

اخلاقی کمزوریوں نے بادشاہ کو دروغ گو اور دروغ پسند بھی بنا دیا تھا۔ خود بھی بڑھا چڑھا کر بات کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے فراقی کا بیان غور طلب ہے:۔

"سبحان اللہ سخنانی کہ از صدق معرا باشد و درصد یکی راست بنود"

---

[1] وقائع عالم شاہی۔ ص ۱۱۶۔ ۱۱۷۔

در بزم شاہی بل بر زبانِ ظلِ الٰہی بگذرد، حق این است کہ بادشاہ عالم پناہ خود از کذب و دروغ اجتناب ندارد۔ مردم مجبور اند۔ الناس علی دین ملوکہم، اگر دروغ گوئی و ہرزہ درائی را بگیرند و بسزا رسانند، کرا بارا است کہ سخن ناراست بر زبان آرد"۔ ۱؎

شاہ عالم ثانی ہندوستانی تہواروں میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ دیوالی دسہرہ، ہولی اور بسنت کے تہواروں کا بڑے جوش و خروش سے اہتمام کرتا۔ اور سرستی اور گوردھن پوجن کے مراسم بھی بڑی خوش اعتقادی کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ ۲؎ مختصر یہ کہ کوئی دن اور رات ایسی نہ گذرتی تھی جب دربار معلی میں کوئی جشن منعقد نہ ہوتا ہو۔ ۳؎

طبقۂ امرا کی حالت : یہی حال اٹھارھویں صدی کے امیروں کا تھا۔ یہ طبقہ فیاضی اور عیاشی کے مشاغل میں بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا۔ ہوجیز (HODGES) کا بیان ہے کہ مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں امرا کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قیدی عورتوں کو اپنی حرم سراؤں میں جمع کرنا سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے گوشے گوشے اور بالخصوص وادیٔ کشمیر سے سیکڑوں کی تعداد میں عورتیں حاصل کی جاتی تھیں۔ کیوں کہ کشمیری عورتوں کا حسن مشہور تھا۔ ۴؎

۱؎ وقائع عالم شاہی - ص ۹۲ - ۹۳ - نیز ص ۸۸ ۲؎ برائے تفصیل نادرات شاہی۔
۳؎ برائے تفصیل - بزم آخر، نیز روزنامچہ شاہ عالم ۴؎ HODGES'S TRAVEL PP 21-22

میر نے بھی اپنے عہد کے امیروں کی عیاشی اور اعمالِ خبیثہ کا ذکر کیا ہے۔

لال خیمہ جو ہے سپہر اساس — پائیں ہیں رنڈیوں کی اسکے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس — رعب کریجے یہیں سے قیاس
قصہ کوتہ رئیس ہے عیاش [1]

قزلباش خاں امید۔ ایرانی نژاد، عہد محمد شاہی میں ہندوستان میں وارد ہوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے پنج ہزاری کے منصب پر فائز ہوگیا اسکی عیش و عشرت نے رکاکت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ عبدالحیٔ تاباں کے ذکر میں قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے :۔

"آخرہائے روز امردانِ شیریں ادا و سادہ رویانِ ملاحت (آما) در خانہ وے بہ روز یور آراستہ و پیراستہ می شدند و حسب الطلب امرائے قزلباش در محافہا نشستہ بشب مہمان می رفتند" [2]

قطب الملک عبداللہ خاں کی طبیعت عیاشی اور جنسی تلذذ کی طرف بے حد مائل تھی۔ اس کے محل سرا میں بے شمار عورتیں تھیں۔ خافی کا بیان ہے کہ سید عبداللہ خاں نے لاتعداد عورتیں جمع کر رکھی تھیں۔ اس پر بھی اس کو تشفی نہ ہوتی تھی۔ اور ایک موقع پر شاہی حرم سرا کی دو عورتیں اس نے اپنے حرم میں داخل کر لی تھیں [3]

---

[1] کلیاتِ میر۔ ص ۳۹۹۔

[2] مجموعۂ نغز۔ ج ۱۔ ص ۱۳۲ ۔

[3] خافی خان (فارسی) ج ۲۔ ۸۲۱ ۔ ۸۲۲ ۔

درگاہ قلی خان نے میر کلو جو نواب وزیر الممالک قمرالدین خاں کی سرکار میں داروغہ ارباب طرب تھا، کی مجلس یازدم کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

چوں وزیر الممالک تجربۂ میلے دارند و با اہل حسن وجمال و اصحاب غنج و دلال از انجا کہ توجہ خاطر این عزیز بتقدیم حسن خدمات معزز و محترم است و در تلاش مردم حسین [illegible] وارد و ہر روز پیکرے تازہ فسوں تسخیری کند از دیگر مصاحبانش مکرم خانہ اش از ہجوم جلوۂ گل رخان گلشن آباد است و کاشانہ اش از ورود مہ جبیناں آشیانۂ پری نژاد ہر جا کہ گل وخاریست مائل صحبت اوست و ہر کسے کہ نشہ حُسنے دارد شیفتۂ بزم سراپا[1]

امیرالامراء حسین علی خاں رقص و سرود میں بے حد روپیے صرف کرتا تھا۔ اور بعض مرتبہ تو اس کی آمدنی سے زیادہ اخراجات کا تخمینہ ہو جاتا تھا[2]۔ ایک مرتبہ روشن الدولہ طرہ باز خاں نے امیرالامراء خانِ دوراں، سربلند خاں اور سید سعادت خاں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ اور اپنے مہمانوں کی تواضع کے لیے محفلِ رقص و سرود کا بھی اہتمام کیا۔ اس محفل کا ذکر کرتے ہوئے قاضی مرتضیٰ نے لکھا ہے۔

"...از جشن طوائفاں آں چہ نویسد، گوئی خیل پری بودہ یا حوران بہشتی۔ بر اسے ربودن ہوش مردم از آسمان فرود آمدہ بودند و خوبی نغمہ و رقص از تحریر بیروں بود"[3]

---

[1] مرقع دہلی۔ ص۔ ۳۳۔ ۳۴۔ [2] مآثر الامراء (فارسی) ۱۔ ص ۳۲۰۔
[3] حدیقۃ الاقالیم ص ۱۵۴۔

مختصر یہ کہ اس عہد کے امیروں کی اخلاقی اور مذہبی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شاہ ولی اللہ اس گروہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں :۔

"اے امیرو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہے اُن کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ اُن میں بعض بعض کو کھاتے، اور نگلتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی"[۱]

صوفیاء خام اور علماء سو کی حالت | چونکہ اس زمانے میں حالات کے زیر اثر لوگ تصوف کے دامن میں سکون ڈھونڈھتے تھے اور خارج کے ہوش ربا حالات سے پناہ لینے کے لئے خانقاہوں کی طرف بھاگتے تھے، اس لئے تصوف کو بھی بڑی حد تک لوگوں نے "کاروبار" بنا رکھا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی، شاہ فخر الدین دہلوی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسی اہم شخصیات تھیں وہیں کچھ عقبیٰ فروش اور دنیادار صوفی بھی اپنی دکانِ تصوف "کھولے بیٹھے تھے۔ چنانچہ نالۂ عندلیب کے مصنف نے ایک صوفی کا حال کسی رقاصہ کی زبانی

---

[۱] الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص ۱۳۳-۱۳۵، ۱۴۲ نیز دیکھئے سیاسی مکتوبات۔ ص ۳۳-۳۴۔ حجۃ اللہ البالغۃ سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲، ۶۰-۲۹۰۔

بیان کیا ہے :-

"میں ایک بڑی مدت سے مفلس بوالہوس کے حالات سے بخوبی واقف ہوں۔ اُس کی تمام باتیں ابلہ فریب ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ شراب نوشی بدکاری کے علاوہ شہوت پرستی کا بھی شکار رہا ہے اور لذاتِ نفسانی ودنیا کا مرتکب ہوتا ہے، چوں کہ اُس نے بہت سی بازاری عورتوں سے بدکاری کی ہے لہٰذا وہ مرض آتشک میں گرفتار ہے"[1]

میر نے ذیل کے اشعار میں صوفیائے دنیادار کی عیاشی و ہوس پرستی کا نقشہ پیش کیا ہے ؎

شیخ کو اس بھی سن میں ہیگی ہوس تنگ پوشی سے چولی جائے جس
ہوئے گا سن شریف ساٹھ برس دانت ٹوٹے گیا ہے کلّہ دھنس
دیکھ رنڈی کو یہ چلے ہے چال

جامے کو خوب سا چناتے ہیں خال رخسار پر بناتے ہیں
مہندی بھی پتلی سی لگاتے ہیں ناز کرتے قدم اُٹھاتے ہیں
دیکھا کرتے ہیں آرسی میں جمال

دل میں دُھن ہے جو عیش و عشرت کی پوچھتے ہیں دوائی شہوت کی
باتیں ہیں رنڈیوں کی صحبت کی دیکھتے ہیں کوئی کتاب حکمت کی
کرتے ہیں معجنیں کا استعمال

محوِ رعنائی کتنے ہیں اللہ مسی سے کرتے ہیں ہونٹے سیاہ

---

[1] نالۂ عندلیب۔ ص۔ ۳۱۵۔

رکھتے ہیں سر پہ اب ہمیشہ کلاہ　　شانہ سے کام ہے گہہ دبے گاہ
کپڑے نارنجی سر پہ اودی شال
چہرہ چرکیں لباس تنگ معاش　　ساتھ رکھتے ہیں ایک موئے تراش
کھینچ لیتے ہیں گاہ و گہہ منقاش　　ہر سر مو پہ اس سے ہے پرخاش
لوگ کہتے ہیں شیخ ہیں چنڈال[1]

اس زمانے کے دنیادار مشائخ نے کشف و کرامات کو وسیلۂ روزی بنا رکھا تھا۔ اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو طرح طرح سے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواجہ میر درد نے رسالۂ نالۂ درد میں ایسے صوفیاء کو مخاطب کرکے اُن کی مذمت کی ہے۔

"دکان کشف و کرامات مکشا، و چوں اہلِ دعوت ہمت وا برین امور صرف منما کہ این کار پیشۂ مزدوران دنیا طلب است نہ شعار شما قانونِ تماشای رب عجائب نمائی، این ہمہ عاملان دعا باز محض شعبدہ بازی است و فلیتہ سوختن و حاضرات کردن صرف فریب سازی خدارا اند کہ حیا ہم باید و این ہمہ ذوفنونی نشاید۔ بیچارہ اہلِ غرض مجنون می بودند و بہ چنین صنائع مفتون می شوند"[2]

انہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے عوام کو ایسے مشائخ کے جال میں پھنسنے سے متنبہ کیا تھا۔ انھوں نے عوام کو مخاطب کرکے کہا۔

"اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہئے۔ اور کبھی

---

[1] کلیات میر ص ۹۰۲ - ۹۰۰۰ [2] رسالۂ درد طبع شاہجہانی بھوپال ص ۳۰

اُن کا مرید نہ ہونا چاہیے، کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات و رسومات میں مبتلا ہیں، شہرت، رجوع خلق اور مریدوں کی کثرت دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیے، اور نہ اُن کی کرامتوں سے دھوکا نہ کھانا چاہیے [1]

اس زمانے کے علمار کا حال توصوفیوں سے بھی زیادہ بدتر تھا۔ انھوں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات کو فراموش کر دیا تھا۔ جاہ و حشمت، دولت و ثروت کی تحصیل ثروت کا بہت آسان ذریعہ تھے، لہٰذا انھوں نے طرح طرح سے رشوت خوری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

مآثر الامرار کے مصنّف نے لکھا ہے:۔

"این امرا جلیل القدر دین بدنیا فروشاں سخت آسان گرفتہ اند۔ زرہا بر رشوت خروج می کنند کہ تا بابطال حقوق مردم صدچنداں ستانند۔ نگاہ داشتہ مہر اند راحلال تر از شیر مادر می دانند از قضات ارنی قصات چہ تواں گفت اکثر بس علم ایشاں نصیب اعدا است و گفتہ دلیسپا ندیہ و گفتہ زمینداران، کتاب و شرع آنہا است۔ ہرگاہ در شان قضات بالظلم وعل حدیثے وارد شدہ کہ (از سہ قاضی یکے بہشتی است) و خواجہ محمد پارسا (قدس سرہٗ) در فصل الخطاب گوید کہ آں قاضی بہشتی ہم مگر قاضی بہشت باشد) اندازکا

---

[1] وصیت نامہ شاہ ولی اللہ (اردو ترجمہ) ص ۵، نیز ملاحظہ ہو الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص ۱۳۶-۱۳۷

گمراہی رضلالت ایں قوم کہ کمتر از جہانی اند کہ تواند گرفت [1]

طباطبائی نے ان رشوت خور اور گمراہ کن قاضیوں کی بڑی مذمت کی ہے۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی غریب و مفلس مسلمان مرجاتا اور نائب قاضی نہ آتا تو لوگوں کا عوام کا عقیدہ تھا کہ ایسی صورت میں میت کی روح گھر سے باہر نہ جائے گی اور اگر اس شخص کے ورثہ سے وجہ معینہ باعث کم مقدوری کے ادا نہ ہو سکے تو مع اہل و عیال کے اس قدر نجس اور ناپاک سمجھا جاتا تھا کہ اس کے ہم پیشہ وردں کو اس کا خورد و نوش گوارا نہ ہوتا۔ اور حد یہ تھی کہ اُسے آگ اور پانی تک نہ دیتے تھے۔ تب وہ مجبوراً چوری ڈکیتی یا قرض وغیرہ سے زر حاصل کرکے قاضی کی خدمت کرتا۔ اور بڑی مشکل سے ذلت سے نجات پاتا۔ یہی حال ختنۂ پسر اور نکاحِ دختر میں تھا کہ سنِ بلوغ کو پہونچ کر بھی برسوں نکاح اور ختنہ سے انھیں محروم رکھا جاتا تھا۔ یہ رسومات اُس وقت تک عمل میں نہ آسکتی تھیں جب تک پہلے قاضی کے نذرانہ کا انتظام نہ ہوجاتا۔ اسی طرح مقدمات میں بھی قاضی رشوت لے کر حق کو باطل اور باطل کو حق کردیتا تھا [2]

یہی حال صدر الصدور کا بھی تھا۔ رشوت خوری اس کی زندگی کا ایک واحد مقصد بن گیا تھا [3]

شاہ ولی اللہ نے علماء رسوم کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ انھیں یونانیوں کے علوم میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا

---

[1] آثار الابرار (فارسی) ص ۱۸۱ ، ص ۲۲۶ [2] سیر المتاخرین (اُردو ترجمہ) ج ۲ - ص ۵۲۲ - ۵۲۳ - [3] ایضاً ج ۲ - ص ۵۲۳ - ۵۲۴ -

چاہیے اور مسلمانوں میں اُس تعلیم کا پرچار کرنا چاہیئے۔ انھوں نے اُن کو مخاطب کر کے کہا:-

"جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف و نحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو۔ علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو۔ لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں، اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔"[1]

عام مسلمانوں کی دینی حالت: جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بادشاہوں، امیروں، عالموں اور صوفیوں کی بے راہ روی سے عوام بڑی حد تک اثر پذیر ہوتے تھے اور اُن کی عیش و عشرت کے مہلک جراثیم جھونپڑوں تک اپنا کام کرتے تھے۔ چونکہ اقتصادی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور عوام اقتصادی زبوں حالی کے شکار تھے لہذا اُن کی حالت کسی معیاری "عیاشی" کی انھیں اجازت نہ دیتی تھی تو اس کا اظہار امرد پرستی، نشہ بازی، میلے ٹھیلے، عرس اور سطحی قسم کے لہو و لعب کی شکل میں ہوتا تھا جن میں مبتلا ہو کر وہ کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

امرد پرستی: زیرِ نظر عہد کے عوام و خواص میں امرد پرستی پورے عروج پر تھی۔ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جہاں "امارد نوخطاں توبہ شکن زہاد" موجود نہ ہوتے ہوں

---

[1] الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص ۱۳۱۔

دہلی کی سوسائٹی میں امرد پرستی ایک فیشن سمجھا جاتا تھا۔ میر کی شاعری پر بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن یہ عیب اس دور میں اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ اُسے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ میر تقی میر نے اپنے والد محمد علی کی امرد پرستی اور اپنے چچا سید امان اللہ کے ایک پسر روغن فروش پر عاشق ہو جانے کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کیا ہے[۱]۔ سب سے زیادہ حیرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ملفوظات میں یہ عبارت دیکھ کر ہوتی ہے کہ

"درذکر امرد پرستی حضرت مرزا مظہر جان جاناں ارشاد شد کہ حالا دارالضرب امارد خانقاہ فخر الدین شد" ہم تو ڈھل گئے "یعنی ما از کار رفتیم۔

اس ذہن کا اثر اردو شاعری پر بھی بہت گہرا ہوا۔ اور وہ آج اس کے لیے بدنام ہے۔

میر جیسا باکمال شاعر یہ کہتا بھی کہتا تھا۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں[۲]

آخر شہر میں یہ وبا بری طرح سے پھیل چکی تھی۔ لوگ لونڈوں سے عقد کرنے لگے تھے۔

قاضی مرتضیٰ کا بیان ہے کہ :-

"حتیٰ کہ با امردانِ نوخیز خوش شکل میل بنکاح می کردند و رسم امت لوط تازہ شد"[۳]

۱؎ میر کی آپ بیتی۔ ص ۴۰ تا ۴۴ نیز ص ۵۹۔ ۲؎ میر کی شاعری میں امرد پرستی کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مضمون مشمولہ "تحقیقات"۔ ۳؎ حدیقۃ الاقالیم ص ۱۳۹، مرشد آباد میں امرد پرستی کے متعلق مزید تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو سیر المتاخرین (فارسی) ج ۳۔ ص ۸۰۰۔

مرقعِ دہلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کا کوئی میلا ٹھیلا، بزرگان دین کے اعراس، بازار اور تفریحی مقامات ایسے نہ تھے جہاں تفریح اور عیاشی کے سوا کوئی دوسرا شغل ہوتا ہو،

مجنوں نانک شاہ کا تکیہ جمنا ندی کے کنارے ایک بہترین تفریح گاہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ مقام آج بھی مجنوں کا ٹیلا نام سے مشہور ہے۔ دہلی کے عوام وخواص وہاں برائے تفریح جایا کرتے تھے۔ درگاہ قلی خان کا بیان ہے:۔

"ہر روز وہاں ایک عجیب وغریب مجمع ہوتا ہے۔ بے شمار تفریح باز عورتیں میانہ میں سوار ہوکر اس مقام پر آتی ہیں۔ اور کسی درخت کے چھایہ تلے سواری چھوڑ کر تفریح میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اور تنہائی میں اپنے عاشقوں سے ملاقات کرتی ہیں۔ مقاصد مستورات اظہار کر کے اپنی جنسی خواہش رفع کرتی ہیں۔"[۱]

کسل سنگھ نامی ایک امیر نے ایک محلہ آباد کیا تھا جو کسل پورہ کے نام سے موسوم تھا۔

درگاہ قلی خان نے اس مقام کا بیان یوں کیا ہے:۔

"پورہ در نہایت تقطیع وتکلف احداث کردہ واز ہر قسم طوائف وفواحش بازاری کہ عبارت از آں زادیہا باشد آمادہ نمودہ وار باب مناہی ومسکرات را بجاہا یت خود جا دادہ۔ کثرت جمعیت محتسب در حوالیش راہ ندارد وقدرت احتساب در خود نمی یابد ودہر راست ہاش

---

[۱] مرقعِ دہلی۔ ص ۱۲۔

— جلباس زنگار رنگ خود را بروم عرض می کنند و در جسم ہر کوچہ بہ ساعت
میانجی اشخاص را تکلیف می نمایند ہوایش شہوت آمیز است و فضایش
باہ انگیز۔ بہ تخصیص در حوالی شام طرفہ مجمعے می شود و عجب ہنگامہ در ہر
مکانے رقص است و در ہر جا سرود۔ ارباب فسق بے مخالف و مزاحمت سری
دراں کارخانہ کشیدہ و بحیل چنیں خیارک و سوزاک دامنِ شہوت را لبریز
کنند و چندے بخمیازہ حسرت گذرانیدہ مشغول می شوند۔ غرض طرفہ کار
گاہے و عجب تماشا گاہ است"[1]

عرس[2] اس زمانے کی معاشرت میں اجتماعی تفریح کا سب سے اہم موقع عرس" تھا۔ درگاہ قلی خان نے مرقع دہلی میں ان عرسوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میر نے نکات الشعراء میں سید حسن رسول نما[3] کے عرس کا ذکر کیا ہے قزلباش خان امید کے بارے میں لکھا ہے:۔

" داخل ذیل امراء بود در ہر سیر و تماشا می رفت و صحبتہا داشت،
چناں چہ یک روز در عرس حسن رسول نما صاحب قدس سرہ العزیز
بندہ نیز بہ تحریکِ یارانِ موافق رفتہ بود و او ہم تشریف می داشت
چوں مرا از دور دید، گفت کہ خوش باشد کہ من ہم درین ایام دو شعر
ریختہ موزوں کردہ ام بشنوید"[4]

---

[1] مرقع دہلی۔ ص ۲۴۔ [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مرقع دہلی۔
ص ۱۰۔ ۱۹۔ [3] خافی خان (فارسی) ج ۲۔ ص ۵۵۲۔ ۵۵۳۔
[4] نکات الشعراء (طبع ثانی) ص ۷۔

عرس خلد منزل کی کیفیت درگاہ قلی خان نے ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

" معاشران با محبوبان خود در گوشہ و کنار مدست بذل و عیاشی در کوچہ و بازار ہجوم شتبہیات نفسانی در رقص حل مے خواران بے اندیشہ محتسب در تلاش سیہ مستی و شہوت طلبان بے داہمہ مزاحمت سرگرم شاہد پرستی "[1]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مرزا عبد القادر بیدل کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ اور اس میں شعر خوانی کی محفل بھی منعقد ہوتی تھی ان عرسوں میں قوالیاں، طوائفوں کے مجرے اور لنگر کی تقسیم ہوتی تھی۔ خرچ زیادہ تر امرا برداشت کرتے تھے۔ غرض اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔

چھڑیاں: مزار پرستی کے سلسلے میں مسلمانوں نے چھڑیوں کی رسم بھی اختراع کی تھی کچھ دن پہلے عقیدت مند اُن کے نام کے جھنڈے نکالتے اور شہر کی گلیوں میں پھرتے اور آخر میں اُن چھڑیوں یا جھنڈیوں کو لے کر اُن بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے، اُن میں خاص طور پر خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، غازی میاں (سالار مسعود بہرائچی) سرور سلطان، اور شاہ مدار کی چھڑیاں مشہور ہیں[2]

میر حسن دہلوی نے جب دہلی سے لکھنؤ کو کوچ کیا تو اتفاق سے وہ زمانہ

---

۱ مرقع دہلی۔ ص ۱۲۔ ۲ تاریخ چہار گلشن محمد شاہی (ق) ص ۳۶ ب۔ الف۔ البلاغ المبین (اردو ترجمہ) ص ۱۰۰ نیز ارشاد الطالبین۔ ثناء اللہ پانی پتی۔ ص ۱۰۲۔

شاہ مدار کے عرس کا تھا۔ اور عقیدت مندوں کے گروہ دہلی سے مع چھڑیوں کے روانہ ہو رہے تھے۔ میر حسن بھی اُن کے ہم سفر ہوئے، اُس نے اس قافلہ کا تفصیلی ذکر مثنوی گلزارِ ارم میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مکن پور کو چھڑی چلتی تھی واں سے — اٹھے ہم ساتھ اُس کے اس مکاں سے
مدار اس قافلہ کا تھا چھڑی پر — چلے ہم واں چھڑیوں ساتھ مل کر
زبس میوات کا اکثر تھا عالم — عجائب ہوشاں تھیں اس میں باہم

چوں کہ ان میلے ٹھیلوں میں مستورات بھی برابر کی شریک تھیں لہٰذا مردوں کے لیے یہ مواقع تفریحی مشاغل کے سامان بہم پہنچاتے تھے۔

کوئی پردے سے تھی چہرہ دکھاتی — کوئی آواز کچھ گا کر سناتی
کوئی چلتی اُتر اٹکھیلیوں سے — کوئی بیٹھی ہی جی لیتی دلوں سے
جہاں ملتا کہیں پانی کا منبع — وہاں ہوتا پری زادوں کا مجمع
کنوئیں پر یوں نظر آتا ہر اک ماہ — کہ جوں یوسف کھڑا ہو برسرِ چاہ
کوئی لیتا مٹھائی اور کوئی پان — کوئی جاتا کسی کے پاس انجان
کوئی آنچل سے اپنا منہ چھپاتی — کوئی پردہ اٹھاتی اور گراتی[1]

بھلا قبر پرستی کا بازار گرم تھا۔ نذر و نیاز۔ حاجت روائی کی منت، مشکل کشائی کے لئے نذر و نیاز ماننا۔ قربانیاں پیش کرنا، چڑھاوے چڑھانا، نہایت تضرع اور آزاری کے ساتھ اُن کو حاجت روا سمجھ کر حاجتیں مانگنا، طواف کرنا، قدم بوسی، عرضیاں لکھ کر لٹکانا، شیرینی، پھول، اور

---

[1] مثنویاتِ میر حسن دہلوی (نول کشور ۱۹۴۵ء) ص ۱۳۶۔ ۱۳۹۔

خوشبوئیں چڑھانا وغیرہ رسومات ادا کی جاتی تھیں[1]۔

توہم پرستی۔ اس دور کے مسلمانوں میں توہم پرستی کو مذہبی درجہ حاصل تھا۔ راجا سے پرجا تک ہر شخص اس مرض کا شکار تھا۔ خواجہ میر درد کا بیان ہے کہ:

"اینجا ہر کس بتوہم خاص گرفتار است"[2]

نجومیوں اور رمالوں پر لوگوں کو بہت عقیدت تھی، ہر بڑے آدمی کے خاندان سے کوئی نہ کوئی نجومی وابستہ ہوتا تھا۔ دہلی، آگرہ اور دوسرے بڑے شہروں کے بازاروں میں سڑکوں کے کنارے یہ لوگ اپنی دکان لگا کر بیٹھتے تھے، اور ان کے گرد لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے دربار سے مبشر خان اور منجم خان منسلک تھے[3]۔ لاولد اشخاص رمالوں، نجومیوں اور برہمنوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اولاد ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں معلومات حاصل کرتے تھے[4]۔ تخت نشینی اور جنگ کا وقت بھی نجومی متعین کرتے تھے[5]۔ جب بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا تو سپند مشک جلایا جاتا تاکہ اس پر جادو ٹونے کا اثر کارگر نہ ہو[6]۔ جب کبھی بادشاہ سفر سے واپس آتا تو محل سرا کے دروازے پر نظر اتاری جاتی، نثار کر روپے غربا میں تقسیم ہوتے تھے[7]۔

---

[1] برائے تفصیل۔ البلاغ المبین۔ ص ١٥، ٢٥١۔ [2] رسالہ دردِ دل۔ ص ١٠٠۔ [3] تاریخ شاکر خانی (ق)، ص ١١٢ ب۔ [4] مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ١٦-١٩۔ [5] سیر المتاخرین (فارسی) ج ٢۔ ص ٢٤٣۔

[6] مراۃ الاصطلاح (ق)، ص ٤٤ ب، ٥٤ الف۔

[7] سیر المتاخرین (فارسی) ج ٢۔ ص ٢٤٣۔

شادی بیاہ کے موقع پر نہ جانے کتنی ایسی رسمیں ادا ہوتی تھیں جن کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ صرف توہم پرستی سے تھا۔ لڑکے اور لڑکی کے مکانات کے دروازے پر تیل اور چونے کے نشانات بنائے جاتے۔[1] ماہ صفر کے ۱۳ دن منحوس مانے جاتے تھے۔ عام طور پر منگل اور جمعرات کو بھی منحوس دن تصور کیا جاتا تھا۔[2]

عورتیں بالخصوص توہم پرست تھیں۔ جس زمانے میں چیچک کی وبا پھیلتی تو مالن کو پھول لے کر بلایا جاتا دروازے پر آم کے پتے لٹکائے جاتے۔[3] اس موقع پر سیتلا دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔

معمولاتِ مظہری میں لکھا ہے:۔

"اکثر زنان بواسطۂ کمال جہال کردارند بایں استمداد ممنوع
مبتلا اند و طلب دفع بلیہ ازیں اسمائے مسمیٰ می نمایند و بادای مراسم
شرک و اہل شرک گرفتار اند۔ علی الخصوص ایں معنی از نیک و بد ایشاں
در وقت عروض مرض جدری کہ در زبان ہندی سیتلہ معروف است و مشہود و
محسوس است، کم زنی باشد کہ از دقائق ایں شرک خالی بود و برسمی
از رسوم آں اقدام نہ نماید"۔[4]

لڑکوں کے سر پر شاہ مدار اور دوسرے صاحبِ کرامات بزرگوں کے نام کی چوٹیاں رکھی جاتی تھیں تاکہ اس کی برکت سے وہ بچہ باحیات رہے اور

---

[1] تقویت الایمان۔ ص ۷۷، مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۲۰۳-۲۰۴ [2] تقویت الایمان۔ ص ۷۱، ۱۸۷ [3] احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ (قلمی) ص ۷۱ [4] معمولات مظہری ص ۱۳۸۔

ہر بلا و مصیبت سے محفوظ رہے۔ جب متعینہ مدت پوری ہوجاتی تو اس بچے کو لے کر اس مزار پر حاضری دیتے اور وہیں اس کی چوٹی ترشوائی جاتی بڑے وقت سے محفوظ رکھنے کے لیے پٹوں کے گلے اور پیروں میں سونے چاندی کی زنجیریں اور تانبے کے طوق ڈالتے تھے[۲]

سوداؔ نے لکھا ہے کہ اس کام کے لیے شیر کے ناخنوں کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ ؎

شیر کے ناخن تک میں ڈالا جینے کو تجھ ہیکل میں

موت کے رد سے نہ بچا پر آن کے تو اس جنگل میں[۳]

یہی حال عورتوں کا شگون لینے کے سلسلے میں تھا۔ ایسی رسمیں عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں داخل تھیں۔ میر تقی میر کے والد جب لاہور کے سفر پر نکلے ہیں تو ان کی ماما نے آئینے پر پانی بہا کر رخصتی کا شگون پورا کیا تھا[۴]

اس سلسلے میں میرؔ کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

لگ جاوے دل کہیں تو اُسے جی میں اپنے رکھ
رکھتا نہیں شگون کچھ اظہار عشق کا

جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں روئیے
سیلاب آیا، آ کے چلا، کیا شگوں ہوا

سیلاب آگے آیا چلا جائے دشت میں
بے اختیار رونے کا میرؔ سے شگوں ہوا

---

[۱] نصیحت المسلمین .. (ق) ص ۴۳، تقویت الایمان۔ ص ۵۔
[۲] MRS MIR HASAN ALI: OBSERVATIONS ETC II, P 373
[۳] کلیات سودا۔ ۲/ ص ۱۹۹، ۱۹۷۔ [۴] میر کی آپ بیتی۔ ص ۳۷۔

نحس تجھے کیا دے وقت و ساعت جن میں لگا تھا دل اپنا
سال پھرے ہے اب تو ہم کو ماہ برابر ہیں گھڑیاں
جب سے عشق کیا ہے میں نے سر پہ میرے قیامت ہے
ساعت دل لگنے کی شاید نحس ترین ساعت تھی
کب نظر میری پڑے گی اس روئے خوب پر
ہم نشین ٹک تو بھی مصحف کھول کر تو فال دیکھ

سوداؔ۔

جڑی نہ جانے کس ساعت میں
بڑھئی نے اس پلنگ کی پاٹی
پاؤں کے رکھتے اس پر تیری
اب جو قضا نے گردن کاٹی

۱؎ کلیاتِ سودا۔ ص ۵۲۹۔

ارواح خبیثہ پر اعتقاد جہلا مسلمانوں کا اس بات پر پورا عقیدہ تھا کہ کچھ بزرگ ایسے گذرے ہیں جن کی روح عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہے، مثلاً شیخ سدو، ایسی صورت میں اس آسیب زدہ عورت کو خلاصی دلانے کیلئے مٹھائیاں تقسیم کی جاتیں یا بکرے کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی، سودا نے مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک میں بڑی تفصیل سے اس طرح کا ایک واقعہ پیش کیا ہے

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر رکھوایا — بے وجہ رات سارے ہمسایوں کو جگایا
چھمک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا — تب شیخ سدو اس پر آسا سک کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

ضاحک یہ سن کے بولا تم نے زبان نکالی — بے آج کو کہا ہے کل دو گے مجھ کو گالی
بکرے کی شکل یاں تو نے گو ری ہے نہ کالی — بی بی کو اور تم کو گھر کر دیا ہے خالی
بکرا وہ دے گی تم کو جن نے کہ سر چڑھایا

میراں یہ سن کے بولے پھر کہیو کیا کہا جی — میں اس سوا نہیں کچھ اور حرف جانتا جی
بکرا اگر نہ آیا چھوڑوں گا کر چپا جی — گالی تو اک طرف ہے یہ سن رکھو بچا جی
آگے سے ڈھول دھیا میں تم کو کہہ سنایا

ضاحک نے تب کہا یوں پاس کچھ پیا کوڑا ہے — گرڈے تو کھل گئے ہیں اور تیل کے پکوڑے
میٹھا کرو جو ہنہ کو دھیلے کے ہیں گنڈوڑے — تب شیخ سدو بولا سنتا ہے دمی کے ...
بجنا ہی کے چھوڑوں خاطر میں کیا تو لایا[1]

مختصر یہ کہ عوام کا عقیدہ تھا کہ میاں شیخ سدو، میاں زین خاں، میاں صدر جہاں، ننھے میاں، چہل تن، میاں شاہ دریا، اور میاں شاہ سکندر کی ارواح عورتوں میں حلول ہو کر انھیں پریشان کرتی تھیں[2] اور نذر و نیاز اور بھینٹ کے بنا ان اثرات سے خلاصی ممکن نہیں،

---

[1] کلیات سودا ج ۱، ص ۳۴۰-۳۴۱ - [2] دریائے لطافت (ا-ت) ص ۱۸۳ -

اسی طرح کچھ اختراعی اور مصنوعی عورتوں کی خبیث روحوں پر بھی عقیدہ عام تھا۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری، آسمان پری دریا پری، اور نور پری۔ عورتوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ میاں شاہ دریا اور میاں شاہ سکندر اور یہ ساتوں پریاں بھائی بہن ہیں ایسی عقیدہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حضرت زہرا علیہا السلام کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ سب ان کے غلام اور کنیزیں ہیں[1] ان مصنوعی پریوں کے نام کے روزے رکھے جاتے اور ان موقعوں پر افطار کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔

مرزا مظہر جان جاناں نے ان عقائد باطل کی بیخ کنی کے لیے ایک ایک زبردست تحریک چلائی تھی۔ ان عقائد کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بیان کیا۔

" صیام نسا رکہ بہ نیت پیران و میان نگاہ دارند و اکثر تا ہائی ایشاں را از نزد خود تراشیدہ روزہائے خود را بنام آنہا نیت کنند و در وقت افطار ما از برائے ہر روز طعام خاص بوضع مخصوص یقین می نمایند و تعین ایام نیز از برائے صیام می کنند و مطالب و مقاصد خود را باین روزہا مربوط می سازند و بتوسل ایں روزہا از آنہا حوائج خود می خواہند و روان حاجت خود را از آنہا می دانند"[2]

---

[1] دریائے لطافت (ا۔ ت) ص ۱۰۳۔ [2] معمولات مظہری ص ۳۹۔

شاہی حرم سے لے کر ادنیٰ درجے کا مسلمان تک ہر طبقے میں تعویذ، گنڈے، اور ٹونے ٹوٹکوں کا رواج تھا۔ اظفری شاہی حرم کی مستورات کے عقائد کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ حیو بیگم کے شوہر مرزا جواں بخت ولی عہد بہادر شاہ، بادشاہ کی بلا اجازت قلعۂ معلیٰ سے فرار ہو گئے تھے، حیو بیگم ان سے ملنے کے لیے ہمہ وقت بے قرار رہتی تھیں لہذا "عورتوں کے مذہب کے موافق وہ ہر وقت تعویذ گنڈوں کی تلاش وطلب میں پیرزادوں کی طرف متوجہ رہتی تھیں" ۱؎

مقامات مظہری اور معمولات مظہری کے بغور مطالعہ کے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا تعویذ گنڈوں پر اعتقاد اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ امراض جسمانی کے مداوا کے لیے بھی انکا سہارا لیا جاتا تھا۔ مثلاً تعویذ برائے دفع تب لرزہ برائے دفع درد چشم برائے دفع چوری۔ اور برائے محافظت زراعت وغیرہ ۲؎

اس عہد کے شعراء کے کلام میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ان عقائد کی نشان دہی ہوتی ہے۔

۱۔ حرز و تعویذ و فسوں کر کے تھکے سب لیکن
اس پری شکل کا سر سے مرے سایہ نہ گیا ۳؎
بیدار۔

کرکے تعویذ رکھیں اسکو بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ وہ بات پہ دالی اسکی
میر۔

۱؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ واقعات اظفری ص ۲۲ - ۲۵۔

۲؎ برائے تفصیل۔ مقامات مظہری ص ۱۱۶ - ۱۱۸ ۳؎ دیوان بیدار۔ ص ۱۰۔

کا سب سے بڑا دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہم آہنگ اور متحدہ تہذیب وجود میں آئی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو تہذیب نے مسلمانوں کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اس کے نقوش آج بھی مسلمانوں کی تہذیب میں ملتے ہیں حالانکہ ہندو اور مسلمان دونوں اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی برابر کوشش کرتے رہتے ہیں [۱]

مجملاً ہولی۔ دسہرہ۔ بسنت وغیرہ حالانکہ خالص ہندوستانی تہوار ہیں لیکن اکبر بادشاہ کے عہد سے قلعۂ معلیٰ میں اُن کا رواج ہوا اور رفتہ رفتہ عام مسلمانوں نے بھی ان کو اپنایا اور رنگ زیب کے عہد میں قلعۂ معلیٰ میں ان تہواروں کو موقوف کر دیا گیا تھا لیکن عوام میں یہ جاری رہے، اور اس کے عیش پرست جانشینوں نے پھر اِن کا احیا کر دیا [۲] ان تہواروں کے موقع پر شعرا نظمیں لکھتے تھے، میر اور قائم چاند پوری اور نظیر اکبر آبادی کی ان موضوعات پر نظمیں بالخصوص اہم ہیں افسوس نے۔ آصف الدولہ کے جشنِ ہولی پر ایک نظم لکھی تھی۔ اس زمانے کے اکثر شعرا کے ہاں ان تہواروں پر اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً

داغ بر دل جو ترا چاہنے والا نکلا ۔ شبِ چراغانِ دوالی کا دوالا نکلا

مرزا مظہر جان جاناں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمان عورتیں میں رسوماتِ کفر پر عمل کرتی ہیں، اور ان کو اپنی عید اور خوشیوں کا موقع سمجھتی ہیں اور اپنے ہم سایہ ہندوؤں کی طرح اپنی لڑکیوں کے گھر تحفے بھیجتی ہیں۔ ایام ہولی میں اپنے برتنوں کو گوناگوں رنگوں سے مزین کرتی ہیں۔ اور ان گھڑوں میں

---

[۱] خاکسار کا مضمون۔ "ہندو تہذیب اور مسلمان" ملاحظہ ہو۔
[۲] معمولاتِ مظہری: ۳۸

سرخ چاول بھر کر اپنی لڑکیوں کی سسرال بھیجتی ہیں[1]۔

مختصر یہ کہ اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کی مذہبی اور دینی حالت اچھی نہیں تھی اور اسلام کی اصلی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ ہندوستانی ماحول نے اس کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور کے مسلمان اپنے عقائد اور اعمال کے لحاظ سے مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ چونکہ وہ ان گھروں میں پیدا ہوئے تھے۔ جو غیر مسلمانوں کی نظر میں مسلمان گھرانے سمجھے جاتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ مسلمان کہے اور سمجھے جاتے تھے۔

آخر میں اُن برائیوں اور بدعتوں کی طرف مجملاً ارشارہ کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ جن کا شاہ ولی اللہ نے ذکر کر کے ان کے اثر لئے کی کوشش کی تھی۔ انکے بعد یہ بھی کوششیں شاہ عبد العزیز دہلوی۔ اور سید احمد بریلوی کی قیادت میں ہوتی رہیں۔ مگر انگریزی تسلط کے قیام نے اُن کو بار آور نہ ہونے دیا۔ ان کے بعد ہندوستان کی سرزمین میں کوئی مصلح قوم وجود میں نہیں آیا جو شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کی طرح مسلمانوں کی دینی اخلاقی اور مذہبی زبوں حالی کو روکنے کی کوشش کرتا۔ اس زمانے میں ایسی تحریکیں کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

ا۔ شرک: تم غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو یہ تمہارے بد ترین افعال ہیں۔ تم نے۔ یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے[2]۔

---

[1] معمولات مظہری ص ۳۰۰۔

۲۔ ارکان دین سے غفلت | (الف) "تم نمازوں سے غافل ہو.... کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں نکال پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔

(ب) "تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو.... تم میں کوئی مال دار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے نہ ہوں، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے۔ مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا"

(س) "تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو، اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو"

۳۔ فسق و فجور | "چاہیئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو۔ خواہ تمھیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنے پڑیں.... تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز اندام عورتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو"

۴۔ بری رسومات | "اے بنی آدم۔! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو، ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں

جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو، اور تم میں سے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے۔

۵۔ غیر شرعی حرکات۔ "پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں۔ جن سے تمھاری زندگی تنگ ہو رہی ہے۔ مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کا ممنوع بنا لینا، بیوہ عورتوں کو بٹھا رکھنا۔ تم نے موت اور غم کو عید بنا رکھا ہے" ۵

---

۵ الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص ۱۳۸ - ۱۴۰

حصّہ دوم

میر لکھنؤ میں

۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۱ء تا ۱۲۲۵ھ/-۱۸۱۰ء

باب پنجم

سیاسی حالات

میر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے۔ یہ عہد سلطنتِ اودھ کی تاریخ کے انحطاط اور زوال کا دور تھا۔ لہٰذا یہاں یہ مناسب ہوگا کہ اودھ کی ریاست کے عروج کی تاریخ کا مجملاً جائزہ لے لیا جائے تاکہ وہاں کے سیاسی اقتصادی، اخلاقی، و مذہبی اور سماجی حالات کے مطالعے میں آسانی ہو۔

نواب سعادت علی خان | سید شمس الدین، ساکن نجف اشرف، ایک اعلیٰ سید خاندان کے فرد اور صاحب علم شخص تھے۔ ایران میں ان کا ہم عصر بادشاہ اسمٰعیل صفوی تھا۔ شاہ اسمٰعیل نے ان کو بلا کر قاضی القضات کے عہدے پر مقرر کیا اور نیشاپور میں بہت سی املاک بطور جاگیر عطا کیں۔[1] ان کے کئی بیٹے تھے اور سب سے بڑے لڑکے کا نام سید محمد جعفر تھا۔ آخر الذکر کے دو بیٹے تھے۔ میر محمد امین اور سید محمد۔ سید محمد امین کے بیٹے کا نام سید یوسف تھا۔ اور

---

[1] سید کمال الدین حیدر الحسینی۔ سوانحات سلاطین اودھ (قلمی نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۶ء) ۱/ ص ۱۹

Memoirs of Dehli Faizabad: (APP) IRI
محمد فیض بخش۔ ج ۱/ ص ۳۰

سید محمد کے لڑکے کا نام محمد نصیر تھا۔ یہ دونوں شاہ عباس ثانی کے عہد میں تھے۔ ایک موقع پر بادشاہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا ہوا تھا۔ ایک شیر اچانک اس پر حملہ آور ہوا، سید محمد یوسف نے بڑی بہادری اور جرأت سے اس شیر پر حملہ کیا اور اپنے خنجر سے اس کو مار ڈالا۔ اس کارنمایاں سے خوش ہو کر بادشاہ نے انھیں اپنا وزیر بنانا چاہا لیکن انھوں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ میر نصیر کی شادی اپنے وزیر، رضا قلی بیگ کی لڑکی سے کرا دیں۔ یہ شادی عمل میں آئی اور ان کے دو لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ میر محمد باقر اور میر محمد امین۔ اور میر یوسف کو نیشاپور میں بہت سی جاگیر اور املاک عطا ہوئی۔ میر محمد امین ہندوستان آکر برہان الملک سعادت خان کے لقب سے موسوم ہوئے۔ اور وہی اودھ کے حکمران خاندان کے بانی ہوئے[۲]

(ہندوستان میں آمد، ۱۷۰۸ء – ۱۷۰۹ء) سترہویں صدی کے نصف کے اواخر میں ایران کے حکمران صفوی خاندان کا انحطاط شروع ہوا، اس زوال کے ذمہ دار آخری عہد کے عیش پرست اور غفلت شعار، شاہان تھے۔ حسین شاہ (۱۶۹۴ء – ۱۷۲۲ء) کے زمانے میں بدین وجہ سید شمس الدین کے خاندان کے افراد کا بھی زوال ہوا اور ان کو تنگ دستی اور افلاس کا شکار ہونا پڑا

۱؎ رسالہ محمد شاہ و خاندوران خان میں "مرزا سعادت" نام لکھا ہے۔ ص ۹۶ ب

۲؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ خزانۂ عامرہ، ص ۴۷، اخبار محبت ص ۴۴۴ – ۴۴۶، محمد قدرت اللہ گوپاموی، تذکرہ نتائج الافکار ص ۱۵، رسالہ محمد شاہ و خاندوران خان ص ۹۶ ب، سوانحات سلاطین اودھ ۱/ ص ۱۹۔

لہذا میر محمد امین کے والد میر محمد نصیر نے ہندوستان میں آکر اپنی قسمت آزمانے کا ارادہ کیا۔ یہ زمانہ ایران کے مہاجرین کے لیے بہت ہی سازگار تھا۔ کیوں کہ ضعیف العمر اورنگ زیب کی وفات ہو چکی تھی اور ان کا جانشین بہادر شاہ شیعی عقائد کی طرف مائل تھا۔ وہ سید ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور سید کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا۔ عقائد شیعی کی ترویج و تبلیغ میں نمایاں کوشش بھی کرتا تھا۔[1]

اپنے بڑے بیٹے۔ میر محمد باقر کو ہمراہ لے کر، میر محمد نصیر ایران سے ۱۷۰۰ء میں ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے۔ پانی کے جہاز کے ذریعے بنگال آئے، وہاں سے بہار پہنچے اور پٹنہ عظیم آباد میں سکونت اختیار کر لی۔[2] یہاں مرشد قلیخان نے ان کو مدد معاش اپنے داماد شجاع خان کی سفارش پر عطا کی جو غریب پروری کے لیے بڑی شہرت کا حامل تھا۔ اور بالخصوص ان لوگوں کے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ جو ایران سے وارد ہوتے تھے۔[3] میر محمد نصیر نے اپنے دوسرے بیٹے میر محمد امین کو نیشاپور ہی میں چھوڑ دیا تھا جس کی قسمت میں عظمت لکھی تھی، اور اسی کو اودھ کے حکمران خاندان کا بانی ہونا تھا۔ وہ اپنے چچا اور خسر میر محمد یوسف کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ ہندوستان[4]

---

[1] سیر المتاخرین (ا۔ت) ۲/ص ۸، تذکرۃ الملوک ص ۱۱۲ الف و ۱۱۶ ب

مہاراجہ کلیان سنگھ۔ خلاصۃ التواریخ

Memoirs of Delhi Faizabad (۲۴۴، ۱۰...

[2] اخبار محبت ص ۴۴۴ عماد/ص ۵

[3] سیر المتاخرین (ا۔ت) ۲/ص ۲۵۸-۲۵۹

وارد ہو گا کہا جاتا ہے کہ ایک دن اس کی بیوی نے طعنہ دیا کہ وہ لوگ صاحب غیرت تھے، وطن چھوڑ کر روانہ ہندوستان ہوئے لیکن تم اتنے بے غیرت ہو کہ یہاں سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔[1] اس کے برعکس غلام علی نقوی[2] کا بیان ہے کہ میر محمد امین اپنے والد ملاقات کرنے کی غرض سے ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء - ۱۷۰۹ء) عظیم آباد پٹنہ آیا۔[3] لیکن اس کے ہندوستان آنے کے کچھ ماہ قبل اس کے معمر والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور پٹنہ سے تھوڑے فاصلے پر ان کو دفن کیا گیا۔[4] اس لیے کچھ دنوں پٹنہ میں قیام کے بعد

۱؎ سوانحات سلاطین اودھ ۱/ص ۲۰۔ سید کمال الدین حیدر نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ نیشاپور میں میر محمد امین نے ایک ٹھیکا لیا تھا، خسارہ ہوا، مرزا یوسف کورکی ماں کا زیور فروخت کر کے اسے ادا کیا۔ اس غیرت و حجاب سے ہندوستان آیا ایضاً ص ۲۰ ۲؎ خافی خاں ۲/ص ۹۰۰

۳؎ حدیقۃ الاقالیم ص ۳۸۴ . . . . . مآثر الامراء ۱/ص ۳۶۳ - عماد/ص ۵ - کچھ مورخوں کا بیان ہے کہ وہ بہادر شاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان وارد ہوا اور کچھ کہتے ہیں کہ فرخ سیر کی تخت نشینی سے قبل وہ ہندوستان میں موجود تھا۔ خزانۂ عامرہ ص ۴، اخبار محبت ص ۴۴۴ - تاریخ مظفری ۱/ص ۲۳۶ ب، ۲۳۷ الف۔ رسالہ محمد شاہ و خاندوراں میں لکھا ہے "بارادہ نوکری و ملازمت ... عازم ہندوستان شد" ص ۹۶ ب

۴؎ ۱۷۴۴ء میں جب صفدر جنگ۔ علی وردی خان کی مدد کے لیے گیا تھا۔ تو وہ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتا تھا۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) ۲/ص ۱۵۰

Memoirs of Dehli and Faizabad (App) 1, P.1

دونوں بھائی تلاش معاش کی غرض سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ واقعہ غالباً ۱۱۲۱ھ / ۱۷۰۹ء کا تھا۔[1]

ابتدا میں میر محمد امین نے معمولی عاملوں کے ہاں نوکری کی[2]۔ اور بڑی تنگدستی کی زندگی گزاری۔ اس کے بعد دونوں بھائی سربلند خاں کے یہاں ملازم ہوئے جو کڑا مانکپور کا فوجدار تھا[3]۔ یہ علاقہ صوبہ الہ آباد کا تھا۔ یہ واقعہ جولائی سنہ ۱۷۱۱ء کا تھا[4]۔ سربلند خان نے میر محمد امین کو میر منزل کا عہدہ دیا[5]۔ چونکہ سربلند خاں نے تخت نشینی کی جنگ میں جہاندار شاہ کا ساتھ دیا تھا بدیں وجہ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اول الذکر کی خدمت کے بدلے میں اُسے گجرات کا نائب گورنر مقرر کیا تھا[6]۔ میر محمد امین اپنے آقا کے ہمراہ ۱۷۱۲ء میں گجرات پہونچا۔ دہلی کے قیام اور بعد

---

[1] اخبار محبت ص ۴۴۴ عماد ص ۵۔

[2] خزانۂ عامرہ " در آں عہد (بہادر شاہ) زمانہ باو موافقت نکرد" ص ۴،

[3] محبت خاں کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سربلند خاں گجرات کا صوبہ دار تھا۔ اور دونوں بھائیوں نے گجرات جا کر اس کے ہاں ملازمت کی تھی اور میر محمد امین کو میر منزل کا عہدہ ملا تھا۔ اخبار محبت ص ۴۴۴ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

[4] حدیقۃ الاقالیم ص ۳۸۳، اخبار محبت ص ۴۴۴، عماد ص ۵

[5] سوانحات سلاطین اودھ ۱/ص ۲۰

[6] خافی خاں ۲/ص ۶۹۳ میں لکھا ہے کہ جہاندار شاہ نے سربلند خاں کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا تھا یہ بات صریحاً غلط ہے۔ مرأت احمدی میں لکھا ہے کہ اس کا تقرر نائب صوبہ دار کی حیثیت سے ہوا تھا اور اسد خاں وہاں کا گورنر تھا۔

میں بھی میر محمد امین نے بڑے غور سے دہلی کے دربار کی سیاسی گٹھ بندیوں، سازشوں اور زوال پذیر عیش دوست تغافل شعار امراء کی شاطرانہ چالوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ لہذا اس نے اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے حالات کے مطابق طرزِ عمل اختیار کیا۔

سربلند خاں کے ہاں ملازم ہونے کے تقریباً دو سال تک میر محمد امین کے حالات میں کوئی قابل ذکر تغیر ظہور میں نہ آیا اور آقا اور خادم کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے۔ لیکن ۱۷۱۳ء کے اواخر میں میر محمد امین اور سربلند خاں کے تعلقات میں یکبارگی شکر رنجی اور کشیدگی پیدا ہوگئی اور طیش میں آکر اول الذکر نے استعفیٰ دیدیا۔ اس کشیدگی کی وجہ ایک معمولی سا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ صوبے میں دورے کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک خیمہ نشیب زمین پر نصب ہوگیا تھا۔ رات کو اتنی شدت کی بارش ہوئی کہ پانی خیمے میں داخل ہوگیا۔ اور تمام سامان بھیگ گیا۔ اور نواب کو سرا کی پوری رات ایک رتھ کے نیچے گذارنی پڑی۔ دوسرے دن صبح کو نواب نے اپنے میر منزل کو طلب کیا اور اپنی خدمات کو حسن اسلوبی سے انجام نہ دینے کی بنا پر اس کا سخت احتساب کیا اور اظہار خفگی کیا۔ میر اس بات سے کبیدہ خاطر ہوا۔ اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اس بات پر نواب نے غصہ میں آکر کہا "تمہارے دماغ میں .. بوئے ہفت ہزاری پائی جاتی ہے۔ کس طرح تم اس معمولی خدمت کو انجام دے سکتے ہو"[1] یہ طنزیہ فقرہ ایران کے ایک حساس اور صاحب عزت نوجوان کو بڑا ناگوار گزرا۔ حالانکہ نواب نے بعد کو اس کی بڑی دلجوئی کی کوشش کی مگر وہ مستعفی ہوگیا۔ اور اس نے بڑے سخت لہجے میں جواب دیا" میں آپ کے اس کہنے کو

---

[1] سوانحات سلاطین اودھ ۱/ ص ۲۰، اخبار محبت ص ۲۲۳-۲۲۴۔

اپنے لیے فال نیک سمجھتا ہوں۔ میں ہفت ہزاری کا منصب حاصل کرنے دہلی جا رہا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔[۱]

درحقیقت سربلند خان کے الفاظ نے میر محمد امین کی زندگی کے لیے پیش گوئی کا کام دیا جو بعد میں حقیقت کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔

رسالہ محمد شاہ و خاندوران کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد امین نے سربلند خان کے ہاں ملازم ہونے سے پہلے بھی دوسرے امراء کے ہاں ملازمت کی تھی۔ جیسے صمصام الدولہ خاندوراں خاں نواب تقرب خاں میر خان سامان۔ اس کے بعد بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا۔ متذکرہ کتاب کے مصنف کا بیان ہے۔

"اولاً بتعارف بعضے مشغول ملازمت نواب صمصام الدولہ خاندوراں ..... فرقہ سپاہیان، ملازمان سربلند بلندی افراخت وجہ برتری بنوکری دو روپیہ برافراخت ثانیاً بخدمت نواب تقرب خان، خان سامان، بعد ازاں بملازمت بادشاہی"[۲]

میر محمد امین (۱۷۱۳ - ۱۷۱۹ء) میں فرخ سیر کی خدمت میں :- بہادر شاہ کی وفات کے بعد جہاندار شاہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے عیش پرستی اور لعل کنور کے عشق میں جاہ و جلال سب کچھ کھو دیا۔ اور پورا سال بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ فرخ سیر کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اور اسے پھانسی کے

---

[۱] حدیقۃ الاقالیم ص ۳۸۳ ، عماد ، ص ۵

[۲] رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں ص ۹۶ ب،

تخت پر لٹکا دیا گیا۔ جیسا کہ تفصیل سے پہلے حصے میں لکھا جا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ فرخ سیر نے سادات بارہہ کے فوجی اور سیاسی اقتدار کو توڑنے کے لیے اور ان کے شکنجے سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اپنے حامیوں کی ایک پارٹی بنائی اس زمانے میں شاہی دربار سازشوں اور دغابازیوں سے آلودہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میر محمد امین دہلی پہونچا اور شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ہفت ہزاری منصب کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔[1] پہلے "والا شاہی" نامی فوجی دستے کا کمانڈر مقرر ہوا۔[2] یہ کامیابی بادشاہ کے منظور نظر محمد جعفر کی سرپرستی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔[3] اس زمانے میں محمد جعفر (جس کا لقب تقرب خاں والا شاہی تھا) دہلی کے گنج کا کروڑی تھا۔ لہذا اس نے میر محمد امین کو نائب کروڑی کا عہدہ دیا۔[4] ۱۷۱۶ء میں محمد جعفر نے وفات پائی۔ اس حادثے کی وجہ سے میر محمد امین ایک ایسے شخص کی سرپرستی سے محروم ہوگیا جو دربار شاہی میں اپنا اچھا خاصا اثر رکھتا تھا۔ لہذا ساڑھے تین سال تک اسے کسی قسم کی ترقی نصیب نہیں ہوئی۔

بیانہ اور ہنڈون کی فوجداری،[5] | اس زمانے میں طاقتور سادات بارہہ اور بزدل

---

[1] خافی خان ۲/ص ۹۰۲، ماثر الامرا ۱/۴۶۳، سیر المتاخرین (ا۔ت) ۲ ص ۵۹، احوال الخواقین۔ فرخ سیر کے عہد کے ہفت ہزاری منصبداروں کی فہرست میں اس کا نام موجود ہے ص ۶۲ الف

[2] ماثر الامرا ۱/ص ۴۶۳۔ [3] ایضاً ۱/ص ۴۶۳۔ [4] رسالہ محمد شاہ و خاندوران میں لکھا ہے کہ بادشاہی ملازمت میں داخل ہونے کے بعد اسے منصب اور خانی کا خطاب ملا اور ۲۲ پرگنوں کی جس میں بیانہ بھی شامل تھا، فوجداری کا عہدہ ملا۔ اس نے اپنے نئے علاقے میں امن و امان قائم کرنے میں بڑی چابکدستی اور پالیسی سے کام لیا اور ستائش کا حامل ہوا۔ روزانہ وہ ایک ہزار سپاہی لے کر امن و امان قائم کرنے اور باغیوں کے قتل کرنے کے لیے نکلتا تھا۔ ص ۹۶ ب - ۹۰ الف

بادشاہ کے درمیان تنازعہ اپنے نقطۂ کمال پر پہونچ چکا تھا۔ آخر میں فرخ سیر کو معزول کر دیا گیا۔ اندھا کیا گیا اور بڑی بے دردی اور بے دردانہ انداز اور ذلت کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہندوستان میں بلا کسی مدمقابل کے "بادشاہ ساخت" سادات بارھہ نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو تخت شاہی پر بٹھایا۔ ان کے بعد انھوں نے روشن اختر کو تخت نشین کیا۔ جس نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اب سادات بارہ اپنے عروج کے نصف النہار پر پہونچ چکے تھے اور تورانی پارٹی کا کوئی منظم گروہ ان کی مخالفت کے لیے موجود نہ تھا۔

اس کشمکش کے زمانے میں میر محمد امین حالانکہ خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا مگر موقع کی تلاش میں ضرور رہا۔ لہٰذا تقرب خان کی وفات کے بعد وہ سادات بارہہ کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ سید اور شیعہ ہونے کی وجہ سے میر محمد امین کو ان کا تقرب حاصل کرنے میں کسی طرح کی زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ان کی داخلی مجالس میں با آسانی شامل ہو سکتا تھا۔ جس موقع پر سید عبد اللہ خان مع رفیع الدولہ کے راجہ جے سنگھ کے خلاف جنگ کرنے گیا تھا۔ میر محمد امین بھی اس کے ہمراہ تھا۔ حسن اخلاق اور خداداد جنگی خصائص کی بنا پر اسے سید حسین علی خاں کی سرپرستی حاصل ہو گئی، جو میر بخشی تھا۔ لہٰذا اس نے میر محمد امین کو ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری کا عہدہ دلوا دیا۔ یہ علاقے صوبہ آگرہ کے مضافات میں داخل تھے[1]

---

[1] قاضی مرتضیٰ کا بیان ہے کہ میر محمد امین کو یہ عہدہ سید حسین علی خان کی سفارش پر ملا تھا ... مقدمۂ مقالیم ص ۳۰۳، اخبار محبت میں لکھا ہے۔ در عہد سلطنت رفیع الدرجات پسر رفیع الشان پیش روئی رتن چند دیوان منصب [illegible] سوال و جواب [illegible] ۱۱۲۸ھ

(بقیہ ص دیکھیے)

اس زمانے میں چونکہ میر محمد امین کی بیوی نے وفات پائی تو اس نے آگرہ کے صوبے دار محمد تقی خان کی دختر سے عقد کر لیا۔[1]

ابھی اس عہدے پر زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ سادات بارہہ نے اس کی عزت افزائی کی اور اس شاہی فوج کا کمانڈر مقرر کیا جو باغی راجہ گردھر (صوبہ دار الہ آباد) کی سرکوبی کے لیے روانہ کی جانے والی تھی۔ اسی دوران میں میر محمد امین سے ایک غلطی سرزد ہو گئی، اور وہ یہ تھی کہ اس نے سید حسین علی خان سے اس بات کی شکایت کی کہ راجہ رتن چند، جو سید عبداللہ خان دیوان تھا، میر جملہ کو صدر الصدور کے تقرری کا فرمان جاری نہیں کرتا۔ اس بات سے خفا ہو کر راجہ رتن چند نے میر محمد امین کے نئے عہدے کی تقرری منسوخ کر دی اور حیدر قلی خان کو شاہی ہراول دستے کا سردار مقرر کیا گیا۔

چونکہ ہنڈون اور بیانہ کا علاقہ راجستان کی سرحدوں سے ملتا تھا اور جاٹوں اور راجپوتوں کی طاقت اس زمانے میں مائل بہ عروج تھی۔ لہذا

(بقیہ ص۳۳۱) بجائے اجارہ لک روپیہ پرگنہ ہنڈون و بیانہ اجارہ گرفت ص ۲۲۴۔ ۲۲۶۔ نیز ملاحظہ ہو۔ عماد ص/۶۔ سیر المتاخرین ۲/ص ۵۹۰، تاریخ مظفری ۱/ص ۲۳۶ ب۔ ۲۳۷ الف

حسن پور کی جنگ کے موقع پر عبداللہ خان نے ان علاقوں پر اسے اپنی طرف سے مقرر کر دیا اور اجارہ داری کی شرط ختم کر دی۔ اخبار محبت ص ۲۴۴۔ ۲۴۶،

[1] رسالہ محمد شاہ و خاندوران خان [illegible] ۔ [illegible] حسین

[illegible] با جدال و قتال آراست ص ۹۷ الف

ان علاقوں میں امورِ حکومت کو منظم طریقے پر چلانا اور نظم و نسق قائم کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس وجہ سے میر محمد امین نے اپنی فوج کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے وزیر الممالک سے بھی درخواست کی وہ شاہی فوج کا ایک دستہ اس علاقے میں طعینات کر دیں۔ شاہی فوج کی امداد سے میر محمد امین نے اس علاقے میں امن و امان، نظم و نسق قائم کیا۔ اور سرکش زمینداروں کی بڑی کامیابی سے سرکوبی کی۔ ان خدمات کے صلے میں اُسے صد ذات کے منصب پر ترقی دی گئی۔[1]

۱۷۱۹ء کا وہ زمانہ تھا کہ سادات بارہہ اپنی سیاسی ترقی کے نقطۂ کمال پر پہونچ چکے تھے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کا زوال خاتمے کی صورت میں رونما ہوا۔ جیسا کہ پہلے حصّہ میں لکھا جا چکا ہے، سادات بارہہ نظام الملک سے دلی عناد رکھتے تھے۔ اور اس کی طاقت کے قلع قمع کرنے کے درپے تھے۔ اس وجہ سے وہ امیر جنوبی ہندوستان چلا گیا تھا۔ اور وہاں سید حسین علی خان کے نائب صوبہ دار دلاور علی خان کو شکست دی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس خبر کو سن کر سادات بارہہ بے حد پریشان ہوئے اور اس کی سرکوبی کے لیے سید حسین علی خان نے مع بادشاہ محمد شاہ کے جنوبی ہند کے لئے کوچ کیا۔

کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد محمد شاہ، بہادر پور کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اکتوبر ۱۷۲۰ء کے کچھ دنوں ما قبل میر محمد امین شاہی لشکر میں وارد ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر۔۔۔ آداب بجالایا۔ اس کی وفاداری اور ہم مشربی پر اعتماد کرتے ہوئے سید حسین علی خان نے حکم دیا کہ وہ شاہی لشکر میں قیام کرے اور

---

[1] خافی خان ۲/ص ۹۰۲ نیز سیر المتاخرین ۲/ص ۵۹

اس کے ساتھ دکن چلے۔ مگر رسالہ محمد شاہ و خاندوراں میں لکھا ہے کہ حسین علی خاں   میر محمد امین کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر حسد کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی طاقت نہ بڑھا سکے۔

"نواب بخشی الممالک حسین علی خان بہادر در باطن ناخوش
وظاہر برائے رفاقت سیر و سفر دکن طلبش نمودہ اختلاج اطوار
جرأت جمعیت بدل داشت"[1]

آگرہ سے دکن کے لیے روانگی کے زمانہ ہی سے شاہی امرار، یعنی تورانی پارٹی۔ میں سادات بارہہ کے خلاف داخلی سازشیں عملی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ اور سازش کرنے والوں کا سرغنہ نظام الملک کا چچا، محمد امین خان اعتماد الدولہ تھا۔ جس کی جان لینے کی کوشش سادات بارہہ بارہا کر چکے تھے۔ محمد امین خان نے، جسے محمد شاہ بادشاہ کی سرپرستی اور اس منصوبے میں ... رضامندی حاصل تھی، اپنے اس منصوبہ میں میر حیدر قلی خان (میر آتش) اور شاہ عبدالغفار کو شریک کار بنالیا تھا۔ باوجودیکہ سادات بارہہ نے میر محمد امین کے ساتھ بڑے احسانات کیے تھے، پھر وہ محمد امین خان اعتماد الدولہ کے گروہ میں شریک ہو گیا۔[2] مختصر یہ کہ ٹوڈا بھون[3] کے مقام پر ۸/ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو

---

[1] رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خان۔ ص ، ۹ الف

[2] خافی خان ۲/ ص ۹۰۲

[3] تاریخ ہندی میں اس مقام کا نام بھوساور لکھا ہے۔ ص ۲۸۰

سید حسین علی خان کو فریب دیکر حیدر بیگ خان نے قتل کردیا۔[1]

سادات خان کا خطاب، ۹ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو بادشاہ نے دربار خاص منعقد کیا اور اپنے نمک حلال سرداروں کو ان کی عالیہ خدمات کے عوض میں انعام واکرام القاب وخطاب اور مناصب میں اضافہ کرکے سرفراز کیا۔ دوسرے امیروں کے علاوہ میر محمد امین کو سعادت خان بہادر کا لقب دیا گیا۔ اور ایک صدی کے منصب سے اضافہ کرکے پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔[2]

---

[1] اس واقع کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ خافی خان ۲/ص ۹۰۲-۹۰۶، تاریخ ہندی ۲۸۰-۲۸۳، سیر المتاخرین ۲/ص ۵۹-۶۰، تذکرۃ الملوک ص ۱۲۸ ب-۱۳۰ الف، احوال الخواقین ص ۱۶۵ ب-۱۶۷ ب، آشوب ۱/ص ۷ ب-۸ الف، ۲۰ الف و ب، رسالہ محمد شاہ وخاندوران خان ص ۷۹ ب، شاہ نامہ منور کلام ص ۴۲ ب-۴۸ الف، تاریخ مظفری ۱۴۲/الف-۱۵۲ ب۔ مآثر الکرام موسومہ سرو آزاد ۲/ص ۱۶۹-۱۷۰ میر عبدالجلیل بلگرامی نے اس واقعہ کو واقعہ کربلا سے تشبیہ دی ہے اور ایک مرثیہ لکھا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

آثار کربلاست عیاں از جبین ہند
زد جوشش خون آل نبی از زمین ہند

Memoirs Delhi Faizabad: 1, pp 246-51

ایضاً ص ۱۶۱-۱۶۳۔

[2] خافی خان ۲/ص ۹۱۱، سیر المتاخرین ۲/ص ۶۰، اخبار محبت ص ۴۴۴-۴۴۶، رسالہ محمد شاہ وخاندوران خان ص ۸۹ الف،

آگرہ کی صوبہ داری ۱۷۲۰ء۔ ۱۱۳۲ھ واپسی میں گوپال پور کے مقام پر سعادت خاں کو دوبارہ ترقی دی گئی اور اس کا منصب بڑھا کر چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا کر دیا گیا اور آگرہ کی صوبہ داری کا عہدہ بھی عطا ہوا۔ مزید براں ایک خلعت ایک راس گھوڑا، ایک ہاتھی، علم و نقارہ بھی تفویض ہوا۔ سعادت خاں نے نیل کنٹھ ناگر کو وہاں کا نائب مقرر کیا اور امور ملکی کی انجام دہی کے لیے بھیجا اور بذات خود بادشاہ کے ہمراہ سید عبداللہ خاں سے مقابلے کے لیے چلا گیا[1]

حسن پور کا محاربہ ۔ ۱۷۲۰ء حسن پور کے مقام پر شاہی افواج اور وزیر الممالک سید عبداللہ خاں کے مابین ایک جنگ ہوئی۔ اور سید عبداللہ خاں زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ شہزادہ محمد ابراہیم سلیم گڑھ کے قلعے میں مقید کر دیا گیا۔ اور سید عبداللہ خاں کو میر حیدر بیگ خاں کے سپرد کر دیا گیا۔[2] اس فتح کے بعد محمد شاہ نے سعادت خاں پر نوازشوں کی بارش کی اور بہادر جنگ کا خطاب دیا اور ماہی و مراتب عطا ہوا،[3] دو ماہ کے بعد محمد شاہ نے سعادت خاں کو داروغۂ خاص کا

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۲۷، سیر المتاخرین ۲/ص ۴۵، اخبار محبت ص ۲۲۳-۲۲۶، رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں ۸۹، منتخب اللباب خافی خاں ۲/۹۱۱ پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو خافی خاں ۲/ص ۹۲۲-۹۳۳ سیر المتاخرین ۲/ص ۴۳-۴۰ سرو آزاد ص ۱۹۱۔ آخر میں زہر پلا کر اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور دہلی میں اس کی قبر زیارت گاہ خواص و عوام تھی۔ یہ واقعہ ۱۱۳۵ھ میں ظہور میں آیا۔ ایضاً ص ۱۹۱۔

[3] سیر المتاخرین ۲/ص ۹۹، Memoir of Delhi Faizabad (App) P.1

عہدہ عطا کیا اور خلعت اور سرپیچ سے نوازا اور اس کے بعد اُسے اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت دیدی گئی۔

آگرہ پہونچ کر سعادت خان نے جاٹوں کی سرکوبی کے لیے اقدام اٹھائے اور بڑی کامیابی سے ان کا قلع قمع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے میواڑ کے راجہ اجیت سنگھ کے خلاف مہم کا ارادہ کیا کہ اسی زمانے میں دربار مغلی سے حکم صادر ہوا کہ وہ جلدی سے دہلی پہونچے۔[1] وہ حسب الحکم دہلی پہونچا اور راجیت سنگھ کے خلاف مہم کی سرداری کے لیے اس کا انتخاب ہوا مگر درباری امرا جو نسلی اور حسبی اعتبار سے اپنے کو اعلیٰ وافضل سمجھتے تھے، سعادت خاں کو نو دولتیہ سمجھتے تھے۔ اور اس کی سرداری میں کام کرنا اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں اس مہم میں خرچ کیلئے محمد شاہ نے رقم بھی بہت کم دی لہذا ان تمام باتوں سے بددل ہو کر سعادت خاں نے اس مہم میں جانے سے انکار کر دیا۔[2]

اس اثنا میں جاٹوں نے نیل کنٹھ ناگر پر حملہ کرکے اس کو قتل کر دیا اور محکم سنگھ نے شاہی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس خبر کو سن کر سعادت خان بڑی تیزگامی سے آگرہ واپس آگیا۔ چونکہ جاٹوں میں باہمی نفاق تھا۔ اس وجہ سے چوڑامن جاٹ کا بیٹا بدن سنگھ سعادت خان سے مل گیا۔ اس موقع پر بدن سنگھ اور سورج مل میں جانشینی کے مسئلہ پر جھگڑا اٹھا[3] ہوا۔ اور بدن سنگھ نے سعادت خان سے

---

[1] سیر المتاخرین ۲/ص ۴۶۶

[2] ایضاً ۲/ص ۶۷-۶۹

[3] ایضاً ۲/ص ۶۶۔ خافی خان ۲/ص ۹۳۶-۹۳۷

مدد کی درخواست کی۔ بدن سنگھ کی قیادت میں سعادت خاں نے دوبارہ
جاٹوں پر حملہ کیا مگر اُسے کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اور نہ زیادہ دن
تک جنگ جاری نہ رکھ سکا۔[1]

چونکہ جاٹوں کو مطیع کرنے میں سعادت خاں ناکام رہا لہٰذا بدیں وجہ آگرہ کا
صوبہ راجہ جے سنگھ کو عطا ہوا اور سعادت خاں کو معزول کر دیا گیا۔[2] اسکے بعد
سعادت خاں دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ چونکہ محمد شاہ اس سے خفا تھا۔ اس لیے
اسے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت نہ ملی اور حکم دیا گیا وہ صوبہ
اودھ چلا جائے۔ اس صوبے میں گورکھپور کی فوجداری بھی شامل تھی۔ مختصر یہ کہ
اودھ کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ اور سند تقرری اور خلعت اُسے بھیج دیا گیا۔[3]

اودھ کی صوبہ داری | گردھر ناگر کو، جو صوبہ اودھ کا گورنر تھا، صوبہ مالوہ کی
صوبہ داری عطا ہوئی۔[4] یہ واقعہ ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو پیش آیا۔ اور اس طرح
سعادت خاں کو صوبہ اودھ کی صوبہ داری ملی۔ اس زمانے تک صوبہ اودھ
سلطنت مغلیہ کا اٹوٹ انگ تھا۔ سعادت خاں نے وہاں پہونچ کر ایک
ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس نے ایک آزاد حکومت کی صورت اختیار کی۔[5]

---

۱ خافی خاں ۲/ص ۹۴۵-۹۴۴، مآثر الامراء ۱/ص ۴۶۶-۴۶۵، سیر المتاخرین ۲/ص ۴۰

۲ سیر المتاخرین ۲/ص ۴۰، خزانہ عامرہ ص ۴۷، ۳ ایضاً ۲/ص ۸۰، ۹ خزانہ عامرہ ص ۴۳،

۴ عماد ص ۱۷، ایضاً ۲/۸۰ ۵ جام جہاں نما ص ۴۹۰، پہلے اودھ کا دارالحکومت مستقر فیض آباد تھا سعادت
خاں کے پوتے نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا۔ ۱۸۱۹ء میں غازی الدین حیدر نے لارڈ ہیسٹنگ
کے کہنے پر بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ Memoirs
Of Delhi Faizabad, (APP) 1, P.1.

کچھ دنوں کے بعد سعادت خاں نے لکھنؤ کے شیخ زادوں کو زیر کیا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے باغی اور سرکش سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ سعادت خاں نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر ان سرداروں کو ان کے علاقوں پر بدستور سابق و قابض رہنے کی اجازت دیدی۔ اس وجہ سے اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہو گیا اور اس کے نام سے باغیوں کا دل دہل گیا۔[1]

مگر کچھ ایسے بھی سرکش زمیندار تھے جو کسی بھی حالت میں صوبہ دار کے مطیع ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان میں سے تیلوئی کا زمیندار موہن سنگھ بھی تھا۔ آخر کار ان دونوں میں جنگ کی نوبت پہونچ گئی اور موہن سنگھ دوران جنگ میں کام آیا۔ (۱۷۲۳ء)[2] سعادت خاں نے اپنے علاقہ کا دوبارہ بندوبست کیا جس کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ ان خدمات کے صلے میں محمد شاہ نے سعادت خاں کو برہان الملک کا خطاب دیا۔[3]

دربار مغلیہ کی سیاست اور گروہ بندیوں کی کشمکش میں اہم رول ادا کرنے

۱۔ چہار گلزار شجاعی ص ۲۳۲ ب

۲۔ خزانہ عامرہ، ص ۴۰، آزاد بلگرامی کا بیان ہے۔ "زمینداران صوبہ اودھ وغیرہ سرکشی علم روزگارها اند و شاید از ابتدای ایجاد عالم هیچ حاکم را اطاعت قرار واقع نکرده باشند۔ برہان الملک همه را بضرب شمشیر مطیع و باجگذار ساخت و نقش عمل که در هیچ عصر نشان نمی دهند در آن صوبہ نشاند و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد، مثل جونپور، و بنارس، و غازی پور، و کڑہ مانکپور، و کوڑہ جہان آباد وغیرہ بزور بازو گرفت و از حضور بادشاہی سند حاصل کرد۔" نیز عماد، ص ۹۔ ۳۔ عماد، ص ۹

کی درخواست برہان الملک دہلی کے لیے رخصت ہوا اور صوبے کے نظم و نسق پر نگرانی کا کام اس نے اپنے نائب پر چھوڑ دیا۔ دہلی میں اس کا ٹکراؤ میر بخشی صمصام الدولہ خاندوراں خاں کے بھائی مظفر جنگ سے ہو گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ

نیشاپور کا ایک باشندہ مظفر جنگ کے ہاں ملازم تھا۔ مظفر جنگ نے اس پر غبن کا الزام عائد کر کے اسے مقید کر دیا تھا۔ چونکہ مجرم سعادت خاں برہان الملک کا ہم وطن تھا اس لیے اس نے مظفر جنگ سے اسے رہا کرنے کی بار بار درخواست کی اور ایک مرتبہ اس اصرار کا نتیجہ سخت کلامی کی صورت میں نمودار ہوا۔ آخر میں یہ جھگڑا بہت بڑھ گیا اور جنگ کی نوبت آ گئی۔ مظفر جنگ اور خاندوراں خاں نے، محمد خان بنگش سے اور سعادت خان نے اپنے دوست روشن الدولہ سے مدد لی۔ اس نازک موقع پر قمر الدین خاں وزیر الممالک نے بیچ میں پڑ کر جھگڑا رفع دفع کرا دیا۔ مگر بادشاہ سعادت خاں سے بے حد ناراض ہو گیا اور اُسے اودھ واپس جانا پڑا اور مظفر جنگ کو اجمیر بھیج دیا۔[1]

صفدر جنگ کا اودھ کا نائب صوبہ دار ہونا
سنہ ۱۱۳۴ھ / سنہ ۱۷۲۲ء

ابھی برہان الملک دہلی ہی میں تھا کہ اس کا بھانجا مرزا محمد مقیم نیشاپور سے

---

[1] تاریخ ہندی میں لکھا ہے کہ اس قضیہ نے طول پکڑا اور آخر کار اس بات پر فیصلہ ہوا کہ صوبہ داری اودھ مظفر جنگ کو اور صوبہ داری مالوہ سعادت خاں کو عطا ہو (عمل صالح، ص ۵۰۸، آشوب ا/ص ۸۱ ب - ۸۲ ب) مگر اس بات کا حوالہ کسی ہم عصر کتاب میں نہیں ملتا کہ سعادت اجمیر کی صوبہ داری پر گیا ہو۔

فیض آباد پہونچا جسے اول الذکر نے بلایا تھا۔ مرزا محمد مقیم، جعفر بیگ خاں، دوسرا لڑکا تھا۔ اور سعادت خاں کی بڑی بہن کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ابھی نومولود چھ ماہ کی عمر کا ہی تھا کہ اس کی ماں نے وفات پائی اور اس کی سگی خالہ نے اس کی پرورش کی اودھ میں تھوڑی کے بعد ہی سعادت خاں نے اپنے بھانجے کو نیشاپور سے بلایا تھا فیض آباد آنے کے بعد سعادت خاں نے اپنی بیٹی صدر جہاں عرف صدر النساء کا اس سے عقد کر دیا۔[۵] کچھ دنوں کے بعد سعادت خاں نے اپنے بھانجے اور داماد کو اودھ کا نائب مقرر کر دیا۔ اور دربار مغلیہ سے اسے منصور خاں کا خطاب دلوا دیا۔[۶] ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا (۱۱۴۴/ ۱۷۳۱-۱۷۳۲ء) جس کا نام جلیل الدین حیدر تھا۔ اور تاریخ میں شجاع الدولہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ سعادت خاں نے اودھ کے حدود کی توسیع کی اور بنارس، جونپور، اور چنار کو اپنے علاقوں میں ملا لیا۔ اور ساچندی کے قلعہ پر قبضہ بھی کر لیا۔

سعادت خاں اور مرہٹہ (۱۷۳۲-۱۷۳۸ء)

تاریخ کے طالب علموں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت کے آخری ۲۶ سال مرہٹوں کے قلع قمع کرنے میں صرف کیے اور بڑی حد تک انکی مرکزی طاقت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مگر یہ بات ان کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ اب مغلیہ بادشاہ کو ایک متحد حکومت کے خلاف جنگ نہیں کرنا تھا۔ بلکہ اب

---

[۴] سوانحات سلاطین اودھ ۱/ ص ۲۱ عماد/ ۸ اخبار محبت ص ۴۴۳-۴۴۴

[۵] ایضاً ۱/ ص ۱۲ عماد ص ۸-۹

[۶] سیر المتاخرین (رف) ۲/ ص ۴۶۵، خزانہ عامرہ ص ۴۳،

کئی سرداروں سے۔ بدیں وجہ اورنگ زیب مرہٹوں کو یکقلم ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشینی کی خانہ جنگیوں، بادشاہوں کی عیش پرستیوں،[1] ہندوستانی اور تورانی پارٹیوں کے باہمی تنازعوں، جاٹوں، راجپوتوں اور بندیلوں کی مرکزی حکومت کی اطاعت کا جوا اتار پھینکنے کی کشمکش نے مرہٹوں کو اپنے علاقوں کی توسیع کا سنہری موقع بہم پہنچایا۔ ۱۷۳۲ء کے بعد سے مرہٹوں نے چنبل ندی پار اتر کر آگرے تک حملے کرنے شروع کر دئے تھے۔

بے جان مغلیہ دربار کے عیش پرست[2] امراء اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتے تھے کہ جب مرہٹوں کے حملے کی خبر ملے تو وہ اپنی افواج لیکر باہر نکلیں اور لغو کاموں میں وقت ضائع کریں۔ درباری پارٹی کے سردار کمزور صمصام الدولہ خاندوراں اس خیال کا حامی تھا۔ کہ مرہٹوں کو اپنا لیا جائے اور ان کی مانگوں کو قبول کر لیا جائے۔ راجہ جے سنگھ (راجہ جے پور) بھی اس رائے کا حامی تھا کیونکہ اس کی مرہٹوں سے دوستی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ ان پر سیاسی کامیابی تو حاصل کی جاسکتی تھی مگر فوجی کامیابی ناممکن تھی۔

برہان الملک صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ کی پالیسی کے برعکس حملہ

سلہ احوال الخواقین "بادشاہ مثل زنان درچار دیواری نشستہ است اکثر از قوم سلاطین طریقہ نسوانی اختیار نمایند و گفتہ زن خصلتان عمل کنند" ۱۹۲ ب

سلہ تذکرۃ الملوک "انکہ بسبب نارسائی وزیر و امراء و تغافل و بے پروائی بادشاہ در عیش و عشرت پیوستہ درماندگی معاملات جہان چنانچہ درمیان آمدہ ستم است از استیلائے ظالمان و کافران مردم آزار" ۳۶ ب

آوردں سے فوجی مقابلے کا حامی تھا۔ وزیر قمرالدین خاں حالانکہ عیش پرست تھا پھر بھی وہ سعادت خاں کا ہم خیال تھا اور اس کی پالیسی کی پرزور حمایت کرتا تھا۔ مزید برآں اس کے ساتھ دوسرے سردار، جیسے محمد خان بنگش، ظفر خان طرہ باز، بلند خان وغیرہ بھی شریک تھے۔ ان کے علاوہ ابھے سنگھ بھی اسی خیال کا حامی تھا۔ سعادت خاں نے نظام الملک سے بھی اس معاملے کے متعلق خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مرہٹوں کو دکن میں ہی اس بری طرح سے الجھا دے کہ وہ شمالی ہند کی طرف رخ بھی نہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں سعادت خاں نے محمد شاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اودھ کے علاوہ اگر اسے آگرہ اور مالوہ کی صوبہ داری عطا ہو تو وہ شمالی ہند میں مرہٹوں کے حملوں کے دفع کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اس نے محمد شاہ کو یہ بھی بتایا کہ راجہ جے سنگھ خفیہ طور سے مرہٹوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ اور ان کی مدد بھی کرتا تھا۔ اگر بادشاہ اسے مالوہ اور آگرہ کی گورنری دے دیں تو وہ مرہٹوں سے جنگ کے لیے روپیہ بھی طلب نہ کرے گا۔ راجہ جے سنگھ نے اسی کام کے لیے شاہی خزانہ سے کروڑوں روپیے لیے لیکن مجھے کچھ نہیں چاہئے کیونکہ میرے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے۔ اس کے علاوہ نظام الملک سے میرے ذاتی تعلقات ہیں۔ وہ مرہٹوں کے سامنے نربدا ندی اترنے میں رکاوٹیں پیدا کر دے گا۔ یہ بات سن کر محمد شاہ کو طیش آگیا۔ اس نے صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ سے ان کی ناکامی کا احتساب کیا مگر صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ کی سازشوں کے مقابلے میں سعادت خاں کی ایک نہ چلی اور اس کی تجویز مسترد کر دی گئی۔

خاندوراں نے بادشاہ کو یہ بات سمجھائی کہ اس نے مرہٹوں کو صرف ان علاقوں کے دینے کا وعدہ کیا تھا، جو باغی، روہیلوں اور دوسرے سرکش سرداروں کے قبضے میں تھا ویسے مرہٹہ سردار شاہی تخت کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اس نے کہا مرہٹوں کو فوجی طاقت سے مطیع نہیں کیا جا سکتا۔ میں باجی راؤ کو اس بات پر رضامند کر لونگا کہ وہ اپنے بھائی چمناجی کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجے اگر ان مانگوں کو پورا کر دیا گیا تو مستقبل میں شاہی علاقے ان کے حملوں سے محفوظ رہ جائیں گے اس کے برعکس اگر سعادت خاں اور نظام الملک میں سمجھوتہ ہو گیا تو وہ دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھا دیں گے۔[1]

اس میں کوئی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اگر سعادت خاں کو مرہٹوں کی سرکوبی کا کام سونپ دیا جاتا۔ اور بادشاہ کا اسے تعاون مل جاتا تو باجی راؤ کو اپنی مانگوں پر نظر ثانی کرنے اور ان کو کم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ مگر شاہی امراء باہمی نفاق اور شازشوں میں اپنی طاقت ضائع کر رہے تھے۔ اور ہر شخص مرہٹہ سرداروں سے علیحدہ علیحدہ مقابلہ کرتا تھا۔

۱۷۳۶ء میں باجی راؤ کو مالوہ کی گورنری عطا کر دی گئی۔ چوں کہ اس کی کل مانگیں پوری نہ ہوئی تھیں لہذا ۱۷۳۷ء میں مرہٹہ سردار دوآبہ کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے شمالی ہند آئے۔ اور سعادت خاں کو دوسرے

---

[1] بہاے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین ۲/ ص ۹۸-۱۰۰، حدیقۃ الاقالیم ص ۳۴۳-۳۴۴، تاریخ چغتائی ص ۱۹۲ الف، تذکرۃ الملوک ۱۳۳ الف-۱۳۴ الف، احوال الخواقین ص ۱۴۱ الف، شاہنامہ منور کلام (قلمی رام پور) ص ۲۰۰-۲۰۱

مغلیہ سرداروں، وزیر اور میر بخشی کے ساتھ متحد ہونے سے باز رکھا۔ مگر سعادت خاں نے اپنے زور بازو سے مرہٹوں کو مار بھگایا۔

سعادت خاں کی اس کامیابی سے محمد شاہ بہت خوش ہوا، اور اس پر انعام واکرام کی بارش کی، کچھ دنوں آگرہ میں قیام کے بعد سعادت خان آگر متھرا میں صمصام الدولہ اور محمد خاں بنگش سے آملا۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ باجی راؤ نے دہلی پر دھاوا بول دیا۔ اور وہ، ذالحجہ ۱۱۴۹ھ کے قریب دہلی کے قریب جا پہونچا۔ یہ خبر سن کر سعادت خاں و دیگر امراء دہلی پہونچے مگر ان کے پہونچنے سے پہلے ہی باجی راؤ راجپوتانہ کی طرف جا چکا تھا۔ اس موقع پر پھر سعادت خاں نے اپنی پرانی تجویز کہ اگر اسے آگرہ، گجرات، مالوہ اور اجمیر کی صوبہ داری عطا ہو، پیش کی اور مرہٹوں کے تہس نہس کرنے کا بیڑا اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ چونکہ صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ اس تجویز کی مخالفت کرتے تھے، لہذا بددل ہو کر وہ اودھ واپس چلا آیا۔

کرنال کا محاربہ اور سعادت خاں کا آخری زمانہ

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس خبر کو سن کر محمد شاہ مع اپنے درباری امراء کے نادر شاہ سے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ اور کرنال میں پہونچ کر خیمہ زن ہوا۔ شاہی حکم کے مطابق سعادت خاں برہان الملک، ابو المنصور خان کو اپنا قائم مقام بنا کر بڑی بڑی تیز رفتاری سے کرنال کے لیے روانہ ہوا۔ جب کرنال تھوڑی دور رہ گیا تو اس نے اپنا مال و اسباب اور بیشتر افواج عقب میں چھوڑ کر اور خود برق رفتاری سے شاہی خیموں میں جا پہونچا۔ جب نادر شاہ کو اس بات کا

علم ہوا تو اس نے اپنا ایک فوجی بھیجکر سعادت خاں کی فوج کی ناکہ بندی کرلی۔ اور ان پر حملہ کرکے جنگی مال و اسباب لوٹ لیا۔ سعادت خاں برائے کورنش بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ درباری امراء جنگ کے متعلق صلاح و مشورہ میں غرق تھے۔ اور نظام الملک کی رائے تھی کہ ابھی جنگ شروع نہ کی جائے۔ اسی اثناء میں سعادت خاں کو اپنے لشکر کے لٹ جانے کی اطلاع ملی۔ اس خبر سے سعادت خاں بے چین ہو گیا۔ اس نے بادشاہ کے روبرو رکھی اپنی تلوار اٹھالی اور جنگ کے لیے جانے کی اجازت چاہی۔ نظام الملک نے جلد بازی سے کام لینے سے منع کیا اور اس نے کہا کہ سعادت خاں کی فوج ایک ماہ کے لمبے سفر کی وجہ سے تھک چکی تھی۔ اور سہ پہر سے زیادہ وقت گذر چکا تھا۔ دوسرے امراء اور بادشاہ کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن ذی حس اور بد دماغ سعادت خاں نے کسی کی بھی بات نہ مانی اور بڑی پھرتی سے اپنے ایک ہزار سوار اور کچھ پیدل سپاہ کو لے کر غنیم کی طرف بڑھ گیا اور توپ خانے کی تیاری کا موقع بھی نہ دیا۔ اس نے ایک نقیب کے ذریعے اپنی سپاہ کو تیاری کا حکم بھیجا لیکن تھکی ماندی سپاہ اپنے خیموں سے ٹس سے مس نہ ہوئی اس کے علاوہ انھیں اس بات کا یقین بھی نہ آیا کہ سعادت خاں نے ایسا حکم صادر کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ ان کی اطلاع کے مطابق بادشاہ کی خدمت میں گیا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے چار ہزار سوار اور ایک ہزار پیدل سپاہ اس کے ساتھ پہونچ پائی۔

اس جنگ میں سعادت خاں زخمی ہوا۔ ایرانی سپاہیوں نے گرفتار کر لیا۔ اور نادر شاہ کے خیموں میں لے جایا گیا[1]

(حاشیہ ص ۳۴۷ پر)

عشاء کی نماز کے بعد سعادت خان کو نادر شاہ کے روبرو پیش کیا گیا۔ سعادت خان نے نادر شاہ کے سوالات کا جواب بڑی دانشمندی سے دیا جن کو سن کر وہ بہت خوش ہوا[1]۔ بعد کے ایک سوال کا جواب اس نے ان الفاظ میں دیا:

"بادشاہ کے وسائل بہت وسیع ہیں۔ ان کا صرف ایک ہی امیر آج جنگ کرنے آیا تھا۔ اور اچانک زخمی ہو جانے کی وجہ سے واپس لوٹ گیا۔ لیکن اس کے علاوہ ابھی بہت سے امیر اور ایسے راجا ہیں جن کے پاس بے شمار فوج ہے"۔

یہ بات سن کر نادر شاہ ششدر رہ گیا اور سعادت خان کے مشورہ کے مطابق وہ نظام الملک سے صلح کرنے پر راضی ہو گیا[2]۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶ ۔) [5] برائے تفصیل جنگ ملاحظہ ہو۔ تاریخ جہان کشائے نادری ص ۲۳۵ – ۲۳۷، ۳۳، سیر المتاخرین ۲/ ص ۱۰۶ – ۱۰۸ خزانہ عامرہ ص ۴۳ – ۴۵، بیاض یوسف علیخان ص ۲۱۷ الف – ۲۲۰ ب۔ چہار گلزار شجاعی ۳۲ الف – ۳۱ الف و ب ۸۲ الف – ۹۲ الف، تاریخ راحت افزا ص ۱۳۰ – ۱۳۲۔ تاریخ چغتائی ص ۴۹ الف – ۵۹ الف اخبار محبت ص ۷۷ – ۸۴ میزان دانش ص ۵۶ – ۵۷، تاریخ ہندی ص ۵۵۹ – ۵۶۰، آشوب ۱/ ص ۸۷ ب ۲/ ص ۱۹۸ ب ۲۲۰ الف رسالہ محمد شاہ و خاندوران خان ص ۱۰۳ ب – ۱۲۷ ب ۔

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد / ص ۲۵ – [2] تاریخ ہندی "گفت خداوندان یکی از بندگان شاہ ہندوستان بود کہ امروز بشما جنگید ہمین قسم و قدر ہم در لشکر و ہم در اطراف و جوانب مملکت بسیار کس از امرایان و لشکری از راجایان بوفور حشمت و شجاعت ملتفا زائد از (بقیہ ص ۳۴۸)

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سعادت خاں برہان الملک بہت دنوں سے امیر الامرائی کے عہدے کا خواہش مند تھا اور نظام الملک نے ہمیشہ اسے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جب کبھی بھی یہ عہدہ خالی ہوگا اسی کو عطا کیا جائیگا مگر صمصام الدولہ کے زخمی ہونے اور فوت ہونے کے بعد محمد شاہ نے یہ عہدہ نظام الملک کو تفویض کر دیا۔ اس خبر کو سُن کر اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس بات سے اسے بے حد غصہ آیا اور جذبۂ انتقام میں اس نے نادر شاہ سے کہا:

"محمد شاہ کے لشکر میں آصف جاہ کے علاوہ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کے نزدیک دو کروڑ روپیے کی کچھ حقیقت نہیں ہے اس قدر رقم تو غلام اپنے گھر سے دے سکتا ہے۔ باقی امرار اور خزانہ بادشاہی اور مہاجن وغیرہ کا کیا ذکر۔ اگر شاہ جہاں آباد تک کوچ کیا جاوے، جو تیس چالیس کوس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تو حصول مدعا ممکن ہے"[1]

ہرچند اس کا بیان ہے:

"برہان الملک چوں بر ایں حال اطلاع یافت بمجرد ایں ماجرا

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۷) عہدہ کہ امر کلی اطمینان خاطر خیر اندیش در مصلحت ہمیں است کہ چیزی بطریق خرچ راہ گرفتہ مراجعت بولایت خود فرمایند"۔ نادر شاہ ۔۔۔۔ صلح قرار یافت' ص ۵۲۸ - ۵۲۷ - نیز ملاحظہ ہو - تاریخ چغتائی ص ۱۵۵ الف -

[1] سیر المتاخرین ۲/ ص ۸۰ ۔ تاریخ ہندی ص ۵۲۸-۵۲۷۔

حسد در نہادش افتاد۔ بسبب آنکہ از مدت آرزوی این خدمت داشت و آصف جاہ بارہا باو وعدہ ساختہ بود کہ خدمت بخشی امیر الامرائی بہ تو سپیدہ ام۔ چون برخلاف آمد ازین سبب فتنہ و فساد عظیم برپا شد و آتش خفیہ بیدار گردید۔[1]

جملاً نادر شاہ اور محمد شاہ کے مابین طے شدہ معاہدہ کے تحت نادر شاہ دہلی آیا۔ سعادت خان کو دونوں بادشاہوں کی طرف سے وکیل مطلق بنا کر طہماسپ جلائر کے ہاتھ قلعہ کی کلید دے کر انتظامات کے لیے بھیجا گیا۔[2]

نادر شاہ کے دہلی آنے، قتل عام اور زبردستی روپے کی تحصیل کے بارے میں تفصیلی ذکر پہلے حصہ میں کیا جا چکا ہے جس کے یہاں دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

سعادت خان کی وفات: | چند دنوں کے بعد مارچ ۱۹/۱۷۳۹ء کو سعادت علیخاں کا

---

[1] چہار گلزار شجاعی ص ۸۸ ب تا ۹۰ الف تاریخ ہندی ص ۵۰-۵۱-۵۲، نیز ملاحظہ ہو۔ تاریخ مظفری ۱/ص ۲۳۳ الف رکلیات سنگھ۔ خلاصۃ التواریخ ص ۱۲۵-۱۲۶ میزان دانش ص ۵۰، آشوب ۲/ص ۲۳۹ الف و ب، ۲۵۳ ب-۲۶۱ الف بیاض یوسف علیخان ص ۱۱/۲ الف۔

[2] سیر المتاخرین ۲/ص ۹۰، تاریخ جہاں کشائے نادری ص ۲۳۹-۲۴۴، خزانہ عامرہ ص ۵۰، بیاض یوسف علیخان ص ۱۲ ب، میزان دانش ص ۵۰-۸۰ تاریخ ہندی ص ۵۵، آشوب ۲/۲۶۰ ب-۲۶۱ ب، رسالہ محمد شاہ و خاندوران خان ص ۱۲۵ ب مآثر الامراء ۱/ص ۳۶۶۔

انتقال مرض سرطان کی وجہ ہو گیا۔[1] مگر چہار گلزار شجاعی میں لکھا ہے کہ زر معہود جو اس کو نادر شاہ کی خدمت میں پیش کرنا تھا کی کم یابی کی وجہ سے اپنی عزت بچانے کی غرض سے الماس کھا کر جان دیدی تھی۔[2] علی قلی خاں داغستانی نے سعادت خاں کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا۔

دور از تو سپہر واژگون میگردد | بنگر کہ زمانہ بیتو چون میگردد
رفتی ز جہان و پشت شمشیر شکست | با قامت خم ہمیشہ خون میگرید[3]

سعادت خاں صاحب کردار، شجاع، سخی، سپاہ پرور، دین دار، راست گو، حق شناس، روزہ و نماز و تلاوت کا پابند تھا۔ اور اثنا عشری عقائد کا پیرو کار تھا۔[4] وہ شاعر بھی تھا اور[5] شاعروں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ اس سلسلے میں بعد میں تفصیلی گفتگو ہوگی۔

---

[1] سیر المتاخرین (ا - ت) ۲/ص ۱۱۰، خزانۂ عامرہ /۵، عماد /۲۸ نیز دیکھئے بیاض یوسف علیخان /۱۰۲ ب، تاریخ محمدی ۲/ ۱۰۰، تاریخ چغتائی /۱۹۲ الف، تاریخ ہندی /۴۳۵، رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں /۱۲۸ الف، تاریخ سعادت جاوید / ۳۰۶-۳۱۳ -

[2] چہار گلزار شجاعی /۱۰۹ ب نیز آشوب ۲/ص ۲۹۳ الف و ب، تاریخ فرحت افزا میں لکھا ہے "کہ از غم بستہ کاری کہ داشت روح با عالم دیگر افراختہ" ۱۳۲-۱۳۳، لیکن تاریخ محتشم کا بیان کتب مذکورہ کے برعکس ہے "۱۱۵۱ھ از چند ماہ دنبل ظاہر شدہ بود... آخر بہمان وجہ روح مبارک او ملازم بہشت برین شد /۱۰۱ ب۔ [3] خزانۂ عامرہ /۶، [4] تاریخ سعادت جاوید /۳۰۱ [5] تذکرہ نتائج الافکار /۱۵

کیا نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کیلئے مدعو کیا گیا تھا

ہم عصر تاریخی کتابوں اور ان کی بنیاد پر انگریزی کتابوں[1] میں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ ہندوستان کے امیروں نے نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔

کچھ کا تو بیان ہے کہ یہ جرم نظام الملک سے سرزد ہوا تھا۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ سعادت خاں نے نادر شاہ کو بلایا تھا۔ نظام الملک کے سلسلے میں طباطبائی کا بیان ہے کہ نظام الملک نے اپنے دشمنوں کے قلع قمع کرنے کے لیے نادر شاہ کو بلایا تھا[2] لوکہارٹ کا خیال ہے کہ اس غداری کا ارتکاب نظام الملک یا سعادت خاں نے کیا تھا۔ یا دونوں کی سازش سے نادر شاہ ہندوستان آیا تھا۔" چین قلیچ خاں نظام الملک، تورانی نسل کا تھا۔ اور سعادت خاں ایرانی، لہذا ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی مغلیہ حکومت سے وفاداری کا جذبہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کے خلاف نہ تو اس جرم کے ارتکاب کا ثبوت ملا ہے۔ اور غالباً آئندہ بھی نہ مل سکے گا۔ اور یہ صرف اسی وقت ثابت ہو گا جب وہ خطوط دستیاب ہو جائیں جو انھوں نے نادر شاہ کو بھیجے تھے[3]

---

[1] Frazer The History of Nadir Shah. PP 129-133- Otter, I P. 355; Hanway I V P. 142 Lockhart: Nadir Shah P. 124 fn. 20 Grose: (m Tur) II, P. VI,

[2] سیر المتاخرین ۱/ص ۷۰ [3] نادر شاہ ص ۱۲۴

گر رسالہ محمد شاہ و خانہ دوراں خاں کے کچھ اجزا[۱] کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو کسی حد تک یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سعادت خاں نے صمصام الدولہ کو زیر کرنے کی غرض سے نادر شاہ کو بلایا تھا۔ چوں کہ ان دونوں امرا میں شکر رنجی تھی لہٰذا سعادت خاں :-

"مدتی تحریص و تحریک نادر شاہ بادشاہ ایران می نمود۔ و تحفہ و تحائف لکہامی فرستاد و مدام بی نسقی و بی انتظامی سلطنت حضرت محمد شاہ و اختلاف امرائے نامدار کا مگاری نوشت چنانچہ ایمان و ارکان و دیگر بسر شریک مشورہ شدہ بنیاد فساد و خرابی مملکت را استحکام تمام دادند"[۲]

جس زمانے میں محمد شاہ نے سعادت خاں کو برائے جنگ نادر شاہ طلب کیا تھا۔ تو درباری امرا نے بادشاہ سے اس سلسلے میں عرض کیا تو اس نے جواب دیا۔

"ہر چند نواب بخشی الممالک بدریافت۔ چناں خسروان مال او ممانعت می کردند کہ او سازشی دارد و این ہمہ کرد با شور فتنہ و فساد در ملا آمدہ انگیختہ او ست طلب او محض بے جا ست و خیالی

[۱] اس کتاب کے مصنف کا علم نہیں ہے۔ لوکہار صاحب نے جوہر صمصام (مصنفہ محمد محسن صدیقی) اور تاریخ ہندی (رستم علی) کے مصنفوں کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ وہ صمصام الدولہ کے زبردست حامیوں میں سے تھے، لہٰذا ان کے بیانات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ [۲] رسالہ محمد شاہ و خانہ دوراں خاں ص ۳۰ الف

کاراست سی فرمودند کہ من در آئینہ طل چہرۂ زنگ آلودہ کدورت ونفاق او را خوب وجہ معائنہ کردہ ام واین تصویر مصدیق رسانیدہ شکل بدیہی الابتہاج بکرائے خطوط او رتضمن طلبش بودند بغرض بیان جلوہ دادہ ام" [1]

مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ جب صمصام الدولہ جنگ کے میدان میں اترا اور قزلباش سپاہ اس کے سامنے ٹھہر دسکی تو اس نے نادری سپاہ کی ہمت افزائی کی اور وہ صمصام الدولہ کی سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ علاوہ ازیں مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ سعادت خان بذات خود گرفتار ہوا تھا۔

"سعادت خان کہ غدر و تمرد در نادرین ازیش بریدہ حیلہ دیگر انگیختہ۔ خود بہ لشکر نادر شاہ مردود اسیر میکردہ بجناب حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الزمانی عرض میکند کہ من مقید ام و پنجاہ لک روپیہ صلح کردہ ام" [2]

مگر تاریخ ہند کے بیانات کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس سازش میں دونوں شامل تھے۔ دربار عام میں نادر شاہ نے نظام الملک اور سعادت خان کو بڑی بری طرح سے پھٹکارا۔

"ناسزا گفت۔ وموعظہ سیاست فرمود۔ چوں اندر بار باہنر

[1] رسالہ محمد شاہ وخاندوران خان ص ۱۱۴ الف

[2] ایضاً ص ۱۱۴ الف

[3] ایضاً ص ۱۱۹ ب

نظام الملک بکمال مکر و تزویر کہ از قدیم در سرشت او است با برہان الملک سخنان ملائم درقت آمیز درمیان آوردہ گفت کہ حالا از دست این خالی مخلصی نیست بجز آنکہ ہمیں وقت بخانہ رفتہ جام زہر ہلاہل خوردہ طریق باید پیمود کہ جان را تصدیق آبرو باید کرد و شما نیز ہمیں کنید۔ پس آں سرآمد ملک مسخرت و تزویر بخانہ خود رفت و از اقربا خود حرف وصایا بیان آوردہ جام شربت نوش کردہ چادر برسر کشیدہ بخفت۔ برہان الملک چوں سپاہی سخت بود و از تزویر آں شیخ کبیر اطلاعی نداشت با صفار افغانش فی الفور جام زہر بکار بردہ رہ نورد ملک عدم شد" [۱]

اس بات سے بھی کچھ شبہہ ہوتا ہے کہ سعادت خاں کسی حد تک اس سازش میں ملوث تھا۔ محمد شاہ کے تیرھویں سنِ جلوس کے زمانے میں جب علی مردان خان ایرانی سفیر دہلی آیا تو اس نے سعادت خاں کے ہاں قیام کیا اور اس کی وساطت سے محمد شاہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ [۲] ایسی صورت میں بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان کے حالات ان سفیروں کے ذریعہ ایران بھیجا کرتا ہو۔ اخبار محبت کے مصنف کا بیان ہے کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ نادر شاہ کو آصف جاہ نظام الملک نے بلایا تھا تاکہ خاندوران خان کا قلع قمع کر سکے۔ [۳]

---

[۱] تاریخ ہندی ص ۵۱۲، ۵۱۳

[۲] تاریخ ہندی ص ۵۱۷، آشوب ۱/ ص ۳۸۱، الف و ب۔ ۱۴۰ ب

[۳] برائے تفصیل دیکھئے۔ اخبار محبت ۱۱۲

ابوالمنصور خان صفدر جنگ

۱۷۰۸ء تا ۱۷۵۴ء

جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے ابوالمنصور خان صفدر جنگ کا اصلی نام مرزا محمد مقیم تھا۔ وہ جعفر بیگ خان کا دوسرا بیٹا اور سعادت خاں برہان الملک کا ہمشیر زادہ تھا۔ جعفر بیگ خاں، قرا یوسف کی اولاد میں سے تھا جو قراقونیلو قبیلے کا ایک ترک تھا۔ اور ایران کے صوبہ آذربائیجان میں واقع تبریز نامی مقام کا حاکم تھا۔ قرا یوسف کو، جس کا سلسلۂ پدری طاؤس تک پہونچتا ہے جس کا تعلق دوسرے امام حسن کی نسل سے تھا۔ امیر تیمور نے (۱۳۶۹ء – ۱۴۰۵ء) اس کے ملک سے مار بھگایا تھا۔ لیکن بعد میں شاہ تیمور کے دوسرے بیٹے، شاہ رُخ مرزا کے عہد حکومت میں جہاں شاہ بن قرا یوسف نے تبریز پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد قرا یوسف کی اولاد اس علاقے پر منصور مرزا کے زمانہ تک حکومت کرتی رہی جو شاہ عباس اول (۱۵۸۲ء – ۱۶۲۸ء) کا ہم عصر تھا۔ شاہ عباس اول نے منصور مرزا کو بیدخل کر دیا اور اسے اپنے ساتھ لاکر نیشاپور میں آباد کر دیا۔ اور اس کے گذارے کے لیے جاگیر عطا کی۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا محمد مقیم کے والد جعفر بیگ خان، منصور مرزا کی چھٹی پیڑھی پر تھے۔[1]

---

[1] جلد ا ص ۸ – ۹، خزانۂ عامرہ ص ۴۰، تاریخ راحت افزا ص ۳۹۲

ابتدائی زندگی اور طالب علمی | جعفر بیگ خان اپنی دوسری بیبیوں سے زیادہ سعادت
خاں کی بہن سے محبت کرتا تھا۔ اس کے بطن سے دو لڑکے۔ مرزا محسن اور مرزا محمد مقیم
تولد ہوئے۔ جس وقت مرزا محمد مقیم کی کچھ ماہ کی اور بڑے بھائی کی عمر دو سال کی تھی
کہ ان کی والدہ نے وفات پائی۔ لہٰذا ان دونوں بچوں کی پرورش سعادت خان
کی دوسری بہن اور ان کی خالہ نے کی جس کی شادی سعادت خان کے چچیرے بھائی
میر محمد شاہ بن میر محمد یوسف سے ہوئی تھی[1] اپنے وطن میں مرزا محمد مقیم ایک بہادر
اور خوش عہد لڑکے کی صورت میں بڑا ہوا۔ مرزا محمد مقیم کی تعلیم عمدہ ہوئی تھی۔ اور
وہ شائستہ اور تہذیبی اقدار سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ان خطوط سے جو اس نے
سعادت خاں کی زندگی اور اس کے بعد لکھے تھے، اس بات کے ثبوت ملتے ہیں کہ
فارسی زبان پر اس کو قدرت حاصل تھی[2] اس عہد کے تقاضوں کے مطابق اس نے
فوجی تربیت بھی حاصل کی ہوگی۔ جیسا کہ ہندوستان میں آنے کے بعد اس کی زندگی
سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہندوستان میں ابتدائی زمانہ اور تربیت ۱۷۳۹ء ـ ۱۷۲۳ء | ابھی مرزا محمد مقیم کی عمر ۱۶ سال کی ہی تھی کہ
سعادت خاں نے اسے ہندوستان بلایا
اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سعادت خاں اودھ کا گورنر تھا۔ اپریل ۱۷۲۳ء میں مرزا
محمد مقیم پانی کے جہاز سے بندر سورت میں اترا۔ اور وہاں سے دور دراز کا بری
سفر طے کر کے فیض آباد پہونچا۔ چونکہ وہ حسن اخلاق اور علم و ادب کے زیورات سے

---

[1] سوانحات سلاطین اودھ ۱/ص ۲۱

[2] ملاحظہ ہو، منصور المکاتیب نیز حدیقۃ الاقالیم ص ۱۴۴/۳۰ ـ ۴۴۳، عماد ص ۳۱

آراستہ تھا، اس لیے سعادت خاں نے اپنی بڑی بیٹی صدرالنساء کو اپنے اسکے ساتھ منسوب کر دیا۔ اس کے بعد نواب نے اپنے داماد کو اودھ کا نائب گورنر مقرر کردیا اور محمد شاہ بادشاہ سے اس کے لیے ابوالمنصور خان کا لقب دلوایا۔

نائب گورنری کے عہدہ پر رہ کر مرزا محمد مقیم نے فوجی اور سول انتظامی امور کے تجربات حاصل کیئے جو بعد میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے جب وہ اپنے خسر کے جانشین کی حیثیت سے اودھ کا گورنر ہوا۔ سعادت خاں نے مرزا محمد مقیم کو، جسے وہ اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اپنا جانشین بنایا اور صوبے کے انتظامی امور میں اسے شریک کار کر لیا۔ اس طرح اس نے اپنے خسر اور دیوان آتما رام، جو ماہر مالیات تھا، کی نگرانی میں مالی، فوجی، دونوں امور میں لیاقت حاصل کر لی، کچھ دنوں کے بعد سعادت خاں نے مرزا مقیم کی نگرانی ہی میں صوبے کا انتظام چھوڑ دیا اور خود دہلی چلا آیا۔[۵۱]

اس تربیت کے دوران میں ابوالمنصور خان نے جنگی قیادت کرنے کی تربیت اور تجربہ بھی حاصل کیا۔ ۱۷۲۴ء کے بعد جتنی بھی اہم جنگیں سعادت خاں نے لڑیں، ان سب میں ابوالمنصور خان بھی شریک تھا۔ ۱۷۳۵ء میں ابوالمنصور خاں اپنے خسر کے ساتھ بھگونت سنگھ کچھی کے ساتھ جنگ کے موقع پر سعادت خاں کا ہمرکاب تھا۔ اسیطرح دوسری جنگوں میں اس کی شرکت کا حال ہم عصر کتابوں میں ملتا ہے۔[۵۲]

---

[۵۱] عماد ص ۹۔

[۵۲] ایلیٹ ۲/ ص ۳۴۲

اودھ کی گورنری ۱۷۳۹ء-۱۷۵۴ء

۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو سعادت خاں برہان الملک نے وفات پائی اور جانشینی کے مسئلہ پر کچھ تنازعہ ظہور میں آیا۔ شیر جنگ[1] اور ابوالمنصور خان دعویدار تھے۔ چونکہ مرحوم سے دونوں کا قریبی تعلق تھا۔ نثار محمد خاں شیر جنگ نے طہماسپ خان جالیسری کی وساطت سے نادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ محمد شاہ سے اس کے حق میں سفارش کریں اور اس نے اپنے دعوے میں کہا کہ جب تک مرحوم کا بھتیجا موجود ہے اس وقت تک اس کے داماد کو جانشین نہیں بنانا چاہیے۔ ابوالمنصور خان کی طرف سے بھی نراتن نے، جو سعادت خان کا وفادار خادم تھا۔ اور اس کے خاندان کے لوگ تواتر سے دربار مغلیہ میں اودھ کے حاکم کی طرف سے وکیل تھے۔ دربار شاہی میں عبدالباقی خان، ایرانی وزیر، کے وسیلے سے عرضی دی تھی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ سعادت خاں کی املاک کا نہ تو اس کا بھتیجا اور نہ ہی داماد وارث ہے بلکہ سعادت خاں کی انتقال کے بعد بادشاہ اس کی املاک کا وارث ہے۔ وہ جسے چاہیں عطا کریں۔ لیکن اگر ان دونوں ہی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا منظور ہو تو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سعادت خاں شیر جنگ سے خوش نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بھتیجے کو نظر انداز کر کے اپنی لڑکی کی شادی اپنے بھانجے سے کی تھی۔ حالانکہ اول الذکر کا مرحوم سے گہرا رشتہ تھا۔ علاوہ ازیں ہر لحاظ سے ابوالمنصور خاں زیادہ مناسب اور تربیت یافتہ ہے۔ وہ ایماندار، قابل اعتماد اور خدا ترس ہے۔

---

[1] نثار محمد خاں۔ سعادت خان کے بڑے بھائی، میر محمد باقر (سعادت خاں) کا بیٹا تھا۔ اور محمد شاہ کے زمانہ میں اسے شیر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ سعادت خاں کا انتقال ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء-۱۷۴۰ء میں ہوا تھا۔ سوانحات سلاطین اودھ ا، ص ۲۱، اخبار محبت ص ۴۴

اس میں عدالت و خصائل پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے خسر کی افواج میں بہت
زیادہ ہر دلعزیز بھی تھا۔ اس کے لیے اس نے نادر شاہ کی خدمت میں پیشکش کے لیے
دو کروڑ روپیہ کا بھی بندوبست کیا تھا۔[1]

چونکہ اس عہدہ پر تقرری کا انحصار مالی وسائل پر تھا۔ لہٰذا ابو المنصور خان
کے حق میں فیصلہ ہوا کیونکہ اس کے قبضے میں اپنے خسر کی دولت تھی۔ مختصر یہ کہ
نادر شاہ کے واپس جانے کے بعد محمد شاہ نے ابو المنصور خاں سے دو کروڑ
روپیہ وصول کیے۔ صفدر جنگ کے خطاب کے ساتھ اودھ کی گورنری عطا کی
اور اس کے خسر کی جاگیر بھی اسے تفویض کی۔[2]

سعادت خاں کے انتقال کے بعد اودھ کے علاقے میں پھر سے بدنظمی اور
طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اور تیلوئی کے راجہ نے بغاوت کا علم بلند کر دیا جس کی
حمایت دوسرے مسلمان زمیندار بھی کر رہے تھے۔ صفدر جنگ نے اپنی بیوی کی
ہمت افزائی پر ان کا مقابلہ کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور باغیوں کو شکست فاش
دی۔[3] یہ واقعہ ۱۷۴۱ء میں ظہور میں آیا۔ صفدر جنگ کو بدرجہ مجبوری بنی نگر اور

---

[1] تاریخ جہاں کشائے نادری میں ایک کروڑ روپیہ لکھا ہے۔ ص ۲۲۲۔

[2] چہار گلزار شجاعی ص ۲۲۳ ب، خزانۂ عامرہ ص ۷۶

[3] خزانۂ عامرہ ص ۷۶، میزان دانش "نواب صفدر جنگ جدید و از ولایت رسیدہ" بعد برہان الملک مالک دولت آوردہ گردیدہ" ص ۴۴،

Memoirs of Dehli and Faizabad: II PP. 246-47

کھٹیر کے زمینداروں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ اس علاقے کا حاکم راجہ نول سنگھ تھا۔ جو بہت ہی جری اور دلاور تھا۔ صفدر جنگ نے اس پر حملہ کیا۔ بنی نگر کے قلعہ کا محاصرہ کر کے راجہ کا ناطقہ بند کر دیا۔ آخر کار راجہ نے فرار کا سہارا لیا۔ اس کے کافی سپاہی مارے گئے۔ آخر میں تنگ آکر راجہ نے اطاعت قبول کر لی اور اس کا علاقہ اسے واپس دیدیا گیا۔

۱۷۳۹ء میں نواب شجاع الدین کی وفات کے بعد اس کا نااہل لڑکا، سرفراز خاں، مشرقی صوبوں (بہار، بنگال، اور اڑیسہ) کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اپریل ۱۷۴۰ء میں علی وردی خاں[۱] نے اس کو قتل کر دیا۔ اور خود ان علاقوں کا صوبہ دار بن بیٹھا، ایک کروڑ روپیہ اور کافی تعداد میں جواہرات بھیجکر دربار شاہی سے فرمان بھی حاصل کر لیا[۲]۔

علی وردی خاں کے ایک ناراض امیر، میر حبیب نے مرہٹہ سرداروں کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا۔ ۱۷۴۲ء میں بھاسکر پنڈت نے، جو ناگپور کے راگھوجی بھونسلہ کا فوجی ایک سردار تھا۔ اڑیسہ کے علاقے پر دھاوا بول دیا۔ بیچیت پر گنے کو تہس نہس کر دیا[۳]۔ علی وردی خان نے مرہٹوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں اور ساتھ ساتھ اس نے محمد شاہ کو بھی لکھا کہ وہ شاہی پیش کش کی رقم اس وقت تک ادا نہ کر سکے گا۔ جب تک مرہٹوں کا

---

[۱] برائے تفصیلی حالات ملاحظہ ہو۔ علی وردی اور اس کا عہد (انگریزی) کے۔ کے۔ دتا

[۲] سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۲/ ص ۱۱۳-۱۱۵، ۱۲۱-۱۲۲

[۳] سیر المتاخرین ۲/ ص ۱۲۱-۱۲۸۔

اس کے علاقے میں قیام رہیگا۔ اور اس کے علاوہ اس نے بادشاہ سے فوجی امداد کی درخواست بھی کی۔ محمد شاہ نے صفدر جنگ کو حکم دیا کہ وہ فوراً علی وردی خاں کی مدد کے لیے کمک لے کر پہونچے اور اس سلسلے میں عمدۃ الملک امیر خان کو جو الہ آباد کا گورنر تھا۔ حکم ہوا کہ وہ صفدر جنگ کو فوراً روانہ کر دے۔[۱] محمد شاہ نے پیشوا باجی راؤ کو بھی اس سلسلے میں خط لکھا جسکی رگھوجی بھونسلا سے دشمنی تھی کہ وہ ثانی الذکر کو مار بھگائے۔ اس خدمت کے عوض میں محمد شاہ نے باجی راؤ کو تینوں صوبوں سے چوتھ کی وصولیابی اور مالوہ کی گورنری کی سند جاری کرنے کا وعدہ بھی کیا۔[۱]

چنار اور رہتاس کے قلعے: بنگال کی مہم پر روانہ ہونے سے قبل صفدر جنگ نے محمد شاہ بادشاہ سے درخواست کی کہ اودھ کے علاقے میں سرکش زمیندار ہیں۔ اور اس کی غیر موجودگی میں وہ لوگ بغاوت کر سکتے ہیں لہذا وہ بنگال جانے سے پہلے اپنے اہل و عیال کو محفوظ مقامات میں چھوڑنا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور رہتاس اور چنار کے قلعے اسے دیدیے۔[۲]

پٹنہ میں صفدر جنگ کا ورود: صفدر جنگ کے ورود کی خبر سن کر پٹنہ کے باشندوں اور نیز نائب صوبہ دار سید حیات علی خان، جو مشہور مورخ طباطبائی کے والد تھے، کے دلوں میں خوف و ہراس اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کیونکہ

۱؎ سیر المتاخرین ۲/ص ۱۴۸-۱۵۰، ماثر الامراء ۱/ص ۳۶۵، خزانہ عامرہ ص ۴۷، تاریخ رحمت خانی ۱۳۶/ First Two Nawabs of Oudh. P. 95. ۵۲

۲؎ سیر المتاخرین ۲/۱۴۹، ماثر الامرا ۱/ ص ۳۶۵، خزانہ عامرہ ص ۴۷

انھوں نے پہلے ہی سے سن رکھا تھا کہ قزلباش افواج نے دہلی کے باشندوں پر کیا کیا مظالم توڑے تھے۔ مختصر یہ کہ سید حیات علی خان نے شہر سے باہر نکل کر صفدر جنگ کا خیر مقدم کیا اور ۱۷ دسمبر ۱۷۴۲ء کو صفدر جنگ شہر میں داخل ہوا۔ اور قلعہ خالی کرا کر خود مقیم ہو گیا۔[1] ابھی صفدر جنگ پٹنہ میں ہی مقیم تھا کہ علی وردی خان نے بھاسکر پنڈت کو اپنے علاقے سے کھدیڑ دیا۔ اس کامیابی کے بعد وہ مرشدآباد واپس آیا۔ اور صفدر جنگ سے اپنے صوبے کو واپس جانے کی درخواست کی[2] دوسری وجہ واپسی کی یہ بھی تھی کہ بالاجی باجی راؤ، بندیل کھنڈ سے چل کر الہ آباد کے راستے سے بنارس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا اس خبر کو سن کر صفدر جنگ برق رفتاری سے واپس آیا۔ اور فیض آباد جانے کے بجائے اس نے بنارس کی طرف رُخ کیا۔ مگر اس کے وہاں پہونچنے سے پہلے ہی بالاجی راؤ بنارس سے آگے بڑھ چکا تھا لہٰذا وہ فیض آباد واپس آگیا۔

صفدر جنگ کا میر آتش کے عہدہ کا پانا اور روہیل کھنڈ کی فتح۔

۱۷۴۳ء۔ ۱۷۴۶ء۔ نادر شاہ کی ایران کے لیے واپسی کے بعد محمد شاہ بادشاہ نے تورانی امیروں کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا لہٰذا اس نے اب یہ سوچا کہ وہ ایرانی امرا کی سرپرستی کرے تاکہ وہ ان کو تورانیوں کی طاقت توڑنے کے لیے استعمال کر سکے ان ایرانیوں میں سب سے زیادہ چہیتے امیر جن کو وہ نظام الملک اور قمرالدین خان کے مقابلے میں استعمال کرنا چاہتا تھا

---

[1] سیر المتاخرین ۲/ ص ۱۵۰

[2] ایضاً ۲/ ص ۱۵۰ - ۱۵۱، مآثر الامرا ۱/ ص ۳۶۵، خزانۂ عامرہ ص ۷۶،

عمدۃ الملک امیر خان اور اسحاق خان موتمن الدولہ تھے۔ جن کو بخشی سوم اور دیوان کے عہدے دیے گئے۔ محمد شاہ اپنے وزیر قمر الدین خان کو معزول کرنا چاہتا تھا۔ عمدۃ الملک کو وزیر بنانے کا خواہشمند تھا۔ مگر اس بات کی ہمت اس وجہ سے نہ کر سکا کیونکہ وزیر نے مستعفی ہونے کی دھمکی دیدی تھی۔ اور نظام الملک کے ساتھ شہر کے باہر شریک ہوگیا تھا۔ جہاں اول الذکر پہلے ہی سے خیمہ زن تھا۔ اور دکن جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ قصہ کوتاہ نظام الملک کے مشورے پر بادشاہ نے عمدۃ الملک کو الہ آباد کا گورنر بنا کر دربار سے ہٹا دیا تاکہ وزیر کی شکایات رفع ہو سکیں۔[۵۲]

عمدۃ الملک کے جانے کے بعد موتمن الدولہ محمد اسحاق خان کو عروج حاصل ہوا[۵۳] اپریل ۲۸۔ ۱۷۴۰ء کو اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مرزا محمد اسحاق خان نجم الدولہ نے بادشاہ کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ اسی زمانے میں نظام الملک دکن کے لیے روانہ ہوا۔ اور وزیر قمر الدین خان عیش و عشرت کے دلدل میں پھنس گیا۔ لہذا ایرانی پارٹی کو درباری سیاست میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ عمدۃ الملک خاموش نہ بیٹھ سکا اور اپنی پارٹی کی طاقت بڑھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی منصوبے کے تحت اس نے صفدر جنگ کی سرپرستی شروع کی۔

اگست ۱۷۴۳ء اور ۱۱۵۶ھ میں ایرانی پارٹی کو مستحکم کرنے کی غرض سے

---

۵۲ سیر المتاخرین ۲/ص ۱۱۰-۱۱۲، ۳/ص ۲، خزانہ عامرہ ص ۴۷

۵۳ ایضاً ۳/ص ۲

محمد شاہ نے امیر خان اور صفدر جنگ کو ان کے صوبوں سے دربار میں طلب کیا۔[۱۵]
جب صفدر جنگ دہلی کے قریب دجوار میں پہونچا تو وزیر قمر الدین خاں نے باہر نکل کر اس کا خیر مقدم کیا۔ تھوڑی دیر اس کے ساتھ رہا اور پھر واپس چلا آیا۔ صفدر جنگ شہر میں داخل ہو کر حویلی دارا شکوہ میں مقیم ہوا۔[۱۶]

دہلی پہونچنے کے بعد عمدۃ الملک نے اپنی پارٹی کو مضبوط کرنے کی غرض سے بادشاہ کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ حفیظ الدین خان، تورانی سردار، داروغہ توپخانہ اور وزیر قمر الدین خان کے متوسل کو معزول کر دے اور اس عہدے پر صفدر جنگ کو مقرر کر دے لہذا ۲۱ مارچ ۱۷۴۳ء کو صفدر جنگ کا اس عہدے پر تقرر ہو گیا۔ چونکہ اس عہدہ دار کے فرائض میں بادشاہ اور اس کے خاندان کے تحفظ کا فرض بھی شامل تھا۔ لہذا صفدر جنگ نے قلعہ کے اندر سکونت اختیار کی۔[۱۷]

اب صفدر جنگ کو بادشاہ کی سرپرستی حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا اپنے عہدہ کے علاوہ اسے ۱۴ اکتوبر ۱۷۴۳ء کو اسد اللہ خان انساکن تخلص کے فوت ہو جانے کے بعد کشمیر کی گورنری بھی عطا کر دی گئی۔ اس صوبے میں حکومت کرنے کے لیے اس نے اپنے خلیرے بھائی شیر جنگ کو بھیجا۔ شیر جنگ نے وہاں پہونچکر بابر اللہ کو، جو ایک طاقتور باغی سردار تھا۔ دھوکے سے قید کر کے وہاں نظم و نسق قائم کیا۔ اور افراسیاب کو

---

۱۵ سیر المتاخرین ۳/ص ۵-۶، چہار گلزار شجاعی ص ۳۸ ب

۱۶ ایضاً ۳/۶ ایضاً ص ۳۸ ب

۱۷ ایضاً ۳ ص ۸/ ایضاً ص ۳۸ ب، خزانۂ عامرہ/ ۱۸، عماد/ ۳۲

وہاں کا حاکم بنا کر دہلی واپس چلا آیا۔[1]

علی محمد خاں روہیلہ: بہادر شاہ (۱۷۰۷-۱۷۱۲ء) کے دور حکومت میں ایک اوالعزم داؤد نامی غلام اپنے آقا شاہ عالم خان کے گھر سے، جو افغانستان میں واقع روہ نامی علاقے کے تارو شاہمت پور کا باشندہ تھا، بھاگ کر ہندوستان چلا آیا اور روہیل کھنڈ میں، جو اس زمانے میں کٹھیر کے نام سے موسوم تھا۔ ایک مقامی سردار کے ہاں ملازمت کرلی۔ مدکر کے سردار مدار شاہ کے ہاں کے نوکری کے زمانے میں داؤد نے بنگولی کے حاکم کے خلاف فوج کشی میں حصہ لیا۔ جس میں دوسری چیزوں کے علاوہ ایک خوبصورت سات یا آٹھ سالہ جاٹ کا لڑکا بھی ہاتھ لگا۔ داؤد نے اس بچے کو مسلمان بنا لیا اور اس کا نام علی محمد خان رکھا۔ اور اس کو لے پالک بنا لیا۔ چونکہ وہ لاولد تھا۔ کچھ برسوں کے بعد داؤد خاں نے مدار شاہ کی ملازمت ترک کردی اور کمایوں کے راجہ دیپ چند کے ہاں ملازم ہو گیا۔

---

[1] سیر المتاخرین ۳/۸

[2] گلستان رحمت (ایلیٹ) ص ۵-۷، سیر المتاخرین میں امیرزادہ لکھا ہے ۳/۹، آشوب ۲/۱۰ اصلش از قوم جاٹ برائے تفصیل دیکھیے۔ ص ۳۱۸ الف و ب، نیز جام جہاں نما ص ۴۹۳-۴۹۷، اخبار الصنادید نجم الغنی (۱۹۱۸) ص ۱۲-۸۰ نے اسکو سید زادہ بتایا ہے۔ اور اس کا نسب نامہ حضرت محمدؐ صاحب تک پہونچا دیا ہے۔ اسی بنا پر دہ نوابین رامپور کو بھی سید ثابت کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد، اجا اور مرادآباد کے نائب فوجدار عظمت اللہ خان کے مابین جنگ کے موقع پر داؤد نے اپنے آقا کے ساتھ غداری کی اور جنگ کے موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نتیجتاً راجہ کے حکم سے اس کی گردن زدنی کی سزا ملی اب علی محمد خان داؤد کی فوج کا سردار ہو گیا۔ اور اس نے عظمت اللہ خان کے ہاں ۱۷۲۲ء میں نوکری کر لی[1]۔

اسی زمانے میں اس نے محمد شاہ کے وزیر قمر الدین کی سرپرستی حاصل کر لی جو ایرانی پارٹی کو کچلنے اور زیر کرنے کے لیے مددگاروں کی تلاش میں تھا۔ ۱۱۵۰/۱۷۳۷ء - ۱۷۳۹ء میں اس نے جانسٹھ کے سید سیف الدین خاں کو میدان جنگ میں قتل کر دیا۔ اس خدمت کے صلے میں اسے نواب کا خطاب ملا اور سالانہ مالگزاری میں کمی کر دی گئی (حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ اسے ۵۰۰۰ کا منصب بھی عطا ہوا۔ ص ۱۳۹) نادر شاہ کے حملے کے دوران میں علی محمد خان نے پیلی بھیت تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور سالانہ مالگزاری بھی ادا نہ کی۔ اپریل ۱۷۴۱ء میں جب قمر الدین نے راجا ہرنند اور اس کے بیٹے، موتی رام کو مالگزاری کی وصولیابی کے لیے بھیجا، تو علی محمد خان نے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا[2] اور بہت تیز رفتاری سے مرادآباد، سنبھل، شاہ آباد، شاہجہاں

---

[1] گلستان (ایلیٹ) ص ۹-۱۰

[2] اخبار الصنادید ۱/ ص ۱۳۵۔

اور بریلی کے کئی دوسرے پرگنوں پر قبضہ کر لیا[1]۔ اس طرح سے غیر متوقع انداز میں اس کی عظمت اور طاقت بڑھ گئی۔ وزیر چونکہ عیش و عشرت میں پھنسا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے علی محمد خاں کو اس کے غاصبانہ مقبوضہ علاقے پر مستقل کر دیا اور سالانہ مالگذاری پر اس سے صلح کر لی[2]۔ اس کے بعد علی محمد خاں نے داؤد کے خون کا بدلا لینے کی غرض سے مرحوم دیپ چند کے جانشین راجہ کلیان چند پر حملہ کر دیا۔ راجہ کو شکست ہوئی۔ وہ الموڑہ کی طرف فرار ہو گیا۔ علی محمد خاں نے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا[3]۔

علی محمد خان کے خلاف صفدر جنگ کا بادشاہ کو اکسانا

فروری ۱۷۴۵ء۔ صفدر جنگ اور علی محمد خاں کے درمیان کشیدگی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ ثانی الذکر کی ریاست اودھ کے سرحدوں سے ملتی تھی جس کی حفاظت کے لیے نہ تو کوئی ندی ہی تھی اور نہ کوئی پہاڑی سلسلہ ہی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طاقتور اولوالعزم اور بے باک علی محمد خاں اپنی سرحدوں کو چاروں طرف آگے بڑھا رہا تھا۔ چونکہ مغرب میں دہلی بہت قریب تھی لہذا وہ اس جانب زیادہ آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ اور پہاڑوں کی رکاوٹ سے وہ شمال۔ مشرق کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ جنوب کی طرف اس لیے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ اس طرف ہم قبیلہ، محمد خاں بنگش کا علاقہ تھا۔ مدیق

---

[1] [illegible] حدیقۃ الاقالیم، ۱۳۹، سیر۔ ۳/۱۰۰۹

[2] حدیقۃ الاقالیم ۱۴۰، سیر المتاخرین ۳/ص ۱۰

[3] حدیقۃ ص ۱۴۰۔ گلستان (ایلیٹ) ص ۱۰

طور سے صفدر جنگ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ علی محمد خان اودھ پر چڑھائی کر دے گا۔ لہٰذا صفدر جنگ روہیلوں کی بستی کو اپنے لیے خطرے سے خالی نہیں سمجھتا تھا۔ اور اس کا موروثی علاقہ ان کے ہاتھوں غیر محفوظ تھا۔ آشوب ۲/ ص ۳۱۸ ب

۱۷۴۵ء کے ابتدائی زمانے میں صفدر جنگ کو محمد شاہ کو روہیلہ سرداروں کے خلاف فوج کشی کے لیے رضامندی کا سنہری موقع ہاتھ آگیا واقعہ یوں ہے کہ داروغۂ عمارت کے زیر نگرانی اس کے کچھ ملازمین کمایوں پہاڑیوں کی ترائی میں لکڑی کاٹ رہے تھے۔ علی محمد خاں نے انھیں مار بھگایا یہ خبر سنکر صفدر جنگ غصہ سے آگ بھبھوکا ہو گیا۔ اور اس نے بادشاہ سے شکایت کی اور فوج کشی کی تجویز پیش کی[۱]۔ چونکہ محمد شاہ بھی علی محمد خاں کی کھلے بندوں نافرمانی سے تنگ تھا۔ لہٰذا اس نے تجویز مان لی[۲]۔

۲۵ فروری ۱۷۴۵ء کو محمد شاہ نے دہلی سے علی محمد خان کی سرکوبی کے لیے کوچ کیا۔ اس کے ہمراہ وزیر قمرالدین خان، امیر خاں، اور دیگر امراء

---

[۱] حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ صفدر جنگ نے اس جنگ کی تیاری کے لیے ایک لاکھ۔ پچاس ہزار روپیے بھی بادشاہ کو دیئے۔ ص ۱۴۰، اخبار محبت ص ۴۴۲ - ۳۴۴

[۲] اس زمانے میں علی محمد خان نے ایک باغی اور بادشاہ کا طرز عمل اختیار کر لیا تھا۔ اس نے پیشکش کی رقم بھیجنا بند کر دی۔ لال خیمہ بنوایا جو صرف بادشاہ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ مآثر الامراء ۲/ ص ۳۴۸

اور ایک بڑی فوج تھی۔ علی محمد خان بن گڑھ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ آخر کار تنگ آ کر اسے فرار ہونا پڑا قلعہ پر شاہی قبضہ ہو گیا اور حملہ آوروں کے ہاتھوں بے حد مال و اسباب لگا[۱]

روہیلہ سردار کو اپنی حمایت کے لیے محفوظ رکھنے کی غرض سے قمرالدین خاں نے مداخلت کی اور بادشاہ سے اُسے معاف کر دینے کی درخواست کی، درخواست قبول ہو گئی۔ اور علی محمد خاں نے شاہی اطاعت قبول کر لی۔ بادشاہ مع علی محمد خان کے دہلی واپس چلا آیا[۲]۔ یہ سیاسی انتشار امراء کی آپسی نفاق، عناد اور چالبازیوں کی وجہ سے تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ایک دوسرے کی تذلیل کے درپے ہوتے، اور ذاتی اغراض کی تحصیل کے لیے اپنی طاقت اور وسائل کو ضائع کرتے[۳]۔ بڑے حیرت کی بات ہے کہ شاہانِ مغلیہ بن گڈھ کے چھوٹے سے قلعہ پر اس وقت تک قابض نہ ہو سکے جب تک کہ علی محمد خاں نے خود ہی قلعہ خالی نہ کر دیا۔

کچھ دنوں دہلی کے قیام کے بعد قمرالدین خاں نے علی محمد خان کو علاقہ سرہند کا

---

[۱] سفرنامہ آنند رام مخلص ص ۱-۴۴۔ سیر ۳/ص ۱۰-۱۱

[۲] سفرنامہ آنند رام مخلص ص ۵۰ مابعد، سیر ۳/ص ۱۱۔ حدیقۃ ۱۴، مآثر الامراء ۱/ص ۳۵۹ ۲/ص ۳۴۸ خزانہ عامرہ ص ۷۰، اخبار محبت ص ۴۴۴-۴۸۴ تاریخ سعادت جاوید ص ۲۹۸ آشوب ۲/ص ۳۱۷ الف ۳۲۱ب تاریخ مظفری ۱/ص ۲۵۹ب-۲۶۰ب

[۳] سیر ۳/ص ۱۱ تاریخ فرح بخش (تاریخ فرخ آباد) ص ۱۲ب-۲۰۰ب

فوجدار مقرر کرکے بھیجا[1]۔ جب جنوری ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا تو علی محمد خاں، جو اس سے پہلے ہی رسل و رسائل رکھتا تھا۔ بادشاہ کی اجازت کے بنا بھاگ کر بہادر پور پہونچ گیا۔ وہاں سے مرادآباد پہونچ کر وزیر کے نائب اور بریلی کے فوجدار سید ہدایت علی خان کو اطاعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اور ۲۵ ستمبر ۱۷۴۸ء کو مرض استسقا میں اس نے وفات پائی[2]۔

شجاعت الدولہ کی شادی: محمد شاہ، امیر خاں کے اس طرز عمل سے نالاں تھا۔ جو اس نے اس کی طرف خود اور نجم الدولہ اسحاق خاں کی طرف اختیار کیا تھا لہذا ثانی الذکر کے وقار کو بڑھانے کی غرض سے اس نے نجم الدولہ کی لڑکی صفدر جنگ کے لڑکے جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) سے رشتہ عقد کی تجویز پیش کی۔ چونکہ بادشاہ اس لڑکی کو اپنی لڑکی کے برابر سمجھتا تھا۔ اور بڑی چہیتی تھی یہ لڑکی بعد میں بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ شادی ۱۷۴۵ء کے اواخر میں

۱؎ خزانہ عامرہ ص ۷۷، اخبار محبت۔ ص ۲۸۶، مخلص، خلاصۃ التواریخ ۱۹۳ ب ۱۹۴ ب، جام جہاں نما ص ۸۰، شہر آشوب ۲/ ص ۳۲۲ الف ۳۲۳ الف تاریخ فرح بخش (تاریخ رام پور) ص ۳۰ ب تا ۳۲ ب

۲؎ حدیقۃ الاقالیم ص ۱۴۱، گلستان (ایلیٹ) ص ۲۰۸، سیر ۳/ ص ۱۹-۲۱۔ اخبار محبت ۲۸۷، ۲۹۵-۲۹۶ جام جہاں نما ص ۸۰ شہر آشوب ۲/ ص ۳۲۳ الف۔ تاریخ فرح بخش (تاریخ رام پور) ص ۳۳ ب - ۳۴ الف

پایۂ تکمیل کو پہونچی۔[1]

۱۵ جنوری ۱۷۴۷ء کو عمدۃ الملک امیر خان کے قتل[2] کے بعد صفدر جنگ ایرانی گروہ کا قائد بن گیا۔ وزیر قمرالدین خان عیش و عشرت میں غرق تھا۔ اور دکن میں نظام الملک بہت ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ اور اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں امراء میں صفدر جنگ ہی ایک صاحب اقتدار اور بڑی امیر تھا۔ اور اوسط درجے کے امیروں میں سب سے زیادہ تجربہ کار طاقتور

---

[1] سیر ۳/ص ۱۳- عماد ص ۳۶ اخبار محبت ۱/ ۲ ۸۶

[2] عمدۃ الملک امیر خان کا قتل محمد شاہ کے ایما سے عمل میں آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ عمدۃ الملک بادشاہ سے ناراض ہو کر سلیم گڑھ میں مقید سلاطین کی ملاقات کو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمدۃ الملک کے دشمنوں نے بادشاہ کے کان اس کے خلاف بھرے۔ اور بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا۔ ایک دوسرے موقع پر عمدۃ الملک نے بادشاہ سے کسی معاملے میں طویل گفتگو کی اور بادشاہ کے بار بار کہنے پر گفتگو کا سلسلہ ختم نہ کیا چوں کہ بادشاہ اس سے تنگ آچکا تھا۔ لہٰذا اس نے روح افزوں ناظر سے کہا کہ اسکا خاتمہ کر دیا جائے۔ ناظر نے جواہر نامی شخص کو جو عمدۃ الملک کے ہاں ملازم تھا اور ناراض ہو کر مستعفی ہو چکا تھا اس کام کیلئے آمادہ کیا۔ لہٰذا ۱۱۵۹ھ ۲۳ ذی الحجہ کی صبح کو جب وہ بادشاہ کی ملاقات سے دیوان خاص کے دروازے پہ آیا خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو سیر ۳/ص ۱۲-۱۴ "ختم عمدہ" اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

خزانہ عامرہ ص ۷۷-۸۰، بہار گلزار شجاعی ص ۱۰۰/ب-۱۰۱ الف اخبار محبت ص ۹۳ تاریخ سعادت جاوید ص ۲۲۱-۲۲۳، تاریخ مظفری ۱/ص ۲۰۷ ب

اور ذہنی اعتبار سے سنجیدہ سمجھا جاتا تھا۔ محمد شاہ کی نظر میں اس کو اہم حیثیت حاصل تھی، اور مرہٹوں جیسے مرہٹوں سے سیاسی تعلقات، اسی کے ذریعہ عمل میں آئے تھے۔ ۱۱۶۱ھ میں صفدر جنگ کو اودھ کے علاوہ صوبہ الہ آباد بھی دیدیا گیا ۔[۱]

ابدالی حملہ ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۷ء حصہ اول میں ہم تفصیل سے ابدالی حملے کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ محمد شاہ نے جن امیروں کو ابدالی حملہ آور سے مقابلے کے لیے بھیجا تھا ان میں صفدر جنگ بھی شریک تھا۔ اس جنگ میں مغلیہ فوج کو کامیابی حاصل ہوئی اور ابدالی فوج نے فرار کی راہ لی۔ واپسی میں افواج مغلیہ راستے ہی میں تھی کہ محمد شاہ بادشاہ کا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں وصال ہو گیا۔ صفدر جنگ نے شہزادہ احمد شاہ کو تخت شاہی پر بٹھا دیا اور مابعد صفدر جنگ کو وزارت کا عہدہ ملا۔ چونکہ احمد شاہ اور صفدر جنگ کے تعلقات کئی وجوہ کی بنا پر کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ لہذا دونوں میں جنگ کی نوبت آگئی اور آخر کار صفدر جنگ کو صلح کرنی پڑی اور بادشاہ نے اس کی خدمت کے صلے میں اسے اودھ کا گورنر برقرار رکھا ۔[۳]

۱؎ خزانۂ عامرہ۔ ص ۶۸

۲؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ حصۂ اوّل۔ ص۔ چہار گلزار شجاعی ص ۱۱۸ ب۔

۳؎ ۵۲۳ الف خزانۂ عامرہ ص ۸۸، ۷۹، ۸۲ - بوساطت بقرار بحالی صوبۂ اودھ مع الہ آباد صلح اتفاق دیانت ۱۰/ ذی الحجہ ۱۱۶۷ کو وہ اودھ کیلئے روانہ ہوا۔ تاریخ راحت افزا ص ۲۶۳ - ۲۸۳ - ۳۸۳ - تواریخ ممالک ہندوستان۔ ۱۲۵ الف تاریخ مظفری ۲۴۵ ۱۹۱ الف - ۲۸۶ الف ۳۱۰ ب تا ۳۲۳ ب

صفدر جنگ کا انتقال۔ ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء | اودھ پہنچنے کے بعد صفدر جنگ ازسرِ نو اپنے صوبے کی مالی اور فوجی تنظیم میں لگ گیا اور ساتھ ہی باغی زمینداروں کی سرکوبی اور مرہٹوں کے حملوں سے علاقے کے دفاعی کاموں میں مشغول ہو گیا۔ اسی زمانے میں مرہٹوں نے آکر سورج مل جاٹ کو کمھیر کے قلعے میں محصور کر لیا اور عماد الملک ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ احمد شاہ بادشاہ نے مرہٹوں کے مقابلے کے لیے کوچ کیا اور سکندرہ آباد میں خیمہ زن ہوا۔ صفدر جنگ بھی بادشاہ کی امداد کے لیے مہندی گھاٹ تک آیا اور بادشاہ کے علی گڑھ پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس کے برعکس احمد شاہ بادشاہ سکندر آباد کے آس پاس ہی رہا اور آگے نہ بڑھا اور آخرکار مرہٹوں نے اس کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ اور بادشاہ شاہی مستورات کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ان واقعات کے پہلے حصے میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ مہدی گھاٹ سے واپسی کے بعد صفدر جنگ پھر اپنے ملکی امور میں منہمک ہو گیا تاکہ وہ مرہٹوں اور عماد الملک کا شکار نہ بن سکے جو اودھ کو ہتھیانے کے خواہاں تھے۔ اسی زمانے میں اس کے پیر میں ایک دنبل نکل آیا جس نے ناسور کی صورت اختیار کر لی۔ تجربہ کار اور ہوشیار حکیموں نے علاج کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اور گومتی کے کنارے پاپر گھاٹ پر ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ / ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء کو اس نے وفات پائی۔ اس کی نعش

۱؎ سیر ۳/ ص ۴۴-۵۵، مآثر الامراء ۱/ ص ۳۶۳-۳۶۴، عماد ص ۶۵ نے ۱۱۶۶ تاریخ وفات لکھی ہے جو غلط ہے، میکی آپ بیتی ص ۱۰۶، چہار گلزار شجاعی ص ۱۳۱، الفغانہ سعادرہ ص ۵۶، تاریخ راحت افزا ص ۲۹۳۔ تاریخ سعادت جاوید ورق ہوتا تھا۔ ۲۴۳-۲۴۴ تاریخ مظفری ۱۱/ ص ۲۷ ب ۱۲۹ ب

دہلی جہاں اس کو شاہ مرداں میں دفن کر دیا گیا۔ شجاع الدولہ نے اپنی صوبہ داری کے زمانے میں اس کی قبر کے اوپر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا۔ جس پر تین لاکھ روپیہ صرف ہوئے۔ اور ہندوستان میں فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ پیمانے کی عمارت ہے۔ اس مقبرے کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہے۔ جس سے اس کی وفات کی تاریخ نکلی ہے۔

چوں آں صفدر عرصہ مردی۔ زدار فنا گشت رحلت گزیں
چنیں سال تاریخ او شد رقم۔ کہ بادا مقیم بہشت بریں

نواب شجاع الدولہ

<u>ولادت اور ابتدائی زندگی</u>، مرزا جلیل الدین حیدر، جو شجاع الدولہ کے لقب سے مشہور و معروف ہیں، دہلی میں دارا شکوہ کی حویلی میں ۲۲ رجب ۱۱۴۴ھ/۱۹ جنوری ۱۷۳۲ء کو پیدا ہوئے تھے[۱] چونکہ برہان الملک سعادت خان کے نواسے تھے اس وجہ سے اس موقع پر بڑے پیمانے پر جشن منعقد ہوئے۔ اور موصوف نے اس خیال سے کہ یہ دن یادگار زمانہ رہے بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ مرزا جلیل الدین حیدر بالعموم اپنے خاندان اور بالخصوص اپنے نانا کے منظور نظر تھے اور ایام طفلی کے آٹھ سال اپنے نانا کے سایہ عاطفت میں گذارے۔ چوں کہ نواب سعادت خان کے اکلوتے لڑکے کا انتقال طفلی ہی میں ہو چکا تھا۔ اور جب

---

[۱] "برآمد آفتاب از مطلع نور" سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ تحریک ۲ اش ۳/ ۱۹۶۲ء کلیات تاریخ ۱۳/۷۔

ان کی عمر ۵۰ سال سے تجاوز کر گئی تو وہ دوسری اولاد کی ولادت کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ اور اب اس بات کی امید بھی باقی نہیں رہی کہ ان کا کوئی لڑکا ان کا جانشین ہو گا، بدیں وجہ انھوں نے اپنے بھانجے اور داماد مرزا محمد مقیم کو (جو ابوالمنصور خان صفدر جنگ کے نام سے مشہور ہیں) خراسان سے بلوا لیا تھا۔ اور اپنی بیٹی صدر النساء کا اس کے ساتھ رشتہ کر دیا تھا۔ اپنے داماد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور صوبۂ اودھ کے نائب کا عہدہ عطا کیا۔ اس کے بعد صوبے کا ملکی اور مالی نظام مرزا مقیم کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ دہلی چلے گئے۔ اور دربار مغلیہ کی سیاست میں پوری طرح سے حصہ لینے لگے۔

بسم اللہ خوانی | ہندوستان کے دستور کے مطابق مرزا جلیل الدین حیدر کی رسم بسم اللہ خوانی چوتھے سال ادا ہوئی۔[1] جب ان کی عمر ۱۲ سال کی ہوئی تو ایران کے مشہور عالم شیخ محمد حسینؒ کو ان کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے معلم ان کو زیادہ دنوں تک تعلیم نہ دے سکے ہوں گے کیونکہ کچھ ہی دنوں بعد صفدر جنگ کا انتقال ہو گیا۔ علاوہ ازیں مرزا جلال الدین حیدر کو دینی تعلیم سے قدرے دلچسپی نہ تھی اس لیے انہوں نے اپنے معلم سے کوئی رابطہ نہ رکھا ہو گا۔ ایام طفلی میں مرزا جلال الدین بلا کے شریر تھے مگر بلا کی ذہانت بھی پائی تھی۔ اور بلاشبہ ایسا یقین کیا جاتا تھا کہ جو کچھ بھی انہیں پڑھایا گیا ہو گا۔ وہ سب کچھ ذہن نشین ہو گیا ہو گا۔ مجملاً، ان کو عربی، فارسی

---

[1] ملاحظہ ہو۔ نور القلوب / ۱۶۷، نالۂ عندلیب ا/ص ۲۴

[2] برائے تفصیل دیکھئے۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) ۲/ ۲۶۳۔۲۶۴

ترکی اور ہندوستانی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ہرچرن داس نے تو یہاں
تک لکھا ہے کہ وہ ہندی بھاشا اور انگریزی زبان سے بھی روشناس تھے۔[۱]
ریاضی، خوش نویسی اور فن موسیقی میں پوری قدرت حاصل تھی۔[۲]

مرزا جلال الدین وجیہہ، لحیم شحیم اور جری تھے۔ جسمانی طاقت بے حد تھی۔
فن تیراکی، کشتی گیری، پنجہ کشی۔ گھوڑسواری، تیراندازی، نیزہ بازی، تلوار
بازی، بندوق اندازی، اور دیگر فنون حرب کی اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔[۳]
حالاں کہ ابتدائی جوانی سے لہو ولعب میں ڈوب گئے تھے۔ تاہم انھوں نے
اپنی بہادری، سیاسی بصیرت اور جفاکشی کی وجہ سے اپنے صوبے کو غنیم
اور لالچی پڑوسیوں کے تسلط سے محفوظ رکھا۔ مرہٹوں کو اودھ میں گھسنے نہ دیا۔
مرزا جلال الدین کی مشکل سے بھی آٹھ سال کی عمر ہوئی ہوگی کہ ان کے
نانا نے وفات پائی۔ اور والد صفدر جنگ ان کے جانشین کی حیثیت سے والیٔ
اودھ ہوئے۔ چونکہ اس زمانے میں دربار مغلیہ سے عطا ہونے والے عہدے
عملی طور سے موروثی ہو چکے تھے۔ لہذا فی الواقع ۵ سال کی عمر میں مرزا
جلال الدین ایک متمول صوبے کے وارث بن گئے۔ ۱۷۴۳ء میں صفدر جنگ
حسب الحکم محمد شاہ دہلی پہونچا۔ مرزا جلال الدین کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

---

۱ چہار گلزار شجاعی / ۲۲۳ الف۔

۲ ایضاً / ۲۲۳ الف

۳ ایضاً / ۲۲۲ ب - ۲۲۳ الف

۴ سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۴۰/۳

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ صفدر جنگ کو میر آتش کا عہدہ تفویض ہوا۔ اس عہد کے ضوابط کے مطابق صفدر جنگ نے قلعہ معلی میں سکونت اختیار کی۔ لہذا مرزا جلال الدین کو جن کی عمر ابھی بارہ سال ہی کی تھی، اکثر و بیشتر دربار میں جانے اور محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا سنہری موقع ملا۔

ایام پیری میں محمد شاہ بادشاہ کو بچوں سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور بالخصوص وہ مرزا محمد سے بڑی محبت کرتا تھا۔ جو اسحاق خاں موتمن الدولہ کا بڑا بیٹا تھا۔ شاہان مغلیہ کے دستور کے برخلاف وہ مرزا محمد۔۔۔ کو اپنے ساتھ تخت پر بھی بٹھا لیا کرتا تھا۔ جیسے کہ وہ شاہی خاندان کا فرد ہو۔ اور ضعیف العمر بادشاہ بعض مرتبہ یہاں تک کہہ دیتا تھا کہ "اگر محمد اسحاق نے مرزا محمد کو نہ چھوڑا ہوتا تو میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد میں کیونکر زندہ رہ سکتا تھا۔ اسی طرح محمد شاہ، محمد اسحاق خاں کے دوسرے دونوں بیٹوں، مرزا علی خاں اور محمد علی سالار جنگ سے بھی بے حد محبت کرتا تھا۔[۵]

یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا جلال الدین کی عمر بارہ[۱۲] تیرہ[۱۳] سال کی تھی، اور یہی سن مرزا محمد کے چھوٹے بھائیوں کا تھا۔ اور اول الذکر بھی اپنے والد کے ساتھ دربار میں جایا کرتا تھا۔ لازمی طور سے بادشاہ کے دل میں مرزا جلال الدین کے لیے کشش پیدا ہوئی ہوگی۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے مرزا جلال الدین کی شادی محمد اسحاق خاں کی بیٹی سے کروائی تھی۔

شادی: | چونکہ اس زمانے میں عمدۃ الملک امیر خاں کا جو اثر بادشاہ

---

[۵] سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/۳، دریائے لطافت (ا۔ش) ص ۱۲۵

محمد شاہ پر تھا۔ بڑی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے بادشاہ نے بقیہ دو ایرانی خاندانوں میں گہرا رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے اس رشتے کی تجویز پیش کی تھی۔ اور اس لڑکی کو اپنے پالک بنا کر خود شادی کی ذمہ داری لی اور بڑی دھوم دھام سے یہ شادی سن ۱۷۴۵ء میں پایہ تکمیل کو پہونچی۔[1] دولہا کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اور دولہن کی عمر غالباً ۱۲، ۱۳ سال کی تھی۔

یہ وہی زمانہ تھا کہ صفدر جنگ کی قسمت کا ستارہ عروج کی طرف مائل تھا۔ ۲۵ر اپریل ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ نے رحلت کی اور پانی پت کے قریب اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ ابدالیوں کے محاربے کے موقع پر وزیر الممالک قمر الدین خاں شہادت پا چکے تھے۔ اس لیے نئے بادشاہ نے صفدر جنگ کو وزیر کا عہدہ عطا کیا۔ اور اس کے منصب میں اضافہ کر کے آٹھ ہزار ذات اور آٹھ ہزار سوار کر دیا۔ علاوہ ازیں غسل خانے کی خدمات بھی صفدر جنگ کو سونپی گئیں۔ ایک ماہ کے بعد اجمیر کی صوبہ داری اور نارنول کی فوجداری کے عہدے بھی اُسے عطا ہوئے۔ لیکن اس نے اجمیر کے بدلے میں ذوالفقار خاں سے۔ جو میر بخشی تھا۔ الہ آباد کا صوبہ لے لیا۔ اسی دن مرزا جلال الدین کو جنکی عمر ساڑھے سولہ سال کی تھی، اعلیٰ منصب کے علاوہ شجاع الدولہ بہادر کا خطاب تفویض ہوا۔[2] ۱۷۵۰ء میں جب

---

[1] سیر المتاخرین ۳ (ا۔ ت) ص ۱۳، نیز دیکھئے۔ چہار گلزار شجاعی/ ۲۱۹ ب۔ ۲۲۰ الف، ۱۹۹ الف وب، اخبار محبت/ ۸۶ م ۳۸ قادر/ ۳۶۔

[2] تاریخ احمد شاہ / ۱۵ ب

صفدر جنگ نے احمد خان بنگش کے خلاف فوج کشی کی تو اس نے شجاع الدولہ کو اپنا قائم مقام وزیر بنایا۔ اس موقع پر صفدر جنگ کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا[1] اس شکست کی خبر سن کر تورانی پارٹی کے افراد اور جاوید خان نے احمد شاہ بادشاہ کو صفدر جنگ کے خلاف ورغلایا۔ اس کی جائداد پر قبضہ کرنے شجاع الدولہ کو وزارت کے عہدے سے معزول کرنے، اور انتظام الدولہ قمر الدین خاں کو وزیر مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ ایسی حالت میں شجاع الدولہ اپنے والد کے مخالفین کے جال میں پھنس گیا لیکن اس نے اپنی صاحب بصیرت و دانشمند والدہ کے مشورہ پر دس ہزار بہادر سپاہی جمع کرکے اپنی حویلی کی حفاظت کا انتظام کیا[2] اس وجہ سے سازش کرنے والوں کا منصوبہ ناکام رہا۔ اور اپنے والد کی واپسی تک شجاع الدولہ قائم مقام وزیر بنا رہا[3]۔ دوسری مرتبہ جب صفدر جنگ نے افغانوں پر فوج کشی کی تو شجاع الدولہ پھر قائم مقام وزیر رہا۔ اس مرتبہ بھی وہ صرف نام کا وزیر تھا۔ جب کہ تمام سیاسی اور مالی معاملات میں نواب جاوید خاں کو پورے اختیارات حاصل تھے۔ واپسی کے بعد صفدر جنگ نے جو نواب جاوید خان کے اختیارات کی سے تنگ تھا۔ سے دھوکا دے کر قتل کروا دیا[4] حالانکہ مجموعی طور پر اس

[1] میر کی آپ بیتی / ۱۰۵

[2] عماد / ۵۰

[3] سیر المتاخرین (ا - ت) ۳ / ۳۳

[4] تاریخ احمد شاہ / ۳۹ ب - ۴۰ ب سیر المتاخرین (ا - ت) ۳ / ۴۲ - ۴۳

قتل کے نتائج صفدر جنگ کے حق میں مسموم ثابت ہوئے۔ لیکن فی الفور اسے بادشاہ
کی ذات اور سیاسی معاملات میں مکمل اختیارات حاصل ہو گئے۔ صفدر جنگ
نے شاہی قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عہدوں پر اپنے نمائندوں کو مقرر
کیا، اور شجاع الدولہ کو میر آتش کے عہدے کے علاوہ نائب وزیر کا عہدہ بھی
ملا۔ علاوہ ازیں اسے وہ چار عہدے بھی ملے۔ جو نواب جاوید خاں کے پاس
تھے۔ یعنی احادیث، عرض مکرر۔ گرز برداران اور جلو خاص[1] اس کے چار ماہ
بعد بادشاہ نے غسل خانہ کا عہدہ بھی شجاع الدولہ کو عطا کیا۔ مگر کچھ ہی دنوں
بعد دربار میں صفدر جنگ کے خلاف سازشوں کا جال پھیل گیا۔ اور جب
مخالفوں کو پورا اقتدار حاصل ہو گیا تو انھوں نے سب سے پہلے شجاع الدولہ
کو میر آتش کے عہدے سے معزول کروانے اور قلعہ معلیٰ سے باہر نکلوانے کا
منصوبہ بنا لیا۔ مگر صفدر جنگ کے خوف سے کوئی دوسرا امیر اس عہدے کو
قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا لہذا یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ ۱۷۵۳ء میں
احمد شاہ نے شجاع الدولہ کے نائب موسوی خاں کو جو نائب میر آتش تھا۔
بلوایا۔ اور بھرے دربار میں اس کی تذلیل کی۔ آدھی رات کو بادشاہ کے حامیوں
نے یہ افواہ پھیلا دی کہ صفدر جنگ قلعہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔
اور اس وجہ سے گڑبڑی پھیل گئی۔ قلعہ میں جو صفدر جنگ کے نمائندے تھے،
وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور جو رہ گئے ان کو مار بھگا دیا گیا۔[2] اس کے بعد

---

۱ تاریخ احمد شاہ /۱۳۴ الف

۲ سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/۴۲۴۔

صفدر جنگ نے بادشاہ سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کیں۔ اس جنگ کے وجوہ اور نتائج کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

تخت نشینی | ۵ر اکتوبر ۱۷۵۴ء میں نواب صفدر جنگ کے انتقال کے بعد شجاع الدولہ اودھ اور الہ آباد کی مسند پر جلوہ افروز ہوا۔ جب نواب صفدر جنگ کی وفات کی خبر دہلی پہونچی تو عالمگیر ثانی نے شجاع الدولہ کے نام تعزیتی خط اپنے دست مبارک سے لکھ کر بھیجا اور اُسے اودھ کا باضابطہ صوبہ دار مقرر کیا۔[15] اس کے بعد بادشاہ نے شجاع الدولہ کو شش پارچہ کا خلعت اور صوبہ داری کے عہدے پر تقرری کا شاہی فرمان ارسال کیا۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہی کہ شاہی فرمان میں صوبہ الہ آباد کا کوئی ذکر نہ تھا۔ بعد میں بادشاہ نے اس صوبے کو اپنے نئے وزیر عماد الملک کو عطا کیا۔[16] لیکن اس خیال سے کہ ایک طویل اور خون ریز جنگ کے باوجود وہ اس صوبے پر قبضہ حاصل نہ کر سکے گا۔ عماد الملک نے صوبہ الہ آباد کی تنظیم کے بارے میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا اور یہ صوبہ بھی خاموشی سے شجاع الدولہ ہی کے قبضہ میں بطور ورثہ پہونچ گیا۔

تخت نشینی کے بعد شجاع الدولہ نے اپنے والد کے زمانے کے تمام عہدہ داروں کو برقرار رکھا۔ محمد قلی خان کو الہ آباد کا نائب صوبہ دار رہنے دیا۔ اور اسماعیل خان کابلی بطور مشیر خاص اور فوج کا کمانڈر

---

[15] تاریخ احمد شاہ ۱/۳۸ الف، خزانۂ عامرہ ۵/۸۰

[16] سیر المتاخرین (د۔ا۔ت) ۳/۸۴

بنا رہا[۲]۔ حالانکہ شجاع الدولہ کی عمر ابھی صرف ۲۳ برس کی تھی۔ لیکن نظام سلطنت کی طرف سے تغافل برتتا تھا اور لہو ولعب میں منہمک رہتا تھا[۳]۔ وہ حسن پرست اور امرد دوست تھا اور اس کے دیگر مشاغل کبوتر بازی پتنگ بازی بٹیر بازی اور اسی نوعیت کے دوسرے طفلانہ مشغلے تھے۔

قدرتی طور پر ملکی اور مالی معاملات کی باگ ڈور اسمٰعیل خاں کابلی کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جو اپنے اقتدار ماضی کو برقرار رکھنے اور نواب کو کٹھ پتلی بنا کر رکھنے کا خواہشمند تھا۔ مگر نواب کی طفلانہ حرکتوں نے اسمٰعیل خاں اور دیگر عہدہ داروں کو نواب کے برخلاف کر دیا، علاوہ ازیں نواب نے اپنی حرکتوں سے اپنی ہندو رعایا کو بھی اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ لہٰذا نواب کے امراء نے شجاع الدولہ کو معزول کرنے اور محمد قلی خاں کو مسند کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اس بیچ میں والدۂ نواب نے اپنی سیاسی بصیرت سے معاملہ کو رفع دفع کر دیا، محمد قلی خاں فیض آباد آیا اور کچھ دنوں وہاں ٹھہرنے کے بعد اپنے صوبے واپس چلا گیا[۴]۔

ہندوستان کا وزیر الممالک ہونا شجاع الدولہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ عماد الملک پر حملہ کر کے اُسے زیر کر سکتا۔ لہٰذا اس نے حکمت عملی سے اس عہدے کو حاصل کرنے

---

[۲] سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳/ ۴۸

[۳] خزانۂ عامرہ ۱۰۶/ ، تاریخ راحت افزا / ۲۹ سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳/ ۸۴۔

[۴] عماد / ۶۶–۶۸

کی کوشش کی اور علی قلی داغستانی کو اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سورج مل جاٹ کے پاس بھیجا اور اس کی حمایت حاصل کی۔ اس کے بعد علی قلی خاں نے سیف الدین محمد خان اور کشن چند کا اعتماد حاصل کیا اور ان کے توسط سے بادشاہ کو اس مسئلہ کی طرف رجوع کیا مگر وزیر کو بر وقت اس بات کا علم ہو گیا اور اس نے اس منصوبے کو ناکام کر دیا۔

شجاع الدولہ کو نہ بذات خود ہی انتظامی معاملات میں دلچسپی تھی لیکن اس خیال سے بھی کہ اس کے نائب کے جذبات مجروح ہوں گے، وہ کسی معاملہ میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ مگر سال بھر ہی کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۷۵۵ء کو اسمٰعیل خاں کابلی نے وفات پائی[۱] تو اب پھر بھی عیش و عشرت کے مشغلوں میں مصروف رہا۔ اور نظم و نسق کے تمام امور اپنے نئے نائب موسوی خاں کے ہاتھوں میں کلیتہً چھوڑ دیئے[۲]

<u>وزیر الممالک اور نواب آودھ کے مابین تصادم</u> | چونکہ صفدر جنگ اور عماد الملک کے آپسی تعلقات بے حد کشیدہ تھے اور اس کے علاوہ شجاع الدولہ نے ثانی الذکر کو وزارت کے عہدے سے معزول کرانے کا منصوبہ بھی بنایا تھا اس لیے جب عماد الملک کو پنجاب اور دیگر سیاسی معاملات سے فرصت ملی تو اس نے بنگش خاندان اور نواب شجاع الدولہ کے قلع قمع کرنے کی کوشش شروع کی۔ اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل کو پہونچانے کے لیے اس نے

---

۱ عماد / ۵۶

۲ ایضاً / ۶۲

احمد خاں بنگش کو الہ آباد کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ جا کر مجوزہ صوبہ پر قبضہ کر لے۔ مگر شجاع الدولہ کو جوں ہی اس بات کا علم ہوا تو اس نے فوری تادیبی کارروائی کی اور اپنی فوج بھیج کر احمد خاں بنگش کا راستہ روک لیا۔ اور محمد قلی خاں، نائب صوبہ دار الہ آباد کو دفاعی اقدام اٹھانے کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سورج مل جاٹ اور نواب نے وزیر الممالک کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے۔ لہذا نجیب الدولہ اور ناگر مل نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دی اور احمد خاں بنگش کی تقرری کا پروانہ منسوخ کروا دیا۔[1]

بلونت سنگھ کی کامیاب چڑھائیاں | گذشتہ دو سالوں سے اودھ اور الہ آباد کے سرحدی علاقوں میں بد امنی کی صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ صفدر جنگ کی کھلے بندوں بادشاہ وقت کی مخالفت، بغاوت اور طویل جنگ کے دوران میں اولوالعزم، زمینداروں کو نواب کی اطاعت سے روگردانی کرنے اور آزادی کا جھنڈا لہرانے کا سنہری موقع مل گیا۔ اس سلسلے میں بنارس کا راجہ بلونت سنگھ زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے پہلے اپنے عمدہ نظم و نسق، سیاسی بصیرت اور مالی وسائل سے اتنی فوجی طاقت حاصل کر لی تھی کہ ۱۷۵۲ء میں اس نے الہ آباد کے نائب صوبہ دار علی قلی خاں کو بڑی کامیابی سے شکست دی۔[2] ایک دوسرے

---

[1] تاریخ عالمگیر ثانی / ۹۰ ب ۹۸ ب، میر کی آپ بیتی / ۱۳۶-۱۳۷

[2] بلونت نامہ / ۲۵ الف۔

موقع پر دوبارہ اس نے صوبہ دار کی اطاعت سے روگردانی کی اور پیشکش ادا کرنا بند کر دیا۔ اور دونوں صوبوں کے نائب صوبہ داروں سے میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔[سلہ] بلونت سنگھ نے صفدر جنگ کی پریشانیوں اور خانہ جنگی کی ناکامیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور اپنے سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے اقدام اٹھائے۔ اس کا واحد مقصد وجے گڑھ کے قلعہ پر تسلط جانا تھا۔ جو مرزاپور سے مشرقی جانب ۵۰ میل اور بنارس سے جنوب کی طرف ۵۳ میل کی دوری پر واقع تھا۔ بلونت سنگھ نے پہلے پٹیا لطیف پور کو فتح کیا۔ اور اس کے بعد وجے گڑھ پر قبضہ حاصل کر لیا۔[سکہ] جس زمانے میں بلونت سنگھ یہ فتوحات حاصل کر رہا تھا، صفدر جنگ دہلی میں موت اور زندگی کی الجھنوں میں غرق تھا۔ جوں ہی اسے دہلی کی جنگ سے نجات ملی، وہ فی الفور فیض آباد آیا، اور بلونت سنگھ کی سرکوبی کے مقصد سے بنارس کے لیے روانہ ہوگیا۔ جب صفدر جنگ بنارس پہونچا تو اس سے پہلے ہی بلونت سنگھ نے فرار ہو کر چندرگی کے قلعہ میں پناہ لے لی تھی۔ چوں کہ صوبے کے دیگر زمینداروں نے بھی سر اٹھانے کی کوشش شروع کر دی تھی لہذا صفدر جنگ زیادہ دنوں تک بنارس میں قیام نہ کر سکتا تھا۔ ابھی وہ وہیں مقیم تھا کہ دہلی سے فرمان ملا کہ وہ فوراً دہلی چلا آئے اور اپنے دشمن مرہٹوں اور عماد الملک پر حملے میں شریک ہو جائے سابق وزیر نے حکم شاہی کی تعمیل کی اور بلونت سنگھ کو اس کے نئے مقبوضات میں چھوڑ دیا۔

[سلہ] تاریخ احمد شاہی/ ۱۱۲ الف

[سکہ] بلونت نامہ/ ۳۱ ب - ۵۳ الف

جب شجاع الدولہ مسند نشین ہوا تو اس نے بلونت سنگھ سے پیشکش ادا کرنے کی مانگ کی چونکہ بلونت سنگھ نے نئے مقبوضات میں اپنے قدم جما لیے تھے۔ اس لیے اس نے نواب کی مانگ کو ٹھکرا دیا۔ اس وجہ سے شجاع الدولہ کو اس پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

صفدر جنگ کی وفات کی وجہ سے صوبے کے نظم و نسق میں انتشار پیدا ہو چکا تھا اور لاقانونیت اور بدامنی پھیل چکی تھی۔ صفدر جنگ کے انتقال کے کچھ دنوں پہلے چنار کے قلعدار احمد بیگ خاں کا انتقال ہوا (۱۷۵۳ء) نواب نے مرحوم کے نابالغ لڑکے آغا جانی کو قلعدار مقرر کیا۔ اور اس کے غلام آغا میر کو اس کا نگراں مقرر کیا۔ اس وجہ سے چنار کے معاملات میں بھی بدنظمی وقوع پذیر ہو گئی تھی۔ اور یہی شجاع الدولہ کی تخت نشینی کا زمانہ تھا ان حالات کی وجہ سے بنارس کے راجا کو ایک ایسا موقع ہاتھ آیا جس کا وہ بہت دنوں سے منتظر تھا۔ اور اس نے چنار کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔ راجا کو یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ اگر وہ فوج کشی کے ذریعہ چنار کے قلعہ پر قبضہ کرے گا تو اسے نواب کی فوج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ لہذا اس نے رشوت کے ذریعہ اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آغا میر کو ایک لاکھ روپیہ رشوت میں دینے کی لالچ دی۔ اور اس طرح اس نے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن بروقت شجاع الدولہ کی مزاحمت سے راجا کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ شجاع الدولہ کو جب بنارس میں فرقہ وارانہ کشیدگیوں اور بلونت سنگھ کے چنار پر قبضہ کرنے کے منصوبوں کا علم ہوا تو قدرے اس کی حیرانی بڑھ گئی۔ لہذا اس نے موقع پر پہونچنے، مجرموں کو سزا دینے

اور شہر کے فرقہ وارانہ عناصر کو دبانے اور وہاں امن قائم کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ ۱۷۶۱ء میں ایک بڑی فوج ساتھ لیکر وہ جونپور کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے بعد بنارس کا رخ کیا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر بلونت سنگھ نے فرار ہو کر لطیف پور کے قلعہ میں پناہ لے لی، راستے میں نواب کو راجا کی خوش دامن کی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جو راجہ کے فرار ہونے کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اور اس کے دامن سے بزدلی کا داغ دھونا چاہتی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ نے یہی کوشش کی کہ صلح ہو جائے ورنہ مستقبل میں لکھا جاتا کہ اس نے ایک عورت پر مظالم توڑے تھے۔ مختصر یہ کہ راجہ ہمت بہادر نے درمیان میں پڑ کر اس بات پر صلح کر دی کہ وہ نواب کی عزت کو برتر رکھنے کی غرض سے قلعہ خالی کر دے اور پھر فوراً ہی اسے قلعہ کا قبضہ دیدیا جائے گا۔ اس سمجھوتے کے بعد نواب چنار کے لیے روانہ ہوا۔

غدار آغا میر نے فرار کی راہ لی، شجاع الدولہ نے چنار کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے معتمد افسر کو قلعدار مقرر کیا۔ اس کے بعد دوبارہ شجاع الدولہ بنارس پہونچا اور فضل علیخان بن عبداللہ اور غازی پور کے فوجدار کو حکم دیا کہ وہ بلونت سنگھ کو لطیف پور کے قلعہ سے مار بھگائیں۔ مگر راجا کوئی ایسا معمولی آدمی نہ تھا کہ وہ بآسانی نواب کے جال میں پھنس جاتا۔ اس نے لطیف پور کے قلعہ میں آگ لگا دی، وجے گڑھ کے قلعہ میں پناہ لی۔ اور اپنی مدد کے لیے مرہٹوں کو پٹنہ سے بلوایا۔ جوانی اور طاقت کے نشے میں شجاع الدولہ نے شیخ علی حزین[۱] کی دانشمندانہ نصیحت پر عمل نہ کیا۔

---

[۱] مجمع التواریخ فارسی، کتب خانہ عامرہ/ ۱۹۳-۲۰۰، سیر المتاخرین (ا-ق) ۲/ ۲۶۲-۲۶۳، مآثر الکرام ۱۱/ ۲۲۵-۲۲۶۔

اور بنارس کے طاقتور راجا سے مصالحت نہ کی۔ نواب فضل علی کو فوجی امداد پہونچانے کی غرض سے لطیف پور کی طرف بڑھا۔ فضل علی نے اس نازک موقع سے فائدہ اٹھایا اور نواب کی خدمت میں چند شرائط پیش کیں۔ ابھی اس معاملہ میں گفت وشنید ہو ہی رہی تھی کہ دہلی سے یہ پریشان کن خبر پہونچی کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کردیا۔ اس علاقے کو فتح کرکے دہلی آپہنچا وزیر الممالک نے شجاع الدولہ اور دیگر امیروں سے التجا کی کہ وہ فوراً اسکی مدد کو دہلی پہونچیں۔ اس نازک اور ذہنی انتشار کے موقع پر شجاع الدولہ کے وزیر اعلیٰ خواجہ تمکین اور محمد علی خاں اور دیگر مشیروں نے نواب کو مشورہ دیا کہ بلونت سنگھ جیسے طاقتور رجہ کو بہت دنوں تک باغی چھوڑ دینا صوبے کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا اور بالخصوص اس نازک زمانے میں جب ایک بیرونی حملہ آور نے شمالی ہندوستان پر کشت وخون کا دریا بہا رکھا ہے۔ اور دونوں صوبوں کے زمیندار آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ راجا کو وہ علاقے، جو اس کے قبضے میں پہونچ چکے ہیں۔ دیدئے جائیں۔ اور اس پر مناسب تاوان لگایا جائے۔ کیونکہ بلونت سنگھ ہی ایک ایسا جری راجا ہے جو بنارس جیسے علاقے کے سرکش زمینداروں سے لگان وصول کرسکتا ہے۔ فضل علی میں اتنی طاقت اور تدبر نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔ اور بڑی مشکل سے وہ غازی پور کے نظم ونسق کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس کے برعکس اگر فضل علی کو وہ علاقے

عطا کر دے گئے۔ جو بلونت سنگھ کے قبضے میں ہیں۔ تو اس طرح وہ دونوں صوبوں کے نصف حصے پر قابض ہو جائے گا۔ اور نواب سے برابری کا دعویٰ کرنے لگے گا۔ اور اگر راجہ نے اسے شکست دیدی جس بات کا قوی امکان ہے تو کافی مالی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ چونکہ احمد شاہ ابدالی کا خوف بھی دل میں جاگزین تھا۔ اس لیے نواب کو محمد علی خاں کی دلیل پسند آئی۔ اور اس نے راجا سے صلح کر لی۔ راجا نے پانچ لاکھ روپیے بطور پیشکش فوراً ادا کرنے اور پانچ لاکھ سالانہ مالگذاری کی صورت میں دینے کا وعدہ کیا۔ اور اس طرح بارہ لاکھ روپیے سالانہ کی ادائیگی پر سمجھوتہ ہو گیا۔ شجاع الدولہ نے راجا کو اپنی جانب سے اس علاقے پر مقرر کر دیا۔ اور بطور جاگیر بعد دہی کا علاقہ عطا کیا۔ ۱۷۵۰ء میں وہ فیض آباد چلا آیا۔ اور احمد شاہ ابدالی کے متوقع حملے کے دفاع کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

وزیر المالک سے کشمکش ۱۷۵۶ء کے آواخر میں احمد شاہ ابدالی نے دوبارہ ہندوستان کا رُخ اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ عماد الملک کو اس کے سرحدی علاقوں میں دیدہ دلیرانہ مداخلت کرنے کی سزا دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ شمالی مغربی سرحدی علاقے ابدالی مملکت کا انگ بن چکے تھے۔ بلا کسی مزاحمت اور مخالفت کے احمد شاہ ابدالی دہلی تک آپہونچا۔ اس کے بعد متھرا اور آگرہ تک کے علاقوں کو نیست و نابود کر کے وہ مارچ ۱۷۵۷ء میں اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ دہلی سے روانگی سے پہلے اس نے ایک فوجی دستہ

مشرقی صوبوں، الہ آباد، اور اودھ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چونکہ شجاع الدولہ کے والد صفدر جنگ نے احمد شاہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس لیے وفادار ہندوستانیوں کی نظروں میں اس کا وقار گر چکا تھا۔ اور مسند نشینی کے بعد نواب (شجاع الدولہ) نے بھی شاہ مغلیہ کو مقررہ پیشکش نہیں بھیجی تھی۔ عماد الملک، شجاع الدولہ کو اپنا خاندانی دشمن سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے احمد شاہ ابدالی کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر اسے دو آبہ پر حملہ کرنے کی اجازت دیدی جائے تو وہ دو کروڑ روپیہ ادا کر سکے گا۔ اس شرط پر عماد الملک کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا گیا تھا۔[۱] اسی طرح شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے درمیان یگانگت نہ تھی کیونکہ ثانی الذکر احمد شاہ ابدالی کا مشیر بھی تھا۔ علاوہ ازیں احمد خاں بنگش کے کے دل میں الہ آباد صوبے پر قبضہ کرنے کی خواہش اب بھی باقی تھی اور اس کا سفیر انداز خاں، بار بار احمد شاہ ابدالی کو اودھ پر حملہ کرنے کے لیے ورغلا رہا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان میں موجودگی کی طرف سے شجاع الدولہ نے غفلت شعاری سے کام لیا تھا۔ صوبہ اودھ کی سرحدیں دہلی تک پہونچتی تھیں اور درمیان میں صرف روہیلہ سرداروں کا علاقہ تھا جو حملہ آور کے حامی اور مددگار تھے۔ لہٰذا ابدالی حملے کے لیے یہ وجہ قوی وجہ ہو سکتی تھی۔ مجملاً، احمد شاہ ابدالی نے عماد الملک کو اس بات کی اجازت دیدی۔ اس کے ساتھ دو شہزادے،

---

[۱] سیر المتاخرین (۱۔ ب) ۳/ ۵۲

ہدایت بخش بن عالمگیر ثانی اور مرزا بابر، داماد عالم گیر ثانی، کر دیئے، اور اپنے سرداروں میں خان بازخان کو بھی ہمراہ کر دیا۔

اس شاہی فوج کی کمک کے لیے روہیلہ سردار اور احمد خاں بنگش بھی پہونچ گئے۔ جب حملہ آور فوج دوآبہ میں داخل ہوئی تو شجاع الدولہ نے انوپ گری گوسائیں کو شاہی افواج سے ٹکر لینے کے لیے روانہ کیا۔ انوپ گری نے پہلے فرخ آباد کا رُخ کیا۔ اس وجہ سے احمد خاں بنگش اپنے علاقہ کے دفاع کے لیے شاہی فوج سے واپس چلا آیا۔ ساتھ ساتھ انوپ گری نے مرہٹوں سے مدد کے لیے اپیل کی۔ مرہٹہ سردار نے راگھو لچھمن پنڈری کو اپنا سفیر بنا کر شجاع الدولہ کی خدمت میں بھیجا۔ دو ماہ کی طویل گفت وشنید کے بعد مرہٹہ سردار نے سکھورام باپو، اناجی منکیشور اور دوسرے جہاں دیدہ سرداروں کی قیادت میں ۲۳ ہزار کا ایک فوجی دستہ بظاہر شجاع الدولہ کی مدد کو بھیجا۔ حالانکہ ان کا داخلی مقصد دوآبہ کے ان علاقوں پر قبضہ بھی کرنا تھا۔ جو روہیلہ اور افغانوں کے قبضے میں تھے۔ مختصر یہ کہ شجاع الدولہ فیض آباد سے کوچ کر کے سانڈی پالی کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ فریقوں میں دو مرتبہ معمولی سی جھڑپیں ہوئیں۔ آخر کار سعد اللہ خاں بن علی محمد خاں... روہیلہ کی وساطت سے جو شجاع الدولہ سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ پانچ لاکھ روپیہ کی ادائیگی پر صلح ہو گئی۔ عماد الملک اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اور واپس فرخ آباد چلا آیا۔ ۱۷۵۷ء[1]

۱؎ خزانۂ عامرہ / ۸۶ - ۱۰۷، سیر المتاخرین ۱، ت ۳ / ۵۲

خطرے سے نجات پانے کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ واپس آیا۔ اور پھر عیش وعشرت کے گہوارے میں سوگیا۔ رگھو لچھمن، مرہٹہ سفیر چشم دید مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ نواب جنسی تلذذات کی تحصیل اور لہو ولعب میں غرق ہوگیا۔ اور انتظامی اور مالی امور سے بالکل غفلت برتنے لگا۔ اور یہ غفلت شعاری اس درجہ کو پہونچ گئی کہ اسکی والدہ کو مداخلت کرنی پڑی، اور انہوں نے کچھ نیک اور مفید مشورے دیئے۔ اور اس کی خدمت سے تیس بیسواؤں کو برطرف کروادیا۔ لیکن وہ ان پانچ عورتوں کو برطرف کرنے پر راضی نہ ہوا جنھیں اس نے اپنے حرم میں داخل کرلیا تھا۔ اس بے توجہی اور عماد الملک سے مقابلہ کے دوران صوبے سے غیر موجودگی کی وجہ سے کئی سرکش زمیندارون نے سرکاری عاملوں کو اپنے علاقوں سے مار بھگایا۔ اور نواب کے احکامات کی خلاف ورزی کی۔ اس طرح سیاسی انتشار پیدا ہوگیا۔

شہزادہ عالی گہر کا لکھنؤ پہونچنا (۱۷۵۸-۱۷۵۶ء) ہندوستان کی تاریخ میں یہ زمانہ غیر معمولی اہمیت کا دور تھا۔ اس زمانے میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے ہندوستان کی سرزمین میں مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور غیر شعوری طور سے ہندوستان کا تخت وتاج مٹھی بھر سمندر پار کے بہادروں کے ہاتھوں میں رفتہ رفتہ چلا گیا۔ وزیر الممالک عماد الملک نے اپنی نااہلی اور خود غرضی کا ثبوت دیا۔ کیونکہ اس میں وطن پرستی اور آقا سے وفاداری کا فقدان تھا۔ اور مرہٹوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ ان باتوں نے مغلیہ سلطنت کے گرتے ہوئے ڈھانچے کو منہدم کردیا۔

علاوہ ازیں شاہی خزانہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ اور ملکی معاملات میں بادشاہ کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی۔

مرہٹوں کی تلواروں کی حمایت سے عماد الملک نے نجیب الدولہ کو پست کرکے برطرف کروا دیا تھا۔ اور اس کی جگہ حاصل کرلی تھی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نجیب الدولہ ہی ایک ایسا واحد شخص تھا جو رعیت اور اسامیوں کی اطاعت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بدرجۂ مجبوری اُسے اپنے علاقے میں جانا پڑا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ہی مرہٹے پنجاب کی طرف بڑھے۔ اور احمد شاہ ابدالی کے لڑکے اور اس کے سرداروں کو اس علاقہ سے کھدیڑ دیا۔ اور خود قابض ہو گئے۔ (۱۷۵۸ء) اس کے بعد ولی عہد عالی گہر کی باری آئی۔ بہت دنوں سے عماد الملک شہزادہ کو اپنے قبضے میں کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اور اس کی ستم ظریفیوں سے شہزادہ کا ناطقہ بند ہو گیا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر مئی ۱۷۵۸ء میں وہ دہلی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور جلاوطنی کی حالت میں ہی اپنے تحفظ پر تکیہ کیا۔ عماد الملک کی ان احمقانہ باتوں کے سبب سے احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان کے لیے کوچ کیا۔ اور اس بات کے لیے بہت دنوں تک ابدالی۔ مرہٹہ کشمکش چلتی رہی کہ شمالی ہندوستان پر کس کا اقتدار قائم ہو۔ اور آخر کار پانی پت کی جنگ میں، جس کا پہلے حصہ میں ذکر آچکا ہے۔ عارضی فیصلہ ہو گیا۔ اور مرہٹوں کا قلع قمع ہو گیا۔ مگر بار بار ابدالی حملوں کی وجہ سے شاہانِ مغلیہ کا وقار گر گیا۔ اُن کی کمزوری آشکارا ہو گئی۔ ہندوستان کے

طاقتور امراء کی بے توجہی اور اقتدار حاصل کرنے کی باہمی کشمکش نے مرکزی حکومت کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ بنگال کے سیاسی انقلاب کی طرف توجہ کر سکتی۔ یہ وہ انقلاب تھا۔ جس میں انگریز تاجروں کو "بادشاہ ساخت" کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور بعد میں سارے ہندوستان میں ان کا طوطی بولنے لگا ہمارے حکمراں طبقے کو جو آپسی جھگڑوں میں غرق تھے۔ اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کے سیاسی افعال دور رس نتائج سے پُر تھے۔ اور نہ انھیں اس بات کا خیال آیا کہ وہ رفتہ رفتہ اس ملک پر اپنا تسلط قائم بھی کر سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ بظاہر تاجر ہی تھے شجاع الدولہ، سورج مل جاٹ، عماد الملک، نجیب الدولہ، رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ ہولکر، ان میں ہر ایک سیاسی بصیرت اور دور بینی سے عاری تھے، اور اپنے ذاتی، اور قبیلائی مفاد کو ملک کے مفاد کے لیے قربان نہیں کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے بالعموم ملک میں اور بالخصوص بنگال میں وقوع پذیر رجحانات کی طرف متوجہ نہ ہو سکے جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافہ کے پیش خیمہ تھے۔

مرہٹوں کی حمایت سے اقتدار حاصل کرنے اور نجیب الدولہ کی طرف سے نجات پانے کے بعد سازشی وزیر نے اپنے دوسرے دشمنوں کو پسپا کرنے اور انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنایا۔ معمولی درباریوں اور جاگیرداروں کو باآسانی مطیع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن عماد الملک شجاع الدولہ اور شہزادہ عالی گہر کو اپنی استبدادی حکومت کے لیے مستقبل میں

سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ چونکہ ایک حالیہ تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شجاع الدولہ کے خلاف فوج کشی بے سود ہوگی۔ لہذا اس نے اُسے بالکل بے سہارا کرنے اور اس کے حامیتوں کا، چاہے وہ معمولی اور غیر معمولی امیر ہی کیوں نہ ہوں، قلع قمع کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس منصوبے کے تحت اس نے پہلے لطف اللہ بیگ اور مولوی قاسم کشمیری کو اس الزام میں گرفتار کروالیا کہ وہ شیر جنگ کے توسط سے شجاع الدولہ سے سازباز رکھتے تھے۔ اور دہلی میں ایک انقلاب برپا کرنے کے درپے تھے۔ اس کے بعد عماد الملک نے شہزادہ کی طرف توجہ کی مگر شہزادہ نے فرار کی راہ لی[۵] روہیلہ سرداروں کے علاقوں سے ہوتا ہوا وہ الہ آباد کے نائب صوبہ دار، محمد قلی خاں کی دعوت پر اس جانب روانہ ہوا، جب اس کا گذر لکھنؤ کے قریب سے ہوا اور وہ موہان میں خیمہ زن ہوا تو شجاع الدولہ خیر مقدم کے لیے آیا۔ ایک سو ایک اشرفی نذر میں پیش کیں اور مزید برآں ایک لاکھ روپیہ نقد دو ہاتھی، پالکی، سات گھوڑے، ایک خوان جواہر، اسلحے، خیمے، ظروف اور چھکڑے برائے باربرداری پیش کیے۔ اس کے بعد عالی گہر نے خلوت میں نواب سے کچھ

---

[۵] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، تاریخ احمد شاہ، ۲۴۴/-۲۴۵، سیر المتاخرین (ا۔ت)، ۳/۵۸-۶۰، تاریخ مظفری، ۲/۸۵ب-۸۶الف، امیر کی آپ بیتی ۱/۱۱۱، خزانۂ عامرہ ۹۴-۹۶/۵، تاریخ سعادت جاوید ۱/۴۴۳-۴۴۵، جام جہاں نما ۱/۵۰۴

کچھ بات چیت کی اور الہ آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔[1] اس کے بعد عالی گہر مشرقی صوبوں کی طرف چلا گیا۔

الہ آباد پر شجاع الدولہ کا قبضہ - ۱۷۵۹ء | شجاع الدولہ بہت دنوں سے صوبہ الہ آباد کے ہتھیانے کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیونکہ محمد قلی خاں شجاع الدولہ کی طرف سے نائب صوبہ دار تو ضرور تھا۔ لیکن عماد الملک نے اپنی طرف سے اُسے صوبہ دار مقرر کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں محمد قلی خاں بن مرزا محسن، برہان الملک سعادت خاں کا بھانجا تھا۔[2] اس لیے عوام میں اس کو کافی عزت حاصل تھی۔ محمد قلی خاں بہادر تو ضرور تھا۔ لیکن سیاسی بصیرت سے عاری تھا۔ جب شہزادہ عالی گہر الہ آباد پہونچا تو شجاع الدولہ نے محمد قلی خاں کی ہمت افزائی کی کہ وہ شہزادے کو مشرقی صوبوں کے فتح کرنے میں مدد کرے۔ لہذا وہ شہزادے کے ساتھ چلا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شجاع الدولہ نے الہ آباد پر قبضہ کر لیا۔[3] یہ خبر سن کر محمد قلی خاں برق رفتاری سے اس امید میں واپس آیا کہ شجاع الدولہ خاندانی رشتہ کا ضرور کچھ نہ کچھ خیال کرے گا۔ اور وہ صوبہ اس کے حوالے کر دے گا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ شجاع الدولہ نے اس کے آنے سے پہلے ہی بینی بہادر کو وہاں کا

---

[1] خزانۂ عامرہ ۹۲، تاریخ راحت افزا ۳۳۴-۳۳۵، اخبار محبت ۶۰۵-۶۰۷، چہار گلزار شجاعی ۲۲۰/الف سیر المتاخرین (ا-ت) ۲/۳۰
[2] سوانحات ۱/۱۲ خزانۂ عامرہ میں عم زادہ لکھا ہے۔ ص ۹۳۔
[3] سیر المتاخرین (ا-ت) ۳۲۷/۲-۳۲۸، خزانۂ عامرہ ۹۳

نائب صوبہ دار مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے کے ایک فوجی دستے کے ساتھ بنارس کے لیے رخصت کر دیا تھا۔ کہ اگر محمد قلی خاں واپس آئے تو اس کا مقابلہ کرے۔ جب محمد قلی خاں نواب کی خدمت میں پہونچا تو فریب دے کر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اور جلال آباد کے قلعہ میں مقید کر دیا گیا۔ اس طرح صوبہ الہ آباد نواب کے قبضہ میں آگیا۔ بعد میں محمد قلی خاں کو قتل کروا دیا گیا۔[۱]

شمالی ہند میں مرہٹہ پالیسی ۱۷۵۹ء - ۱۷۶۱ء | ۱۷۵۰ء - ۱۷۶۱ء کے درمیان شمالی ہند کے بارے میں مرہٹوں کی پالیسی بہت ہی پر ہوس تھی۔ وہ ہندوستان میں ہندو پت پادشاہی قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے۔[۲] ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ بادشاہ اور صفدر جنگ وزیر سے ایک مخصوص صلحنامہ کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان پر بیرونی حملہ آوروں سے دفاع کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی۔ ۱۷۵۷ء میں عماد الملک اور احمد خاں بنگش نے شجاع الدولہ کے خلاف محاذ بنایا تو شجاع الدولہ نے مرہٹوں سے استمداد کی درخواست کی۔ اور بدلے میں انھیں بنارس اور اجودھیا کے علاقے دینا قبول کر لیا تھا۔ مگر اس نے قبضہ دینے میں پہلو تہی کی۔ ۱۷۵۹ء میں مرہٹوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ سیاسی چالوں یا بصورت دیگر فوجی طاقت کے

---

[۱] خزانہ عامرہ / ۹۳، عماد / ۷۹

[۲] تاریخ فرحت افزا / ۲۹۳

[۳] First Two Nawabs of oudh - PP 200-201

ذریعہ بنارس اور الہ آباد پر قبضہ کر لیے گئے۔ اس طرح وہ شجاع الدولہ کو اپنا مطیع بنانا چاہتے تھے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے پہلے انھوں نے روہیلہ علاقوں پر قابض ہونے کے لیے اقدام اٹھائے۔[1]

سکرتال کا محاصرہ: پنجاب پر قابض ہونے کے بعد مرہٹوں نے نجیب الدولہ کی طرف رخ کیا۔ نجیب الدولہ نے سکرتال کے قلعہ میں پناہ لے لی۔ مرہٹوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے متوقع مرہٹوں کے حملے کی اطلاع پہلے ہی شاہ ابدالی کو دے رکھی تھی۔ اس موقع پر نجیب الدولہ نے نواب شجاع الدولہ سے بھی مدد کی درخواست کی جس نے فوری مدد پہونچانے کا ارادہ کیا۔ مگر مرہٹوں سے جنگ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ہی یہ بات اسکے مفاد میں تھی کہ نجیب الدولہ کا قلع قمع کر دیا جائے۔ لہٰذا اس نے درمیان میں پڑ کر مصالحت کرادی۔ اور طے پایا کہ نجیب الدولہ ۲۰ لاکھ روپیہ تاوان کے روپ میں ادا کرے۔ مگر یہ سمجھوتہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا کیونکہ اسی اثنا میں شاہ ابدالی کی آمد کی خبر پھیل گئی، اور مرہٹوں نے محاصرہ اٹھا لیا[2] اور شجاع الدولہ واپس چلا گیا۔

پہلے حصہ میں ہم تفصیل سے مرہٹوں کی شمالی ہند میں فتوحات کا ذکر کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں صرف شجاع الدولہ کے سیاسی گٹھ جوڑوں کا مفصل ذکر کریں گے۔ اس زمانے کے حکمرانوں میں شجاع الدولہ کو ایک خاص حیثیت

---

[1] خزانۂ عامرہ / ۸۷ – ۸۸ –

[2] کاشی راج / ۵ عماد / ۱۸۰ – ۱۷۹

حاصل تھی۔ دوسرے مسلمان حکمرانوں۔ مثلاً نواب بنگال اور نجیب الدولہ کے مقابلے میں ایک وسیع، زرخیز اور گنجان علاقے کا حکمران تھا۔ اس کی فوج ملک کی عمدہ ترین افواج میں شمار ہوتا تھا۔ یہ فوج دو طاقتور عناصر پر مشتمل تھی۔ قزلباش، جن کی تعداد چھ سات ہزار تھی۔ اور ان میں سے اکثر ایک زمانہ میں نادرشاہ کی فوج میں ملازم رہ چکے تھے اور بعد میں صفدر جنگ جنگ کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ دوسرے ناگا گسائین۔ ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ یہ لوگ بڑے جری اور بہادر ہوتے تھے۔ ان کے سردار بالعموم فن ساحری سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان پر گولی اور توپوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بلا کسی شک وشبہ کے اس کا توپخانہ ہندوستان میں سب سے زیادہ عمدہ تھا۔ اس کے علاقے کے مالی وسائل زیادہ تھے۔ علاوہ ازیں سعادت خاں برہان الملک اور صفدر جنگ نے بہادری خزانہ ورثے میں چھوڑا تھا۔ شجاع الدولہ کے والد نے بحیثیت وزیر الممالک پانچ سال تک ہندوستان پر حکومت کی تھی۔ جس کی وجہ سے اودھ کے حکمران خاندان کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے متوقع جنگ کے موقع پر نواب اودھ ایک بیش بہا معاون ہو سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس جنگ میں دلچسپی لینے کے لیے اسے تیار کر لیا جائے۔

مالوہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی بھاؤ نے گوبند بلال کے نام واضح احکام جاری کیے تھے۔ کہ جس طرح سے بھی ممکن ہو وہ شجاع الدولہ کو مرہٹوں کا ساتھ دینے کے لیے رضامند کرے اور اگر وہ مرہٹوں کی طرف سے

جنگ میں شرکت کرنے کے لیے کسی طرح راضی نہ ہو تو اس سے یہ وعدہ ضرور لے لیا جائے کہ وہ ہر طرح سے غیر جانبداری کا طرز عمل اختیار کریگا۔

لیکن گوبند بلال اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ اور افغانوں نے شجاع الدولہ کو اپنی طرف ملا لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ ابدالی، علی گڈھ میں خیمہ زن تھا۔ اگر شجاع الدولہ پہلو تہی کرتا تو بہت ممکن تھا کہ شاہ ابدالی اس کی طاقت کو تہس نہس کر دیتا۔ ۲۰ اپریل ۱۷۶۰ء کو پیشوا نے گوبند بلال کے توسط سے شجاع الدولہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ان دونوں کے اغراض و مقاصد میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ یعنی بیرونی لیٹرے حملہ آوروں اور دغا باز افغانوں سے، جو ابدالیوں کی پشت پناہی۔ اور حمایت کر رہے تھے۔ ہندوستان اور خاندان مغلیہ کا تحفظ کرنا، مزید برآں تواتر سے مرہٹہ اودھ کے حکمراں کے بہی خواہ اور حمایتی رہے ہیں۔ صفدر جنگ اور سندھیہ اور ہولکر کے آپس میں دوستانہ تعلقات رہے اور خود اس کے اور مرہٹوں کے بالخصوص ملہار راؤ ہولکر کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں نے شجاع الدولہ کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ مشترک دشمن پر فتح حاصل کرنے کے بعد مرہٹہ اور شجاع الدولہ دونوں مل کر ملک کا نظام چلائیں گے۔

اس کے برعکس شجاع الدولہ دونوں گروہوں کی کشمکش سے علیحدہ ہی رہنا چاہتا تھا۔ اور کسی ایک گروہ کا ہمنوا نہیں ہونا چاہتا تھا[۱]

---

[۱] کاشی راج/ ۵، عماد/ ۱۶۸ - ۱۶۹

مگر کچھ دنوں کے بعد اس کا رجحان مرہٹوں کی طرف ہو گیا تھا۔ اس نے بھاؤ کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ وہ اس کی کامیابی کا خواہشمند ہے اور مرہٹہ فوج سے وہ اس وقت آکر مل جائے گا جب وہ اس کی سرحد کے قریب آجائیں گی۔ اس جواب سے خوش ہو کر بھاؤ نے شمبھو جی رنگناتھ کو اپنا سفیر بنا کر نواب کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ مجوزہ اتحاد کی شرائط کے بارے میں مصالحت اور گفت و شنید کرے۔ لیکن سفیر کے پہونچنے سے پہلے ہی نواب نے مرہٹوں سے اتحاد کرنے کی اپنی شرائط واضح کر دی تھیں۔ وہ شرائط یہ تھیں "مجھے وزارت عطا کی جائے، اور شہزادہ عالی گہر کو شہنشاہ بنایا جائے۔ اگر تم ان باتوں کا وعدہ حلفیہ تحریر میں بھیجو تو میں تمہارے ساتھ مل جاؤں گا۔" اس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ بھاؤ نے ان شرطوں کو منظور کر لیا ہوگا۔ لیکن اس اثنا میں نجیب الدولہ اور جہاں خان نے اپنی فوج کو اودھ کے سرحدی علاقوں کے قریب تک پہونچا دیا۔ اور حکمت عملی کے زور پر شجاع الدولہ کو تذبذب میں ڈال دیا اور اس وجہ سے مرہٹوں سے اتحاد کے بارے میں اسکے پیر ڈگمگا گئے۔ دونوں گروہوں کو ناراض کرنے کے بجائے اس نے پھر غیر جانب داری کا اپنا پہلا راستہ اختیار کیا۔ اور دونوں جانب کے سفیروں کی مسلسل گفت و شنید اور کھینچا تانی سے تنگ آکر وہ اپنے مستقر فیض آباد سے نکل کر پٹنہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور اس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ وہ شاہ عالم ثانی کے ساتھ شامل ہونے جا رہا ہے۔ مگر اس خیال سے کہ اس کے صوبے

کی مغربی سرحد پر افغانی فوج موجود تھی۔ اور اس کا علاقہ خطرے سے بری نہ تھا۔ وہ لکھنؤ واپس چلا آیا۔ اور وہاں سے قنوج کے لیے کوچ کر دیا تاکہ وہ اپنے حدود کے نزدیک رہ کر افغانوں کی کارروائیوں سے باخبر رہے۔ ان تمام باتوں سے بھاؤ کو بے حد پریشانی لاحق ہوئی۔ لہٰذا ایک مرتبہ پھر اپنے پُرانے وعدوں کو دہرایا۔ اور شجاع الدولہ سے گذارش کی کہ وہ غیر جانب دارانہ طرزِ عمل اختیار کرے مگر نواب افغان سفیروں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ بھاؤ نے شجاع الدولہ کی والدہ کی وساطت سے اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش بھی بارآور ثابت نہ ہوئی۔[۱]

دوسری طرف احمد شاہ ابدالی نے بھی وہی سبز باغ دکھائے جو بھاؤ نے شجاع الدولہ کو دکھائے تھے۔ شاہ ابدالی نے اعلان کیا کہ اس کا مقصد شجاع الدولہ کو وزیر الممالک مقرر کرنا اور شاہ عالم ثانی کی قیادت میں مغلیہ سلطنت کو ایک نئی زندگی عطا کرنا ہے۔ لیکن ابھی تک نواب مرہٹوں سے مصالحت کرنے کی طرف مائل تھا۔ لہٰذا شاہ ابدالی نے محمد شاہ بادشاہ کی بیوہ ملکۂ زمانی کو اس کام کے لیے لکھنؤ روانہ کیا کہ وہ جا کر نواب پر دباؤ ڈالے کہ وہ افغانوں کی طرف راغب ہو جائے۔ اس وسیلے کا بھی جب خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو شاہ ابدالی نے اس اہم سیاسی حکمت عملی کے کام کے لیے بذاتِ خود نجیب الدولہ کو بھیجا۔[۲]

۱؎ عماد/۷۹، شجاع الدولہ کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش میں مرہٹوں کی ناکامی کے اسباب دیکھیے۔ خزانۂ عامرہ/۱۰۵ ۲؎ خزانۂ عامرہ/۱۰۵، کاشی راج (انگریزی)/ص ۶

وزارت شجاع الدولہ کے لیے اور تخت شاہ عالم ثانی کے نام کا صلح نامہ لے کر، جس پر شاہ ابدالی اور اس کے وزیر کی مہریں ثبت تھیں، نجیب الدولہ مہدی گھاٹ کے لیے روانہ ہوا۔ جہاں اس زمانے میں نواب خیمہ زن تھا۔ نواب نے نجیب الدولہ کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ جب دونوں میں کام کی بات شروع ہوئی تو نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کا پیغام اور صلح نامہ نواب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے بعد نواب نے اپنے مہمان کو ان شرطوں سے آگاہ کیا۔ جو مرہٹوں نے اس کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ اور بھاؤ کا اصلی خط بھی دکھا دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے غیر جانب دار رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ مرہٹے اس سے اس بات سے زیادہ کسی اور بات کی توقع نہیں رکھتے۔ اور جنگ میں فتح کے بعد بھی وہ اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے۔ ایک سفیر کی حکمت عملی کو کام میں لاتے ہوئے نجیب الدولہ نے بھاؤ کے خط کو دھوکے کا ایک جال بتایا۔ اور اس نے کہا کہ مرہٹوں کا واحد مقصد سارے ہندوستان کو اپنا مطیع بنانا ہے۔ اور بھاؤ مسلمانوں سے بہت سخت دشمنی رکھتا ہے۔ اور جب بھی اسے طاقت حاصل ہو جائے گی تو بلا استثناء کوئی بھی مسلمان اس کے پنجے سے بچ کر نکل نہ سکے گا۔ اور آخر میں نجیب الدولہ نے اپنا آخری وار کیا۔ اور کہا یہ جنگ نہ تو ایک بیرونی حملہ آور اور ہندوستان کے سرداروں کے مابین ہے اور نہ افغانوں اور غیر افغانوں کے درمیان جیسا بھاؤ کا بیان ہے بلکہ در اصل یہ کفر اور اسلام کی جنگ ہے۔ یہ ایک جہاد ہے

اس جنگ میں شرکت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور بالخصوص نواب شجاع الدولہ جیسے ذی وقار امیر کے لیے۔ جسے ایک بڑی عظمت کا مقام حاصل ہے۔ اس دعا کو سن کر نواب کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے۔ اور اس نے کہا۔ "خدا کی قسم . . . . . یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ کی جائے۔ اور جام شہادت نوش کیا جائے"۔ لیکن پھر بھی کچھ وجوہ کی بنا پر وہ غیر جانب دار رہنا پسند کرے گا۔ کیونکہ وہ ایک ہندوستانی تھا۔ اس کا تعلق شیعہ عقائد سے تھا۔ لہذا شاہ ابدالی اور اس کے افسروں کے ساتھ اس کا نبھاؤ نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ وہ بیرونی ممالک کے تھے اور سنی تھے اسکے علاوہ اسے اس بات کا بھی خوف تھا کہ شاہ ابدالی اب بھی اسکے خلاف بغض اور انتقام کے جذبات رکھتا ہوگا کیونکہ اسکے والد نے منو پور کے مقام پر ۱۷۴۸ء میں اُسے شکست فاش دی تھی بحالا طویل گفت وشنید کے بعد نواب نے حلفیہ وعدہ کیا کہ وہ شاہ ابدالی کا ساتھ دے گا۔ اسکے بعد

ا؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو شاہ نامہ منور کلام (قلمی رام پور) ص ۱۵۰، ۱۳۰ کا تحقیق ۱۰۱۰/۱۸، اسیر، التواریخ (ق - ش) ۳/۲۵، عماد/۹۔ ۸۰۰ مراسلات نجیب الدولہ نقل خط شجاع الدولہ بنام سورج مل «مہم پیش آمدہ آمد بھاؤ سردار دکن ہست مجموعی قرار یافتہ وہمہ سرداران برفاقت بادشاہ وعہد موافقت بستند برائے مقابلہ بھاؤ یکدل ویکجہت گشتند بودن آمدن بھاؤ موجب انقلال ہندوستان و دفع این فساد کشور آشوب بدون اتفاق و موافقت ہر رئیس ونامدار صورت نمی بندد ہر کسے کہ از رفاقت ہمدیگر پہلو تہی خواہند کرد ہدف تیر ملامت خواہد گردید لہذا بقلم می آید کہ اشان مہربان کہ بفضل الٰہی رئیس عمدہ ہندوستان اند مصلحت کار چہ اندیشیدہ»

ص ۳ ب – ۴ ب

بھی مرہٹوں نے نواب کو اپنا حمایتی بنانے کی بار بار بے سود کوششیں کیں۔

اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد نجیب الدولہ واپس آیا۔ شاہ ابدالی نے شجاع الدولہ کے لیے خلعت اور وزیر الممالک ... کے عہدے پر تقرری کا فرمان بھیجا۔ اس کے بعد نواب شجاع الدولہ نے اپنے خاندان کے افراد کو لکھنؤ کے لیے روانہ کیا۔ اپنے بیٹے مرزا امانی کو راجہ بینی بہادر کی نگرانی میں اپنے صوبوں کا ناظم مقرر کیا۔ ایک بھاری فوج کے ساتھ شاہ ابدالی کے پڑاؤ میں شامل ہونے کے لیے ۱۸ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء کو کوچ کیا۔ نواب کی آمد کی خبر پاکر ابدالی وزیر، شاہ ولی خان نے کچھ منزلوں آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اور بڑی عزت کے ساتھ شاہی خیموں میں لایا۔ شاہ ابدالی بھی بڑی گرم جوشی سے نواب سے ملے [1]

شجاع الدولہ نے صلح کی کوشش کی، جب بھاؤ کو خبر ملی کہ نواب افغانوں سے مل گیا ہے۔ تو وہ بے حد پریشان ہوا۔ اور اس نے نواب کے دربار میں مقیم اپنے سفیر بھوانی شنکر کو پھر لکھا کہ وہ نواب کی خدمت میں حاضر ہو کر بھاؤ کا خط پیش کرے۔ اس خط میں بھاؤ نے نواب سے اس بات کی شکایت کی تھی کہ وہ حملہ آور افغانوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اور اس سے درخواست کی وہ مرہٹوں کا ساتھ دے۔ اس خط و کتابت سے فائدہ اٹھا کر نواب نے خفیہ طور سے جھگڑے کو رفع دفع کرانے اور مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ اس نے

---

[1] چہار گلزار شجاعی ۱/۲۲۰ ب، تاریخ مرہٹہ و ابدالی ۱۵۱، سیر المتاخرین ۳/۶۹۳

[2] خزانۂ عامرہ/ ۸۹

بھاؤ کو لکھا کہ صلح کرنا زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ کیونکہ ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان امیر شاہ ابدالی کے ہم نوا ہو چکے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اس جنگ نے مذہبی رنگ بھی اختیار کر لیا ہے۔ نواب نے بھاؤ کو اپنی دوستی کا یقین بھی دلایا۔ اور اس نے کہا کہ افغانوں کے خیموں میں اس کی موجودگی مرہٹوں کے مفاد میں تھی۔ کیونکہ صلح کے لیے ابھی دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور صلح کرانے کی وہ حتی الامکان کوشش کرے گا۔[۱] نواب نے راجہ دیپ دت اور کاشی راج کو صلح کی شرائط کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے مرہٹوں کے پاس بھیجا۔[۲] بھاؤ نے اس بات پر رضا مندی ظاہر کی کہ وہ پنجاب کے کل علاقوں میں سے سرہند تک کا علاقہ افغانوں کے لیے چھوڑ دے گا۔[۳] لیکن ہندوستان کے افغانوں اور مرہٹوں کے تعلقات کا مسئلہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کی مصالحت ناممکن تھی۔ اس کے برعکس عمادالملک اور سورج مل جاٹ اُن شرائط کے حق میں نہ تھے۔ کیونکہ سورج مل جاٹ، عمادالملک کا حامی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وزارت کا عہدہ عمادالملک کے ہی پاس رہے۔ ناراض ہو کر یہ دونوں مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر نکل آئے۔ بذاتِ خود نجیب الدولہ بھی صلح کے حق میں نہ تھا۔ اور ہر قسم کی رکاوٹیں ڈال رہا تھا۔[۴]

---

[۱] کاشی راج ۱۳/۱، عماد ۱۸۴/۱۸۵-۱۸۵

[۲] خزانۂ عامرہ ۱۰۵/، کاشی راج ۱۵/، عماد ۱۸۵/

[۳] کاشی راج ۱۵/-۱۶، عماد ۱۸۵/

[۴] ؍؍ ؍؍ ۱۴/-۱۵

اپنی گذشتہ کامیابیوں کی وجہ سے بھاؤ بھی صلح کا زیادہ خواہشمند نہ تھا۔
اس اثنار میں شاہ ابدالی نے نواب سے مالی امداد کی درخواست کی۔
اس نے کہا کہ "تم صاحبِ اقتدار امیر ہو۔ تمہارے قبضے میں دو کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا علاقہ ہے۔ میں اپنے سپاہیوں کی بقایا تنخواہوں کی وجہ سے بے حد مالی مصائب میں گرفتار ہوں۔ اس رقم کا کچھ انتظام کرو" شجاع الدولہ نے شاہ ابدالی کے وزیر شاہ ولی خاں سے مل کر اس مسئلے کو طے کرا لیا اور اس سے زبردستی کوئی رقم وصول نہ کی گئی۔

دہلی کے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بھاؤ نے مرزا جوان بخت بن عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کو تخت پر بٹھایا اور غائبانہ شجاع الدولہ کو وزیر الممالک مقرر کر دیا۔ اس تقرر کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ شجاع الدولہ عہدے کی لالچ میں ابدالیوں کا ساتھ چھوڑ دے گا[1] میدان جنگ میں پہونچنے کے بعد ایک بار پھر بھاؤ نے شجاع الدولہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور تحفے تحائف بھیجے۔ نواب نے ایک بار پھر مصالحت کی کوشش کی لیکن نجیب الدولہ نے اس بات کی سخت مخالفت کی اور شاہ ابدالی کو اپنا ہم خیال بنا لیا[2] اس کے بعد شجاع الدولہ کی کوشش ناکام رہی[3]

پانی پت کی جنگ اور اس کے نتائج کا پہلے مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔ مجملاً

---

[1] خزانۂ عامرہ/۱۰۶، سیر المتاخرین ۳/۶۶

[2] سرگذشت نجیب الدولہ۔ عماد/۱۹۲-۱۹۳

[3] عماد/۱۹۰-۱۹۴

اس جنگ میں مرہٹوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اس موقع پر بھی شجاع الدولہ نے مرہٹوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور مرہٹہ سرداروں کی نعشوں کو بے حرمتی سے بچانے کی کوشش کی۔ اور وسواس راؤ کی نعش دو ہزار روپیہ دے کر برخوردار خان سے حاصل کر لی۔ لیکن شاہ ابدالی نے اس نعش کو ملاخطہ کیلئے منگوا لیا۔[۵۱] یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شجاع الدولہ نے شکست خوردہ ابراہیم خان گردی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ اور بعد میں شاہ ابدالی کی خدمت میں اسے پیش کرنا پڑا۔[۵۲]

اس فتح کے بعد فاتحین کا قافلہ دہلی آیا۔ شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی غیر موجودگی میں مرزا جواں بخت کو اس کا نائب مقرر کیا۔ شجاع الدولہ کو وزیر اور نجیب الدولہ کو امیر الامراء کے عہدے عطا کیے اور اوّل الذکر کو خلاع فاخرہ، مع اسپ دیراق خاصہ لطف فرما کر اودھ کے لیے رخصت کیا۔[۵۳] لکھنؤ پہونچنے کے بعد شجاع الدولہ نے بنارس کے لیے کوچ کیا۔ کیونکہ ان دنوں شاہ عالم سید نور نامی مقام پر خیمہ زن تھا۔ نواب نے شرف قدم بوسی حاصل کیا۔[۵۴] وہاں سے کوچ کرکے جاجمو پہونچا اور اس جوار سے مرہٹہ گماشتوں کو مار بھگایا۔ جنھوں نے اس کی غیر موجودگی میں ان علاقوں کے

---

[۵۱] عماد / ۲۰۱-۲۲

[۵۲] عماد / ۲۰۰-۲۰۱

[۵۳] ایضاً / ۲۰۱-۲۰۲، ۲۰۴-۲۰۷، ۲۰۸؛ خزانۂ عامرہ / ۹۰

[۵۴] خزانۂ عامرہ میں سید پور لکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ بادشاہ سے خلعتِ وزارت حاصل کرے۔ ص ۹۰۔

قبضہ کر لیا تھا۔[1] پھر وہ کالپی کی طرف گیا۔ اور وہاں سے جھانسی کے اطراف کے مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے پہونچا۔ شاہ عالم نے نواب کو ہفت پارچہ خلعت مع چار قب اور رمالاے مرواریہ اور قلمدان مرصع عطا کیا۔ اسی زمانے میں نواب نے مرزا امانی کو دیوان خاص کا داروغہ مقرر کیا۔[2]

انگریزوں سے تصادم | پہلے یہ لکھا جا چکا ہے کہ میر قاسم نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے شاہ عالم ثانی اور نواب شجاع الدولہ کو اپنا حامی بنالیا تھا۔ اور بکسر کے میدان میں ان تینوں نے انگریزوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی تھی۔ ایک صلحنامہ کے تحت انگریزوں نے صوبہ الہ آباد شجاع الدولہ سے لے کر شاہ عالم ثانی کو دیدیا، اور اپنا ایک نمائندہ نواب کے دربار میں مقرر کر دیا[3] شجاع الدولہ بدستور وزیر الممالک کے عہدے پر برقرار رہا۔

شجاع الدولہ اور روہیلہ سردار | انگریزوں اور نواب شجاع الدولہ کے مابین صلحنامہ میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ فریقین لڑائی کے موقع پر ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بھی ہوں گے۔ اس حقیقت کا مجملاً پہلے ذکر آچکا ہے کہ روہیلہ اور اودھ کے حکمران خاندانوں میں سیاسی رقابت بہت پرانی تھی اور صفدر جنگ نے روہیلوں کے قلع قمع کرنے کی غرض سے محمد شاہ کو اکساکر بن گڈھ پر حملہ کروایا تھا۔[4]

---

[1] خزانۂ عامرہ / ۹۶ -

[2] ایضاً / ۹۷

[3] چہار گلزار شجاعی / ۲۲۰ ب - ۲۲۲ الف سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/ ۸۳، سوانحات ۱۴۳/۱۴۴

[4] خزانۂ عامرہ / ۹۷ - ۹۸ نیز دیکھیے سفرنامہ آنند رام مخلص،

شجاع الدولہ نے حالاں کہ وقتاً فوقتاً روہیلوں کی مدد بھی کی تھی۔ لیکن اس فعل کے پیچھے روہیلوں سے ہمدردی کا جذبہ کم اور اپنے علاقوں کے تحفظ کا جذبہ زیادہ کارفرما تھا۔ شجاع الدولہ ان کے وجود سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اب چوں کہ مرہٹوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ لہذا اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کی استمداد سے ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنایا اس حملے کی جواز کے وجوہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مقصد[۱] روہیلوں کو نیست و نابود کرنا ہی تھا۔ میرؔ نے ان واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

وزیر اعظم امیر معظم، شجاع الدولہ جو بہت زورآور تھا، حافظ رحمت خاں روہیلہ سے جنگ کرنے نکلا۔ ان دونوں کی آپس میں بہت کٹی چھنی تھی۔ حریف (حافظ رحمت خاں) نے از راہ بد اندیشی انگریزوں کو لکھ بھیجا کہ "وزیر (شجاع الدولہ) جو اتنی فوج اکٹھا کر رہا ہے وہ تمھاری پرخاش میں ہے"۔ چنانچہ گورنر بہادر مقابلے کے لیے نکل آیا۔ نواب وزیر جو اس بالادست قوم (انگریز) سے بہت ہی رعایت اور لحاظ کرتا تھا۔ ان کے پاس اکیلا گیا۔ اور کہا "میں تمھارا پاس کرتا ہوں اور کسی سے اپنی بات ہیٹی نہ کرونگا۔ اس میں جو کچھ ہونا ہے ہو رہے! چاہے مجھے اپنے ساتھ کلکتے لے جاؤ یا ملک کو میرے اوپر چھوڑ دو۔ انگریزوں نے وزیر کے سلوک پر نظر کر کے سب چیزوں سے ہاتھ اٹھا لیا۔ کڑا اور الہ آباد بھی اس کے حوالے کر دیئے اور چلے گئے۔ جب آسمان نے نیا شگوفہ کھلایا

---

[۱] چہار گلزار شجاعی ۱۲۲۱، ۲۱۲ الف - ۱۳ب چارج فارسٹر ۱ / ص ۱۹۹ - ۲۰۵

اور زمانہ ہی نیا انقلاب لایا۔"

۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو کٹرہ میران پور میں روہیلوں اور شجاع الدولہ کے درمیاں جنگ ہوئی۔ روہیلہ مغلوب ہوئے۔ اور حافظ رحمت خاں نے شہادت پائی[1] اس جنگ کے بارے میں میر نے لکھا ہے :۔

"صاحب زادہ آصف الدولہ بہادر جواب وزیر اعظم ہیں، جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑے، جدھر کا رخ کرتے دھواں سا اڑا دیتے اور توپ خانے کی زنجیر کو تلوار سے کاٹ دیتے جب جنگ اپنے شباب پر آئی تو حریف کی ساری اکڑ فوں ہوا ہوگئی۔ (ادھر سے) اتنے گولے برسائے گئے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے جب زمین (رحمت خاں) پر تنگ ہوگئی اور اس نے دیکھا کہ نہ بھاگنے کا راستہ ہے۔ نہ ٹکنے کا موقع تو دل کڑا کرکے میدان میں جم گیا اور دنیا سے دل ہٹا کر جان پر کھیل گیا۔ ایک ہی ہلّے میں روہیلوں کے ہوش وحواس اڑ گئے۔ جانوں پر بن گئی۔ بڑے بڑے دلاوروں کے پتے پانی ہوگئے۔ ایک گولہ اسکے (حافظ رحمت) کے سینے میں لگا۔ صفیں درہم برہم ہوگئیں اور دشمن کا سر گیند کی طرح لڑھک گیا ... جب یقین ہوگیا کہ وہ (حافظ رحمت) مارا گیا تو وزیر نے

---

[1] "آخر حور روہیلہ آباد ہمایوں" سے حافظ رحمت خاں کی تاریخ شہادت نکلتی ہے۔ تحریر ۲/۳/۱ (۱۱۸۸ھ) ص ۱۱۵ محبت خاں محبت نے اس واقعہ پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ طبقات الشعرا ص ۲۵۲-۲۵۳

اس فتح کے شکرانے میں سجدہ کیا۔ حریف کا لشکر لٹ گیا۔ بہت سے سردار قید کر لیے گئے۔ اور اس کا سارا ملک وزیر (شجاع الدولہ) کے قبضے میں آگیا"[1]

شجاع الدولہ کو روہیلوں کو نیست و نابود کرنے میں کامیابی تو ضرور حاصل ہو گئی۔ لیکن اسلام کو کاری ضرب لگی۔ شیو پرشاد نے تاریخ فرح بخش میں لکھا ہے کہ مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں، اور مقبروں میں تلنگے گوبر سے چوکا لگاتے اور کھانا پکاتے تھے۔ نواب علی محمد خاں نے آنولہ شہر کو بڑی ترقی دی تھی۔ وہاں مسلمان آباد کیے تھے۔ اس عہد میں وہ شہر دار الاسلام تھا۔ قلعہ اور مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ اس فتح کے بعد وہ شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ خون محمد رحیم خاں کی مسجد میں رنڈیاں اور فاحشہ عورتیں رہنے لگیں۔ اور انہیں بیہودہ طائفہ کسب کرائیں۔[2]

<u>شجاع الدولہ کی وفات</u> نواب شجاع الدولہ نے ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ بروز پنجشنبہ کو چار گھڑی رات گئے وفات پائی[3] اور گلاب باڑی میں دفن کیا گیا،

---

[1] میر کی آپ بیتی ۱۶۳/۱-۱۶۴، نیز ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی ۱۸۹/۱ الف، ۲۱۰-۲۱۰ب، گلستان رحمت، تاریخ مظفری ۱۹۰/۲ الف ۲۰۰ الف، جام جہاں نما فارسی ۱۱۲/۲، ۲۰۲، ۲۰۳، مفتاح التواریخ ۳۵۲،

[2] ماخوذ از تاریخ اودھ ۲۶۰/۲-۲۶۱

[3] چہار گلزار شجاعی ۲۱۷/۱ الف، سیر المتاخرین (د۔ت) ۳/ میں ۲۲ ذی قعدہ لکھا ہے ص ۹۶، عماد میں ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ لکھا ہے ص ۱۰۹، مفتاح التواریخ میں ۲۴ ذی قعدہ/۲۹ جنوری لکھا ہے ص ۳۵۵، تفریح الناظرین ص ۱۳، تاریخ مظفری ۲۲ ذی قعدہ ۲/ ص ۲۰۰ الف

لیکن ہم عصر مورخوں میں اس کی وفات کے وجہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ میرؔ نے تو صرف اتنا ہی لکھا ہے،

"اس فتح عظیم کے بعد وزیر اعظم امیر اعظم نواب شجاع الدولہ بڑی شان و شوکت سے اپنے صوبے میں داخل ہوا۔ لیکن آسمان کی نظر تو اہل دنیا کی خرابی پر لگی رہتی ہے۔ اس انبوہ پُر شکوہ کو بھی نظر کھا گئی۔ یعنی وہ بہادر اور لائق وزیر آب ہوا کی تبدیلی سے ایسا بیمار پڑا کہ مرض کا تدارک مشکل ہو گیا۔ بہت سے طبیبوں اور فرنگیوں نے معالجے میں کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وزیر نے جب دیکھا کہ بیماری بڑھتی ہی جا رہی ہے تو از راہ دانشمندی اپنے خلف الصدق نواب آصف الدولہ کو مسند وزارت پر بٹھا دیا۔ . . . پھر اس دنیا سے کنارہ کر گئے"[1]

اس کے برعکس طباطبائی کا بیان ہے کہ "ہندوستان میں جسے خیارک کہتے ہیں، ایک پھوڑا نمودار ہوا۔ مگر چنداں اس طرف توجہ نہ ہوئی کیونکہ یہ امید مضبوط تھی کہ ایسے پھوڑے پھنسیوں سے جان جانے کا خوف نہیں ہے۔ ہندوستانی اور ولایتی جرّاح وغیرہ مداوا کرتے رہے مگر موثر نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ مادہ نے وسعت پکڑ کے سرطانی حیثیت قائم کی۔ اس وقت ایک طرح کی تشویش اور تردد کا مقام ہوا۔ تعجب انگیز تو یہ روئیداد ہے کہ اس پھوڑے کے

---

[1] میر کی آپ بیتی / ۱۶۴ - ۱۶۵ -

زخم کا اشتہار عموماً اس مضمون سے مشتہر ہوا کہ شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خاں کی بیٹی سے خیال وصال کیا اور اُسے خلوت میں طلب فرمایا۔ وہ بے چاری فرطِ غیرت اور کثرتِ جہالت سو جو عام عورات مخصوص پٹھانیوں میں ہوتی ہے، ایک چاقو پوشیدہ اپنے ہمراہ لیتی گئی اور بروقت کشفِ پردہ کے اسی چاقو کو شجاع الدولہ کی ران میں مارا۔ اور وہ چاقو زہر سے بجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے زخم کا اندمال نہ ہوتا تھا۔ باوجودیکہ یہ شہرت محض غلط اور افترا ہے۔ مگر ہنوز عموماً لوگوں میں زبان زد ہے"[1]

ہرچند اس نے بھی شجاع الدولہ کی موت کا سبب خیارک کا عارضہ ہی

---

[1] سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳/ ۹۶، غلام علی نقوی نے شجاع الدولہ کی رحلت کرنے کا ذکر کرتے ہوئے ابتدا ہی میں لکھدیا ہے "ازین جا گوش باید کرد کہ تنوع اقوال واختلاف روایات در وجہ بیماری نواب سپہر جناب بسیار است لاکن این ہمہ بعضے بقرائن عقل وبعضے بعدم وثوق رواتش قابل ذکر نیست۔ آنچہ بتواتر رسیدہ این است کہ خیارک برآوردہ بود" برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد/ ۱۱۸ - ۱۱۹ "آشوب بعلت ناسوری کہ در ساقش افتادہ بود" ا/ ص ۱۳ الف تاریخ مظفری ۲/ از عارضہ خیارک" ص ۳۰۰ الف تاریخ اودھ ۲/ ص ۲۶۲ - ۲۶۵، ۲۹۰ - ۲۹۵، تاریخ سعادت جاوید / ۱،۳ - تاریخ فرخ بخش (رام پور) "بعارضہ دنبل" ۱۱۱ ب، ۱۱۲ ب، ۱۲۵ الف ۱۲۶ الف۔

لکھا ہے۔[1] میرؔ نے اصلی واقعہ بیان کرنے کے بجائے صرف تبدیلی آب و ہوا سے بیمار پڑنے کا ذکر کیا ہے۔ میرؔ نے اصل واقعہ بیان کرنے سے اس لیے گریز کیا ہوگا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ اور اس نے اپنی کتاب "ذکر میرؔ" عہد آصفی ہی میں مکمل کی تھی۔ اسی طرح ہر چند اس بھی نواب شجاع الدولہ کے ہاں ملازم تھا۔ اور اس کا خاندان نوابان اودھ کا نمک خوار تھا۔ اس بنا پر اس نے اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جو عوام میں زبان زد تھی[2] طبا طبائی نے اس واقعہ کا ذکر تو ضرور کیا مگر اس بات کو غلط بتایا۔ کہ اس نے حافظ رحمت خاں کی بیٹی سے بدفعلی کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن غور طلب یہ بات ہے کہ اگر یہ بات غلط تھی تو زبان زد عام کیونکر ہوئی۔ اس واقعہ کی کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوگی۔

ہم عصر کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب جنسی تلذذات سے بیحد دلچسپی رکھتا تھا، اسکے حرم میں اٹھ ہزار منکوحہ اور غیر منکوحہ عورتیں تھیں[3]۔ ایسی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نے حافظ رحمت خاں کی بیٹی سے خلوت کی خواہش کی ہوگی اور زبان زد واقعہ غالباً عمل میں آیا ہوگا۔

شجاع الدولہ کی وفات پر میر حسن دہلوی نے یہ قطعہ کہا تھا۔

جس روز کہ تو جہان فانی سے گیا دل سب کا نشاط و کامرانی سے گیا
کیا زیست کا لطف اب شجاع الدولہ تجھ بن تو مزا ہی زندگی سے گیا

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے: چہار گلزار شجاعی ۲۱۶/ب - ۲۱۹ الف [2] ایضاً ۲۱۱/الف، ب

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو: چہار گلزار شجاعی ۲۲۱/ب - ۲۲۲ الف، نیز دیکھئے۔

George Forster. Travels in India I, PP. 213-214

Dow. History of Hindostan. II, PP. 3[illegible]5

[illegible]

نواب آصف الدولہ

ولادت | نواب شجاع الدولہ کی بیگم امۃ الزہرا بیگم المخاطب بہ جناب عالیہ بہو بیگم کے بطن سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام مرزا یحییٰ خاں اور عرفیت مرزا امانی تھی۔ مسند نشینی کے بعد اُس نے آصف الدولہ لقب اختیار کیا۔[1] مرزا امانی کی ولادت ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء یا ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء میں ہوئی تھی۔[2] صاحبزادگی کے زمانے میں شاہ عالم ثانی نے اُسے میر آتشی اور داروغہ غسل خانہ کا عہدہ عطا کیا تھا۔[3] ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء میں ختنے کی رسم ادا ہوئی۔[4] جس وقت مرزا امانی کی عمر پینتیس یا چھتیس سال کی تھی۔

تعلیم و تربیت | عام دستور کے برعکس سولہ یا سترہ سال کی عمر میں بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی گئی۔[5] اس کی تعلیم کے لیے ادیب اور خوش نویس مقرر ہوئے۔ سید شرف الدین محمد شاہی کو اتالیق مقرر کیا گیا۔ لیکن ابتدائے طفلی سے ہی تحصیل علم کی طرف مرزا امانی کی رغبت نہ تھی۔ لہذا کچھ زمانے کی

---

[1] تفضیح الغافلین /۵، سوانحات ۱/ص ۲

[2] تاریخ اودھ ۳/۱

[3] ایضاً ۳/۱، ایضاً ۲/۹۳

[4] تحریک، شمارہ ۳، ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۳ "زیب برستِ ظلیل فرزند" سے تاریخ نکلتی ہے۔

[5] ایضاً /۱۱۳ گفتش اقرأ باسم ربک سالش بداں ۱۱۷۷ھ تاریخ بسم اللہ خوانی نکلتی ہے۔

[6] مولوی عبدالحکیم کشمیری کو تدریس کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ عماد/۱۰۳

لاحاصل محنت اور مشقت کے بعد اتالیق برطرف کر دیئے گئے[1] آصف الدولہ
خط شکستہ خوب لکھتے تھے اور علامہ تفضل حسین خاں سے تربیت پائی تھی[2]

شادی: نواب شجاع الدولہ نے بڑے طمطراق سے مرزا امانی کی شادی انتظام الدولہ کی بیٹی سے کی۔ اس وقت نوشہ کی عمر ۲۳ سال کی تھی[3]۔ فردو نورِ قمری آفتاب، باید گفت، سے تاریخ شادی (۱۱۸۲ھ) نکلتی ہے[4]۔

ابتدائی زندگی اور طبعی رجحانات: سن بلوغ سے ہی مرزا امانی کا رجحان لہو و لعب کی طرف مائل تھا۔ اور اراذل، نااہلوں، احمقوں اور شہدوں کی صحبت کی طرف رغبت تھی۔ محل دبے محل ہنسنا، دوسروں کو فحش گالی دینا، اور اس کے جواب میں ترکی بترکی گندی گالی کا طالب ہونا، ان کی فطرت کا خاصہ تھا۔ بے کار اور بے معنی مشغلوں سے دلچسپی تھی۔ اور بد زبان لوگوں کی صحبت میں بہت خوش ہوتے تھے۔ جس محفل میں جتنی زیادہ فحش آمیز گفتگو ہوتی، اتنا ہی وہ زیادہ محظوظ ہوتے۔ علم سے عاری مگر تیر اندازی اور بندوق زنی میں عمدہ مہارت رکھتے تھے۔ اپنی طبیعت پر قابو نہیں تھا۔ اپنے عزیز دوستوں کے ساتھ بھی بے رخی بدکلامی اور بد تمیزی سے پیش آتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ان کی کسی بات پر معترض ہوتا

---

[1] تاریخ اودھ ۳/۳

[2] عماد/۱۰۳

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی/۱۹۹ الف و ب، تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۱۰، تاریخ اودھ ۲/۱۵۲-۱۵۳، مثنوی شادی آصف الدولہ، معیار پٹنہ مارچ ۱۹۳۶ء ص ۴۳-۴۴

[4] تحریر جلد ۲ شمارہ ۳ ۱۹۶۹ء ص ۱۱۳۔

یا ان کے رجحانات کے برعکس کوئی مشورہ دیتا، اس موقع پر ان پر جذبات کا بے حد غلبہ ہوجاتا۔ اور طیش میں آکر اس شخص کو اپنی محفل سے باہر نکلوا دیتے اور دوستی طاق پر رکھ دیتے تھے۔[1]

مسند نشینی | چونکہ نواب شجاع الدولہ کی تاریخ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے لہذا نواب آصف الدولہ کی تاریخ مسند نشینی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجملاً نواب مرحوم کا جنازہ ابھی گلاب باڑی[2] پہونچا ہی تھا کہ مرزا امانی نے مرزا علی خاں اور سالار جنگ کو جو ان کے سگے ماموں تھے، پیغام بھیجا کہ وہ جلدی واپس چلے آئیں جو نواب مرحوم کی تدفین میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے واپس آنے کے بعد مرزا امانی نے ان سے مسند نشینی کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس کے بعد کرنیل کلیس اور میجر پلیر صاحب ریذیڈنٹ سے بھی مشورہ کیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ جلدی سے انھیں مسند نشین کرادیں۔ چونکہ مرزا امانی نواب مرحوم کا بڑا بیٹا اور قاعدہ کے مطابق مسند اور ملک کا وارث تھا۔ لہذا کسی کو اس بات پر کوئی عذر نہ ہوا۔ اور اسی وقت مسند نشینی کی رسم ادا کردی گئی۔ حاضرین نے جو میت چھوڑ کر چلے آئے تھے، نذریں پیش کیں۔ نواب مرحوم کی تدفین کے بعد نقارچی واپس آئے اور آوازۂ شادمانی بلند ہوا۔[3] مسند نشینی میں تعجیل کی وجہ یہ بھی

---

[1] تاریخ فرح بخش ۱/ ص ۱۰۸، تاریخ اودھ ۳/۲

[2] وہ باغ جس میں نواب مرحوم نے اپنا مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ وہ جگہ اب بھی گلاب باڑی کے نام سے مشہور ہے۔ [3] سوانحات ۱/ ۹۰-۹۱، تاریخ اودھ ۳/ ۴، ۹ "گشت ازپائے آصف الدولہ + رونق مسند وزارت ہند" سے تاریخ نکلتی ہے۔ تفضیح الغافلین ۱۳/ ۱۴-۱۳، چہار گلزار شجاعی ۱/ ۲۲۳ ب - ۲۲۲ الف

معلوم ہوتی ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے مرزا امانی کے علاوہ ۲۵ بیٹے اور بھی چھوڑے تھے، جو دوسری بیبیوں کے بطن سے تھے[۱] اور وہ لوگ بھی وراثت کے مدعی ہو سکتے تھے۔ ان میں نظم ونسق چلانے کی اہلیت بھی تھی[۲]۔ کچھ مورخوں کا کہنا ہے کہ مسند نشینی کی رسم بروز سوم ۲۵ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء کو ادا ہوئی تھی[۳]۔

حدود ریاست ۱۷۶۵ء[۴] میں انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کے تحت صوبہ الہ آباد جسکی سالانہ آمدنی ۲۴ لاکھ روپے تھی اور صوبہ کوڑہ جہاں آباد، جس کی سالانہ ۸ لاکھ تھی شاہ عالم ثانی کے حوالے کر دیئے گئے۔ بقیہ صوبہ اودھ جس کا محاصل ایک کروڑ پچاس لاکھ تھا۔ اور بنارس اور غازی پور جن کی آمدنی پچاس لاکھ اور پندرہ لاکھ تھی، نواب موصوف کے قبضۂ اقتدار میں رہے۔ اس کل آمدنی میں سے نواب کو پچاس لاکھ سالانہ اس فوج کے اخراجات کے لیے دینا پڑتا تھا۔ جو انگریزوں نے وہاں صوبے کی حفاظت کے لیے تعینات کر رکھی تھی[۵]۔ لہذا قدیم اودھ کے علاوہ نواب آصف الدولہ کو وراثت میں روہیلہ افغانوں کا کل علاقہ جو شمال میں ہردوار تک پھیلا ہوا تھا۔ دوآبہ کا تمام علاقہ جس میں الہ آباد بھی شامل تھا جس کو منیر الدولہ[۶] کے

---

۱ سوانحات ۱/۲

۲ ایضاً ۱/ص ۱۹ نیز ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/۹۸، چہار گلزار شجاعی ہر ۲۲ عماد/۱۱۹۔ ۳ سوانحات ۱/۱۹، تاریخ تیموریہ میں لکھا ہے کہ عجلت کی ایک وجہ یہ تھی کہ نجومیوں نے مرزا امانی کو اس سلسلے میں مشورہ دیا تھا۔ بحوالہ تاریخ اودھ ۳/۸

۴ سوانحات ۱/۲۰

۵ سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/۸۵۔

انتقال کے بعد معاوضہ کی رقم ادا کرکے حاصل کر لیا گیا تھا۔ مشرق میں جہانگیر نگر تک کا علاقہ جو ہاپڑ کے قریب تک تھا۔ علاوہ ازیں شاہ جہاں پور سے بنارس تک کا تمام علاقہ مع مضافات کے نواب کو ملا۔ اس طرح مزروعہ اور غیر مزروعہ زمین کا کل رقبہ چالیس کروڑ بیگھے تھا۔[1] کل سالانہ آمدنی ۲ کروڑ ستر لاکھ روپے تھی اس میں سے تراسی لاکھ روپے میں چھ آنے کے حساب سے انگریزی سرکار کو دیدی جاتی تھی۔[2]

تقررات نواب آصف الدولہ نے مسند نشینی کے بعد اپنے ان مصاحبوں کو، جو سن بلوغ سے اس کے ہم جلیس رہے تھے، نوازنا شروع کیا۔ اور ان کو اونچے اونچے عہدوں پر مقرر کیا۔ مرتضیٰ خاں، عرف مرزا جانی کو، جو مسند نشینی سے چند دنوں قبل میر صدیق کی معرفت شہزادہ مرزا امانی کی خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ اور ان کا میر سامان تھا، خلعت نیابت کے ساتھ نواب مختار الدولہ میر مرتضیٰ خاں ہیبت جنگ کا خطاب[3] اور ہفت ہزاری منصب اور ماہی و مراتب سے سرفراز کیا۔[4] اس کے علاوہ قدیم ملازمین سرکار کو از راہ عنایت اعلیٰ رتبے اور عہدے عطا کیے اور خدمات اعلیٰ سے سرفراز کیا۔ راجہ صورت سنگھ کو خزانچی،[5] سبقت اللہ خان کو خان سامان،

---

[1] عماد / ۱۱۹ [2] تاریخ اودھ ۲ / ۳۰۴

[3] مرتضیٰ خاں کے حسب و نسب کے بارے میں مفصل معلومات کیلئے ملاحظہ ہو۔ عماد / ۱۳۳، مفتاح التواریخ / ۳۵۶ تفضیح الغافلین / ۵، تاریخ اودھ ۳ / ۱۰ - ۱۴

[4] طباطبائی کا بیان ہے کہ مرتضیٰ خاں کو مجید الدولہ کا خطاب دیا گیا۔ ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین ۳ / ۹۹، نیز دیکھئے تفضیح الغافلین / ۴، چہار گلزار شجاعی / ۲۲۳ الف تاریخ فرح بخش ۱۱ / ۲۲ - ۲۴ عماد / ۱۱۹

[5] عماد / ۱۲۲ میں لکھا ہے کہ رائے جگناتھ کو دیوانی اور صورت سنگھ کو پتھر گڈھ کا علاقہ تفویض ہوا۔

کرم بیگ خاں کو داروغۂ فراش خانہ مقرر کیا گیا۔ سید خان جہاں اور دوسرے اہلکاروں کو خلعت اور بالا مرداریہ، کلغی اور جاگیریں عطا کی گئیں۔[1] حسن رضا خاں[2] کو داروغۂ توپخانہ کو عہدہ دیا گیا۔ کچھ تلنگوں کو جو شہزادگی کی زمانے میں مرزا امانی کے اردلی اور دیگر خدمات انجام دیتے تھے، راجہ کا خطاب ملا اور ہر ایک کو رسالدار بنایا گیا۔[3] علاوہ ازیں جواہر علی خاں خواجہ سرا[4]، ناظر، دنشاط علی خاں اور بہادر علی خاں خواجہ سراؤں کو، جنھوں نے امارت کا لباس ترک کر کے نواب مرحوم کے مقرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی تسلی و تشفی دے کر واپس بلوایا، عہدے اور خلعتیں عطا کیں،[5] ابوطالب لندنی کا بیان ہے کہ "از عہد صفدر جنگ الی الان ہمیشہ مردم اردلی نائب خانہ وزیر شدہ اند الا مختار الدولہ کہ از اکابر است" محکمۂ فوج میں زیادہ تر خواجہ سراؤں کو ترقی دی گئی۔ مثلاً لطافت علی خان اور محبوب علی خان کو جنرل کے عہدے پر فائز کیا۔ اسی طرح محکمۂ مالیات میں بہار علی خان و جواہر علی خاں کو مقرر کیا گیا۔ عنبر علی خاں خواجہ سرا تو توشکخانہ و باورچی خانہ کی خدمات سونپی گئیں۔[6] اس خوشی کا موقع پر ہزاروں قیدیوں کو رہا کیا گیا۔[7]

---

[1] چہار گلزار شجاعی/۲۲۴ الف، عماد/۱۲۲، تفضیح الغافلین/۶-۷۔

[2] برائے تفصیل دیکھیے۔ عماد/۱۳۵-۱۳۶، تاریخ اودھ ۳/۱۳۱-۱۳۲، تفضیح الغافلین

[3] تفضیح الغافلین ۱۴

[4] برائے تفصیل دیکھیے۔ تاریخ فرح بخش ۱۱/۴۶-۵۳

[5] چہار گلزار شجاعی/۲۲۴ ب، ۲۲۵ الف

[6] تفضیح الغافلین/۶-۷

[7] چہار گلزار شجاعی/۲۲۵ ب

نواب سعادت علی خان کا مسئلہ | سعادت علی خاں عرف مرزا منگلی نواب شجاع الدولہ کی دوسری بیگم، خورد محل کے بطن سے تولد ہوا تھا۔ مرزا منگلی کے علاوہ دوسری بیگمات سوا جن کی تعداد سات سو کے لگ بھگ تھی ۳۰ بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ اور کل تعداد ۴۰ تھی۔ ؎ نواب مرحوم نے اپنی حیات میں مرزا منگلی کو بریلی کا علاقہ تفویض کیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کی مسند نشینی کے کچھ دنوں بعد مختار الدولہ نے میجر پلیر اور کرنیل کلیس سے کہا کہ وہ مرزا منگلی کو بریلی سے واپس بلالیں اور وہ آکر فیض آباد میں قیام کریں اور ان کی کفالت کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا جائے گا۔ مختار الدولہ نے اپنی دلیل میں کہا کہ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رکھی جاسکتیں اسی طرح ایک ملک میں دو فرمانرواؤں کا وجود محال ہے۔ مرزا منگلی مسند کا برابر کا حقدار ہے۔ آصف الدولہ کی مسند نشینی اس وجہ سے عمل میں آئی کہ وہ نواب مرحوم کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اگر مرزا منگلی بریلی میں خود مختارانہ حکومت کرتا رہا تو ملک میں بدامنی پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ لہذا یا تو ان کو واپس بلایا جائے ورنہ ان کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کیا جائے۔ انھوں نے کیا قصور کیا ہے۔ جو انھیں حقِ وراثت سے محروم رکھا جائے۔ اور انھیں بھی علاقے عطا ہوں۔ اس گفتگو کو سننے کے بعد پہلے تو ریذیڈنٹ نے اپنی معذوری ظاہر کی لیکن آخر کار بدرجۂ مجبوری اس نے مرزا منگلی کو شقہ لکھا۔ ریذیڈنٹ کے حکم کو پاتے ہی مرزا منگلی فیض آباد کے لیے روانہ ہوگیا۔ اور فیض آباد میں آکر بنیاد منزل میں سکونت اختیار کرلی ؎ لیکن چند دنوں کے قیام کے

؎ سوانحات ۱/ص ۲، چار گلزار شجاعی / میں ۲۲ یا ۲۳ لڑکوں اور ۴۴ لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے

۲۲۱ ب، ؎ تفضیح الغافلین / ۵، ۲۶؛ ؎ عماد / ۱۱۹-۱۲، سوانحات ۱/ ص ۹۳-۹۴

دوران میں اس نے محسوس کیا کہ نواب اور ارکان دولت اس کی طرف سے بے توجہی برتتے ہیں اس لیے کبیدہ خاطر ہو کر ریذیڈنٹ کے توسط سے نواب عالی سے اجازت لے کر بنارس چلا گیا اور اس کی گذر اوقات کے لیے تین لاکھ روپے مقرر کر دیے گئے۔[۱]

بنارس انگریزوں کے حوالے کرنا | مختار الدولہ نے اپنی خیر خواہی اور نواب عالی پر اپنے اثرات کی وجہ سے نواب کو زمانے کے نشیب و فراز کے بارے میں بہت کچھ سمجھایا۔ اور یہ بات ان کے ذہن نشین کرا دی کہ ان کا وجود انگریزوں کی حمایت کے بغیر ناممکن ہے۔ انھیں کی وجہ سے انھیں مسند ملی، اور انھیں کے خوف سے مرزا منگلی کان دبائے بریلی سے فیض آباد چلا آیا۔ اس لیے ان کی خدمات کے صلے میں از روئے احسان مندی بنارس اور غازی پور کا علاقہ انھیں عطا کر دیا جائے۔ جن کی سالانہ آمدنی ۲۲ لاکھ روپیے تھی، نواب نے اس مشورہ پر عمل کیا۔[۲]

کم ظرفوں کا عروج۔ | چونکہ نواب سفلہ پرور تھا۔ اور ادنیٰ لوگوں کی صحبت سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے زمانے میں ایسے لوگوں کو بڑا عروج حاصل ہوا غلام علی نقوی کا بیان ہے۔

"کسانے کہ آبا و اجداد شان سواری اسپ کم در خواب آرزو داشتند در عہد او مالک فیلخانہ و اصطبل شدند، ہیچ مغلوکے نبود کہ بامید پالکی بھالر دار بر در دولتش استادہ نشود۔ خلاصہ این کہ معتقدان از عزو رخود بخاک سیاہ نشستند و تہیدستان کاسہ لیس را اقبال روز افزوں ملازم آستان گردید۔"[۳]

---

[۱] عماد/۱۳۲، ۱۳۶، سیر المتاخرین ۳/ ۱۰۰-۱۰۱، سوانحات ۱/۹۵ [۲] عماد/۱۲۲، نیز دیکھئے تفضیح الغافلین/۶-۷، تاریخ فرح بخش ۱/۲۱، تاریخ اودھ ۳/۲۵-۲۶
[۳] عماد/۱۳۰-۱۳۱، سیر المتاخرین ۳/۱۰۰-۱۰۱، سوانحات ۱/۹۵

نواب نے اپنے ایک کہار کو راجہ بہرا کا خطاب اور جھالردار پالکی گھوڑا، ہاتھی اور فوجی دستے کی رسالہ داری سے سرفراز کیا۔ اس کہار نے پانچسو سواروں کا ایک ایسا فوجی دستہ تیار کیا جن کی پگڑیاں سرخ تھیں۔ رانوں تک لمبے کوٹ تھے۔ اور ان میں سبز سنجاف لگی ہوئی تھی۔ پائجامے مشروع کے بنے ہوئے تھے۔ وہ کہار بڑا دور اندیش اور عقلمند تھا۔ اس نے بعض ناچنے والی عورتوں کو کہاروں کا ایک مخصوص گانا اور ناچنا سکھا کر نواب کی خدمت میں حاضر کیا۔ نواب نے ان کے رقص و سرود کو پسند فرمایا اور انھیں بہت سا انعام دیا۔ اس وجہ سے ممالک محروسہ میں اس قسم کے رقص کا بڑا رواج ہوا۔ اور اکثر ناچنے والی عورتوں نے اس طرز کے رقص و سرود کے ذریعہ نواب کے ہاں رسائی حاصل کر کے بہت دولت حاصل کی۔[۵۵]

بہو بیگم زوجہ نواب شجاع الدولہ سے تنازع | مختار الدولہ کے بہکانے پر نواب نے اپنی والدہ بہو بیگم سے اُس دولت میں سے اپنا حصہ طلب کیا جو نواب شجاع الدولہ نے ان کے پاس محفوظ کر رکھی تھی۔ چونکہ نواب ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے انھوں نے کچھ تامل کے بعد پچاس لاکھ روپے دیدیئے۔ بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ بہو بیگم نے اتنی اتنی رقم کئی مرتبہ نواب کو دی۔ اس کے بعد نواب نے اپنی بڑی دادی صدر جہاں بیگم زوجہ نواب صفدر جنگ کے ساتھ ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا۔ وہ ضعیفہ جہاں دیدہ تھی۔ وہ نواب کی نااہلی اور ناشائستہ حرکات سے بخوبی واقف تھی لہذا انھوں نے گرد و پیش کے زمینداروں اور

---

[۵۵] تاریخ اودھ ۳ / ۲۵-۲۶

رنجاؤں کو مع فوج کے اپنی مدد کے لیے طلب کیا۔ جب مختارالدولہ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ دُم دبا کر راتوں رات لکھنؤ چلا گیا[1]

مختارالدولہ کا عروج | چونکہ نواب لہو ولعب میں منہمک رہتا تھا[2]۔ اور نظام حکومت سے بے توجہی برتتا تھا۔ اس لیے مختارالدولہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی اور سپید وسیاہ کا مالک بن بیٹھا۔ اور اسمیں فرعونی نخوت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ وافضل سمجھتا تھا اور کسی کو اپنا مدِ مقابل تصور نہ کرتا تھا۔ بالفاظ دیگر ے وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس کا واحد مقصد سیاہ کو تباہ کرنا اور نواب کو معزول کرنا تھا[3]۔ طباطبائی کا بیان ہے۔ "مختارالدولہ کی نہایت ایسی چلی کہ آصف الدولہ سے بجز نام کے کچھ ظاہر نہ تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کو اقتدار الدولہ بہادر کا خطاب دیا۔ اور نائب صوبہ اودھ کر دیا۔ اور دوسرے بھائی معزز خاں کو معزز الدولہ بہادر کا خطاب دلوا کر نائب صوبہ الہ آباد کیا۔ اور اپنے اقربا میں ہر ایک کو صاحب اقتدار کر دیا۔ شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے ملازمین اُسکے دست نگر ہو کر رہ گئے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے خلاف دم مارتا"[4]

---

[1] سیر المتاخرین ۳/ ۹۹، سوانحات ۱/ ص ۹۲ Selections from the Letters etc (Cal. 1890) III. PP. 12, 21

[2] سیر المتاخرین ۳/ ۱۰۴، ۱۱۰

[3] تاریخ فرح بخش ۱/ ص ۲۲ - ۲۴

[4] سیر المتاخرین ۳/ ص ۱۰۰

جب ہر طرح سے اس نے طاقت اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں میں مرکوز کرلی تو اس نے قدیم ملازمین کی تذلیل کرنی شروع کر دی اور نتیجتاً ان میں سے بعض کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی اور جو لوگ رہ گئے وہ ہمہ وقت ترساں و ہراساں رہتے تھے۔ ان کی زندگی عذاب تھی۔[1]

مختار الدولہ کا قتل ساتھ ساتھ مختار الدولہ نے انگریزی افسروں کے ساتھ اپنا رسوخ بڑھا لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ نخوت و غرور کے نشے میں سرشار رہنے لگا کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ افسران فوج کو بذلت تمام برطرف کروا دیتا۔ فوج کی تنخواہیں بقایا رہنے لگیں اور اس طریقہ کار نے انھیں بے حد بدل کر دیا۔ نواب کے ہاں ملازم فرانسیسی فوج برطرف کر دی گئی۔ صاحب عزت لوگ خاک میں ملا دیئے گئے۔[2] اسفال اونچے عہدوں پر فائز ہو رہے تھے، رشوت خوری کا بازار گرم تھا، افسران نے لاکھوں روپے اپنی اولاد کو ترکے میں چھوڑا۔ مثلاً جب راجہ بھرا فوت ہوا تو ضبطی کے موقع پر دو کروڑ روپے کا اثاثہ برآمد ہوا۔ وہ تمام کا تمام اثاثہ نواب شمس الدولہ ہضم کر گئے۔[3]

جس زمانے میں نواب فرخ آباد سے واپسی میں اٹاوہ میں خیمہ زن تھا تو

۱؎ سیر المتاخرین ۳/ص ۱۰۴، سوانحات ا/ص ۹۹ ۲؎ عماد/ ۱۲۱

۳؎ سوانحات ا/ص ۹۶۔ اودھ کے سپاہی مختار الدولہ سے اس قدر ناراض تھے کہ ان میں سے کسی کا جب کبھی اس کی قبر کے قریب سے گذر ہوتا تو خواہ مخواہ اس پر ڈھیلے مارتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عشرہ محرم میں اس نے تعزیوں پر گولے برسوائے تھے۔ کمال الدین حیدر نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا۔ ایضاً ا/ص ۹۷، نیز عماد/۱۲۱، سیر المتاخرین ۳/ ۹۹-۱۰۰، ۱۰۴

میر احمد[1] جو افسر پائیسی ۸ ہزار پلٹن نجیب[2] کا سردار تھا۔ مختار الدولہ کے حکم سے سپاہ کی بقایا تنخواہ لینے کی غرض سے آیا اور کوس بھر کی دوری پر خیمہ زن ہوگیا۔ اور اس نے سوچا کہ صبح کو جاکر تنخواہ کی رقم لے لیگا۔ مختار الدولہ نے میر احمد کے خلاف نواب کے کان بھرے اور اس پر بغاوت اور سرکشی کا اتہام لگایا۔ اور نواب سے اجازت لے کر ایک فوجی دستہ اس کی سرکوبی کے لیے بھیجدیا۔ نتیجتاً ایک محاربہ ظہور میں آیا اور سیکڑوں سپاہی کام میں آئے۔ آخر میں میر احمد کی سپاہ نے فرار کی راہ لی اور کچھ گرفتار کر لیے گئے[3]

اپنے اقتدار اور احتشام کی وجہ سے مختار الدولہ نواب کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا اور اس کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آتا تھا۔ اور ریذیڈنٹ برسٹو کو نواب کے خلاف ورغلایا کرتا تھا[4]۔ نواب کو جب ان تمام باتوں کا علم ہوا۔ اور خیر خواہان سلطنت نے بھی نواب سے مختار الدولہ کی شکایتیں کیں تو نواب نے اس کے قلع قمع کا پروگرام بنایا۔ بسنت خاں[5] کو اس کام کے لیے مامور کیا۔ ان دنوں بسنت خاں دیوان خانے کا مہتمم بھی تھا۔ حالانکہ مختار الدولہ نے بسنت خاں کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ لیکن نواب کے اشارے پر وہ ہاتھ دھو کر اس کی جان کے درپے ہوگیا۔ موسم گرما میں ایک دن اس نے مختار الدولہ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔

---

[1] سوانحات ۱/۹۶-۹۷، سیر المتاخرین ۳/۱۰۱-۱۰۲، عماد/۱۲۷-۱۲۹

[2] برائے تفصیل پلٹن نجیب ملاحظہ ہو سیر المتاخرین ۳/۱۰۱

[3] عماد/۱۲۶-۱۲۹، سیر المتاخرین ۳/۱۰۱-۱۰۲، سوانحات ۱/۹۶-۹۷، تاریخ اودھ ۳/۸۶-۸۸

[4] سیر المتاخرین ۳/۱۰۰ [5] برائے تفصیل دیکھیے سیر المتاخرین ۳/۱۰۲

تہ خانے میں ضیافت کا انتظام ہوا۔ رقص و سرود و قوالی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ بے خودی کے عالم میں مختارالدولہ قیلولہ کرنے لگا۔ اسی اثنا میں میر طالب علی نے اندر داخل ہو کر اس کا کام تمام کر دیا۔[۱] بسنت علی خاں اس خوشخبری کو لے کر نواب کی خدمت میں حاضر ہوا اس خوف سے کہ کہیں راز افشا نہ ہو جائے۔ نواب نے اس پر طپنچہ کی ایک گولی ماری، وار خالی گیا، مگر بسنت علی خاں زمین پر دھڑ سے گر گیا۔ راجہ نول سنگھ نے جو اس وقت موقع پر موجود تھا، دوڑ کر اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۷ صفر بروز چہارشنبہ ۱۱۹۰/ ۱۷۷۶ء کو اٹاوہ میں پیش آیا۔[۲]

انور خواجہ سرا کو نیابت ملنا۔ اسی وقت نواب ریذیڈنٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس کے روبرو انور خواجہ سرا کو جو مختارالدولہ کا نائب تھا خلعت نیابت سے سرفراز کیا۔ اس بات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اودھ کی ریاست میں عملی طور پر انگریزوں کا پورا تسلط قائم ہو چکا تھا۔[۳]

مرزا منگلی سعادت علی خاں کا فرار ہونا۔ مختارالدولہ کے قتل کے بعد لشکر شاہی میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مرزا منگلی کے نوکروں نے اس کو قتل کر ڈالا۔ تفضل حسین خاں نے

۱؎ سیر المتاخرین ۳/ ۱۰۲-۱۰۳، تفضیح الغافلین/ ۲۶-۲۷۔ Shah Alam II and His Court. PP. 105-110 سوانحات ۱/ ۹۹

۲؎ سیر المتاخرین ۳/ ۱۰۳، عماد/ ۱۳۰-۱۳۲، مفتاح التواریخ/ ۳۵۶-۳۵۷، تفضیح الغافلین/ ۲۷-۲۹، تاریخ اودھ ۳/ ۱۰۰-۱۰۳، ۱۰۷۔

۳؎ عماد/ ۱۳۲، سوانحات ۱/ ۹۹

مرزا منگلی کو اس بات سے مطلع کیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ بھاگ کر امراؤ گر کے ہاں پناہ لے لیں۔ جب نواب آصف الدولہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے امراؤ گر سے احتساب کیا لیکن اس کے جواب سے مطمئن ہو گئے۔ لیکن امراؤ گر نے مرزا منگلی کا اپنے ہاں پناہ گزین رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے مرزا منگلی کو اپنی گھوڑی دے کر رائے دی کہ جہاں ان کے سینگ سمائیں چلے جائیں۔ لہذا اپنے چند رفقاء میر مظہر، میر علی پناہ، میر فضل علی خاں، میر طالب علی، اور مرزا مومن بیگ کو ہمراہ لیکر وہ نجف خان کے لشکر میں چلا گیا۔[1] ۸۱-۱۷۸۰ء میں دوبارہ آگرہ سے لکھنؤ واپس آیا اور بنارس میں قیام پذیر ہوا۔[2]

محمد ایلچ خاں[3] مختار الدولہ کے مظالم سے تنگ آکر محمد ایلچ خاں لکھنؤ سے رخصت ہو کر دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے کہا کہ دہلی جاکر وہ نواب کے لیے وزیر الممالک کا خلعت حاصل کرے گا۔ اس وجہ سے نواب نے اس کے ساتھ گوپال پنڈت کو اور دو پلٹنیں بھی کر دیں۔[4] محمد ایلچ خان آگرہ آکر وہیں ٹھہر گیا۔[5] جس زمانے میں مرزا منگلی آگرہ پہونچا تھا۔ محمد ایلچ خان وہاں موجود تھا۔ لہذا اس نے اپنے اہلکار محمد مکرم خاں، محمد اسحٰق خان کو خیر مقدم کے لیے بھیجا اور

---

[1] ایضاً سوانحات ۱/۹۹، سیر المتاخرین ۳/۱۰۳، عماد/۱۳۲-۱۳۳، تفضیح الغافلین/۴۵۔ [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو تفضیح الغافلین/۴۵ [3] تفضیح الغافلین/۴۶، تاریخ اودھ ۳/۲۰-۲۴۔

[4] عماد/۱۲۱، سیر المتاخرین ۳/۹۹، ۱۰۹، تفضیح الغافلین/۱۳، Shah Alam II And His Court. PP. 41-42, 44, 45

[5] سوانحات ۱/۹۹

ضعیف العمری کی وجہ سے آگے نہ جا سکا اور اپنی ڈیوڑھی پر شہزادہ کا استقبال کیا۔ نذر پیش کی اور بطور مہمان اپنے ساتھ رکھا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سعادت علی خان نے مرزا نجف کے لشکر میں پناہ لی تھی۔ کچھ دنوں بعد مرزا نجف خان نے سعادت علی خان سے کہا کہ وہ محمد ایلچ خان سے وہ تمام دولت زبردستی چھین لے جو اس کے پاس تھی لیکن ثانی الذکر اس بات کے لیے راضی نہ ہوا[1] اسی دوران میں محمد ایلچ خان نے نواب آصف الدولہ سے درخواست کی کہ اُسے اودھ کے علاقے میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ نواب نے بخوشی درخواست منظور کر لی۔ جب محمد ایلچ خان اودھ کے حدود میں داخل ہوا تو نواب نے بذاتِ خود اس کا خیر مقدم کیا۔ نواب نے اُسکو خلعتِ نیابت عطا کی۔ حالانکہ وہ ضعیف العمر تھا۔ اور علیل بھی تھا۔ پھر بھی اس نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔[2] کام کی زیادتی کی وجہ سے روز بروز کمزوری بڑھتی گئی، فالج کا شکار ہوا۔ اور وفات پائی۔[3]

نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خان کو نیابت کا خلعت تفویض ہونا

محمد ایلچ خان کی وفات کے بعد نواب اور جان برسٹو، ریذیڈنٹ کو نیابت کے عہدہ پر کسی کے تقرر

---

[1] عماد /۳ ۱۳۲ [2] سوانحات ۱/۱۰۰-۱۰۱، سیر المتاخرین ۳/۱۰۹، عماد/۴ ۱۳۴-۱۳۵، تفضیح الغافلین ۱/۳۱-۳۲ [3] سیر المتاخرین ۳/۱۱۱۔ عماد/۵ ۱۳۵، تفضیح الغافلین ۱/۳۲ تاریخ اودھ ۳/۲۸ رجب ۱۱۹۰ھ کو وفات پائی ۱/۱۲۶۔

[4] رقعات مرزا قتیل "امیر الدولہ خطاب حیدر بیگ خان بود" ۳۳/ برائے حسب و نسب حیدر بیگ خان ملاحظہ ہو۔ عماد/۵ ۱۳۵، سیر المتاخرین ۳/۱۱۲، تفضیح الغافلین ۱/۳۱، وفات ۱۰۹۲/۱۶۹۱ء ص ۱۱۹-۱۲۰

کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ چونکہ حسن رضا خاں[۵] نواب شجاع الدولہ کے دورِ حکومت سے باورچی خانے کا داروغہ تھا۔ اور نواب کے حاشیہ نشینوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس وجہ سے نواب آصف الدولہ کے دور میں اُسے خلوت اور جلوت کی مجالس تک رسائی حاصل تھی، اور حاضر باش رہتا تھا۔ لہذا نیابت کے لیے اس کا نام تجویز ہوا مگر سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض اُمّی تھا۔ اور عیاش اور کاہل الوجود بھی تھا۔ حالانکہ حسن رضا خاں میں اس عہدے کے سنبھالنے کی اہلیت نہ تھی پھر بھی مسٹر ہرسٹوڈ کی یہی رائے ہوئی کہ نیابت تو اسی کے نام رہے اور اس کی مدد کے لیے اس کا نائب ایک ایسا شخص بنایا جائے جس میں نظام حکومت کے چلانے کی صلاحیت ہو۔ ہر چند حسن خاں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کیا لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ اور اُسے نائب مقرر کر دیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے حیدر بیگ خان کو اس کی نیابت پر مقرر کیا گیا۔ دونوں کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا۔ حیدر بیگ خان نظام حکومت کے چلانے میں مصروف ہوا۔ اور حسن رضا خاں، چھ لاکھ روپے ماہوار کی جاگیر ملی ہوئی تھی۔ عیش و عشرت میں ڈوب گیا، "صحبت شراب و کباب میں شاغل، اور دربار میں آمد و رفت سے غافل ہوا" اس وجہ سے فوج میں تخفیف ہوئی۔ اور بہتوں کو ذریعہ معاش سے محروم کر دیا گیا۔[۶]

روہیلکھنڈ کا محاربہ | نواب فیض اللہ خاں[۷]، والیٔ رام پور نے ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں

---

۵ تفضیح الغافلین/ ۳۵-۳۶، تاریخ سعادت جاوید/ ۱۰۰-۱۰۴، تاریخ اودھ ۳/ ۱۳۲، ۱۳۲-۱۳۳

۶ تفضیح الغافلین/ ۳۵، تاریخ اودھ ۳/ ۱۳۳

۷ برائے تفصیل سوانح عمری۔ ملاحظہ ہو۔ وقائع عالم شاہی/ ۲۰۳-۲۰۴، عماد/ ۱۵۱

وفات پائی۔ نواب مرحوم کا بڑا بیٹا نواب سید محمد علی خاں ۸ ذیقعدہ ۱۲۰۹ھ میں مسند نشین ہوا۔ ان کے برادر خورد سید غلام محمد خاں[1] نے افغانوں کو اپنا رفیق بنا کر بڑے بھائی کو قتل کروا ڈالا اور خود مسند پر قبضہ کر لیا۔ نواب آصف الدولہ چونکہ نواب محمد علی خاں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ ان پر بڑی عنایتیں کی تھیں۔ اور اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس لیے اس حادثہ کی خبر سن کر اپنا یہ فرض سمجھا کہ اس کے خون کا بدلہ لیں۔ نواب نے کمانڈر انچیف کو ابلکرام کو حکم دیا کہ وہ غلام محمد خاں کو گرفتار کریں اور بذات خود مع لشکر اور انگریزی فوج کے فرخ آباد کے راستے سے رام پور کیلئے کوچ کیا۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں جنگ واقع ہوئی۔ اور نواب آصف الدولہ کو رہزہ کے مقام پر فتح نصیب ہوئی۔ نواب نے محمد علی خاں کے کم سن بیٹے احمد علیخاں کو مسند نشین کیا۔ اور سید نصیر اللہ خاں کو بطور منصرم ریاست اور محافظ احمد علیخاں مقرر کیا[2]۔ اس کے بعد نواب آصف الدولہ کو پچاس لاکھ روپے اور روہیلہ افغانوں کا نصف ملک ملا[3]۔ اس فتح کے بعد جب نواب آصف الدولہ ۱۰ جمادی الآخر ۱۲۰۹ھ کو واپس لکھنؤ پہونچا تو کوتوال شہر میر بہادر علی بلگرامی نے نواب کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا اور اس موقع پر شہر میں آئینہ بندی کا اہتمام کیا گیا[4]۔

گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگ کی لکھنؤ میں آمد | حالانکہ میجر ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء میں لکھنؤ

---

۱ دیکھیے تاریخ اودھ ۳/۳۲۳

۲ عماد/۱۵۱-۱۵۳، تفضیح الغافلین/۱۳۷

۳ ایضاً/۱۵۳، تاریخ اودھ ۳/۳۲۸-۳۲۹

پہونچ چکے تھے۔ اور بہت سے سیاسی واقعات ان کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے مگر انھوں نے نہ تو ذکر میر اور کسی دوسرے روزنامچہ میں ان کو قلم بند کیا۔ انھوں نے گورنر جنرل کی لکھنؤ میں آمد اور اس موقع پر جو کچھ عمل میں آیا اس کو قلم بند کیا ہے۔ ۱۲۱۱ھ/۹۷-۱۷۹۸ء میں گورنر جنرل لکھنؤ آئے تھے۔ میر لکھتے ہیں۔

"ادھر وزیر اعظم امیر معظم گورنر بہادر کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے جو ان کی دعوت پر آرہے تھے۔ اور اس وقت تمام ملک میں وہ قوی اور غالب ہیں۔ فوج کا غبار آسمان تک پہونچ رہا تھا۔ یہ سفر الہ آباد تک ہوا۔ اس ضلع کے تمام سردار ان کی آمد سے آگاہ ہو کر ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک منزل پہلے نواب گردوں کا بس سے ملاقات ہوئی۔ دہاں سے اپنے ساتھ لکھنؤ لائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہر منزل پر نئی نئی ضیافت ہوتی تھی۔ نئے نئے خیمے۔ عجیب و غریب کھانے ترکی و تازی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی، قیمتی پوشاک، اور جواہر کی کشتیاں، خوشگوار شربت، ان گنت میوے، اس علاقے کے اچھے تحفے، جنوب اور مشرق کی (بنی ہوئی) تلواریں، چابک، کمانیں (ہر جگہ بہار دکھا رہی تھیں۔ جب لکھنؤ میں آئے اور محل میں اقامت فرما ہوئے تو ہر روز رنگا رنگ کے فرش فروش، جن پر اعلیٰ درجے کا کام کیا ہوا، مکان کے کونے میں گلاب چھڑکا ہوا، نرم و ملائم بستر خواب، معطر و معنبر لباس مخمل کے اچھوتے فرش، سیم گل کی ہوئی دیواریں، پردول اور جھاڑ

سے آراستہ ایوان عنبر کی خوشبو عجیب مستی آفریں تھی۔ بھنے ہوئے پستے اور بادام اور انگریزی چیزیں، نقل کے لیے رکھی ہوئی۔ راتوں کو حسین و جمیل عورتوں کا رقص ہوتا۔ بلکہ وہ رقاصائیں بہشت کی حوروں سے زیادہ دلکش تھیں۔ شیشے اور چینی کے گلدان سلیقے سے چنے ہوئے۔ تمام طاق تازہ میوے سے بھرے تھے۔ فرنگی رقص ہو رہا تھا۔ عجب تماشا تھا۔ عجب مکان تھا۔ عجب ہوا تھی۔ شام کو چراغاں ہوا، آتش بازی لائی گئی، ستارہ، اور "ہوائی" آسمان تک پہونچ رہی تھیں چراغاں کا نظارہ دل کو لبھا رہا تھا۔ اور مہتابی سے رات روز روشن کا نمونہ بن گئی تھی۔ زربفت کا سائبان اس خوبی سے کھینچا گیا تھا کہ سورج کی نگاہوں نے اس کا جواب نہ دیکھا ہوگا۔ تمام امرا حاطریں لگے ہوئے، راجہ خدمت پر آمادہ۔ اچھے اچھے شعراء مدح خوانی کر رہے تھے۔ خوش منظر جوان تھے، ہر جگہ خوب سایہ پھیلا ہوا، پانی کے فوارے بہتے ہوئے۔ نرگس دان برابر رکھے تھے جیسے پائیں باغ (آراستہ) ہو۔ اور برف ایسی بہہ رہی تھی گویا پگھلی ہوئی چاندی ہے۔ طرح طرح کے خوش رنگ شربت، قسم قسم کی بنی ہوئی روٹیاں تھیں۔ نان بادام بڑی نزاکت سے بنی ہوئی شیرمال، اور باقرخانی، خورشید کے مثل صاف اور گرم، نان جوان ایسی کہ (واقعی) بوڑھا کھالے تو جوان ہوجائے۔ نان ورقی کی تعریف کروں تو دفتر بھر جائے۔ نان زنجبیلی کو دیکھ کر ذائقہ محظوظ ہوتا ہے، ہر نوع کے قلیے، دوپیازے رکھے تھے، تمام مہمانوں کا

کا جی للچا رہا تھا۔ کئی قسم کے کباب دستر خوان پر حاضر تھے۔ کباب گل، اپنی تازگی اور خوبی میں لاجواب، اور خوش ذائقہ، کباب ہندی دل موہ لے رہا تھا۔ کباب قندھاری اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ تو کباب سنگ ایسے کہ رات کے تھکے ماندوں کو بشاش کر دیں۔ کباب ورق نہ جانے کس انداز سے تلے گئے تھے کہ طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے، یہ سب کباب بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ تھے۔ ایک ایک کھانے کی دس دس قابیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر ایک مہمان کے سامنے طرح طرح کے پلاؤ، شوربے اور کھانے چُنے گئے تھے۔

یہ مہمانداری چھ ماہ تک متواتر رہی اور اِس دوران میں ملکی اور مالی معاملات میں گفت و شنید بھی ہوتی رہی"۔[1]

خلعتِ وزارت، | نواب آصف الدولہ موروثی خلعت وزارت کے حاصل کرنے کا بڑا خواہشمند تھا،[2] لہذا اس نے لطافت علی خان خواجہ سرا[3] کو اس کام کے لیے شاہ عالم ثانی خدمت میں بھیجا، قطب الدین خان

---

[1] میری آپ بیتی / ۱۸۲-۱۸۴، نیز دیکھیے۔ چہار گلزار شجاعی / ۶۲ ب - ۶۳ الف، عماد / ۱۲۵-۱۲۶، ۲۰ مارچ ۱۷۸۴ء کو گورنر جنرل لکھنؤ آئے، اور ۲۷ اگست ۱۷۸۴ء کو واپس گئے۔ تاریخ اودھ ۳/ ۲۴۰-۲۴۱

[2] Shah Alam II And His Court. P. 41

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو تفضیح الغافلین / ۳۰-۳۱، وقائع عالم شاہی / ۱۳، ۱۵-۱۶، ۱۹، ۱۸۶-۱۸۸، تاریخ اودھ ۳/ ۶۱-۶۲

بن ضیاء الدولہ سعد الدین اور مجید الدولہ عبدالاحد[۱] کے توسط سے یہ خلعت نواب کے پاس اس وقت پہونچی جب وہ اٹاوہ کے مقام پر خیمہ زن تھا[۲]

وفات: یہ علامہ تفضل حسین خان کی نیابت کا زمانہ تھا کہ نامور نواب آصف الدولہ نے ۲۲ سال ۱۰ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۲۸ ربیع الاول بروز جمعہ ۱۲۱۲ھ/۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو پچاس سال کی عمر میں رحلت کی۔ اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ میں مدفون ہوئے[۳]۔

نواب آصف الدولہ کی وفات پر اودھ ریاست کے حدود: پہلے لکھا جاچکا ہے کہ نواب آصف الدولہ کو ورثہ میں ایک وسیع ریاست ملی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنی تغافل شعاری کی وجہ سے انگریزوں کو اس بات کا موقع بہم پہونچایا کہ رفتہ رفتہ وہ تمام علاقوں پر قابض ہوسکیں۔ اور ایسا ہی ہوا، انگریزوں نے دھیرے دھیرے نواب کے عاملوں کو آودھ، بریلی، کوڑہ جہاں آباد، اور مراد آباد سے برطرف کرکے اپنے

۱؎ ان کے والد نواب مجد الدولہ عبدالمجید خان کشمیر کے باشندے اور احمد شاہ بادشاہ بن محمد شاہ کے بخشی سوم تھے۔ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں انتقال ہوا۔ مجد الدولہ عبدالاحد خان کو ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں شاہ عالم ثانی نے نائب وزیر مقرر کیا۔ اس زمانے میں دہلی کی سیاست میں انھوں نے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ ۱۲۰۲-۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء میں وفات پائی۔ تیمر کی آپ بیتی/ ۱۷۱-۱۷۲، وقائع عالم شاہی ص ۱۸۱-۱۸۳۔

۲؎ برائے تفصیل حصول خلعت دیکھیے۔ تاریخ اودھ ۳/ ۹۰-۹۱

۳؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تذکرہ علمائے ہند/ ۳۶-۳۷، تبصرۃ الغافلین/ ۵-۶، تاریخ اودھ ۳/ ۲۲۵-۲۲۸۔

۴؎ مفتاح التواریخ/ ۳۶۵، عماد/ ۱۵۷، سوانحات ۱/ ۱۲۰-۱۲۲

نمایندوں کو حاکم مقرر کیا۔ اور محصول اور مالگذاری کی وصول یابی اپنے ملازمین کے ذریعہ کرانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے نواب شجاع الدولہ کے زمانے سے ملازم فوج جس کی تعداد تقریباً تیس ہزار تھی، اور سپاہ توپ خانہ کو اپنی حکمت عملی سے برطرف کروا دیا۔ دو مرتبہ انھوں نے بہو بیگم اور دیگر بیگمات سے زبردستی کروڑ کروڑ کی رقمیں وصول کیں اور اس طرح قدیم خزانہ خالی کر دیا۔ اور شاہی خاندان کے افراد کو تنگ معاشی میں مبتلا کر دیا۔[۱]

مرزا وزیر علی خاں

نواب آصف الدولہ کو عورتوں سے رغبت نہ تھی کیونکہ قوت رجولیت سے عاری تھا۔ لیکن اس کے محل میں پانچ سو عورتیں تھیں۔ ان میں کچھ ایسی بھی تھیں کہ نواب نے ان کو ایسے زمانے میں اپنے حرم میں داخل کیا جب وہ حاملہ تھیں اور جب ان سے لڑکے پیدا ہوئے تو نواب نے انہیں اپنے نطفے سے بتایا۔ اور ان موقعوں پر بڑی بڑی خوشیاں منائی جاتیں۔ ان لڑکوں کی اپنی اولاد ہی کی طرح پرورش کی جاتی۔ اس طرح کی کل اولاد ساٹھ تھیں، ۳۲ لڑکے، اور ۲۵ لڑکیاں لڑکوں میں سب سے بڑا وزیر علی خان تھا۔ وزیر علی خان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ وہ نہایت ذہین۔ خوبصورت، ملیح، خوشنما تھا۔ علم و ہنر اور انشاء کی تعلیم

---

[۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ وقائع بعد از وفات عالمگیر/ ۱۷۱ الف و ب نیز دیکھیے سیر المتاخرین ۳/ ۱۰۴، عماد/ ۱۵۸؛ سواد اسکات ۱/ ۱۲۰؛ تفضیح الغافلین/ ۱۲۲-۱۲۵

بخوبی پائی تھی۔ خوش نویسی میں مرزا احمد علی اعجاز رقم کا شاگرد تھا۔ اور فنون سپاہ گری رستم خاں پھلیت سے سیکھے تھے۔ اسپ تازی، شمشیر افگنی، تیر اندازی اور چوگان بازی میں اس کو خوب مشق تھی۔ نواب آصف الدولہ کو اس سے کمال الفت تھی۔[1] نواب نے وزیر علی خاں کی شادی میں قریب تیس لاکھ روپیے خرچ کیے تھے۔ نواب کے انتقال کے بعد چار ماہ کے لیے مسند نشیں بھی ہوا۔ چونکہ وزیر علی خاں نواب کے نطفے سے نہ تھا، اور کہا جاتا ہے کہ[2] فراش کا لڑکا تھا[3]۔ اس لیے مسٹر جان شور ریزیڈنٹ نے اُسے بہو بیگم کی رضامندی حاصل کرکے معزول کر دیا۔ معزولی کے فرمان پر تمام درباری امرا کے دستخط کروا کے اُسے مقید کر لیا گیا۔ اور چند دنوں کے بعد اُسے بنارس کی طرف روانہ کر دیا گیا۔[4] بنارس پہونچنے کے بعد مسٹر چیری بہادر جو وہاں کا حاکم تھا، وزیر علی خاں کا مخالف ہو گیا۔ اور کلکتہ سے جو احکام وزیر علی خاں کے نام آتے ان کی تعمیل میں تاخیر کرنے لگا۔

---

[1] تاریخ اودھ ۳ / ۳۶۰

[2] تفضیح الغافلین / ۱۳۴-۱۳۵

[3] محمد نجم الغنی نے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے نطفے سے کوئی فرزند نہ تھا۔ ہمیشہ آرزومند رہے کہ کوئی وارث ریاست پیدا ہو لیکن نخل بارور نہ ہوا۔ عالم مایوسی میں ایک غریب سید کے لڑکے کو نواب نے اپنی فرزندی میں جگہ دی اور وزیر علی نام رکھا۔ تاریخ اودھ ۳ / ۳۶۰ لیکن مصنف موصوف نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

[4] تاریخ سعادت جاوید / ۲۲۴، مفتاح التواریخ / ۳۶۶-۳۶۷، عماد / ۱۶۴-۱۶۱

۱۷۹۸ء-۱۷۹۹ء میں وزیر علی خاں نے مسٹر چیری کو مع دو دیگر انگریز حاکموں کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور وزارت کا مدعی ہوا۔ آخر کار وہاں سے بھاگ کر دشت نوردی کرتا ہوا جے نگر پہنچا اور وہاں قیام کیا۔ ہندوستانی اور انگریز وکلا نے وہاں پہونچ کر اُسے گرفتار کر لیا۔ اور کلکتہ بھیج دیا گیا، جہاں اُسے سخت قید میں رکھا گیا۔ گورنر جنرل اور کارنوالس نے وزیر علی خاں کو کھیتی باڑی کی اجازت دیدی تھی۔ ماہ شعبان ۱۲۳۲ھ / ماہ جون ۱۸۱۷ء کو وفات پائی۔[1]

اس مختصر دورِ حکومت میں اس سے ایسی حرکات ناشائستہ عمل میں آئیں کہ اُن کا ذکر بے سود ہے۔ رذیلوں کو بڑے عہدے اور خطابات عطا کیے۔ تاڑی کش اور دوسرے رذیل فرقے کے لوگ اُسے نصیب الدولہ کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔[2]

نواب سعادت علی خاں

وزیر علی خاں کی معزولی کے بعد ۳/ شعبان سنہ ۱۲۱۳ھ / یکم جنوری ۱۷۹۸ء کو

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد / ۱۶۲-۱۷۱، تاریخ سعادت جاوید / ۳ / ۲۲۴، وزیر نامہ (از محمد امیر علی خاں) (نظامی پریس کانپور، ۱۸۷۶) ص ۴۹-۵۱، قیصر التواریخ / ۱ / ۱۳۶-۲۴۲، سوانحات / ص ۱۳۰-۱۴۲، مفتاح التواریخ / ۳۷۸، وقائع عبدالقادر خانی / ۲ / ۱۳۲، تاریخ مہاراجگان ہند و نجم الغنی، ہمدم برقی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۶ء، ص ۲۴۳-۲۴۵، تاریخ اودھ / ۳ / ۳۷۷-۳۸۵

[2] عماد / ۱۵۹

سعادت علی خان کی مسند نشینی عمل میں آئی۔[1] سعادت علی خاں نواب شجاع الدولہ کا بیٹا۔ اور نواب آصف الدولہ کا بھائی تھا۔ مسند نشینی کے موقع پر ارکان دولت نے حسب دستور نذرین پیش کیں۔ جلوس کے دن نواب کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی سال بھر عیش وعشرت میں گذرا، کسی کارخانہ، اہلکار، مصاحب اور منافق سے بے خبری برتی لیکن سب کے بارے میں رائے قائم کرتے رہے۔ عیش وعشرت کے جلسے اکثر نشاط باغ میں ہوا کرتے تھے۔ صبح کو سیر وسپاٹے کے لیے جایا کرتے تھے۔[2]

عہدنامہ فیمابین گورنر جنرل اور نواب سعادت علی خان | بکسر کی جنگ میں نواب شجاع الدولہ کی شکست کے بعد نواب اور انگریزی سرکار کے مابین ایک سمجھوتہ ہوا تھا۔ اور اس کے تحت کل آمدنی میں سے ۶ آنہ فی روپیہ کے حساب سے انگریزی فوج کے اخراجات کے مد میں دیئے جاتے تھے۔ جو اودھ میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے تعینات کی گئی تھی۔[3] جب نواب سعادت علی خان مسند نشین ہوئے تو ایک نئے عہدنامہ پر نواب کو دستخط کرنے پڑے جس کی رو سے نصف ملک محروسہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا[4] اور اس پورے علاقے کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ تیس لاکھ روپیے ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا معاملات میں اس قدر اقتدار

---

[1] انشاء نے تاریخ جلوس میں یہ شعر کہا تھا۔ ع

جلوس کردہ ابسال وسال حال الکمال فزوں دوازدہ است از دوازدہ صد سال

کلیات انشاء/ ۱۲۵۲، ۲۰۵-۲۰۶

[2] سوانحات ا/ص ۱۵۱، ۱۲۹، عماد/ ۱۲۵-۱۲۶

[3] ایضاً ا/ص ۱۵۰، تاریخ سعادت جاوید۔

[4] ایضاً ا/۱۵۰

بڑھ گیا تھا کہ بقول سید کمال الدین حیدر صاحب جانشین بلدۂ لکھنؤ میں اپنے عہدہ میں بمنزلہ قائم مقام سرکار انگریز بہادر مقرر و معین ہیں۔ اور سب امور بین واسطہ مستمرہ سوال وجواب فیمابین دولتین متصور ہیں۔ اس صورت میں صاحب موصوف کو رسمیہ میں مراتب صلاح وصوابدید سرکار انگریز بہادر کو نواب گورنر جنرل کی طرف سے خدمت جناب عالی میں گذارش کریں گے" سلہ

نواب کا وقار گر چکا تھا۔ ایک دن نواب کی سواری کے ساتھ نقارہ بج رہا تھا۔ جب سواری کا گذر برگیڈیر صاحب کے بنگلے سے ہوا تو سنتری نے نقارہ رکوا دیا۔ نواب خاموش واپس چلے آئے سلہ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ریاست کا زوال ہو چکا تھا۔ اور انگریزوں کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا۔ نواب انگریزوں کے نظر کرم پر تخت پر جلوہ افروز تھا لیکن اختیار بالکل نہ تھے۔ انگریزوں کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

سعادت علی خان کی وفات | آخری عمر میں بصارت میں ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ آغا میر کحال کو دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھا گیا تھا۔ انھوں نے طرح طرح کے سرمے تیار کر کے بینائی کے بڑھانے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ۲۲ یا ۲۴ رجب ۱۲۲۹ھ بروز دوشنبہ / ۱۱ یا ۱۲ جولائی ۱۸۱۴ء کو حسب معمول سواری تامجان پر برآمد ہوئے۔ اور خاص بازار تک گئے۔ راستے سے مداری نامی گویے کو ساتھ لیتے آئے۔ محل میں آکر اس کا گانا سنا، پچاس روپے

سلہ سوانحات ۱/ ۱۵۸۔ تفصیل عہد نامہ ملاحظہ ہو ۲-۴۰۱۶-۱۹۹، رقعات مرزا قتیل ۲۴

سلہ ایضاً ۱/ ص ۱۶۰

بطور انعام مرحمت کیے۔ چار گھڑی رات گئے۔ خاصہ طلب کیا، پلنگ پر بیٹھے، پالک کا ساگ خشکے کے ساتھ کھایا۔ کئی پھلکے ساتھ میں کھائے۔ کھانے کے بعد یخنی پینے کا معمول تھا۔ خاصۂ طعام ہمیشہ قاب غوری میں نوش کرتے تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ غوری میں زہر کا اثر جلد ظاہر ہو جاتا ہے۔ یخنی کا گلاس لے کر نوش کیا۔ اس کے بعد سے طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ اور چند گھنٹوں میں ان کی روح جسم خاکی سے پرواز کر گئی۔ سہ شنبہ کو دوپہر کے وقت گومتی ندی کے کنارے فرح بخش کے نیچے ایک خیمے میں غسل دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ غسل کے وقت نعش کے منہ سے خون جاری تھا۔ جنازے کو بڑی دھوم دھام سے لے جا کر خاص بازار میں نواب غازی الدین حیدر کے مکان میں دفن کر دیا گیا۔

"آہ شد گنج سعادت در زمیں" سے تاریخ وفات نکلتی ہے [1]

نواب سعادت علی خان نے دس لڑکے اور ۵ لڑکیاں چھوڑیں جو مختلف عورتوں کے بطن سے تھیں [2]

---

[1] سوانحات ۱/ ۱۹۹۔ ۲۰۰ مفتاح التواریخ / ۳۷۶

[2] ایضاً ۱/ ۲۰۳

باب ششم

اقتصادی حالت

نظامِ حکومت | کسی ملک یا ریاست کی صنعت وحرفت اور دستکاری وزراعت کی ترقی کے لیے جان ومال، اور امن وامان کی ضمانت لازمی ہے۔ اور یہ شرائط صرف ایک عمدہ نظم ونسق ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ نواب سعادت خاں برہان الملک، اور نواب صفدر جنگ مطلق العنان حکمراں تھے۔ اور عملی طور پر وہ مرکزی حکومت سے آزاد تھے مگر بظاہر وہ خود کو ایک صوبہ دار ہی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ کیونکہ بصورتِ دیگر عوام ان کی اطاعت سے روگردانی کرتے۔ وہ وزیر الممالک سے احکامات حاصل نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی اپنے علاقوں کی آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ ہی مرکزی حکومت کے روبرو پیش کرتے تھے۔ ان کا طرزِ عمل ایک آزاد حکمراں جیسا تھا۔ اس وجہ سے اپنے حاکموں کا وہ خود ہی تقرر کرتے تھے۔ اور انھیں القاب وخطاب خود ہی تفویض کرتے تھے۔ لہٰذا متذکرہ نوابوں نے اپنے صوبوں میں مرکزی حکومت کے طرز پر نائب صوبہ دار، دیوان، بخشی، قاضی، صدر اور حاکم بیوتات مقرر کیے۔ مالگذاری کی وصولیابی اور نظم ونسق میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے

صفدر جنگ نے آودھ اور الہ آباد کے صوبوں کو ضلعوں میں تقسیم کیا۔ اور ناظم کے لقب سے وہاں حاکم مقرر کیے۔ ہر ضلعے میں کچھ پرگنوں کو اکائی کی صورت میں حد بندی کر کے وہاں ایک عامل مقرر کیا۔ فوجدار اور کروڑی کے عہدے موقوف کر دیئے۔ امن و امان قائم رکھنے کے لیے ناظم اور عامل کی نگرانی میں فوجی دستے تعینات کیے۔ مواد کی کمی کی وجہ سے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ مالگذاری کے وصول کرنے کے قواعد وضوابط کیا تھے۔ اور لگان کا تعین کس طرح ہوتا تھا۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ وہ قواعد نرم تھے۔ اور مناسب لگان لیا جاتا تھا۔ رعیت فارغ البال تھی

آبادی اس زمانے میں آودھ اور الہ آباد کی بیشتر آبادی ہندوؤں کی تھی۔ اور انہی کی اکثریت تھی مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ موجودہ زمانے میں بھی ان علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس آبادی کا زیادہ نمایاں حصہ راجپوتوں پر مشتمل تھا۔ جو تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور کئی چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں منقسم تھے۔ راجپوتوں کے بعد برہمنوں کی تعداد زیادہ تھی اور بقیہ کی آبادی نچلے طبقے کے لوگوں کی تھی۔ اہیر اور کمہار بالخصوص زراعت کا پیشہ کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں زیادہ تر مسلمان شہروں اور قصبوں میں رہتے تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمتوں کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ان کی آبادی کا زیادہ حصہ افغانوں اور شیوخ پر مشتمل تھا۔ افغانوں کی زیادہ تر آبادیاں جونپور، الہ آباد، ملیح آباد میں تھیں۔ زیادہ تر شیوخ لکھنؤ، کاکوری، خیرآباد، گوپامئو، اور بلگرام میں سکونت رکھتے تھے۔ نواب سعادت خاں اور

صفدر جنگ کے مصاحبوں، دوستوں آشناؤں، افسروں اور فوجی کمانڈروں نے جن میں ہزاروں ایرانی النسل تھے۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں بود و باشش اختیار کر لی تھی، چونکہ ان نوابوں کا مستقر فیض آباد تھا۔ لہٰذا اٹھارہویں صدی میں اس شہر کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

زراعت وصنعت و حرفت و تجارت

صوبہ اودھ ہمیشہ سے زرعی دولت سے مالا مال تھا۔ جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ اُس علاقے میں جوار، باجرہ، سکھداس، جَو، چنا، گیہوں اور دوسرے اناج اور تلہن خوب پیدا ہوتے تھے۔ کپاس کی زراعت ہوتی تھی۔ میوے مثلاً آم، اَمرود خربوزہ، تربوز کثرت سے ہوتے تھے۔ گنّا اور پان کی کاشت ہوتی تھی۔ ہر قسم کی ترکاریاں خوب ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے یہ صوبہ "باغ ہندوستان" کہلاتا تھا۔[1] صنعت و حرفت کے لحاظ سے یہ صوبہ دوسرے صوبوں سے پچھڑا ہوا نہ تھا۔ سترہویں صدی کے نصف اوّل میں اودھ کی چھینٹ کی بھاری مانگ انگلینڈ میں تھی۔ ۱۶۴۰ء میں انگریزوں نے لکھنؤ میں ایک فیکٹری قائم کی تھی۔ جو دریا آباد، خیرآباد اور دوسرے علاقوں سے منقش کپڑے جمع کرتی تھی۔ انگریزی تجار ان کپڑوں کو دریا آبادی خیرآبادی اور ایریزیہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اودھ کے مغربی علاقوں میں ایک قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ جو مرکولیز کہلاتا تھا۔ اس کپڑے کو ایسٹ انڈیا کمپنی خریدتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں اس صوبے میں کپڑے کی صنعت

---

[1] خلاصۃ التواریخ / ۴۲

اوج کمال پر تھی۔ اور دریاآباد، خیرآباد کو چھینٹ اور گزی کے بنانے میں مرکزیت کا درجہ حاصل رہا۔[1] شہزادپور چھینٹ اور گزی گاڑھے کی تیاری کے لئے شہرت رکھتا تھا۔ اور یہاں سے شاہان مغلیہ کی ضروریات کے لئے خیمے، شامیانے، اور پردے بھیجے جاتے تھے۔ مگر مرکزی حکومت کی اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے اس صدی کے نصف آخر سے اس صفت کا زوال شروع ہوگیا۔ جونپور، ادنی اور ریشمی کپڑوں کی خرید وفروخت کی منڈی تھا۔ ان کے علاوہ وہاں کشمیر، نینی تال، کمایوں، بنگال، الہسہ اور دوسری جگہوں کا صنعتی مال پہونچتا تھا۔ اس شہر میں بڑے بڑے تجار رہتے تھے جو اس مقام سے صنعتی چیزوں کی نکاسی اور دوسری جگہوں سے اس مال کے درآمد کا کام کرتے تھے جو وہاں دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ وہاں نیل پیدا ہوتا تھا عطریات اور خوشبودار تیل بالخصوص اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں مرغوب خاطر تھا۔ اس وجہ سے کئی مقامات پر عطر اور تیل کشی کا کام ہوتا تھا۔[2] غازی پور میں خاص طور پر عطر گلاب اور آب گلاب تیار کیا جاتا تھا[3] جونپور میں عطر اور خوشبودار تیل اور بالخصوص روغن بیلا تیار ہوتا تھا[4] ان شہروں کے علاوہ دوسرے مقامات

---

[1] حدیقۃ الاقالیم/۴۵۱ [2] MR-LEIGH, نے کمپنی کی نوکری سے سبکدوشی اختیار کر کے جونپور میں تجارت کا کام شروع کردیا تھا اور دوسرے بہت سے انگریز وہاں رہتے تھے۔ وہاں حقے کے تلے اور سوریاں بھی عمدہ بنتی تھیں۔ بڑی تعداد میں بھیڑیں باہر بھیجی جاتی تھیں۔
TWINING PP-326-27

[3] ایضاً/۴۷۸ [4] ایضاً/۴۷۷

میں بھی چھوٹی چھوٹی کئی صنعتیں تھیں۔ گورکھپور میں اشیا خوردنی کی کثرت تھی۔ جو شخص ایک مرتبہ وہاں پہونچ جاتا تو پھر وہیں کا ہو رہتا۔ وہاں روغن زرد عمدہ تیار ہوتا تھا۔[۱] مرزا پور میں میووں اور پھلوں کی بہتات تھی۔ یہ شہر ایک بڑی تجارتی منڈی بھی تھا۔ قاضی مرتضیٰ بلگرامی کا بیان ہے، "اکثر آنجا تجاران و بیوپاریان مال و اجناس خود را از شہرہای دور دراز بالخصوص مثل کشمیر و کمایوں و لاسہ و مشرق می آرند و می فروشند آنجا بجائی دیگری برند اکثر چیزہا آنجا بحسب تمنا کہ ارزان بدست می آید، بخصوص اقمشہ ریشمی، و پارچہ سفید پوربی، ہزار ہا کہ خواہند خرید کنند و ہمچنیں اشیاد کولہ وغیرہ مرزا پور از جملہ از نگ ست داز نگ آں را گویند کہ جملہ اشیا آنجا خرید و فروخت می شوند"[۲] اٹھارہویں صدی کے سیاحوں نے اس شہر کی تجارتی مرکزیت کا ذکر کیا ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ٹیوننگ کا بیان ہے کہ مرزا پور ایک تجارتی مقام تھا۔ یہاں کی آبادی بیس لاکھ کے قریب تھی۔ تجارتی لحاظ سے گنگا ندی کے کنارے پر یہ ایک مشہور مقام تھا۔ اور اس لحاظ سے وہ پٹنہ کے مدمقابل تھا۔ یہاں روئی کی گانٹھوں سے لدی سیکڑوں کشتیاں ندی کے کنارے کھڑی رہتی تھیں۔ مرزا پور روئی کی تجارت کے لئے ایک اہم منڈی تھا۔[۳]

۱؎ حدیقۃ الاقالیم ۲/ ۱۵۲، تاریخ گورکھپور (قلمی) ۱۱۲، الف تا ۱۱۵ الف ۲؎ حدیقۃ الاقالیم ۲۲۷/

۳؎ ٹیوننگ نے ۱۷۹۴ء میں شمالی ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔

TWINING: TRAVELS IN INDIA-P-156
LUMSDON: A JORNEY FROM
MERUTTOLONDON-(1819-1820)P.9
DAVIDSON: DIARY, TRAVELS &
ADVENTURE ETC-I-P 238

فیض آباد میں کپڑے بننے کی صنعت ہوتی تھی۔ ٹیوننگ نے وہاں تیار شدہ کپڑوں کے کچھ نمونے دیکھے اور پسند کیے تھے۔ [1] ٹانڈہ میں سوتی کپڑا بڑی تعداد میں تیار ہوتا تھا۔ اور گھاگھرا ندی کے ذریعہ گنگا ندی میں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں سے کلکتہ اور وہاں سے یوپی شہروں میں یہ کپڑا بھیجا جاتا تھا۔ ۱۷۹۲ء میں ان کپڑوں کی مانگ بہت گر گئی تھی۔ مگر دوبارہ مانگ بڑھنے کے امکانات تھے کیونکہ یہ کپڑا عمدہ سستا تھا اور اس پر ٹیکس بھی نہیں لگتا تھا۔ [2] جلال پور میں سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا [3]۔ اس میں لکھنؤ میں خاص طور پر کمان اور عمدہ مٹھائیاں بنتی تھیں، لیکن اول الذکر صنعت کا اٹھارہویں صدی کے آخری ایام میں زوال شروع ہو گیا تھا۔ [4] آصف الدولہ کے زمانے میں یہاں زردوزی کا عمدہ کام ہونے لگا تھا [5] بہرائچ میں نیپال سے آئی ہوئی چیزوں کی منڈی تھی۔ پہاڑی علاقے کے باشندے یہاں سونا چاندی اور کانچ کے زیورات، شہد، موم، مشک، اخروٹ، انگور، شکاری جانور وغیرہ اور دوسری چیزیں فروخت کرنے کے لئے لاتے تھے۔ [6]

---

[1] TWINING P.P 318

[2] ایضاً ۳۲۱

[3] ایضاً ۳۲۲، ۳۲۳

[4] حدیقۃ الاقالیم رقندوا دلہ شیرینی و کمان آنجا معروف بودہ اکنون کمان بآں خوبی ساختہ نشود ۱۵۲

[5] فسانۂ عجائب ۹

[6] حدیقۃ الاقالیم ۱۵۲-۱۵۳، ۶۶۸، ۶۷۹، خلاصۃ التواریخ ۴۳، ۴۴

صوبہ الہ آباد کی آب وہوا سازگار تھی لہذا وہاں عمدہ اور رنگ برنگ کے پھول اور میوے خصوصاً خربوزہ اور انگور کثرت سے ہوتے تھے۔ وہاں موٹھ کیاب، جوار اور باجرہ بالکل نہیں ہوتا تھا، جھونہ اور بھرگل نامی عمدہ کپڑے بنے جاتے تھے۔ [1]

اس دور میں صنعت وحرفت اور تجارت کی ترقی کی وجہ یہ تھی کہ نواب سعادت خاں اور نواب صفدر جنگ بلا استثنا اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرتے تھے اس وجہ سے قدرتاً ظالموں اور لالچی عاملوں پر روک لگ گئی۔ صوبوں میں امن و اماں قائم ہوا۔ لوگوں کو اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔ ان کے جان ومال اور عزت کی حفاظت کی ضمانت دی گئی۔ نتیجتاً دستکاریاں، زراعت، صنعت وحرفت اور تجارت ترقی کے اوج کمال کو پہونچ گئیں۔

محمد فیض بخش نے فیض آباد کی تجارتی اور اشیائے خورد ونوش کی سرگرمیوں کا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کے بقول یہ بازار ہر قسم کی تجارت کی مرکز کا تھا اور خاص طور پر چوک کا بازار جہاں توران، فارس، چین اور یورپ کے تجار خرید وفروخت میں منہمک نظر آتے تھے۔ وہ اپنے ممالک کی اشیاء یہاں لاتے اور اپنی خواہش کے مطابق منافع کماتے تھے۔ [2]

---

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۴۳

[2] تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ۲/ ص ۸

میر حسن دہلوی نے فیض آباد کے بازار اور چوک بازار کی تجارتی خرید و فروخت کی سرگرمیوں کا اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یوں ذکر کیا ہے۔

کھلا بازار اور رستے کشادہ — بیاضِ جدولی ہو جیسے سادہ
دو رستہ اہلِ حرفہ اور دوکاندار — لڑی موتی کی ہو جیسے نمودار
جو کوئی شام کو وہاں چوک جاوے — شبِ راحت کا دن کو حظ اٹھاوے

بازار کا منظر ملاحظہ ہو:

اِدھر کو جوہری اُدھر کو بزاز — اِدھر صرّاف اور اودھر طلا ساز
جواہر کا کھڑے دلال لیں نام — میاں صاحب جواہر کا ہو کام
روپے اور اشرفی دیکھے برستے — دھرے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے
کناری اور گوٹے وہاں مسلسل — مثالِ برق کرتے ہیں جھلا جھل
کہیں تربوز و خربوزوں کے انبار — کھڑی ہیں مالنیں لے کر کہیں ہار
کوئی مصری کے گنے کہہ پکارے — کوئی کہتا ہے میٹھے ہیں کتارے
یہ فرنی اور فالودے کا عالم — کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم
سراسر بیٹھے ہیں میوہ فروشاں — بھرے انبار سے میوؤں کی دوکان
دھرے ہیں خوانچے ان میں سراسر — پکارے ہے ہر اک اپنی صدا کر
کوئی کہتا ہے کیا نمکین بنے ہیں — کوئی کہتا ہے مرچوں کے چنے ہیں
لئے بیٹھا ہے کوئی سونٹھ کھٹی — پکارے ہے کوئی مصری کی پٹی
خطائی بیچتے ہیں کہہ کے مکھ پاٹ — کہ ہندوستان والی ہے تری چاٹ

کہیں خشکا ہے اور سالن کہیں ہے — کہیں پچلو نہ اور پاچین کہیں ہے
لیے پھرتے ہیں شہلے روٹیوں کو — کرے سستی ہیں آدھی ڈیڑھ میں دو

ملائی دودھ کو دیکھو تو گویا — اسی میں مال حلوائی نے کھویا
کوئی لے کھیر کے بیٹھا ہے کاسے — یہ کہتا ہے کہ لے دودھ اور بتاسے
صدائیں ریوڑی والوں کی اُن میں — کڑاکڑ بولتی غلابیاں ہیں
بلندی میں وہ حلوائی کی دوکان — ستارے گرد ہوں جن کے چراغاں
دھری ہیں گولیاں اور یوں انسے — کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے
وہ پیڑے روشن الدولہ کے ہاں کے — یہ کہتے ہیں پکارے اور ہانکے
مزا اڑ جائے برفی کا جنھوں کو — سدا چاٹا کریں اپنے لبوں کو

کھیٹوں اور گلابی لوزلوں کے بعد میر حسن سوہن حلوے کا ذکر کرتا ہے۔

نہ دیکھا ہم نے ایسا حلوہ سوہن — کہ ہو دیکھے سے جسکے شیریں تن من
خصوصاً ان میں وہ حبشی جو ہے وہاں — ملا ہے اس میں گویا آب حیوان
مٹھائی کی کروں تعریف تا چند — قلم کی ہو گئی اب تو زبان بند

جہاں قہوہ ہے اور سپاری و بن — بساطی بیٹھے ہیں نیچے دکان چن
وہ دیکھی جنس ان کی جب سے پُر کار — نظر سے گھر گیا خانم کا بازار[1]

اپنے عدل اور عمدہ نظام حکومت اور بلا لگان میں اضافہ کئے نواب سعادت خاں برہان الملک نے اودھ کی آمدنی کو بڑھایا تھا۔ اور شعبۂ مالیات میں باقاعدگی پیدا کی تھی۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ نواب ہذا نے اپنی وفات

[1] مجموعۂ مثنویات میر حسن / ۱۴۸ ۔ ۱۵۱

پر ۹ کروڑ نقد خزانے میں چھوڑے تھے[1] لیکن نواب صفدر جنگ کے زمانے میں اقتصادی زبوں حالی کا دور شروع ہوا۔ اس کی وجہ نواب صفدر جنگ کی فضول خرچی اور سخاوت بھی کہا جاتا ہے کہ وہ غربا اور مساکین کے ساتھ بڑی دریا دلی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جب کوئی گدا اس کے روبرو دست سوال دراز کرتا تھا تو نواب اُسے پچاس اشرفیاں مرحمت کرتا تھا[2]۔ تمام عمر اس کا یہی انداز رہا۔ صفدر جنگ کے بہت سے ایسے خطوط بھی ملتے ہیں۔ جو اس نے اپنے نائبوں کو لکھے تھے کہ وہ سیدوں اور دوسرے پرانے خاندانوں کی جاگیریں واپس کر دیں۔ اور وظیفے دوبارہ جاری کر دیں۔ جو افسران نے ضبط کر لیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیردارانہ نظام کے مسموم اثرات اودھ کے اقتصادی نظام میں سرایت کر گئے۔ اور اس ریاست کا بھی وہی حال ہوا جو جاگیردارانہ نظم پر چلنے والے ممالک کا ہوتا تھا۔ ۱۷۸۳ء میں ولیم ہوجیج فیض آباد گیا تھا۔ اس نے وہاں زوال کے آثار دیکھے کیونکہ اس سے قبل نواب آصف الدولہ نے اپنا مستقر لکھنؤ کو

---

[1] عماد / ۲۹ تاریخ محتشم / ۱۱ الف

[2] حدیقۃ الاقالیم / ۸۶ ۳ "تاریخ محتشم (قلمی پٹنہ)" سخاوتش حد ندارد۔ با ہر کس کہ مساکین حرف می زد پنجاہ اشرفی بعد انقطاع کلام بادی بخشید و ایں یکروز نبود بلکہ قاعدہ مستمرہ او ہمیں بودہ است و از سواران فوج و پیادہ گان بطرف ہر کس کہ بنظر نگاہ می کرد دہ روپیہ بحساب ماہواری اضافہ سوار می داد و دہ دو روپیہ پیادہ " ص ۱۱ ب

بنالیا تھا۔ اس سیاح کا بیان ہے کہ یہ شہر بہت وسیع تھا اور ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں بہت بڑی آبادی تھی اور بیشتر نچلے طبقہ کے
لوگ سکونت پذیر تھے لیکن اب زوال پذیر تھا۔ چونکہ لکھنؤ مستقر تھا اس لیے
یہاں کے بڑے بڑے تجار، صراف، مہاجن، ساہوکار اور صناع یہاں سے
وہاں چلے گئے ہیں۔ فیض آباد میں صرف عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں[1]

نواب شجاع الدولہ کی تخت نشینی اور بالخصوص بکسر (۱۷۶۴ء-
۱۷۶۵ء) کی جنگ کے بعد اودھ کی اقتصادی زبوں حالی کی تاریخ کا آغاز
ہوتا ہے۔ نواب کی سرکار میں قریب ایک لاکھ پچاس ہزار سوار اور
پیادہ تھے۔ پانچ سو ہاتھی، تین ہزار گھوڑے، علاوہ ازیں محکمۂ توپ خانہ،
رہکلہ، زنبورخانہ اور بان کے ملازمین۔[2] نواب کو جیسا کہ بعد میں مفصل
لکھا جائے گا۔ کبوتر بازی اور مرغ بازی کا بھی شوق تھا۔ ان پرندوں کی
اتنی بڑی تعداد تھی کہ ان کے دانے پر یومیہ ایک ہزار روپے صرف
ہوتے تھے۔[3] بکسر میں نواب کی شکست کے بعد ان کے اور انگریزوں
کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نواب کو ان کے
صوبے واپس کر دئے گئے۔ لیکن نواب سے الٰہ آباد اور کڑہ کے ضلع لے
لئے گئے۔ علاوہ ازیں انہیں جنگ کے تاوان کی صورت میں پچاس لاکھ

[1] WILLIAM HODGES:
TRAVALS IN INDIA PP 1-3

[2] چہار گلزار شجاعی / ۲۲۱ ب

[3] ایضاً / ۲۲۱ ب

مزید اپنے خزانے سے ادا کرنے پڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ نواب کو اپنے ہاں ایک انگریزی فوجی دستہ بھی رکھنا پڑا۔ جس کا خرچ ریاست کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔[۱] بنارس چیت سنگھ بن بلونت سنگھ کو دیدیا گیا۔[۲] ان وجوہ کی بنا پر ریاست کی آمدنی تو کم ہوگئی مگر اخراجات بڑھ گئے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس اقتصادی تنگ حالی سے مجبور ہو کر نواب نے وظیفہ خواروں پر ہاتھ ڈالا اور بقول طباطبائی "اس جماعت کو جو لاکھوں سے زیادہ تھی۔ یک قلم روزینہ اور وجہ معاش سے محروم کر دیا ان کی آراضی اور دیہات کو ضبط کر لیا۔ جس کے نتیجے میں خلق اللہ ایسی تنگ ہوئی کہ بعض نے غیرت کے مارے اپنے گھروں کے دروازے بند کرکے شرم کے مارے منہ نہ دکھایا۔ اور جان دی۔ اور بعض نے فقیری کا پیالہ لے کر دربدر بھیک مانگنی شروع کی"[۳]

---

[۱] سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/ص ۳۰۸ انگریزی سرکار دوسرے طریقوں سے بھی زر وصول کرتی تھی غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ انگلینڈ سے بار بار گورنر جنرل کے نام "فرمان تاکید ارسال زر از ہندوستان شدہ" (عماد/۲/۱۷)۔ نیز دیکھئے۔ جارج فوسٹر ۱/۹۰-۱۸۹ مصحفی نے بھی اس کا ماتم کیا ہے:۔

افسوس کہ لی چھین نصاری کی سکون نے پالون بات سے اس فرقۂ اسلام کی روٹی

دیوان مصحفی دوم (رام پور) ص ۱۸۸ الف

ہندوستان میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی :: کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی ہے۔

دیوان مصحفی دوم (رام پور) ص ۱۸۸ الف

[۲] GEORGE FORSTER: TRAVLS -1-PP.199-91

[۳] سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/۹۳

جاگیرداروں اور عمال نے کاشتکاروں سے زیادہ مالیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اگر ایک کاشتکار اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرتا تو اسے جبراً اپنے اصلی پیشے پر واپس لایا جاتا۔ اودھ میں اندرونی بدنظمی اور عمال کی دست درازیوں کی وجہ سے کاشتکاروں نے زرعی کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ زمینیں بنجر اور غیر آباد ہو گئیں۔ حالانکہ نواب شجاع الدولہ کی سخاوت و فیاضی شہرۂ آفاق تھی لیکن بقول جارج فورسٹر نواب زر و روپے کی تحصیل اور جمع کرنے میں کافی سختی سے کام لیتا تھا۔ ؎۱ سیاح ہذا آگے لکھتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ بڑا دوربین اور چالاک تھا۔ جب اس کے سامنے کوئی مقصد نہ ہوتا تو وہ لوگوں کی بھلائی اور فلاح و بہبود کی طرف مائل ہوتا۔ اور دست درازی اور ظلم سے پرہیز کرتا تھا ؎۲ اٹھارہویں صدی میں آنے والے انگریز سیاحوں نے اودھ کی اقتصادی زبوں حالی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس اقتصادی تباہی کے وجوہ پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

نواب شجاع الدولہ کے دور میں اودھ کی بیرونی تجارت کو بڑا نقصان پہونچا۔ نواب نے کمپنی سے اجازت لے لی تھی۔ کہ یورپ اور بنگال سے اودھ آنے والی چیزوں پر وہ بھاری ٹیکس لگائے ؎۳

؎۱ GHORGE FORSTER, I-213,

؎۲ ایضاً، ص ۲۱۱

؎۳ ایضاً، ۱۹۱، ۱۹۲

نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں نواب کی تغافل شعاری، عیش پرستی اور بے جا اسراف کی وجہ سے اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ نواب سخاوت کے نام پر فضول خرچی کرتا تھا[۱] اس کا کوئی کارخانہ شاہانِ مغلیہ سے کسی بھی صورت کم نہ تھا۔ باورچی خانہ کا یومیہ خرچ ستر سو روپے تھا۔ فیل خانے میں دو ہزار ہاتھی[۲] تھے۔ جو صرف شکار کے دورے کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے ورنہ بے مصرف تھے۔ ابو طالب لندنی کا بیان ہے "خرچ فیل خانہ و اصطبل و بازیخانہ او ازیں جا قیاس باید کرد" کہ ہزار و دو صد فیل و دو سہ ہزار اسپ و ہزار سگ راتب خور ہستند، از آنجملہ چہار صد فیل و پانصد اسپ و صد سگ لائق سواری و شکار در آن میان خواہد بود، باقی محض حرام خوران، بجہت راہ وزدی آنہارا داشتہ اند" ملازمین کی حالت یہ تھی کہ اگر ان کتوں میں سے کوئی کتا مر جاتا تو وہ دوسرا کتا سڑک سے پکڑ کر اس گروہ میں شامل کر دیتے۔ اسی طرح کبوتر خانہ، مرغ خانہ، دنبہ اور آہو و میمون، سانپ، عقرب اور عنکبوت خانوں کا اتنا بڑا خرچ تھا کہ اگر وہ اخراجات موقوف کر دئے جاتے تو نواب مرحوم

---

[۱] اس کے اسراف کا یہ عالم تھا کہ اس دور میں یہ کہا جاتا تھا۔ کہ جسے نہ دے مولا اُسے دے آصف الدولہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت چلانے کو روپیہ نہ رہا۔ میر حسن ر ۱۰۱ - ۱۰۲

[۲] ہوجز نے لکھا ہے کہ نواب کے اصطبل میں بڑی تعداد میں ہاتھی تھے۔

HODGES: PP 100 101

نیز دیکھئے TWINING: PP. 313

(نواب شجاع الدولہ کی اولاد کی کفالت کے لئے کافی ہوتا۔ تین لاکھ کبوتر تھے[1] اس اخراجات کے علاوہ شاگرد پیشہ لوگوں کی تنخواہیں تھیں دو ہزار فراش ایک ہزار چوبدار، چار ہزار باغبان، اور سیکڑوں باورچی تھے۔ اسی طرح شکار میں جانے کے موقعوں کے لئے اسباب خیمہ برداروں کی تعداد ہزاروں کے قریب تھی۔ ان اخراجات کے علاوہ ہولی بازی متبنیٰ اولاد کی شادیاں[2]، اور چراغاں میں لاکھوں روپے صرف کیے جاتے تھے[3]۔ اشیا خورونوش افراط سے خریدی جاتی تھیں۔ نواب نے حکم جاری کیا تھا کہ برف، گل کیوڑہ، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں کوئی بازار میں فروخت نہ کرے بلکہ سرکار کے کارخانوں کے ہاتھوں فروخت ہوں[4]۔ ہر سال ولایتی میوے اس بڑی مقدار میں خریدے جاتے تھے کہ کل میزانیہ

---

[1] نواب چیونٹیوں اور مکڑیوں سے شغل کرتے تھے اور ان حشرات کی نگہبانی میں صدہا روپے صرف کرتے تھے۔ تاریخ اودھ ۳/۲۷۲ نواب نے ایک چڑیا گھر بھی کھولا تھا۔ جس میں ہزاروں پرندے اور درندے تھے۔ اور سرکار ان کا خرچ برداشت کرتی تھی

TWINING: PP 212-13

[2] ان شادیوں میں کم سے کم بیس لاکھ اور زیادہ سے زیادہ چالیس لاکھ روپے صرف کئے جاتے تھے۔ تاریخ اودھ ۳/۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷ دل بادل ہاتھی کی شادی کی تفاصیل دیکھئے۔ تاریخ اودھ ۳/۲۷۳-۲۷۴۔ تفضیح الغافلین/۱۳۲

[3] تفضیح الغافلین/۴۸-۴۹، تاریخ اودھ ۳/۵۵، ایضاً تاریخ اودھ ۳/۲۵۱

[4] تاریخ اودھ - ۳/۲۵۱

ایک لاکھ روپے کو پہونچ جاتا تھا وہ تمام میوے امراء اور رفقا میں تقسیم ہوتے تھے۔ [1] نواب کو انگریزی سامان خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک گھڑی ایک لاکھ روپے کی خریدی تھی۔ یہی حال دوسری چیزوں کے بارے میں تھا۔ [2] کروڑوں روپے عمارتوں کی تعمیر میں صرف کیے [3] نجف اشرف میں نہر کھدوانے کے لئے پانچ لاکھ روپے بھیجے [4]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ خالی ہوگیا۔ سپاہ برطرف کرنی پڑی۔ ریاست میں چاروں طرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی [5] علاوہ ازیں سپاہ کو تنخواہ نہ ملتی تھی۔ میر حسن دہلوی نے ملازمین کی تنخواہیں نہ ملنے کا ذکر اس شعر میں کیا ہے۔

ہے غنیمت جو اس زمانے میں   اپنی تنخواہ پائے جاتا ہے
ورنہ بے روزگاریوں کا غم   ایک عالم کو کھائے جاتا ہے

---

[1] تاریخ اودھ ۳/۹۹ [2] امام باڑہ اور رومی دروازے کی تعمیر کے اخراجات دیکھئے۔ تفضیح الغافلین/۱۱۲۔۱۱۴، نیز TWINING: PP 311-312

HODGES: PP 101-1-2   [3] TWINING. 312

[4] برائے تفصیل دیکھئے تذکرہ گلشن ہند/ص ۱۱، تاریخ اودھ ۳/۹۹، برائے دیگر امرات ملاحظہ ہو: ایضاً ۳/ص ۱۵۶۔۱۵۰، لاکھوں روپے آتش بازی میں صرف ہوتے تھے، ۳/۱۸۳، برائے سخاوت دیکھئے ایضاً ۳/۲۷۵۔۲۷۷۔۲۷۸۔۲۷۹۔۳۷۵۔ ۳۵۸۔۳۳۲۔۳۳۳، تفضیح الغافلین/۴۸۔۴۹ ان فضول خرچیوں کی وجہ سے عوام پر برا اثر پڑتا تھا۔ دیکھئے۔ تاریخ فرح بخش ۲/۸۳ [5] تاریخ اودھ ۳/۹۰

نواب شجاع الدولہ کے زمانے سے دو ہزار ملازم چلے آ رہے تھے۔ ان کو آصف الدولہ کے زمانے میں پندرہ ماہ سے تنخواہ نہ ملی تھی۔ پہلے تو ان ملازمین نے بڑی عاجزی اور انکساری سے اس بات کی کوشش کی کہ ان کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں، لیکن جب ان کی کسی طرح شنوائی نہ ہوئی تو انہوں نے نواب کی کوٹھی کا محاصرہ کر لیا، جا بجا توپیں لگا دیں، شہر میں عجب ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انجام کار نواب نے ان سپاہ کو برطرف کر دیا جو نانِ شبینہ کے لئے دربدر مارے مارے پھرنے لگے۔ [۱]
ان حالات میں نواب کو انگریزی فوجی دستوں کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے تھے، جو کسی بھی صورت میں ادا نہ ہو سکتے تھے۔ اور بڑی زیرباری کا سامنا کرنا پڑتا تھا[۲]۔ رفتہ رفتہ رزیڈنٹ ہر جزوی و کلی معاملات میں حاوی ہوتا گیا[۳]۔ نواب نے اپنی والدہ اور دادی پر بڑی سختیاں کیں۔ اور کئی مرتبہ زبردستی روپیہ وصول کئے[۴]۔ فیض آباد میں مقیم شاہی افراد اور ان کے ملازمین کی اقتصادی زبوں حالی کی دل دوز داستان تاریخ

۱؎ چہار گلزار شجاعی / ۱۷ ب۔ ۲۲ الف، ۵۱ ب، نیز دیکھئے تاریخ اودھ ۳/ ۱۱۳۔ ۱۱۴، سیر المتاخرین (ا۔ت) ۳/ ۱۱۰
POLIBR: SHAHALAM, II AND HIS COURT: PP-107-108
کلیات انشاء: تم سے ہم یوں اڑے ہیں بوسے پر، مانگتے جیسے ہوں سپاہ خرچ / ص ۴۰،
تفضیح الغافلین / ۱۲۳ تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ۲/ ص ۳۰۰۔ ۴
۲؎ تاریخ اودھ ۳/ ۱۵۶۔ ۱۶۵، ۳؎ ایضاً ۳/ ۱۱۲۔ ۱۱۶، ۴؎ ایضاً ۳/ ۵۴۔ ۵۹

اُودھ میں مذکور ہے [1]

ان حالات میں نواب سے یہ توقع رکھنی کہ وہ صنعت وحرفت، دستکاری، زراعت تجارت اور دیگر پیشوں کی سرپرستی کرے گا بے سود تھا۔ اگر ابوطالب لندنی کے بیانات پر اعتماد کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صنعت وحرفت کی سرپرستی تو درکنار وہ ان صنعتوں کی تباہی کے درپے تھا وہ لکھتا ہے کہ "باوجود این کہ برف سازان کمر بالتماس نمودند کہ اگر حکم فروختن بدہند، زیادہ از حال برائے ودیو سرکار جمع می کنیم، و خرچ ہم کمتر خواہد شد، رخصت نداد" [2]

اسی طرح نواب نے باغبانی کے پیشہ وروں کو تباہ کیا جو اس کام کے ذریعہ اپنی روزی کماتے تھے۔ حالانکہ لکھنؤ اور فیض آباد اور دیگر نواب کے دو ذاتی باغ تھے۔ اور ان میں اس قدر میوے اور پھل پیدا ہوتے تھے کہ ہزاروں بیچ لوگ جو ان کی رکھوالی کے لیے ملازم تھے کھاتے تھے۔ اور پھر بھی بچ رہتے تھے اور گل سڑ جاتے تھے لیکن آم کی فصل کے زمانے میں وہ فیض آباد اور لکھنؤ کے عام رعایا کے باغوں کو ضبط کر لیتا تھا اور بعض مرتبہ تو یہاں تک نوبت پہونچ جاتی تھی کہ پیادے جو اس کام کیلئے مقرر ہوئے تھے۔ مالکان باغات کے مکانات تک نیست و نابود کر دیتے تھے۔ نواب نے کیوڑے، گلاب۔ اور دیگر خوشبودار پھولوں کی فروخت پر پابندی لگادی تھی کہ لوگوں کو بنگال سے عرق کیوڑہ منگوانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے اس عرق کی قیمت میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ ابوطالب لندنی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اپنی اولاد کی شادیوں کے زمانے میں اشراف لوگ جنگلوں سے پھول منگوا کر مہمانوں کے لیے ہار گندھواتے تھے، کیونکہ شہر میں کوئی شخص پھول

---

[1] تاریخ اودھ ۲۲۲، ۲۷۶، شہزادوں کی زبوں حالی کے لئے دیکھئے۔ تفضیح الغافلین ص ۷۶-۸۰ [2] تفضیح الغافلین ص ۶۲

فروخت نہ کر سکتا تھا۔ وہ پھل، جو قلیل المقدار ہوتے تھے، ہمیشہ ضبط کر لیے جاتے تھے۔ اسی طرح آم اور خربوزے کی فصلوں کی فروخت پر پابندی عائد کر دی جاتی تھی۔ نواب نے چھینٹ سازی کی صنعت کو بڑا نقصان پہونچایا۔ ابوطالب لندنی کا بیان ہے۔

"واز اسباب وپوشاک وسائر اشیائے آسائش انچہ کر بضبط توانند آمد، نیز ترقی می باشند، چنانچہ شخصے اختراع صنعت جدید کردہ، چھینٹ ہائے نفیس در لکھنؤ بروئے کار آوردہ، وزیر فرمود کہ انچہ سازد ہمہ را بوتے رسانند اتفاقاً جامہ بیان چھینٹ دربر کسے بنظرش درآمد، استاد چھینٹ ساز را با آنکہ مرد آدمی واستاد چہار صد یا پانصد شاگرد بود، خر سوار کردہ بشہر گردانیند" [۱]

یہی طرز عمل تجاروں کے ساتھ تھا۔ مثلاً گھوڑے اور دوسری چیزوں کے فروخت کرنے والے جب تک پہلے نواب کے ہاں مال فروخت نہ کریں اور راجہ جھاؤ لال کی زبان اور ہاتھ سے اذیتیں نہ اٹھائیں، کسی غیر شخص کو مال فروخت کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ یہی رویہ دوسرے پیشہ وروں اور صناعوں کے ساتھ تھا [۲] حیدر بیگ خان اور اس کے اہلکاروں کے مظالم اور رشوت خوری اور مالگذاری کی زیادہ وصولیابی کے سبب سے کاشتکاروں نے زراعت کرنے کی طرف سے غفلت برتی، زمینیں بنجر ہو گئیں، ابوطالب کا بیان ہے،

"وبباید دانست کہ از ہا حیدر بیگ خاں سراسر است، از کثرت ظلم وہ ویرانی

---

[۱] تفضیح الغافلین / ۶۲ - ۶۳

[۲] ایضاً / ۶۳

ملک سروار وانددختن ازخیانت۔ اما حقیقت ظلم وویرانی اینکہ سردار ملکیت
کہ قبل ازین بصد سال بقدر کروڑ روپیہ حاصل داشتہ، در عہد نواب مرحوم
شاید تا بست لکھ بعمل می آمد وعاملان حیدر بیگ خاں زیادہ از دوازدہ لکھ
وصول نہ کردند، دکرنیل دست ددو لکھ روپیہ بلا خرچ بسرکار فیر رسانیدہ
وباعث کمی جمع ملک باین درجہ راہجائے حرام خور غرض ہائے نفسانی شدہ اند رعایا مدار معاش خود بہ
منافع مواشی گذاشتہ عمل زراعت ترک کردند چنانچہ دیدیم کہ صد سال قبل ازین جمع آن بود حالا صدی بیست جمع آید[۱]

۱۷۸۴ء میں الٰہ آباد کی زراعت کے بارے میں لکھے گئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ تیس سالوں سے زراعت سے کاشتکاروں نے غفلت برتی، اور سرکاری آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔[۲] ۱۷۹۴ء میں جب جورج فورسٹر کا گذر الٰہ آباد سے ہوا تو اس نے مشاہدہ کیا کہ زیادہ تر مزروعہ زمینیں بنجر پڑی تھیں۔ جس کی وجہ اودھ سرکار کے حکام کی دست درازیاں تھیں۔[۳]

بھولا ناتھ، جو بخشی کے عہدے پر فائز تھا، اہلکاروں اور دیگر ملازموں سے رشوت لیا تھا۔ جس کی بنا پر عمال زر اندوزی کے لیے رعایا پر دست درازی کرتے تھے۔ سپاہ تباہ حال تھی۔[۴] حیدر بیگ خان، نائب سلطنت نے

۱۔ تفضیح الغافلین/ ۹۲ - ۲۔ Selections from the Letters (Cal-1890) II. PP 3-5
۳۔ George Forster Travels in India I: PP. 89-90.
۴۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو تفضیح الغافلین/ ۸۴

جواہرات اور طلا کی صورت میں بے حد دولت جمع کر رکھی تھی۔ اس کی وفات کے بعد ضبطی کے قانون کے مطابق پہلے تو اس کی دولت ضبطی میں آئی۔ لیکن وہ تمام دولت اس کی مستورات کے قبضے میں دیدی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ملازمین نے اس دولت پر ہاتھ مارا، محمد حسین، خدمت گار کے ہاتھ قریب ایک لاکھ روپیہ لگا۔[1] اس طرح اودھ کی دولت سرکاری کارکنوں اور اہلکاروں کے قبضے میں تھی۔ ابوطالب لندنی کا بیان ہے کہ حیدر بیگ خاں کے زیر اثر رشوت خوری اور خیانت کا دور دورہ شروع ہوا اور اس سے ساز باز کر کے اہلکاروں نے "تصرفہائے مالکی کردہ اند" چنانچہ دیوان و سررشتہ دار بخشی و خزانچی کے دفاتر میں بھی یہ وبا پھیل گئی۔ ان کے اخراجات نواب کے اخراجات کے مساوی ہو گئے۔[2] یہ ارکان دولت ضیافتوں میں پانچ ہزار روپے تک صرف کر دیتے تھے۔[3]

اسی طرح نواب وزیر علیخاں اسراف پسند اور عیش پرست نواب تھا۔[4] بسنت کے جشن میں لاکھوں صرف کر دیتا تھا۔[5] نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا تھا۔ اس نواب نے

---

[1] تفضیح الغافلین / ۱۲۰-۱۲۱

[2] ایضاً / ۱۲۱،۵۰-۱۲۲

[3] ایضاً / ۱۲۳

[4] تاریخ اودھ ۳/۲۶۸،۲۷۸

[5] ایضاً ۳/۲۷۵

عیش و عشرت اور[1] تعمیرات میں جو کچھ بھی پس انداز روپیہ تھا صرف کر دیا۔ خزانہ خالی تھا۔ ریاست کی کل آمدنی ایک کروڑ چودہ لاکھ رہ گئی تھی[2] کیونکہ نواب شجاع الدولہ نے ۱۷۷۳ء کے عہد نامے کی رو سے کل آمدنی سے چھ آنے فی روپیہ انگریزوں کو دیدیا تھا۔[3] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ خالی ہوتا گیا۔ اور ملازمین کو سرکار سے تنخواہیں ملنی بند ہو گئیں[4]۔ اور کئی کئی ماہ تک تنخواہیں سرکار پر چڑھتی رہتی تھیں لہٰذا جب کبھی سپاہ تنخواہ کی مانگ کرتی تو ان کو توپ دم کرنے کی دھمکی دی جاتی تھی اور اس طرح ان کو دبایا جاتا تھا۔[5] مرزا قتیل نے اپنے ایک خط میں اس معاشی تنگ حالی کا ذکر کیا ہے۔ مرزا امانی نے مرزا صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ شیخ محمد حسین کو سرکاری ملازمت دلا دیں۔ مرزا صاحب نے جواباً مرزا امانی کو لکھا "نوکری در سرکار ایشاں خیلے مشکل ست، کسانے کہ ایں سرکار را ندیدہ اند ہوس دارند و آنہا کہ نوکر اند در فکر ترک بسر می برند لیکن توقفے کہ در ترک نوکری

---

[1] نواب سعادت علی خان نے تعزیوں کے دفنانے کے لیے پچاس بیگھے زمین کے چاروں طرف فصیل تعمیر کروائی اور اس کے اندر کچھ عمارتیں بھی بنوائیں۔ دیگر عمارتوں میں درگاہ حضرت عباس، مبارک منزل، کوٹھی دلارام، اور کوٹھی دلکشا اس کی تعمیرات میں سے ہیں سوانحات ۱/ ۱۶۹ - ۱۷۲، مفتاح التواریخ / ۳۷۲، دیوان جرأت / ۲۶۲ ب - ۲۶۴

[2] سوانحات ۱/ ۱۸۱ - ۱۸۲

[3] Memoirs of Dehli Faizabad, II, P. 4

[4] ملاحظہ ہو۔ رقعات مرزا قتیل / ۷۳،

[5] گلزار شجاعی / ۳۰ ب، ۱۱ب، ۱۵۲ ب، تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ۱۱/ ۱۴۰-۱۴۱، Polier، ۱۰۷-۱۰۸، سوانحات ۱/ ۱۸۱ - ۱۸۲

رد میدہد از سبب نیامدن تنخواہ ہست۔ در انتظار بر آمدن تنخواہ اول تنخواہ دیگر جمع می شود و بیچارہا این قدر پول نجانہ ندارند کہ از تنخواہ دست بردارند" [1]

اودھ سرکار مقروض ہو گئی تھی ۱۸۰۸ء میں یہ قرض ایک کرور چالیس لاکھ ہو چکا تھا۔ [2]

امراء کی فضول خرچیاں | نوابان اودھ کے امراء بڑے خرآچ تھے اور اسراف بے جا میں مبتلا تھے۔ حیدر بیگ خاں کی فضول خرچی کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد راجہ ٹکیٹ رائے نے اس کے خاصہ کے اخراجات کا تخمینہ پچاس لاکھ لگایا تھا۔ اسراف بے جا کی لت نہ صرف وزیر، حیدر بیگ مرزا حسن رضا خاں اور راجا ٹکیٹ رائے میں پائی جاتی تھی بلکہ ہر وہ شخص جسکے ہاتھ میں علاقہ یا مال آجاتا تھا وہ اس مرض میں مبتلا ہو جاتا تھا کیونکہ اسے اس بات کا خوف رہتا تھا کہ مبادا اس کی دولت پر حکومت دست درازی کرے۔ چنانچہ الماس خان کے چیلے فتح علی خان نے چند سالوں میں تقریباً بیس لاکھ روپے لکھنؤ میں صرف تماشہ بینی میں ضائع کیے تھے۔ اور الماس خان کے دیوان نے اتنی تعداد میں سرائیں، تالاب، مسجدیں اور مندر تعمیر کروائے تھے کہ ان کی تعمیرات میں بیس لاکھ روپے صرف ہوئے ہوں گے۔ الماس خان، بعض عمال اور ٹکیٹ رائے کے رفقاء میں سے ہر ایک کے اتنے زیادہ اخراجات تھے کہ اس سے پہلے زمانے میں نواب شجاع الدولہ کے اخراجات تھے۔ یہی حال دوسرے عمال کا تھا۔

---

[1] رقعات مرزا قتیل ۱/ ۸۱۔

[2] تاریخ اودھ ۳/ ۱۶۰

اس وجہ سے لکھنؤ کے شرفا، بدحالی میں گرفتار، نان اور شبینہ کے لئے محتاج اور خانہ خراب تھے۔[1] یہی حال مین الدین کی فضول خرچی کا تھا۔ ہر سال محرم کے زمانے میں وہ اپنے گھر کا تمام مال و اسباب لٹا دیتا تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس نے تقریباً چالیس پچاس لاکھ روپے اسراف بے جا میں لٹا دیئے تھے۔[2]

جواہر علی خاں نے ہر قسم کے پیشہ وروں، علما، حکما، انشا پردازوں تیر اندازوں پٹہ بازوں اور بڑی تعداد میں سپاہ کی سرپرستی کی تھی، اور اس طرح کافی روپیہ صرف کرتا تھا۔ مزید برآں اپنے ملازمین کے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں کے موقعوں پر ان کی مالی امداد بھی کرتا تھا۔ جو ان کی تنخواہوں کے علاوہ ہوتی تھی۔ جواہر علی خاں کی رہائش گاہ دوسرے خواجہ سراؤں کے مقابلے بڑی شاندار تھی۔ اس کا مکان بہت لمبا چوڑا تھا۔ بڑی قیمتی اور عمدہ قالینیں بچھی تھیں، بیش بہا پردے پڑے تھے اور عیش اور آرام سے زندگی گذارنے کی دوسری چیزیں بھی کثرت سے تھیں۔ مسندیں کمخواب، ریشم اور مخمل کے کپڑوں سے تیار کی گئی تھیں۔ اس کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ جس پر عمدہ تشتریاں رکھی ہوتیں اور عمدہ اور مرغن کھانے چنے ہوتے تھے۔ اس کے دسترخوان پر بڑی تعداد میں مہمان ہوتے تھے۔ مجملاً اسکی سخاوت مشہور تھی۔[3]

<u>عوام کی معاشی حالت</u>: ان تمام باتوں سے بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ، جو کل آبادی کا ایک جزوی حصہ تھے۔ دولت مند اور خراج تھے۔ بڑے زمیندار اور حکمراں طبقہ بڑی عیش کی زندگی گذارتا تھا۔ اور وقت کی

---

[1] تفضیح الغافلین/ ۵۷ [2] تاریخ فرح بخش ۱۱/ ۴۸-۵۹، ۹۷

[3] ایضاً: ۵۷

تمام اشیائے آسائش سے محظوظ ہوتا تھا۔ اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر اسراف بے جا پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ ایک متوسط طبقہ تجاروں، چھوٹے زمینداروں، سپاہیوں، اور اہلکاروں کا تھا۔ ان میں تجار اور زمیندار کفایت شعار تھے، لیکن فوجی افسر اور رشوت خور اہلکار عیاش تھے۔ حالانکہ آج کے زمانے کے حساب سے اس زمانے میں ملازمین کی تنخواہیں قلیل تھیں مگر اس زمانے میں اشیائے خورد و نوش کی فراوانی تھی اور یہ تنخواہیں کافی تھیں۔ صفدر جنگ نے ہندوستانی گھوڑ سوار کی پینتیس روپے مغل گھوڑ سوار کی پچاس روپے اور پیادہ کی دس روپے ماہوار تنخواہ کر دی تھی لیکن سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک سپاہی کی تنخواہ آٹھ یا دس روپے تھی مگر وقت پر ادا نہ ہوتی تھی۔ ہم عصر کتابوں میں اس زمانے کے اقتصادی حالات کے بارے میں مواد کے فقدان کی وجہ سے عام لوگوں کی معاشی زندگی کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی حالت بہت خراب تھی موجودہ زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی عوام کچے مکانوں اور جھونپڑوں میں گذر بسر کرتے تھے۔ اور پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھکنے کے لیے کپڑے پر زندگی گذارتے تھے۔[۱] ۱۷۹۴ء میں جب ٹیوننگ کا گذر لکھنؤ شہر سے ہوا تو اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اودھ کا مستقر دیکھنے میں

---

۱ William Hodges. Travels in India P99 الہ آباد سے فیض آباد تک کے زرعی علاقے کے مفصل بیان کے لیے دیکھیے ایضاً ص ۱۰۶-۱۰۷

اتنا زبوں حال تھا۔ وہ لکھتا ہے، گلیوں سے بار بار آمد و رفت کے بعد میں نے ویسی ہی زبوں حالی دیکھی، جیسی میں نے باہر سے دیکھی تھی۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں کوئی بڑی خرابی ہے، جس کا مستقر اور خاص شہر اس قسم کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بلا تحقیق کے طرز حکومت کی بہت سی خرابیاں اور نقائص نمایاں ہیں"[1] یہ تمام اقتصادی خرابیاں نوابان اور امرا کی فضول خرچیوں کے نتائج تھے جن سے عوام متاثر ہوتے تھے[2]

اٹھارویں صدی کے نصف اول میں اودھ کے علاقوں میں امساکِ باراں کے سبب سے قحط عظیم کی صورت پیدا ہوئی۔ اتفاقاً اسی زمانے میں بنگال میں قحط پڑا۔ لہذا انگریزوں نے فیض آباد سے غلہ خرید کر بنگال بھیج دیا جس کی وجہ سے یہاں قحط پر قحط پڑ گیا[3]۔ ہرچرن داس نے اس زمانے کی معاشی تنگ حالی کا یوں ذکر کیا ہے۔

"خلائق کہ از گرسنگی بسبب گرانی فقیر و شہبرہ و لچہ شدہ، و سر پا برہنہ دگرسنہ میگردیدند۔ ہرچہ از قسم طعام وغیرہ را بازار و کوچہ وغیرہ در دست کسی می یافتند، گرفتہ می بردند و می خوردند۔ طرفہ ماجرائی این است کہ شخصی را شادی

---

[1] Twining: Travels in - P. 313

[2] ایضاً، ص ۳۱۲

[3] چہار گلزار شجاعی / ۲۴۹ ب، ۲۵۰ الف، ۱۷۸۴ء ـ ۱۷۸۳ء میں فیض آباد اور لکھنؤ میں قحط زدہ لوگوں کی زبوں حالی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو تفضیح الغافلین ۹۵، تاریخ گورکھپور / ۹ الف - ۱۰ ب

کتخدائی شدہ، آور روز دوم از کتخدائی بھون پوشاک شادی برائے زیارت
درگاہ رفت۔ چوں بر دروازہ درگاہ رسید شخصے دستار از سرش گرفتہ
گریخت و او برہنہ سر ایستادہ ماند" [1]

ہوجیج نے الہ آباد سے فیض آباد کے درمیانی علاقوں میں زراعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کاشتکاری متوسط درجے پر بھی کہیں اچھی تھی اور کہیں خراب۔ اور جہاں کہیں بھی زراعت کی طرف سے غفلت برتی جاتی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ کاشتکاروں کی غربت تھی۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو وہ عمدہ فصلیں پیدا کر سکتے تھے۔ دیہات، جن کی کثرت تھی، کچھ تو بظاہر متمول نظر آتے تھے اور بقیہ تباہ و برباد معلوم ہوتے تھے۔ بنارس کے زرخیز اور سرسبز علاقے کو دیکھنے کے بعد سیاح مذکور اس بنجر اور برباد علاقے کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کیونکہ یہ تباہی نواب کی غفلت شعاری اور عمال کی دست درازیوں کی وجہ سے ظہور میں آئی تھی۔ دیہاتوں سے غربت اور افلاس ٹپکتا تھا۔ اٹاوہ شہر وسیع تھا۔ مگر مکانات خستہ تھے جن سے غربت کے آثار ظاہر تھے [2] یہی حال اودھ دوسرے علاقوں کا تھا۔ [3]

---

[1] William Hodges Travels in India
P P. 106–107.

[2] ایضاً ص ۱۰۹، ۱۱۰ George Forster Travels in India ½ P. 84.

[3] ایضاً ص ۱۱۰-۱۱۲، اسکے برعکس ٹیوننگ نے لکھا ہے کہ بنارس کے مقابلے میں اودھ کی ثقافت عام طور پر بہتر تھی۔ Twining: Travels in Indian P. 324.

تجارت کا زوال ، اس زمانے میں تجارت زوال پذیر تھی۔ اس کا سب سے بڑا
سبب یہ تھا کہ انگریزوں نے اشیائے تجارتی پر بھاری ٹیکس لگا دیئے تھے اور
ندیوں کے گھاٹوں پر بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔[1] انگریز جو اشیاء فروخت کرتے تھے
ان پر ٹیکس معاف ہوتا تھا۔[2] مرزاپور جو ایک زمانے میں ایسی تجارتی منڈی تھا کہ
مغربی صوبوں اور دکن کے تجار وہاں آتے تھے، اپنی چیزیں فروخت کرتے تھے
بنگال اور شمالی ہند کے علاقوں، مثلاً نیپال، اور تبت سے آئی ہوئی چیزیں خریدتے
اس زمانے میں اپنی تجارتی مرکزیت کھو چکا تھا۔ بلونت سنگھ کے جانشین نے تجارتی
اشیاء پر بھاری ٹیکس لگا دیئے۔ ۱۷۸۱ء سے مرزاپور کا زوال شروع ہوا
۱۷۷۳ء میں کمپنی نے راجہ بنارس کو جتنی چنگی لگانے کی اجازت دیدی تھی،
وہی زیادہ تھی۔ مگر راجہ نے اپنی طرف سے اس کو اور بڑھا دیا۔ یہ ٹیکس زبردستی
وصول کرتا تھا۔[3] اس کی وجہ سے صوبوں کے مابین تجارتی رابطے ٹوٹ گئے۔[4] اسطرح
چیت سنگھ نے بھی تجارتی چیزوں پر بھاری ٹیکس لگا دیئے تھے۔[5] ۱۷۷۵ء کی
ایک روداد سے پتا چلتا ہے کہ کمپنی نے اودھ سے تعلقات کے دوران میں جو بھی
اقدامات کیے تھے۔ ان کا ایک مقصد ملک کی صنعت و حرفت کو تباہ کرنا اور

۱؎ رقعات مرزا قتیل / ۸۰

۲؎ راجا بنارس اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ دیکھیے۔
G. W Forrest:- Selections From the Letters etc (Cal-1890) PP.28-29

۳؎ ایضاً // ص ۱۲۶ ۴؎ ایضاً // ص ۴۴

ہر قسم کی اشیاء سے محروم کرنا اور ملک کو مالی نقطۂ نظر سے کنگال کرنا تھا۔ ملک کو افلاس اور انتشار کی حالت میں مہمل کرنا تھا۔[ل] اودھ پر انگریزوں کے سلطے سے قبل مئو ایک بڑی تجارتی منڈی تھا۔ مگر ۱۷۸۲ء میں اس کی مرکزیت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مگر اس کی بربادی کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑا تھا۔ کیونکہ یہاں سے سرحدی پہاڑیوں کے علاقوں کے باشندوں کو زندگی کے لیے ضروری چیزیں اسی جگہ سے دستیاب ہوتی تھیں۔ وہ لوگ یہاں اپنے علاقوں کی چیزیں لاتے اور یہاں کی چیزوں سے بدل لیتے تھے۔ مئو کی تباہی کے بعد یہ تجارتی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اور بنارس اور اودھ کے تجاروں کا پہاڑی علاقوں کے باشندوں سے بہت تھوڑا تعلق باقی رہ گیا۔[ک] اس زمانے میں ریاست اودھ کے حدود میں سونے چاندی کی قلت تھی جورج فارسٹر نے اس کمی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ جو رقم کمپنی کے نام پر لکھنؤ کے خزانے میں جمع کرتا تھا وہ وہاں سے بنگال کو بھیجدی جاتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں کمپنی کی مالی حالت خراب تھی۔ اس طرح کمپنی کے جو ملازم لکھنؤ میں رہتے تھے انھوں نے بھی اپنی دولت اسی طرح منتقل کر دی تھی۔ سونا چاندی کی کمی کی وجہ سے اودھ کی تجارت میں تھماؤ آ گیا تھا۔ کیونکہ مال بھیجنے کے لیے روپے کی ضرورت

ل۔ راجا بنارس اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ دیکھیے۔

G. W. Forrest:- Selections From the Letters etc. (Cal-1890)

George Forser's Travel in India, PP. 76-77 ص ۳۶

ک

ہوتی تھی۔ اگر روپیہ مہیا ہوجائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی ملک کے ذرائع آمدنی مسدود ہوجائیں تو وہ ملک تباہ ہوجائے گا۔ یہاں کی دولت یورپ بھیجدی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں یہاں تجارت کچھ مخصوص لوگوں کے ہاتھوں میں تھی اور حکومت کا تجارت پر بڑا دخل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بنگال کے بلوں کے ادا کرنے میں صرافوں کو ساڑھے سترہ فیصدی کا منافع ہوتا تھا۔ اس کی وجہ کر چاندی کی کمی ہوتی جاتی تھی[1] اس زمانے میں اودھ کی آبادی بھی کم ہوگئی تھی۔ اور تجارت جو اگلے وقتوں میں بڑی اہم تھی۔ برباد ہوچکی تھی۔ فارسٹر کا بیان ہے کہ جن خرابیوں نے ہندوستان کو تباہ کیا تھا۔ وہ سب خرابیاں اودھ میں بھی سرایت کرگئی تھیں۔ اودھ کو تباہی سے بچانے کے لیے ایک عقلمند اور منصف حکمراں کی ضرورت تھی۔ ان خرابیوں کو صرف ایسا ہی شخص دور کرسکتا تھا[2]

جاگیروں کی ضبطی ۔ جاگیردار لوگ بڑے خراچ ہوتے تھے وہ زندگی کی آسائش کی چیزیں چاہے مہنگی ہی کیوں نہ ہوں، خریدتے تھے۔ اور اس طرح بلاواسطہ صنعت وحرفت اور تجارت کو بڑھاوا دیتے تھے۔ ان کی سرکاروں سے بڑی تعداد میں صناع اور ملازم منسلک ہوتے تھے۔ جب ان کی جاگیریں ضبط ہوگئیں تو وہ سب صناع بیکار ہوگئے۔ ان علاقوں میں زراعت آبادی اور تجارتی سرگرمی سرد پڑگئی[3]

---

۱ George Forster Travels in India, I, PP. 100

۲ I, P. 99 ۳ ایضاً، ۱، ص ۱۰۰

انگریزوں کا تسلط | فارسٹر کا بیان ہے کہ اودھ میں تباہی کے آثار بڑے نمایاں تھے۔ انگریزوں اور اودھ کے آپسی تعلقات سے چاہے انگریزوں کو فائدہ پہونچا ہو لیکن ثانی الذکر کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچا اور ریاست کی تباہی میں انگریز بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔[1]

جاگیردارانہ نظام کی خرابی | جاگیردارانہ نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ بڑی تعداد میں نوکر پیشہ اور صناع کسی فرد واحد کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اس کے عروج اور زوال پر ان سب کی روزی کا انحصار تھا۔ اس شخص کے انتقال پر یا زوال کی صورت میں سیکڑوں لوگ بے روزگار ہو جاتے تھے۔ مثلاً صدر النساء بیگم زوجہ صفدر جنگ کی سرکار سے ہزاروں ہنرمند وابستہ تھے ان میں سے بہتوں کو بلاواسطہ اور بالواسطہ اس سرکار سے روزی ملتی تھی۔ سپاہ، دوکاندار اور اکثر مستحق افراد ان کی سخاوت سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کی وفات ان سب لوگوں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوئی۔ خواجہ سرا لکھنؤ کو سدھارے۔ ان میں سے کچھ نے حج بیت اللہ کی تیاری کی کچھ نے افلاس اور تنگدستی میں زندگی گذارنی شروع کر دی۔ محمد فیض بخش نے خود اپنی آنکھوں سے ان خادماؤں کو دیکھا جو ان کی زندگی میں بڑی آن بان سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان کے بعد قلعہ کی ایک پرانی عمارت میں زندگی بسر کرنے لگیں اور اس عمارت میں اس طرح رہتی تھیں جیسے کہ کسی گودام میں غلہ کے بورے بھر دیئے گئے ہوں اور دو تین روپے ماہوار کی آمدنی پر زندگی گذارتی تھیں۔[2]

---

[1] George Forster: Travels in India. I, P. 100-1

[2] تاریخ فرح بخش ۱۰۱/۲۵-۲۰۲ شاہ کمال نے ایک مثنوی جہاں آصفی پر لکھی ہے۔ اس مثنوی میں اودھ کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے نواب آصف الدولہ کی وفات پر لوگوں کی بے روزگاری کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرہ مجمع الانتخاب / ص ۲۳۳ ب

مختصر یہ کہ اس عہد کے ادب سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے ربع اول میں اودھ ریاست کی اقتصادی زبوں حالی زوال کے آخری منازل طے کر چکی تھی، اقتصادی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہر طرح کے ہنرور، صناع پیشہ ور، علما، ادبا، حکما اقتصادی پریشانیوں میں سرگرداں تھے۔ انشاء اللہ خان انشا نے اپنی بے قدری اور زبوں حالی کے بیان کے ساتھ ساتھ ہنروروں کی پریشانیوں کا نوحہ لکھا ہے۔

کہاں تک کروں میں زمانے کا شکوہ — مصیبت ہے یوں تو سب اہل ہنر پر
خصوصاً جو وضع داروں میں تھا یہاں — برستا ہے افلاس ہی ان کے گھر پر
فکا رام جانے پتیا دیکھیا تو — کھڑا بنیا کہتا ہے اب ان کے در پر
سلیمانی تلوار تو سے چکا ہے — لگائی ہے اب تاک شاید سپر پر
پڑا ہنہناتا ہے بن گھاس گھوڑا — ہوئے چار فاقے ہیں پیہم نفر پر [1]

غلام حسین ہدایت نے ایک شہر آشوب میں اودھ کے پیشہ وروں کی اقتصادی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ مجملاً ان پیشہ وروں کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

امیروں کا حال

ہے اس کے وقت میں غم سے انھوں کو کام
جو بیٹھے بنگلوں میں باغوں میں سنتے تو ہنڈول

---

[1] کلیات انشا/۹۴۔

منصبداروں کا حال

سوال ہر ایک سے کرتے ہیں رہ میں منصبدار
سلام کرکے غریب سے بھکاری کیسہ ٹٹول

سپاہ کا حال

سپاہی وہ ہیں مشت جو ار گو ہے گراں
ہے زیادہ قدر کا نامرد کے گھر سے مول

ساہوکار و تجار

تمام ساہو تجار ظلم سے جس کے
ہوئے ہیں لٹ کے گدایوں . . . . . تول

فقیروں کی حالت

فقیر فاقے سے نالاں پھرتے ہیں در در
کہ جیوں پکارتے پھرتے ہیں سنبدیو [illegible] بول[۹]

میر حسن دہلوی نے اپنی زبوں حالی کے ذکر کے ساتھ تمام ہمدردوں کی اقتصادی پریشانیوں کا مرثیہ لکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سلہ کلیات ہدایت (قلمی انجمن ترقی اردو، علی گڑھ) ص ۱۵۰-۱۵۱
مرزا ہیچکا کی زبوں حالی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ رقعات مرزا قتیل
۱، اودھ کی عام اقتصادی حالت کے مطالعہ کے لیے دیکھیے، مخمس شہر آشوب دیوان شاہ کمال (قلمی) ص ۶۱۸-۶۲۱

ہنروروں کی بے قدری

جو آگے تھے ہنر سو عیب ہیں اب ‏ ‏ ‏ نہ ہو کس طرح وہ کاں ہنرمند

دامن سے کوئی جھٹکے ہے بھیرے ہے کوئی منھ ‏ ‏ ‏ کیا کیا ہیں خواریاں میرے مشت غبار میں

جنس آسودگی کی نہیں ہم پاس ‏ ‏ ‏ درد اور غم کے کاروان ہیں ہم

جن کا دماغ عرش پہ تھا اب ہیں پائمال ‏ ‏ ‏ کوٹھے پہ جو کہ رہتے تھے زینہ پہ آرہے

جز بے سر و سامانی حسنؔ ہم نے جہاں میں ‏ ‏ ‏ افسوس کہ کچھ اور سرانجام نہ پایا

ہو جو قسمت میں پریشانی تو وہ جائے کہاں
گو خدائی کے ہنر اہل ہنر جمع کریں

باب ہفتم

نوابانِ اودھ کی طرزِ زندگی،

نواب سعادت علی خاں برہان الملک اور نواب صفدر جنگ کا زیادہ تر وقت دہلی میں اور وہاں کی سیاست میں گذرا اور انھوں نے اپنی ریاست کا نظم ونسق اپنے نائبوں کے ذریعہ چلایا تھا۔ اس لیے حکومت کے سلسلے میں ان کے نظام اوقات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ نواب شجاع الدولہ کا تعلق دہلی کے دربار اور وہاں کی سیاست سے بالکل نہ تھا۔ اور آخری زمانے میں شاہ عالم ثانی نے اُسے برائے نام وزیر الممالک مقرر کیا تھا۔ اور اس زمانے میں یہ عہدہ صرف اعزازی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہِ مغلیہ خود انگریزوں کی حراست میں تھا۔ اس لیے سلطنتِ مغلیہ کے نظم ونسق کے سلسلے میں اس کا بالکل عملی تعلق نہیں تھا۔ ایسی صورت میں وزیر الممالک کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ مگر شجاع الدولہ نے اس اعزاز کو قبول کر لیا تھا تاکہ عوام میں اس کا اقتدار بڑھ جائے۔ اس بنا پہ شجاع الدولہ کا سارا وقت اپنے صوبوں میں ہی گذرتا تھا۔ لہٰذا وہ ریاست کے

نظم ونسق کو بذاتِ خود چلاتا تھا۔ سید کمال الدین حیدر کا بیان ہے کہ نواب
صبح سویرے اٹھ کر جابجا چھاونیوں میں سپاہ کی قواعد، سوار و پیادہ اور توپخانہ
ملاحظہ کرتے، ۹ بجے دربار کرتے۔ ارکانِ دولت اور وکلائے ہر ریاست ہندوستان
حاضر ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ وزیر الممالک تھے۔ دوپہر کو حرم سرا میں داخل ہوتے
بہو بیگم کے ساتھ طعام تناول کرتے تھے، سہ پہر کو خورد محل میں داخل ہوتے اسی
وجہ سے وہ محل چور محل کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں سے نکل کر تفریحِ طبع کے لیے
لہو لعب شکار پرند باغیچہ میں جاتے اور ان کے ساتھ دو شکاری ہوتے تھے۔ چار بجے
دستار مبارک سر پر رکھ کر سرکاری عنداتِ ملکی و مالی ملاحظہ کرتے۔ رات کو
محل سرا میں رہتے۔ لیکن جس رات کو کہیں باہر آرام کرتے تو پانچ ہزار روپے بطور
جرمانہ بہو بیگم کو دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ خورد محل کی مستورات سے کسی اولاد نہیں تھی۔[1]

نواب شجاع الدولہ کو سیر و شکار کا بہت ذوق تھا۔ وہ چھ ماہ اپنی ریاست
کے دورے پر اور شکار کھیلنے کی غرض سے جایا کرتے تھے، اور موسم برسات میں
فیض آباد میں مقیم رہتے تھے[2]۔ نواب نے فیض آباد میں شکارگاہ کا انتظام کیا تھا۔
پہلی شکارگاہ شہر کے مغربی جانب گرجی بیگ خان کی مسجد سے گپتر گھاٹ تک ایک
بہت وسیع جنگل تھا۔ اس جنگل کے دو سمتوں میں مٹی کی فصیل کھڑی کی گئی تھی،
اور تیسری سمت میں گھاگھرا ندی بہتی تھی۔ اور اس علاقے کو محصور کرتی تھی۔

---

۱ سوانحات / ۸۹ - ۹۰

Memoris of Dehli, Faiz e ۲ تاریخ اودھ ۱۵۹/۲

Beo, 11, P.10 Observations etc. PP. 410-411

اس جنگل میں برائے شکار جانور مثلاً ہرن، بارہ سنگے، چیتے، چیتل چھوڑ دیئے گئے تھے،
دوسری شکارگاہ مشرقی سمت میں موضع جنورا کے چھاونی گسائیں سے شروع
ہوکر دریا کے کنارے کنارے پانچ میل کے فاصلے تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ شکارگاہ
مکمل نہ ہوسکی اور نہ اس میں جانور ہی پالے گئے۔ [1]

نواب شجاع الدولہ کو جنگ فیلان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ۱۱۸۴ھ میں
اس موقع پر تماشہ بینوں کا مجمع پچاس ہزار کا تھا۔ جب غالب ہاتھی نے مغلوب
کا تعاقب کیا تو اس ہڑبونگ میں چھ اشخاص ہلاک ہو گئے۔ [2]

نواب آصف الدولہ کو جو ریاست ورثہ میں ملی تھی اس کے نظم و نسق کو چلانے
کے لیے پوری توجہ کی ضرورت تھی، مگر نواب میں ابتدا ہی سے اس کی اہلیت نہ تھی
اور اگر اہلیت ہوتی بھی تو اس صورت میں بھی وہ مفلوج ثابت ہوتا۔ انگریزوں
کا اقتدار کافی بڑھ چکا تھا، لہٰذا نواب نے ریاست کے انتظامی امور سے بے توجہی
برتی اور لہو و لعب میں مشغول رہنے لگا۔ طباطبائی اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر
لکھتا ہے کہ نواب شعور و خرد سے عاری تھا۔ اراذل اور پوچ لوگوں کی
صحبت میں مصروف رہتا تھا۔ بجز لہو و لعب کے کسی کام کی طرف، چاہے
ملکی ہو یا مالی، متوجہ نہ ہوتا تھا۔ ہر صبح کو اٹھ کر دوپہر تک ایک باغ سے

---

[1] Memoir of Dehli Faizabad, II, P.6
نیز ملاحظہ ہو چہار گلزار شجاعی، ۱۹۰ الف و ب، ۱۹۱ ب، ۱۹۲ ب، ۱۹۵ الف، ۱۹۵ ب،
۱۹۷ ب، ۱۹۹ الف، ۲۰۱ الف، تفضیح الغافلین - / ۵۸ - ۶۰

[2] چہار گلزار شجاعی / ۲۰۱ الف

دوسرے باغ میں یا ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں جاتا۔ فیل خانے کے تماشے میں بسر کرتا۔ دو تین دن کے بعد ہمیشہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا۔ پس ایسے ہی اشغال میں صبح و شام بسر کرتا تھا۔ اور کوئی دوسرا کام نہ تھا۔[1] چونکہ نواب کو افیون خوری کی لت تھی اس لیے صبح کو دیر سے بیدار ہوتا تھا۔[2]

نواب کو شکار سے بہت شغف تھا۔ سال میں دو بار ضرور شکار کھیلنے جاتے۔ یہ سفر عجیب سیر و تماشا کا منظر پیش کرتے تھے۔ ہر مقام پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا شہر لکھنؤ وہاں آباد ہو گیا۔ اس سفر میں لاکھوں روپئے صرف ہوتے تھے۔[3] دو مرتبہ میر تقی میر بھی نواب کے ہمراہ شکاری قافلے کے ساتھ گئے تھے، لہذا انھوں نے بڑے مفصل دو شکار نامے لکھے ہیں۔[4]

---

[1] سیر المتاخرین (ا-ت) ۳/۱۰۴، نیز ملاحظہ ہو چہار گلزار شجاعی/۲۴۹ الف، ٹیوننگ کی ملاقات نواب سے ہوئی تھی، وہ لکھتا ہے کہ نواب کے اخلاق میں نفاست اور شائستگی پائی جاتی تھی۔ اپنی سخاوت، داخلی اور خارجی، اور فضول خرچی میں نواب آصف الدولہ کا مقابلہ یورپ کے کسی شاندار بادشاہ سے کیا جا سکتا ہو، Travels in India P. 311

[2] تفضیح الغافلین/۶۱، تاریخ فرح بخش (انگریزی) ۱۰۳/۱،

[3] سوانحات ۱۸۰/۱-۱۸۱، تفضیح الغافلین/۵، چہار گلزار شجاعی/۲۵۹ الف، ۲۵۵ الف و ب، ۲۵۶ الف، ۲۵۹ ب، تاریخ فرح بخش ۲۳۲/۱

[4] کلیات میر/۸۵۲-۸۶۴، میر کی آپ بیتی/۱۸۶-۱۸۷، تذکرہ گلشن ہند/۱۰-۱۱، چہار گلزار شجاعی/۲۴۹ الف، ۲۵۵ الف و ب، ۲۵۹ ب، عماد/۱۳۰، Forbes (J) Oriental Memoirs etc, II, 232
کلیات سودا ۳۲۱/۱-۳۲۲

نواب سعادت علی خان صبح سویرے اُٹھ کر گھوڑے کی سواری کرتے تھے۔
کیوں کہ شہسواری کے بڑی مہارت رکھتے تھے۔ بادشاہ فرخ سیر کی طرح نواب کو بھی
عمدہ گھوڑے رکھنے کا شوق تھا۔ نواب موصوف نے دکھنی، عرب اور جنگلی گھوڑے
گھوڑیوں کے نال میل سے ایسے گھوڑے پیدا کیے تھے جو سیرت وصورت میں عجیب
وغریب تھے۔ گھوڑسواری کے وقت انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے۔ سیر وسپاٹے
پر روانگی سے پہلے مرشد زادے، ان کے داماد، اور اہلکاران برائے مجرا حاضر ہوا کرتے تھے،
ہواخوری کے لیے اکثر وبیشتر دلکشا یا پار دریا (گومتی) یا موسیٰ باغ تک جایا کرتے تھے۔ دو گھڑی
کے بعد واپس آتے۔ اس کے بعد جلوس کی سواری نکلتی۔ خود ہاتھی پر سوار ہوتے اور
دوسرے درباری بھی ہاتھی پر ہوتے۔ جب گھوڑے پر سوار ہوتے تو صرف دو خاص
بردار یا چوبدار داہنے بائیں ہمراہ ہوتے یا مرزا کریم بیگ یا محمد غلامی خانہ زادان حضوری
پر سوار، لباس انگریزی پہنے، آگے ہوتے یا چند شکاری کتے بازار وگرد کچھ فاصلے سے
پیشرو ہوتے۔ روزانہ چوکی پر ہر فرقے کے بائیس سو آدمی حاضر رہتے۔ دربار کے بعد نو بجے
ناشتہ ہوتا۔ اس موقع پر ان کے ساتھ مقربان خاص، مثلاً صمصام الدولہ مرزا جو، مرزا
محمد تقی خاں، شاعر ہندی، بیٹے نواب مرزا علی خاں، انشاء اللہ خاں، ڈاکٹر لا صاحب،
میر ابوالقاسم خاں بن میر مدن سپہ سالار فوج نواب سراج الدولہ وغیرہ ہوتے۔
اور خواجہ سرایان برائے مجرا حاضر ہوتے تھے۔ باہر برآمدے میں انگریزی بینڈ بجتا تھا۔
تیسرا دربار ہوتا تو مقربان خاص حاضر ہوتے۔ گیارہ بجے دربار برخاست ہوتا۔ اور
محل سرا میں چلے جاتے۔ اور کوچ پر بیٹھ کر حقہ پیتے۔ چوتھا دربار بارہ بجے دن کو
ہوتا۔ آمد وخرچ کے کاغذات ملاحظہ کرتے۔ شام کے وقت بگھی پر سوار ہو کر

باہر نکلتے اور کوچوانی کے فرائض خود ہی انجام دیتے۔ اس موقع پر بختاور سنگھ کے ترک سوار اور اردلی ساتھ ہوتے۔ بعض مرتبہ تامجان کی سواری پر نکلتے۔ کبھی کسی گنج کی طرف جا کر غلہ کا نرخ پوچھتے۔ سال میں دو مرتبہ ریذیڈنٹ کے ہاں سالگرہ شاہ لندن اور بڑے دن کی تقریبیں ہوتیں۔ ان موقعوں پر ساٹھ ستر ہزار روپیہ صرف ہوتے۔ مرشد زادوں اور دامادوں کو کشتیاں اور امراء کو گوٹے کے ہار مرحمت ہوتے۔ اور آتشبازی چھوڑی جاتی تھی۔[1] دربار عام جمعہ کے دن ہوتا تھا۔[2]

نواب سعادت علی خان شکار کھیلنے کا ذوق رکھتا تھا۔ رقعات مرزا قتیل میں کئی جگہوں پر اس بات کا ذکر پایا جاتا ہے اور ان موقعوں پر مرزا قتیل بھی نواب کے ہمراہ ہوا کرتا تھا۔ ایک جگہ پر مرزا قتیل نے لکھا ہے کہ نواب "بطرف اینٹھی کلاں ردبالہ آباد برائے شکار رفت"[3] نواب موصوف کو بندوق چلانے میں پوری دسترس حاصل تھی، جب نواب شکار کھیلنے کے لیے روانہ ہوتے تو ہزارہا آدمی اور اوباش ان کے ہمراہ ہوتے معمول یہ تھا کہ کچھ رات رہے سوار ہوتے، فانوس کی روشنی میں سفر طے ہوتا، شہنا نواز شہنائیاں بجاتے، اور خوانچے والے ہر قسم کی فواکہات فروخت کرتے اور زور زور سے پکارتے پھرتے[4]۔ انشا اللہ خاں "انشا" نے نواب موصوف کے لیے شکار نامے لکھے ہیں۔ اور جنگل کے مناظر اور شکار کھیلنے کے

۱؎ سوانحات ۱/ص ۱۸۳-۱۸۵

۲؎ رقعات مرزا قتیل / ۹۲

۳؎ ایضاً / ۹، ۴۰، ۶۹، ۷۰، ۷۸، ۴۰

۴؎ سوانحات سلاطین ۱/۱۸۰-۱۸۱

واقعات جزوی اور رنگین انداز میں بیان کیے ہیں۔[1]

کھیل اور تفریحی مشاغل

شکار کھیلنے کے علاوہ کچھ ایسے تفریحی مشاغل بھی تھے جن سے نوابان اودھ مستقر میں قیام کے زمانے حظ اٹھاتے تھے۔ مثلاً چوپڑ بازی۔ نواب شجاع الدولہ کو چوپڑ کھیلنے کی بڑی لت تھی۔ تاریخ احمد شاہ میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ اس کھیل کا اس حد تک گرویدہ تھا۔ کہ میدان جنگ میں بھی وہ انتظامی امور کو نظرانداز کرکے چوپڑ کھیلنے میں مشغول ہوگیا۔ بکسر کے میدان میں انگریزوں کے ہاتھوں اس کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ چوپڑ کھیلتا رہا۔ اور فوج کی تنظیم وغیرہ کے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہ دی[2] چوسر بازی۔ نواب آصف الدولہ کو چوسر کھیلنے کا شوق تھا اور اپنا زیادہ تر وقت اس بازی میں صرف کرتا تھا[3]

پتنگ بازی : نواب شجاع الدولہ[4] اور آصف الدولہ[5] پتنگ اڑایا کرتے تھے۔

---

[1] کلیات انشاء مثنوی شکارنامہ کہ حسب الارشاد جناب عالی متعالی وو سفر دہم بقید تاریخ بطریق روزنامچہ بنوک قلم آمد، ۴۳۴ - ۳۵۲

[2] تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص ۴ ب

[3] سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳/ص ۱۴۳ [4] عماد/۹۸

[5] سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳/ص ۱۰۴، تاریخ محمد شاہ تا نواب آصف الدولہ (قلمی) ص، تاریخ احمد شاہی/ ۷ ب

ان کے لیے عمدہ عمدہ پتنگ اور مانجھے تیار ہوتے۔ اسی طرح درباری امراء پتنگ اڑاتے اور نوابان سے ان کے مقابلے ہوتے تھے۔

کبوتر بازی | نواب شجاع الدولہ کے ہاں دو ہزار کبوتر پلے ہوئے تھے[۱]۔ نواب آصف الدولہ کے ہاں پلے ہوئے کبوتروں کی تعداد تین لاکھ تھی۔ اور اُن پر کافی رقم صرف ہوتی تھی[۲]۔ نواب سعادت علی خاں بھی اس شغل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ مرزا قتیل ایک رسید بنام سید حسین خاں لکھتے ہیں "کہ ہنوز در سر ملازمان ہوائے صاحبزادگی باقی ست دریں حالت افلاس کبوتران از قسم پر برآوردن مورچکانست"[۳] نواب آصف الدولہ کے ساتھ سفر و حضر میں ہزاروں کبوتر رہتے تھے[۴] اور یہی حال نواب سعادت علیخاں کا تھا[۵]۔

مرغ بازی | نواب شجاع الدولہ[۶] نواب آصف الدولہ[۷] اور نواب سعادت علی خاں کو مرغ بازی کا شوق تھا[۸]۔ میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب اصف الدولہ

۱؎ چہار گلزار شجاعی ۱۱/۲۲۱ ب عماد / ۷۰ نواب کو بٹیر بازی کا بھی شوق تھا۔

۲؎ تفضیح الغافلین / ۴۸-۴۹

۳؎ ثمرات الہدائع / ۳۶-۳۷

۴؎ TWINNG TRAUEL IN INDIA P 311

۵؎ رقعات مرزا قتیل / ۱۴ ۶؎ چہار گلزار شجاعی ۱۱/۲۲۱ ب

۷؎ تفضیح الغافلین / ۴۸، ۴۹ سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳/ ۱۰۴، پولیئر میں فوٹو دیکھیے۔ کلیات انشاء / ۴۴۰

۸؎ گذشتہ لکھنؤ / ۱۶۵-۱۶۸

عام مرغ بازوں سے بازی لگاتے تھے یہ بازی ایک ایسے مقام پر ہوتی تھی جہاں عوام بھی جا سکتے تھے۔ میر کی ملاقات نواب سے اسی موقع پر ہوئی تھی جب وہ مرغ لڑانے آئے تھے۔[1]

ان کے مشاغل کے علاوہ نواب شجاع الدولہ کو کشتی لڑنے، پنجہ کشی، تیر اندازی، شناوری اور بھالہ اندازی کا بھی شوق تھا۔ پنجہ کشی میں نواب کو اتنی مہارت تھی کہ جب وہ قریب المرگ تھا تو اس نے دانش علی خاں خواجہ سرائے سے کہا "مرا دریں حالت دیدہ کم زور نخواہی دانست بیا و با ما پنجہ کن۔ او ہر چند ابا نمود عذر غش قبول نفرمود چوں تقید و تکرار از حد گذشت ایں بے چارہ لاچار شدہ حسب الحکم بعمل آورد"[2]

حرم شاہی

مسلمانوں میں پردے کی سختی کی وجہ سے نوابانِ اودھ کے حرم کی زندگی اور طرزِ معاشرت کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ محمد فیض بخش نے صدر النسا زوجہ نواب صفدر جنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی زندگی بہت سادہ تھی اور وہ اپنی عصمت کا اس حد تک خیال رکھتی تھیں۔ کہ اپنے بھائی آغا علی خاں کو بھی بلا اجازت زنانے محل میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی۔ جب وہ اپنے بھائی سے بھی ملتیں تو اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ ہو، یہاں تک کہ ہاتھوں پاؤں کو بھی اچھی طرح سے ڈھک لیتی تھیں اور چہرے کے علاوہ کوئی حصہ نظر نہ آتا[3] جب سفر کرتیں تو ڈولی اور چوپالہ پر پردے کا بڑا اہتمام ہوتا تھا بگونگ

---

[1] میر کی آپ بیتی / ۱۰۹ تاریخ احمد شاہ / ۸۰ الف

[2] چہار گلزار شجاعی / ۲۲۲ ب - ۲۲۳ الف

[3] تاریخ فرح بخش / ۲۵۳ - ۲۵۴ نیز دیکھیے صفحات ۴۵۴ - ۴۵۵

کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ کے حرم میں کشمیر کی عورتیں تھیں۔ یہ بات غالباً
اس نے شاہی ملازمین سے سنی ہوگی کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ عورتیں پردہ
دار پالکیوں میں سفر کر رہی تھیں اور پردہ اتنا سخت تھا کہ ان کا دیکھ لینا ناممکنات
میں سے تھا۔ ان کی خادمائیں بھی اس طرز پر سفر کر رہی تھیں۔ ان سواریوں کی حفاظت
کے لیے پیدل سوار تعینات تھے[۱]

لیکن نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں حرم شاہی کی طرز معاشرت کا حال
ایک انگریز نے لکھا ہے جو نواب کے دربار سے وابستہ تھا۔ ان بیانات کے مطالعہ سے
شاہان اودھ کے شاہی حرم کی زندگی کا مجموعی طور پر اندازہ ہوسکتا ہے اور ان کی
بنیاد پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ صف اوّل کے نوابان کے زمانے میں ایسی ہی زندگی ہوگی۔

حرم شاہی کے محافظ زنانہ سپاہی ہوتے تھے۔ یہ عورتیں سپاہی مردوں کی
وردیوں میں اور ہتھیار باندھ کر زنانہ ڈیوڑھیوں پر پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان زنانہ
سپاہیوں کو دردولت کے صحن میں روزانہ قواعد کرائی جاتی تاکہ اگر موقع پڑے
تو وہ مرد سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں کام آسکیں۔ ان زنانہ سپاہ کے
علاوہ، عورتوں کا ایک اور گروہ کہاریوں کا ہوتا تھا۔ ان کے ذمّے یہ خدمت تھی کہ
حرم شاہی کے اندر جب بادشاہ سلامت یا کوئی بیگم صاحبہ ایک مکان سے دوسرے
مکان میں جانا چاہیں تو ان کی پالکی اٹھا کر لے جائیں۔ ان کہاریوں کو بھی سپاہیانہ
طرز پر قواعد کرائی جاتی تھی۔

بیگمات کی خدمت گذاری کے لیے حسین وجمیل خادمائیں، مامائیں اور

TWINING. TRAVELS IN INDIA. PP. 311 - 312 [۱]

سہیلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی تھیں جن کے خاندان کی عورتیں قدیم زمانے سے شاہی حرم میں ملازم چلی آرہی تھیں اور ان کا خاندانی پیشہ یہی ملازمت تھی۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی ملازمائیں تھیں جن کے والدین مفلوک الحال تھے اور ان کی حسین وجمیل لڑکیاں خرید لی جاتی تھیں۔ اُن کے علاوہ خواجہ سرا بھی ہوتے تھے۔ ان خواجہ سراؤں کو بقول میر، میر حسن علی، حقوق خصوصی حاصل تھے۔ اور دیگر ملازمین کے مقابلے میں ان کے ساتھ مخصوص مراعات کی جاتی تھیں۔ ان لوگوں کو ہر وقت اور ہر حالت میں زنان خانے میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی حرم شاہی میں بیگمات کو نہلانے کی خدمت یہ لوگ ملازماؤں سے بھی زیادہ اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد سے ان خواجہ سراؤں کو بڑا عروج حاصل ہوا تھا۔ مثلاً خواجہ سرا جواہر علی خاں[1] اور امام بخش غلام بخش[2] اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے خواجہ سرا تھے جن کو بڑے عہدے ملے ہوئے تھے، ان کی تفصیل نجم الغنی کی تاریخ اودھ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

زنانہ شاہی کی مستورات بڑے عیش وعشرت، تکلفات اور تجملات کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان کے کمروں میں بڑے بڑے جھاڑ فانوس ہوتے، اور عمدہ سجاوٹ اور آرائش ہوتی۔ نواب ان کے جتنے محل تھے سب کی ڈیوڑھیاں علیحدہ علیحدہ تھیں اور ہر ایک میں ملاقات کے کمرے، مسندیں، اور دالان الگ الگ تھے، مستورات شاہی اور ان کے ملازمائیں بڑے قیمتی لباس زیب تن کرتیں، لباس تو

---

[1] تاریخ فرح بخش ۱/ ص ۸۴-۹۰

[2] سیر المتاخرین (ا-ت) ۳ ص ۱۱۰-۱۱۱، تاریخ اودھ ۳/ ۱۱۹-۱۲۰

عام طرز کے ساتھ مگر کپڑے قیمتی اور جاذبِ نظر ہوتے تھے۔ جسم پر زیورات ہوتے اور دیگر لوازماتِ حُسن کا بھی استعمال کرتی تھیں[1]۔ نصیرالدین حیدر کے زمانے میں شاہی جلوس کے ساتھ بیگمات کی بھی سواریاں ہوتیں جس زمانے میں کوئی بیگم اولاد کی تمنا میں کسی مسجد کو جاتی یا زیارت کے لئے کسی متبرک مقام کو جاتی[2] تو سواری کا تزک و احتشام قابلِ دید ہوتا۔ بادشاہ بیگم کی سواری کے ساتھ نوبت، نقارہ، ماہی و مراتب چتر زرنگار اور سایہ بان جو آفتابہ کہلاتا تھا، ہوتا تھا۔[3]

واجد علی شاہ نے خود نوشت ایک مثنوی میں شاہی حرم کی زندگی کی یہ تصویر پیش کی ہے:۔

کہ پریاں ہماری جو ہمدم ہوئیں — زنانِ حسینہ فراہم ہوئیں
پری دار تھے اُن کے رخسار صاف — مکاں بن گیا غیرتِ کوہ قاف
دامِ آشنائی وہ بھرنے لگیں — پری دار پرواز کرنے لگیں
کبھی گرمِ الفت کبھی گرمِ جوش — اُڑاتی تھیں باتوں میں عالم کے گوش
پری خانہ تھا گو مکاں مختصر — صفائی لگاتی تھی پر اس کو پر
عجب فرش اس قصرِ دیباہ کا — کہ دھوکا ہوا چادرِ ماہ کا
وہ پردے تھے اس میں صفا والواں — کہ تھی پردہ جسم حورِ جناں

---

[1] مجموعہ مثنویات میر حسن/ ۲۰۔ ۲۶۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۸۔ ۶۱-۶۴، ما بعد

[2] تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۲۴۸-۲۴۹۔ مسنز میر حسن علی۔ سواری بادشاہ بیگم برائے زیارت درگاہ حضرت عباس / ۲۴۸۔ مثنوی واجد علی شاہ/ ۱۶۴-۱۶۵

[3] برائے تفصیل۔ شباب لکھنؤ/ ۱۰۲-۱۱۸

عجب صحن تھا خلد جس کی فضا — جو دیوار دلچسپ درد دل کشا
عیاں صحن میں سنگ مرمر کا حوض — کہ ہم سنگ تھا حوض کوثر کا حوض
نیا ان پر آراستہ اک پلنگ — اوڑی جس سے تخت سلیماں کا رنگ
دیا حکم آنے نہ پائے کوئی — اجازت طلب ہو نوائی کوئی
جو آئیں تو داروغہ نجم النساء — وہ پریاں وار باب رقص و غنا
سوا ان کے ہرگز نہ ہو دخل غیر — اگر غیر جائے اجازت بغیر
یہی صحبت عیش دو دوپہر — یہی مشق تھی مجھکو شام و سحر[۱]

شاہی حرم کی زندگی عیش و عشرت اور جشن کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ کبھی بچے کی ولادت کا جشن تھا۔ تو کبھی شعبان کے جشن کی روشنیوں اور رقص و سرود کی تیاریاں کی تھیں[۲]

دربار اودھ کے جشن و تقریبات

دربار اودھ میں تقریباً بجنسہٖ اوسی اعلیٰ پیمانے پر جشن منعقد ہوتے تھے جن کا ہم دربار مغلیہ (دہلی) کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں مجملاً ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جشن نوروز: جشن نوروز کے دن ہر جگہ عوام و خواص رقص و سرود کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور یہ دن ان کے لیے بڑی خوشی کا دن ہوتا تھا، وقت کے مطابق لباس زیب تن کیا جاتا تھا۔ اگر رات کے وقت نو روز کی

---

۱ مثنوی واجد علی شاہ (قلمی) ص ۱۲۳ - ۱۲۴
۲ ایضاً: نیز عمّار: ۱۴۲: ۱۴۳

آمد ہوتی تو لباس کا رنگ سیاہ ہوتا، اگر دوپہر ہوتی تو لباس کا رنگ گہرا سرخ اور بھورا کیلا ہوتا۔ ہر طبقے کے لوگ یعنی بادشاہ سے لے کر ادنیٰ آدمی تک ایسا ہی لباس پہنتے تھے۔ اس دن دربار منعقد ہوتا، نواب تخت پر جلوہ افروز ہوتا، درباری امراء اور ملازمین نذریں پیش کرتے لوگ ایک دوسرے کو نوروز کی مبارکباد دیتے۔ بادشاہ بذاتِ خود اپنے امراء کو نوروز کی مبارکباد دے کر مثال قائم کرتا تھا۔ محل شاہی میں عصرانہ کی ضیافتیں ہوتیں، تحفے تحائف بھیجے جاتے اور شاہی مستورات خاندانی افراد کے یہاں آتی جاتیں۔ تحفے تحائف اشیاء کو خوانوں میں بہت سجا کر بھیجا جاتا جن بھیجنے کی تیاریاں بہت دنوں پہلے سے شروع ہو جاتی تھیں۔ دیگر رسومات کے علاوہ اس دن انڈے لڑانے کی رسم بھی ادا ہوتی تھی۔ انڈے ابالے جاتے ان کو مختلف النوع رنگوں سے رنگا جاتا۔ اس لیے تحائف میں انڈے بھی بھیجے جاتے تھے۔ مذہبی لوگ وہ دن دعائیں کرتے اور نمازیں پڑھنے میں گذارتے تھے۔ عورتوں میں دوسری ایک یہ رسم بھی مروج تھی کہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ نوروز کا آغاز دن کی روشنی میں ہوگا تو وہ کچھ دیر ایک تھال پر نظر گاڑ کر دیکھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب نوروز کا آغاز ہوگا تو گلاب کی کلی کھِل جائے گی، لہٰذا گلاب کی ایک کلی توڑ کر ایک تھال میں ڈال دیتے تھے اور اس میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ نوروز کے آغاز کے موقع پر خود بخود اس پھول کا رُخ سورج کی جانب ہو جائے گا۔

نوروز کے دن متوقع دولہا دولہن کے گھروں کے افراد آپس میں ایک دوسرے کے ہاں تحفے تحائف بھیجتے تھے، بڑے اپنے چھوٹوں کو تحفے دیتے، یہی حالت ماماؤں اور اساتذہ کی بھی دربار شاہی کے ملازمین کے لیے یہ دن بڑی مسرت کا دن ہوتا تھا۔[1]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OBSERVATIONS ETC, I, PP. 283-287

درباری شعرا اس دن کی مبارکباد کے لیے تہنیت نامے موزوں کرتے، دربار میں جاتے، اور انعامات حاصل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نوروز کے موقع پر سوداؔ نے نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں یہ قطعہ پڑھا تھا۔

تیری محفل میں شمع دولت افروز ہوا یہ سال نو فرخندہ فیروز
تیری طبع مبارک کو جہاں میں ہوا اس سال کی ہو فرحت آموز
فروغ فیض سے تیرے ہے روشن بسان شمع جو تیرا ہے دل سوز
نگہ ترک فلک کی بازگشتی تیرے اعدا کو ہے تیر جگر دوز
تفضل سے جناب مرتضیٰ کے تجھے ہر روز ہوئے عید نوروز[۱]

مرزا قتیل کے تہنیت نامہ سے، جو انھوں نے نوروز کے دن نواب سعادت علی خان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ دربار کی محفل رقص سرود کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"سازو سامان جشن جمشیدی و بزم کیقبادی حسن ترتیب و زینت آرایش یافتہ و اختر طالع محتاجان و مساکین بمدار فلاح ابدی و دولت سرمدی تافتہ۔ خواجہ سرایان محترم باہتمام مجلس بہشت آئیں سرفراز، و ناظران محتشم بندای حق علی العیش، بلند آواز مغنیان رنگین نوا بنغمۂ دلنواز ترانہ ریز و رامشگران ہمہ تن بہ رقص گرم خیز و ساقیان حسین لالہ رخسار جام پیمای بادہ حسن و دلربائی و محبوبان گلعذار از شور ملاحت نمک ریز خوان دلفریبی و خوش ادائی

۱؎ کلیات سودا ۲/ص ۳۰ ۲؎ نواب آصف الدولہ بھی جشن نوروز کا اہتمام کیا کرتے تھے: تاریخ اودھ ۳/۱۰۳

ندانم کہ بزمے در غایت نزہت و لطافت زینت ترتیب پذیرفتہ[1]

اس زمانے کے شعراء نے جشن نوروز پر قطعے اور غزلیں کہی ہیں[2]۔ انشا نے انڈے لڑانے کی رسم کا ذکر کیا ہے، اس کھیل کو "سرا اور چپک لڑا" کہا جاتا تھا۔

ٹہرے گی خوب سی سرا اور چپک کی لڑا کو آدیں گے انڈے لڑانے کو کل آغا نوروز[3]

بسنت | جشن نوروز کی طرح بسنت کا جشن بھی دربار میں منایا جاتا تھا۔ اس دن دربار ہوتا، ضیافتیں ہوتیں، اور درندوں کی جنگوں کے تماشے کا اہتمام ہوتا۔ مسز میر حسن علی کا بیان ہے کہ یہ جشن صرف دربار میں منعقد ہوتا تھا۔ اور عوام کو اس تہوار سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی[4]۔ نواب آصف الدولہ اس جشن کے اہتمام میں ہزاروں روپے صرف کر دیتا تھا[5]۔

جشن سالگرہ | نوابان اودھ اور ان کے امرار اپنی سالگرہ کا جشن مناتے تھے۔

---

[1] ثمرات الہمایع /۹-۱۰، دیوان مصحفی پنجم (ق۔پ) ۱۱۶۔ الف۔ ۱۱۵ ب،

[2] ملاحظہ ہو کلیات میر حسن دہلوی (قلمی) ۱۴۲، مجموعہ مثنویات میر حسن | ۵۳، کلیات انشا ۱۲/۲، دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ۱۱۵ ب ۔ ۱۱۶ الف

[3] آغا ولایت کے باشندے کو کہتے تھے۔ انشا نے ایک شعر میں اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے:
آغا وہ ہیں جو تازہ ولایت سے ہو رات کو بے مطرب کو وڈم کہتے ہیں بولے کہ ددم ہے
کلیات انشار / ۱۵۲

[4] کلیات انشار / ۱۴۲، مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۳

[5] OBSERVATIONIS ETS . 154.

[6] تاریخ اودھ ۳ / ص ۱

رقص و سرور کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ نواب کی خدمت میں امرا تحائف بھیجتے، اور اس خوشی کے موقع پر انھیں انعامات اور خلعتیں تفویض ہوتی تھیں۔ درباری اور شہر کے نامور شعرا مبارکبادی کے تہنیت نامے پیش کرتے، اور جب حیثیت انعامات پاتے۔ سودا[۱] نے نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ[۲] اور دیگر امرا کی سالگرہ کے موقع پر تہنیت نامے پیش کیے تھے۔ ہرچرن داس نے نواب آصف الدولہ کے جشن سالگرہ کے بارے میں لکھا ہے۔

"شادی سالگرہ نواب آصف الدولہ بہادر کہ بیگم والدہ اش چہارم ذی الحجہ ہر سال می کند۔ درین سال نواب (شجاع الدولہ) نیز شامل آں شادی شد"[۳]

نواب سعادت علی خاں بھی اپنی سال گرہ کا جشن منعقد کرتے اور لوگوں میں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ مرزا قتیل ایک خط میں مرزا امانی کو لکھتے ہیں۔

"طعام سالگرہ جناب عالی از خانہ خاص محل آمدہ بود"[۴]

جشن تولد پسر | میر حسن دہلوی نے تولد پسر کے موقع پر درباری جشن کا تفصیلی ذکر کیا ہے یہ بیانات دہلی اور اودھ دونوں جگہوں کیلئے یکساں مطابقت رکھتے ہیں۔[۵] دراصل

---

[۱] کلیات سودا ۲/ ۵-۶

[۲] ایضاً ۲/ ص ۶

[۳] چہار گلزار شجاعی/ ۲۵۹ الف

[۴] رقعات مرزا قتیل/ ۱۳

[۵] مجموعہ مثنویات میر حسن/ ۲۰-۲۷

مثنوی سحرالبیان فیض آباد میں لکھی گئی تھی۔ لیکن میرحسن دہلی اور اودھ دونوں جگہوں کے رسومات سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ لہذا ہمنے اس مثنوی کے حوالے دہلی کے بیانات میں بھی دیئے ہیں۔

اس موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتیں، رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتیں، ملازمین کو انعامات ملتے، امرار نواب کی خدمت میں نذریں پیش کرتے۔ اور شعراء تہنیت نامے۔ نواب آصف الدولہ کے ہاں لڑکے کی ولادت کے موقع پر سودا نے یہ قطعہ پڑھا تھا۔

مبارکباد ایں فرزند دلبند — ترا اے درۃ التاج شرافت
شدم در فکر تاریخ تولد — برائے آں گل باغ نجابت
کہ ہاتف گفت ناگہ از سر ہوش — گرامی گوہر درج سیادت[1]

نواب واجد علی شاہ نے بیدار بخت کے مولود ہونے کے موقع کے جشن کا یوں ذکر کیا ہے۔

ہوا جشن شادی مبارک ہوئی — دیا حکم سلطاں نے سلک ہوئی
ملازم فرحساک (کذا) خاطر ہوئے — مصاحب سبھی نذر حاضر ہوئے
کہیں رقص رقاص عشرت فزا — کہیں گانے والوں کی دلکش صدا
صدا تھی یہ سارنگیوں کی بہم — مبارک مبارک شہ ذی حشم
کسی سمت پریاں تھیں آراستہ — سراپا جدا ہر سے پیراستہ
کروں میں بیاں اس خوشی کا وفور — عجب عید تھی طرفہ جشن سرور[2]

---

[1] کلیات سودا ۱۲ ص ۱۲/ نیز دیکھئے قطعہ مبارکباد تولد شہزادہ تولد نواب آصف الدولہ ایضاً ص ۳۰۳
[2] مثنوی واجد علی شاہ / ۱۶۲

اسی طرح آغا علی خاں پسر قاسم علی خاں[1] اور کاظم علی خاں[2] کے ہاں تولد پسر کے موقع پر خوشیوں کے جشن منعقد ہوئے تھے۔ رقص و سرود، بھانڈوں کے تماشے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ غربا و مساکین میں بے دریغ زر تقسیم کیا گیا۔

جشن غسل صحت | نوابان اور امرا جب کسی سخت علالت سے شفا پاتے تو اس موقع پر غسل صحت کے نام سے جشن ہوتا تھا۔ اور نواب غسل صحت فرماتا تھا۔ امرا نذریں پیش کرتے اور شعرا قطعہ مبارکبادی پیش کرتے۔ ایک موقع پر نواب آصف الدولہ علیل ہوئے، بڑی مقدار میں نقدی روپے اور جنس بطور خیرات غربا و مساکین میں بانٹا گیا۔ نائب سلطنت حیدر بیگ خاں نے ضیافت کا اہتمام کیا۔ نواب حیدر بیگ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں طعام تناول فرمایا۔ حیدر بیگ خاں نے پوشاک جواہرنگار نذر خدمت کی۔[3]

عیدین | عید الفطر کے چاند کا اعلان بندوقیں داغ کر کیا جاتا، فرط خوشی میں بگل اور نقارے بجائے جاتے۔ عید کے دن صبح کو عوام و خواص نماز کے لیے جانے کی تیاریاں کرتے۔ نواب اودھ بڑی شان و شوکت سے عیدگاہ جاتے۔ نواب کی سواری کے ساتھ امرا کا گروہ فوجی دستے، گھوڑسوار اور پیدل، یہ تمام لوگ زرق و برق لباس میں ملبوس ہوتے۔ نواب کی سواری کے ہاتھی کو

---

[1] چہار گلزار شجاعی / ۱۳۴ الف و ب

[2] ایضاً / ۱۷۷ الف و ب

[3] چہار گلزار شجاعی / ۲۵۴؛ نیز ملاحظہ ہو۔ دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ص ۱۱۶ ب، ۳۶ الف

نواب وزیر نے کیا غسل صحت   کیا فتح علی کی آرزو بر آئے

اس دن خوب صاف ستھرا کیا جاتا، بدن پر روغن لگایا جاتا۔ جلوس کی ترتیب اس طرح ہوتی۔ پچاس جوڑے اونٹ، جن پر اونٹ بان کے علاوہ دو بندوقچی بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کا لباس صاف ستھرا، اور سر پر سرخ اور نارنجی رنگ کی پگڑیاں ہوتیں، اونٹوں کے بعد توپ خانے کا دستہ ہوتا، اس شعبے کے متعلقہ ملازمین کا لباس نیلے رنگ کا ہوتا، ان کے بعد تلنگوں کا دستہ، جو سرخ جاکٹ اور سر پر چمڑے کی ٹوپیاں پہنے ہوتے، یہ ٹوپیاں مرصع اور زرنگار ہوتی تھیں۔ اس کے بعد ہاتھی گاڑیاں ہوتیں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں نواب سوار ہوتے تھے۔ اور دوسری گاڑیوں میں امراء اور دوسرے خاص درباری۔ نواب کی سواری کی گاڑی میں چار ہاتھی جتے ہوتے تھے جن پر کمخواب اور اطلس کی مرصع جھولیں پڑی ہوتیں، نواب کی گاڑی کے آگے پیچھے گھوڑ سوار ہوتے۔ ہرکارے سونے اور چاندی کے عصا لیے نواب کی سواری کی آمد کا اعلان کرتے جاتے، راستہ صاف ہوتا جاتا، اس کروفر کے ساتھ جلوس عید گاہ پہنچتا اور اسی انداز سے واپس آتا تھا۔[1] ہرچند داس نے نواب آصف الدولہ کی سواری برائے عیدگاہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر نواب غربا اور مسکینوں میں خیرات تقسیم کرتے چلتے تھے۔

"بعد مرزا منگلی و نواب بہادر و دیگر برادران و امرایان و ارکان شوکت و حشمت تمام نوبت نوازان در دیہا بر مسکینان و فقیران اندازان بعید گاہ

۱؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OBSERVATIONS ETC. PP 262-65

نیز دیکھیے۔ کلیات میر حسن ۱۲۰۲/۱۲۲، چہار گلزار شجاعی ۲۲۴/ب

دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ)، ص ۱۱۵ ب

سعادت شد و نذر بسیار بہ محتاجان و پنجاہ ہزار روپیہ بگمات و ایمن امرا و گر رسالہ دار و دو ہزار روپیہ بہ مقبول علی خان خواجہ سرا و بسیاری خلعت و دو شالہ مرحمت فرمود"[۱]

عیدگاہ سے واپسی کے بعد دربار ہوتا۔ امرا مبارکباد اور نذریں پیش کرتے شعرا تہنیت نامے پڑھ کر سناتے۔ سودا نے نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کی خدمت میں عیدین کے موقعوں پر تہنیت نامے پیش کرتے تھے[۲]۔ اسیطرح سودا نے حسن رضا خان کے نام بھی عیدین کے موقعوں پر مبارکبادی کے قطعے پڑھے تھے[۳]۔

عیدین کے دن شاہی حرم کی مستورات اپنی چاردیواریوں کے اندر تمام ممکن خوشیوں کے اظہار کے طریقے استعمال میں لائیں۔ اس دن کی خوشی کا اظہار اچھے اور عمدہ لباسوں، زیورات اور لوازمات حسن کے استعمال کے ذریعہ کرتی تھیں۔ زنان خانے کے رقص و سرود کی گونجیں آسمان تک پہونچ جاتی تھیں۔ سہیلیوں کا ایک دوسرے سے گلے ملنا ایک دوسرے کو مبارکباد دینا ڈولیوں کا ایک محل سے دوسرے محل میں جانا۔ ملازماؤں کو تحفے تحائف دینا، غریبوں میں صدقہ تقسیم کرنا، اس دن نواب کی خاص محل، اپنی ملازماؤں کی نذریں قبول کرتیں، اور بدلے میں انعامات بطور عیدی عطا کرتیں[۴]۔

---

[۱] چہار گلزار شجاعی ۲۲۵/ ب

[۲] کلیات سودا ۱/ ص ۲۴-۲۵، ۸۰، کلیات میرحسن ۲۴۴/ا، کلیات جرأت ۱۰۱/ا
۲۹۰-۲۹۸/ا

[۳] کلیات سودا ۲/ ص ۱۸، ۱۹

[۴] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OBSERVATIONS ETC I, PP. 192-193

عید الضحیٰ | اس کے دن، عید کے دن کی طرح بڑی شان وشوکت سے نواب کی سواری عیدگاہ جاتی، عید کی نماز کے بعد نواب عیدگاہ میں اونٹ کی قربانی کرتا تھا اور اس عمل کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا[1] واپس آکر دربار ہوتا - انعامات دیے جاتے، نذریں قبول کی جاتیں اور تہنیت نامے پڑھے جاتے۔[2]

جشن شعبان | واجد علی شاہ نے اس جشن کا بیان اس طرح کیا ہے۔ یہ جشن حضرت امام حسین کی ولادت کے دن منایا جاتا تھا۔

ہوا نصف جب ماہ شعبان تمام — وہ تھا روز مولود شاہ انام
ہوئے قصر عالی لطافت سرشت — بعینہ وہ گلزار باغ بہشت
کروں روشنی بزم کا گر بیاں — تو ہو روشنی شمع روشن زباں

رقص و سرود اور شراب نوشی ۔

کسی سمت مردنگ کی تھی قطار — کہ جنبش (کذا) ہوئے سو سو ہزار
کسی سمت مطرب تھی نغمہ سرا — مغنی کسی سمت گرم غنا
جو سازندے تھے اور کرتے تھے مست — وہ ساقی تھے گویا کہ ساغر بدست۔
دوپٹے گرے اور کھل کا کلیں — چہکتی تھی گلزار میں بلبلیں
عجب نغمہ لذت اسیر تھے — کہ ہر سمت طوطی شکر ریز تھے
وہ مینا خاص (کذا)، بلوریں و جام — محمد حسین و صاحب اہتمام

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو - ۱/۲۵۹ - ROSS: HINDU -
[2] ایضاً: ۲۴۳-۲۵۹ MUHAMMADAN FEASTS PP. 1-2-3
[3] کلیات سودا - ۱۱/ص ۳۰۲

طعام لذیذ و لطافت سرشت ۔۔۔ مزے میں بعینہٖ طعام بہشت[1]

نواب سعادت علی خاں نے اس جشن کے انعقاد کا آغاز کیا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ جشن ۱۲۱۲ھ چہارم شعبان کو منعقد ہوا تھا۔ "و امرا ر عظام و خوانین ذی جبروت نذر می آرند و بقدر بخلعت سرفراز می شدند"[2]

عام مسلمانوں کی معاشرت

رسوم و رواج (الف) ولادت تا وفات :-

بچے کی ولادت کے متعلق دہلی اور اودھ کی رسموں میں کوئی زیادہ تفاوت نہ تھا اور بڑی حد تک ان میں یکسانیت ہی پائی جاتی تھی۔ مرزا قتیل نے ہفت تماشا اور سعادت یار خاں رنگین نے اپنی مثنوی سائلہ میں ولادت سے وفات تک کی رسموں کا مفصل ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان تمام رسوم کا ہم دہلی کے رسم و رواج کے ضمن میں بڑی وضاحت سے ذکر کر چکے ہیں۔ دوبارہ تفصیل ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

بچے کی ولادت کے وقت دائی کی مدد حاصل کی جاتی تھی۔ انشا نے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

لڑکا جو نگوڑا جنے بھوت سا کالا ۔۔۔ اے دائی خبائی ۔ پرچھائیں اری بی[3]

---

[1] مثنوی واجد علی شاہ / ۲۰۲ - ۲۰۷

[2] عماد / ۱۶۳ - ۱۶۴

[3] کلیات انشا / ۳۶۷

نومولود کے کان میں تکبیر کہی جاتی تھی۔[۱] چھٹے دن چھٹی اور ساتویں دن عقیقہ کی رسموں کو ادا کیا جاتا تھا۔ اگر لڑکا ہوتا تو دو بکرے اور لڑکی ہوتی تو ایک بکری کی قربانی کی جاتی مگر شرط یہ تھی کہ ان بکروں اور بکری کے جسم کا کوئی عضو ناقص نہ ہو۔ عقیقہ کے دن نومولود کے سر کے بال مونڈے جاتے اور ان بالوں کے وزن کے برابر چاندی غرباؤ مسکینوں میں بطور صدقہ بانٹ دی جاتی تھی۔ اس کے بعد بچے کا نام تجویز ہوتا۔

ایک سال کی عمر ہونے پر بچے کی سالگرہ کا جشن ہوتا۔ دو سال کی عمر میں دودھ چھڑایا جاتا۔ اور اس موقع پر بھی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ مرزا قتیل ایک خط میں اس موقع کی رسموں کا ذکر کرتے ہیں۔

"میر یوسف علی خاں دختر خود را از شیر وا کردہ است۔ بخش شیرینی بماس ہم فرستادہ بود۔ جائے دیگر کجور خانہ ساز رفتہ بود و ایں جا ہمہ از دکان کولی بود"[۲]

پانچویں سال بسم اللہ خوانی کی رسم ادا ہوتی، اور بڑے لوگوں کے ہاں اس موقع پر خوشیاں منائی جاتیں۔ ایک تقریب کا اہتمام ہوتا۔ اور بقول سعادت یار خاں رنگین شاہ و گدا شرکت کرتے تھے۔ پہلے بچے کو قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی اور جب وہ ناظرہ قرآن پڑھ لیتا تو اس موقع پر بھی خوشیاں منائی جاتیں۔ بچے کے والدین اپنی حیثیت کے مطابق کھانا پکوا کر غربا اور مساکین کو کھلواتے تھے۔[۳] سات برس کی عمر میں

---

[۱] Observations etc., 210-211

[۲] رقعات مرزا قتیل / ۳۹

[۳] ملا نظام الدین سہالوی کے فرزند عبد العلی بحر العلوم کی بسم اللہ خوانی کی رسم کی تقریب کے لیے ملاحظہ ہو۔ معارف (دسمبر ۱۹۴۸ء) ص ۲۰۹-۲۱۴ نیز ملاحظہ ہو ملفوظات رزاقی / ۲۱۰

نماز کی ہدایت کی جاتی اور دس سال کی عمر کے بعد نماز پڑھنے پر اصرار کیا جاتا۔ سن بلوغ کو پہونچنے سے پہلے ختنہ کی رسم ادا ہوتی۔[1]

جب لڑکے اور لڑکی سن بلوغ کو پہونچ جاتے تو شادی ہوتی۔ ان رسوم میں ساچق، حنا بندی اور نکاح کی رسمیں سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی تھیں۔[2] ساچق کی رسم میں شیخ فرید کا پوڑہ، بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ شیعہ و سنی دونوں عقائد کے لوگ اس رسم کو ادا کرتے تھے۔ ساچق میں جو اشیائے خورد و نوش لڑکی والوں کے گھر بھیجی جاتیں تو ان میں ایک شکر کا پوڑہ رکھا جاتا تھا۔ اور وہ "شیخ فرید کا پڑہ" کہلاتا تھا۔[3]

ساچق کی رسم حسب حیثیت دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔ مرزا قتیل نے اس رسم کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کی صورت یوں تھی۔ مٹکیوں کو پوت کر ان پر پھول بوٹے بناتے تھے۔ ان میں نقل بھری جاتی، جو شکر اور چنے سے تیار کی جاتی تھی۔ اور ان مٹکیوں کو پستہ، بادام اور مصری سے پر کرتے تھے۔ چار مٹکیوں کو ایک تخت پر رکھتے، ہر ایک تخت کو ایک مرد اٹھاتا۔ تختوں کی کمی بیشی کا انحصار لڑکے کے والدین کی حیثیت پر ہوتا تھا۔ اسی طرح آرائشی تختوں کو ان تختوں پر جاتے تھے۔ ان کے علاوہ قند اور میووں کے چند خوان ہوتے تھے۔ پھولوں کے ہار اور دوسرے زیورات دولہن کے لیے ہوتے۔ اس جلوس میں مستورات اور رشتہ داروں کی سواریاں ہوتی تھیں

---

[1] تاریخ فرح بخش (انگریزی) ۱۱/ص ۳۰۶

[2] رقعات مرزا قتیل / "تا بیست و دوم ساچق بعمل خواہد آمد و فردای آن حنا بندی و بیست و چہارم یعنی شب بست و پنجم مجلس عروس مرتب خواہد شد" / ۴۱

[3] ہفت تماشا / ۱۴۰ - ۱۴۲

دولہا گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہوتا تھا۔ یہ جلوس بڑی شان و شوکت کے ساتھ اور نقارہ بجاتے دولہن کے گھر جاتا تھا۔ دولہن کے گھر میں دولہا کو ایک مسند پر بٹھایا جاتا اور وہاں رقص و سرود شروع ہوتا۔ جب دوپہر رات گئے گلاب سے معطر کیا ہوا مصری کا شربت مہمانوں کو پیش کیا جاتا مابعد دوسروں کو۔ دولہا کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ شربت پہلے دولہا کو پیش کیا جاتا۔ چکھنے کے بعد پانچ روپے یا کم یا ایک دو اشرفی تھال میں ڈال دے۔ پھر کلی کرتا اور ایک دو روپے یا اس سے زیادہ لگن میں بھی ڈالتا تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی شربت چکھنے کے بعد زر نقد تھالی میں ڈالتے تھے اور لگن میں ڈالنا ان کی خوشی پر مبنی تھا۔

ساچق کے اگلے دن یا اس کے دو تین دن بعد شب حنا بندی قرار پاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ دولہن کے گھر سے دولہا کے لیے مہندی اس صورت میں لاتے تھے کہ آرائش کے تختے جو ساچق کے روز دولہا کے گھر سے آتے تھے، اسی جگہ چھوڑ دئے جاتے تھے۔ بہرحال دولہا کے گھر ساچق کے آنے کا شام کا وقت مقرر ہوتا تھا۔ اور حنا رات کو لائی جاتی تھی، حنا پہونچنے کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بلایا جاتا۔ اور رشتہ کی سالیاں اس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگاتیں۔ جب عورتیں مہندی لگا چکتیں تو دولہا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نقدی بطور نیگ دیتا تھا۔ وہ عورتیں جو دولہا سے عمر میں بڑی ہوتیں، اسے سلامی دیتی تھیں۔ اس رسم کی ادائیگی کے وقت، مردانہ حصے میں دونوں طرف کی ناچنے والیاں باری باری رقص کرتی تھیں،

اور عورتوں کی مجلس میں ڈومنیاں[1] سرود[2] بدھائی گاتی تھیں. جس طرح دولہن والوں کو شربت پلایا تھا اسی طریقے پر دولہا کے گھر دولہن کے ہاں کے آئے مہمانوں کو شربت پلایا جاتا تھا اور تھالی میں روپے لے کر سمدھن کو دے دیا جاتا تھا اور مہمان رخصت ہو جاتے.

برات کے دن سرِشام سے دونوں گھروں میں دوست، احباب، وضیع و شریف جمع ہونے لگتے تھے. دولہا کو زرد لباس میں ملبوس کر کے مسند پر بٹھا دیا جاتا، اور عورتوں کے رقص کا تماشا دیکھنے میں مصروف کر دیا جاتا. جب ناچنے والیوں میں سے ایک رقاصہ ناچتے ناچتے تھک جاتی تھی تو وہ بھڑوے کے اشارے پر بیٹھ جاتی اور دوسری طوائف مامور کی جاتی. اس موقع پر دولہا کے لیے لازمی تھا کہ وہ اس طوائف کو جو رقص کر چکی تھی، اپنے ہاتھ سے عطر، پان اور دھنیا پیش کرے.

برات کی روانگی کے اوقات میں اختلاف پایا جاتا تھا. بعض گھروں میں دولہا کو رات کے آخری پہر سوار کرتے. پہلے دولہا کو اس طرح تیار کیا جاتا، پہلے غسل کراتے، زرد وزری کا لباس جو مع سہرا کے پیراچہ کے

لہ کلیات آتش.

سہ شادی مبارک آ کے لگے گانے عندلیب ⁂ ہرا گئی خوشی سے ہر ایک اس چمن کی بیل

بول اٹھیں بنکے ڈومنیاں ساری قمریاں ⁂ صاحب ہمیں دلائی دولہا دولہن کی بیل

/ص ۸۲

دیوان مصحفی (قلمی رام پور) ۲/ سہ شیخ جی کا جب ہوا میرزا کی پوتی سے نکاح

ڈومنی گانے بدھاوا میرا ہریالہ بنا ۳۴۴/ب

گھر سے کرایہ پر آتا۔ پہناتے۔ اس کے بعد سر سے سہرا[1] لٹکاتے، گلے اور کاندھوں پر پھولوں کی بدھیاں ڈالی جاتیں۔ اس کے بعد خاندانوں کی رسم کے مطابق گھوڑے یا ہاتھی پر سوار کر کے اور اس کے ساتھ کسی کم عمر کے بچے کو بٹھاتے جو شہ بالا کہلاتا تھا۔ اس کے بعد بڑے تجمل کے ساتھ یعنی آرائش، روشنی، آتشبازی اور ساز و نوبت خانہ کی قسم کی دوسری چیزوں کے ساتھ دولہن کے گھر کے لیے روانہ ہو جاتے، برات کی ترتیب اس طرز پر ہوتی۔ پہلے دولہا کی سواری، اس کے بعد آرائش اور مابعد تخت رواں[2] یعنی ناچنے والی عورتوں کے چند تختے ہوتے تھے جن کو زربافت کے کپڑوں سے سجاتے تھے۔ نوبت کے علاوہ روشن چوکی بھی ہوتی تھی۔ دولہن کے دروازے پر پہونچ کر دھنگانا کی رسم پوری ہوتی اور اس کے بعد دولہا مع بھائیوں کے اندر داخل ہوتا، مسند پر بٹھایا جاتا، اور رقص و سرود

---

[1] کلیات انشاء، کس کا یہ بیاہ تھا ہوتی ہے سہرے کے ابتک جھڑتی ہیں دامن سحر سے لڑیاں ‎/۸۹

[2] اس زمانے میں رقص و سرود کا اہتمام لازمی تھا۔ مرزا قتیل ایک خط میں مرزا امانی کو لکھتے ہیں۔ "حالا باید کہ اندوختہ خود را بما ظاہر نکنید کہ دریں شادی صرف کردہ آید۔ اگر خواستہ باشید کہ کلمات چرب و شیریں روغن قاز مالیدہ ہیچ نہ بیدہ دست بردار نخواہم شد و ما چو دائم کہ شما دارید یا ندارید از ہر جا و بہر طور کہ بدست پول بیارید کہ مارا کار بارقص و سرود است پلاؤ شما را بشما بخشیدم"، رقعات مرزا قتیل ‎/۲۸ نیز ملاحظہ ہو۔ تاریخ فرح بخش ‎۱۱/ص ۲۲۸، چہار گلزار شجاعی ‎/ ۱۷۴ ب

کی محفل کا آغاز ہوتا تھا۔ اس کے بعد نکاح ہوتا۔ نکاح کے بعد دولہا اندر زنانخانے میں جاتا اور بہت سی ایسی رسمیں ادا ہوتیں جن کی بنیاد توہم پرستی پر تھی۔[1]

دولہن کو زعفرانی لباس[2] اور زیورات وغیرہ سے سجایا جاتا تھا۔ تمام رسموں کے ادا ہونے کے بعد رخصتی ہوتی۔ جہیز لڑکی کے ساتھ کر دیا جاتا۔ آخری رسم چوتھی کی ہوتی تھی۔ اس موقع دونوں خاندانوں کی عورتیں ایک جگہ جمع ہوتیں۔ اور فرطِ خوشی میں ایک دوسرے پر رنگین پانی پھینکتیں۔ یہ رسم ہولی کھیلنا کہلاتی تھی، اس کے بعد پھولوں کے زیورات مع چند ٹوکریوں کے جس میں ہری ترکاریاں مثلاً بینگن، شلجم، اور دوسری ایسی ہی چیزیں اور پھل پھلار یا فصلی میوے مثلاً خربوزے ہوتے تھے، اور ہندوانہ وغیرہ داماد کے گھر سے لے جا کر دولہن کو پہناتے تھے فریقِ ثانی کے زن و مرد متفق ہو کر یہی پھل ترکاریاں داماد کے، دولہن کے اور ان کے قبیلے کی عورتوں کے پھینک کر مارتے تھے۔ اس کھیل میں چوٹ چپیٹ بھی آ جاتی تھی۔ عورتیں اور بچے دھڑا دھڑ گرتے تھے۔ منہ سوج جاتے تھے۔ اور پٹھانوں میں بعض بعض کی تو بینائی تک جاتی رہتی تھی۔[3] انشاء نے اپنے اشعار میں چھڑیوں کا ذکر کیا ہے:۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہفت تماشا / ۱۴۹-۱۵۰، مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۲۷، مرزا محمد ناصر کی شادی کے موقع پر آ سے دولہن کے گھر میں زیورات پہنائے گئے تھے۔ تاریخ فرح بخش / ص ۲۲۸، رقعات مرزا قتیل / ۴ [2] رقعات مرزا قتیل "روز جذاش زعفرانی پوشش خواہند شد" / ۱۴ [3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو ہفت تماشا / ۱۲۹-۱۲۵، مسائل نیز مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۲۱ - ۱۲۹

نوعروسانِ چمن کا دیکھیے گا اختلاط ٭ چل رہی ہیں خوب پھولوں کی چھڑیاں باغ میں[1]

تو مجھے کچھ نہ ہو معلوم مگر اتنا کچھ ٭ چھڑی پھولوں کی کوئی جیسے کہ سمدھن مارے[2]

کون سی حور یہاں کھیلنے چوکھی آئی ٭ بوئے گل لے کے جو پھولوں کی چھڑی مجھ سے لڑی[3]

شادی کی رسمیں اور بالخصوص برات کے مناظر اتنے دل کش اور جاذبِ نظر ہوتے تھے کہ نواب آصف الدولہ شادیوں کا بڑا اہتمام کرتا تھا۔ اپنی اولاد ہو یا چاہے دوسرے کی اولاد کی شادی کیوں نہ ہو۔ بعض مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ جہاں شادی ہوتی تو ایک طرف وہ خود ہو جاتا۔ اور دوسری طرف اپنے کسی عملہ کو مقرر کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ قائم خاں فوج دار فیل خانہ کے ہاں شادی کی تقریب تھی۔ نواب بذاتِ خود اس تقریب کا مہتمم ہوا[5]۔ ایک انگریزی سیاح کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ کو آتشبازی کے مناظر سے بڑی دلچسپی تھی، وزیر علی خاں کی شادی کے موقع پر اس سڑک پر جو طرفِ ثانی کے ہاں تک جاتی تھی، زمین میں آتشبازی دفن کر دی گئی تھی۔ اور ہاتھیوں کے ہر قدم کے ساتھ چھوٹتی تھی۔ اس موقع پر بے حد چراغاں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان تقریبات میں وہ بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا[6]۔ اپنی بیٹی اور بیٹے کی شادی میں نواب نے لاکھوں روپیہ صرف کیے[7]۔ نواب کا یہ ذوق

---

۱ کلیات آتش /۱۰۶ ۲ ایضاً /۵۴ ۳ دیوان مجبور /۱۸ ۴ ایضاً /۷۰ ۵ سیر المتاخرین (ا-ت) ۲/۱۱۱، تنقیح الغافلین /۱۳۵ ۶ تنقیح الغافلین /۴۸-۹۴ ۷ چہار گلزار شجاعی /۲۵۸ ب، برائے اخراجات در شادی وزیر علی خاں ملاحظہ ہو، تنقیح الغافلین /۱۳۴

اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ درندوں کی شادی کا اہتمام کرتا تھا۔ نول باول
ہاتھی کی شادی بڑکنی ہتھنی کے ساتھ بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام
سے کی اور لکھا روپیہ خرچ میں آیا۔ بارہ سو ہاتھی براتی تھے۔ الماس علی خاں
خواجہ سرا دولھن والا اور نواب آصف الدولہ دولھا کی طرف تھا[1]

• کسی مرد یا عورت کی موت[2] کے موقع پر پہلے تجہیز و تکفین کی رسمیں پوری
کی جاتیں۔ مابعد سوم، دہم، چہلم، ششماہی اور برسی کے دن مختلف رسومات
ادا ہوتی تھیں[3]۔ نوابان اور امرا کے جنازے کے ہمراہ ہزاروں آدمی ہوتے
اور ان کو بڑی شان و شوکت، باجے گاجے، فوج پھاٹے اور شاہی تزک سے
لے جاتے تھے۔ ان کے مزارات پر قرآن خواں بٹھائے جاتے تھے[4]۔ اور
سالانہ عرس منایا جاتا، چراغاں ہوتا، غربا اور مسکینوں میں کھانا

---

[1] تاریخ اودھ ۳/۳۷۲-۲۰۲۷۴ [2] تفضیح الغافلین رحیاں چہ رسم نشستن چہل روز
... بہ تعزیت ص ۱۵۰ [3] تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۱۲، ۳۱۹، کلیات آتش ۱/۸۱،
فسانۂ عجائب/۱۵۲، والدہ شفیق علی خاں کے جنازہ کا ذکر کرتے ہوئے ہرچرن
داس نے لکھا ہے "تابوت اور محمل سبز پیچیدہ و نیکبزہ محمل سبز بہ بالائش و فیلان
پُر از زنان و مرادی گندم و زر نقد ہمراہش خیرات کناں" چہار گلزار شجاعی ۱۷۵/ ا ب؛
نیز ملاحظہ شور ص ۲/ الف و ب۔ ملفوظ رزاقی ۲۳۷/ دیوان مصحفی چہارم ورق
۵۸ الف [4] تاریخ فرح بخش ۱۱/۳۳۲؛ شجاع الدولہ کے مزار پر قرآن خواں
چہار گلزار شجاعی ۲۱۹/ الف و ب۔

تقسیم کیا جاتا۔[۱] اسی طرح شاہی حرم کی خاص بیگمات کے مزار پر بھی سالانہ عرس کی تقریبات انجام پاتیں، زوجہ شجاع الدولہ، بہو بیگم کے مزار پر سالانہ عرس ہوا کرتا تھا۔[۲]

درباری لباس سعادت خاں برہان الملک اور صفدر جنگ حالانکہ ایرانی النسل تھے مگر وہ ہندوستانی یعنی دربار مغلیہ کا لباس پہنتے تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کے زمانے میں تبدیلی واقع ہوئی تھی، چونکہ وہ ایک سال تک شاہ ابدالی کے دربار اور فوجی پڑاؤ سے وابستہ رہا تھا لہٰذا اس نے ایرانی لباس اختیار کرلیا تھا۔ ایرانی لباس اس زمانے میں موسم سرما میں دہلی اور لکھنؤ کے درباروں میں پہنا جانے لگا تھا۔ کیونکہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دہلی اور لکھنؤ کی درباری معاشرت ہرات اور قندھار کے طرز پر تھی۔[۳] مجملاً اس زمانے میں لکھنؤ کے دربار کا لباس، سر پہ پگڑی، بدن پہ نیمہ جامہ، نچلے حصے میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پائجامہ پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا۔ کمر میں جامے کے اوپر پٹکا اور گھر میں سر پہ ٹوپی۔[۴]

---

۱ تاریخ فرح بخش مرتبہ ۱، ۲۷، ۲۲۳، اس موقع پر مجلس مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ روشنی ہوتی اور غربا میں کھانا تقسیم ہوتا۔ ایضاً ۱/ص ۱۱۲-۱۱۳ ۲ ایضاً ۱/ص ۳۰۵ نیز

OBSERVATIONS ETC. 56, 73, 75

۳ سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) ج ۲/ص ۵۴۹ فٹ نوٹ ۲۹۰ نیز ص ۵۶۳۔

اشاریہ ۱۸۵ ۴ برائے تفصیل ملاحظہ ہو گذشتہ لکھنؤ ص ۲۶۶-۲۷۳

دربار میں بالعموم پگڑیوں کا رواج تھا مگر دہلی کی باوقعت امیرانہ دستاروں کا یہاں رواج نہ رہا اور امراء اور دیگر شاہی کارکنوں کے سروں پر ٹوپیاں رہ گئیں لیکن دربار کے لیے پگڑیاں آخری زمانے تک مخصوص تھیں۔ شاہی ملازمین اپنے آقا کے سامنے سر پر پگڑی باندھ کر ہی حاضر ہوتے تھے[1] نواب آصف الدولہ کے زمانے تک نوابان اودھ کے سروں پر دہلی کی سی سفید دستار ہوا کرتی تھی۔ دربار کے موقعوں پر اس پر جواہرات کی کلغیاں مرصع چیغے اور سرپیچ لگا دیے جاتے تھے۔ یہ پگڑیاں بالکل سادہ اور سفید رنگ کی ہوتی تھیں۔ لیکن سعادت علی خاں کے سر پر پگڑی کے بجائے شملہ[2] ہوا کرتا تھا۔[3]

دربار مغلیہ کے لباسوں میں لکھنؤ کے تصنع پسند ماحول میں کچھ تغیرات ہوئے مثلاً کہ پاؤں کے جوڑوں پر لمبی صراحیاں بنائی گئیں اور ان صراحیوں کے درمیان خوشنما چاند قائم کیے گئے۔ یہ چاند اور صراحیاں اس طرح بنائی جاتیں کہ باریک تنزیب کے پاؤں میں نین سکھ کی صراحیاں اور چاند کاٹ کر اندر کی طرف ٹانک دیئے جاتے جو اوپر نمایاں ہو کر ٹوپی میں ایک اچھی نفاست، صفائی اور سادگی پیدا کرتے۔ یہ ٹوپی بہت پسند کی گئی اور عوام نے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۸۰ شجاع الدولہ کے زمانے میں رنگین پگڑیوں کا رواج تھا۔ تاریخ فرح بخش ۱/۱۱۵ [2] شملہ کی ساخت کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے دیکھیے گزشتہ لکھنؤ ۱/۲۸ مرزا قتیل سفید پگڑی سر پر باندھا کرتے تھے۔ [3] ایضاً ۲۸۱، ایک خط میں مرزا ماتی سے سفید پگڑی لانے کی فرمائش کی ہے۔ رقعات مرزا قتیل /۹۰

یکایک پگڑی باندھنا ترک کر دیا۔ اور ہر مہذب اور شائستہ آدمی کے سر پر بھی ٹوپی نظر آنے لگی۔[1]

نواب آصف الدولہ کے سادہ مگر شان دار لباس کو دیکھ کر سیاح ٹیوننگ کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس وقت نواب کے سر پر کلاہ اور اس پر دستار بندھی ہوئی تھی اس کے کاندھے پر خوبصورت شال پڑی ہوئی تھی جو اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی۔ پیروں میں سنہری زری کی جوتی تھی۔[2]

امرا اپنے ذوق کے مطابق لباس پہنتے تھے۔ مثلاً جواہر علی خاں شاہ نواز خانی کوٹ پہنا کرتا تھا۔ زر دوزی کے کام کے شال یا کم خواب کا ہوتا تھا۔ وہ موسم گرما اور سرما کے لباس کا بالخصوص بڑا اہتمام کرتا تھا۔[3] امرا کمر میں دوپٹہ بھی باندھتے تھے۔[4]

عوام و متوسط طبقے کے لوگوں کا لباس

عوام اور متوسط درجے کے لوگ پائجامہ پہنتے تھے مگر مہری تنگ اور گھیر پرانے شرعی پائجامے کا سا ہوتا تھا۔ سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے یہی پائجامہ اختیار کیا تھا۔ مگر ہندو تہذیب کے زیر اثر ادنیٰ درجے کے مسلمان دھوتیاں بھی باندھتے تھے۔ لکھنؤ میں ڈھیلے عرض کے پائنچوں کے پائجامہ کا رواج تھا۔ مگر سعادت علی خاں کے

---

[1] گذشتہ لکھنؤ ص ۲۷

[2] TWINING:- TRAVELS IN INDIA-P. -167

[3] تاریخ فرح بخش ۱۱/۵۲-۵۸ [4] رقعات مرزا قتیل ص ۴۵

عہد کے بعد مروج ہوا۔ اس سے پہلے دہلی کی وضع کا پائجامہ پہنا جاتا تھا[1] جسم پر انگرکھا اور اس کے اوپر دوشالے کا بھی رواج تھا[2] اور یہی دربار اودھ سے خلعت میں بھی عطا ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں شال اور رومال اوڑھنے کا بھی کسی حد تک رواج تھا۔ یہی دونوں چیزیں دہلی سے لکھنؤ آئیں مگر لکھنؤ میں زیادہ رواج رومال اوڑھنے کا تھا۔ جاڑوں میں بالعموم شال، رومال اور کافی سردی میں دو شالہ اوڑھا جاتا تھا۔ شرفاء کا لباس یہ تھا۔ سر پر قالب چڑھی چکن کی چوگوشیہ ٹوپی، بدن پر انگرکھا، اور پیروں میں عرض کے پائنچوں کا پائجامہ اور کندھے پر ہلکا چکن یا ہمالی کا رومال اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا۔ ان جوتوں میں نوک بالکل نہ ہوتی تھی لیکن ان پر سلمے ستارے کے کارچوبی کا کام ہوتا تھا[1]۔ انشا نے دہلی اور لکھنؤ کے مردانہ لباس کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اگر میں وہاں (دہلی) کی مردانہ پوشاک کا مقابلہ لکھنؤ کی پوشاک سے کروں تو بعینہٖ ایسا ہے کہ کاندھلا اور شاملی کے بنیوں کی پوشاک کا ایران کے مرزاؤں کی پوشاک سے مقابلہ کرنا۔ وہاں کی پوشاک اگرچہ سوائے لکھنؤ کے اور شہروں کی پوشاک پر غالب آتی ہے"[2]

امراء کے لڑکوں میں انگریزی لباس کا رواج ہو چلا تھا۔ اشرف علی خاں کا لڑکا مرزا عباس "کہ لباس انگریزی می پوشید"[3]

---

[1] گذشتہ لکھنؤ / ص ۲۹۰۔ ۲۹۴؛ مسز میر حسن علی / ۹۳

[2] دریائے لطافت (ا۔ت)، ص ۶۷۔ ۶۸؛ نیز ص ۸۶

[3] رقعات مرزا قتیل / ۸۱؛ شہزادہ مرزا جہانگیر نے انگریزی لباس اختیار کر لیا تھا / ۸۷

زنانہ پوشاک لکھنؤ کی زنانہ پوشاک، دہلی کی زنانہ پوشاک کے مقابلے میں وضع قطع اور کپڑے کی نوعیت میں کہیں زیادہ متنوع تھی۔ انشا نے لکھا ہے :۔

"لیکن یہاں کی زنانہ پوشاک کے سامنے وہاں (دہلی) کی زنانہ پوشاک ایسی ہے جیسے میاں غلام رسول کے گانے کے سامنے لڑکے لڑکی کی شادی کے موقع پر بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کا گانا، یا سرخ اطلس کے سامنے لال کھاروا" [۱]

لکھنؤ کی عورتوں کے لباس میں تراش خراش اور کپڑوں کی بناوٹ میں کافی ترقی واقع پذیر ہوئی تھی۔ مراۃ الاوضاع کے مصنف کا بیان ہے :۔

"بیت السلطنت لکھنؤ از عہد نواب آصف الدولہ صناعان صنائع عجیبہ و کاملان فنون غریبہ ماندہ دریں زماں ہم کملائے ہر فن دریں شہر موجودہ اند۔ لہذا بسیاری اشیا را ابداع و اختراع انہا بوضعی دریں شہر تیار می شوند .... بادلہ و مقیش، ایں جا از بس سبک و باریک و خوش رنگ و کار زردوزی خیلے پاکیزہ و صاف می شود۔ چناں چہ تاج ہر قسم از چہار گوشیہ و ہشت گوشیہ و شش گوشیہ و نیز تاج سموری د، دستہ و تکمہ قبا، و مندیل، و شملہ

---

[۱] دریائے لطافت (ا۔ ت) ص ۶۸

زردوزی و سینہ بند، و نیم تنہ، و پیشواز، و شلوار و دوپٹہ
زنان وجفت پای گھتیلہ ۔ ۔ ۔ ۔ ایجاد و اختراع میسازند[1]

میر حسن دہلوی نے کپڑوں میں کناری، مسلسل، کمخواب، آب رواں، سنجاف، تن زیب اور لاہی وغیرہ کا ذکر کیا ہے[2] عورتوں کا پورا لباس دوپٹہ، اوڑھنی، سینہ بند، نیم تنہ، شلوار کلی دار، اکثر اوقات سینہ بند کے اوپر نیم تنہ کے بجائے انگرکھا شاہنوار خانی اور موسم سرما میں پائجامہ گھوٹنہ وجفت گھتیلہ، وغیرہ پر مشتمل تھا۔[3]

---

[1] مراۃ الاوضاع ص ۱۱۰ الف۔ ۱۱۱ ب [2] کپڑوں کی مختلف اقسام کے لیے ملاحظہ ہو۔ ثمرات البدائع / ۲۶، ۲۷ [3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مراۃ الاوضاع ص ۹۵ ب۔ ۹۶ الف مجموعہ مثنویات میر حسن ص ۲۴۔ ۲۵، ۱۵۴، ۱۵۹، دریائے لطافت (ا۔ ت) ص ۹۷، ۹۹ ثمرات البدائع ص ۲۶، ۲۷،

OBSERVATONS etc. PP. 106-108-111-113-102-103-105

دیوان مصحفی پنجم (پٹنہ)، ص ۲ الف، ۱۵ الف، ۳۶ الف، ۱۲۱ الف دیوان ششم (پٹنہ) ص ۶ ب۔ ۷ الف۔ ۹۱ الف دیوان ہفتم (ق پ)، ۳ ب، ۶۵ ب، ۷۲ ب، ۱۳۵ ب دیوان چہارم (ق رامپور) ص ۷۶، ۷۸، ۷۹، ۸۰، دیوان دوم ص ۱۰ الف، دیوان دوم ص ۳۵ الف، ۴۶ الف،

کلیات انشاء / ۴، ۱۹، ۳۸، ۱۱۸، ۱۳۷، ۱۴۸، ۹۶، ۱۷، ۱۴۳، ۱۲۸، ۲۶، ۳۸، ۴۹، ۱۱۸، ۲۰۱۔

آخری زمانے میں گھاگھرے کا عام رواج ہوگیا تھا۔ [1] انشا کے کلام میں پشواز اور لہنگا کا بھی ذکر ملتا ہے:۔

اوسکی پشواز کی سی لائی پاس   اوسکی میں گود بھرے پر غش ہوں [2]

لیجئے لہنگا پہن بادلے کے تھان کا [3]

لکھنؤ کی عورتوں میں بنارس کا دوپٹہ بہت زیادہ مروج تھا۔ انشا، کے ایک شعر سے، اس کی نشان دہی ہوتی ہے۔

اوڑھیں سے کئی ہیں جو بنارس کے ڈوپٹے [4] ؛ چھکیلے توڑ کر چوڑ دکر دہانہ کے ٹکرے

پیروں میں خوبصورت اور کام کی ہوئی جوتیاں ہوتی تھیں۔ [5]

شاہی محلات کی خادماؤں کا لباس یہ تھا۔ دوپٹہ، سینہ بند، ونیم تنہ بالائی آں وشلوار کلی دار، بعد میں ان لباسوں میں تبدیلی واقع ہوئی اور اکثر اوقات بالائی سینہ بند، بجاری نیم تنہ، انگرکھا شاہجہانی وموسم سرما میں پائجامہ گھوٹنہ اور جفت گفتیلہ کے بجائے بوٹ زردوزی یا مخملی پیروں میں پہنتی تھیں [6]

---

[1] THE COSTUMES TEXTILES OF INDIA. PP. 37-38

[2] کلیات انشا / ٦٩، ١٩٥، ١٩٦ [3] ایضاً / ١٨٦ [4] ایضاً / ١٠٨، مجموعہ مثنویات میر حسن ص ١١٨ [5] مجموعہ مثنویات میر حسن / پڑی پاؤں میں کفش زریں نگار ص ١٦٨، ٨ [5] سیر میر حسن علی / ٦٣

[6] مراۃ الاوضاع / ص ١٩٥ الف وب ہمائے تفصیلات لباس۔ فسانہ عجائب / ١٠١، ١٠٣، زنانہ لباس کے مفصل تفصیل کے لیے دیکھئے OBSERVATIONS I P. 60-61

زنانہ زیورات عورتوں کے زیورات سے گہرے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحلیم شرؔر نے لکھا ہے کہ عورتیں اکثر اپنی مخصوص دولت اور جائداد اپنے زیور کو سمجھتی ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اکثر صوبجات ہند میں بھدے اور بھاری زیور کا زیادہ رواج ہے۔ تاکہ وہ قیمت میں زیادہ ہوں۔ زیور کے بھاری ہونے کا شوق اودھ کے دیہات میں عموماً ہندوستان کے تمام شہروں میں روز بڑھتا جاتا ہے۔ مگر لکھنؤ میں دہلی کے شریف خاندانوں کی معزز خاتونیں آئیں تو ابتداً وہی زیور جس کا سارے ہندوستان اور خود دہلی میں رواج تھا پہنے ہوئے تھیں مگر یہاں آنے کے چند روز بعد جب یہاں کی ترمیم شدہ مخصوص معاشرت قائم ہوئی تو زیور میں فقط زینت و آرائش کا خیال باقی رہ گیا اور ہر قسم کا زیور روز بروز سبک، ہلکا، نازک اور خوشنما ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر عہد میں امرا اور دولت مند گھرانوں کی بیویوں کی یہ وضع ہو گئی کہ سادے بغیر سالے اور گوٹے پٹھے کے کپڑے پہنتیں اور زیور کی قسم کی وہی ایک چیزوں پر جو بہت ہی نازک، سبک اور قیمتی ہوتیں، کفایت کرتیں۔ اور اگر گلے اور ناک کان میں متعدد چیزیں پہنتیں بھی تو وہ بہت ہلکی ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا سبک اور ہلکا زیور لکھنؤ میں بننے لگا کہیں نہ بن سکتا تھا۔[1]

---

[1] گزشتہ لکھنؤ / ۳۰۲-۳۰۳

اَوَدھ کی عورتیں ذیل زیورات زیب تن کرتی تھیں۔ یہ فہرست کلیات انشا، دواوین مصحفی اور مجموعہ مثنویات میرحسن سے مرتب کی گئی ہے۔ اور یہاں صرف ان کے نام درج کیے جاتے ہیں:-

عقد گوہر[1]، بلاق[2]، پازیب[3]، چھلا[4]، تعویذ[5]، آرسی[6]، حائل[7]، ہیکل[8]، نتھ[9]، بالی[10]، بندہ[11]، بالا[12]، بجبند[13]، دو لڑی وغیرہ، جگنو، اودیسی، کڑا، کرن پھول، جھمکا، بازوبند، چھدانی، چنپا کلی، جگنی، خلخال، زنجیر، سبزہ، توڑا، پتھرا، لچھا، جہانگیریاں، نورتن، پہونچی، کنگن، انگوٹھی وغیرہ جس زمانے میں عورتیں کان میں زیور پہنتی تھیں تو ان دنوں کانوں میں لونگ ڈال لیتی تھیں۔ تاکہ سوراخ

---

[1] دیوان مصحفی ج / ۵ (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا، (در گوش) ص ۱۳۷، ۱۴۷،
[2] ایضاً / ص ۳ الف، دیوان ہفتم / ۱۸۰ الف [3] ایضاً / ۶ ب، ۱۰۷ ب،
کلیات انشا / ۱۵۵، [4] ایضاً / ۲ ب، ۴۰، ۱۱۷ الف، کلیات انشا، ۹۰، ۱۴۴،
۲۴۸، ۱۱۷، [5] ایضاً / ۲۸ ب، ۹۴ الف [6] ایضاً / ۷۴ ب،
دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ) ۱۹ الف، ۳۴ الف، ۱۲۳ الف، کلیات انشا / ۴۲،
۱۴۹، ۱۳۹ [7] ایضاً / ۲۸ ب [8] ایضاً / ۹۴ الف [9] ایضاً / ۱، الف
۱۱۷ الف، ۱۴۰ الف، ۱۴۷ الف [10] ایضاً / ۱۰۱ الف، ۱۱۷ الف، ب،
۱۴۰ الف، ۷۴ ب، کلیات انشا / ۱۹۲ [11] دیوان مصحفی ج / ۵ / (قلمی پٹنہ)
ص ۱۰۱ الف، و ب، کلیات انشا / ۵۰، ۱۶۲ [12] ایضاً / ۱۱۷ الف و ب۔
کلیات انشا / ۵۰ [13] ایضاً / ص ۱۳۰ الف، ۱۴۷ الف، دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ)
۱۴۹ الف کلیات انشا / ۸، ۱۶۷

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۷ پر دیکھیے)

بھرنہ جائیں[24]۔ مرزا قتیل نے پارہ نامی ایک زیور کا ذکر کیا ہے جو ہاتھ کی زیبائش کے لیے عورتیں استعمال کرتی تھیں[25]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ٥١٦

[14] دیوان مصحفی چہارم (قلمی رامپور) ص ۸۰، کلیات انشاء /۰۵ ۰۵ ۱۱۵، ۸۲،
۹۰، ۱۲۲، ۱۴۹، ۲۰۶، ۲۶۱

[15] کلیات انشاء /۱۴۰

[16] ایضاً /۱۷، ۵۶، ۵۰۱

[17] کلیات انشاء / یہ جھمکے، بندے، بالی، توڑے، کڑے، چھڑے ہوں /۹۵

[18] کلیات انشاء /۱۰ [19] ایضاً /۱۸ [20] ایضاً /۲۵، ۱۹۴، ۲۸۲،

[21] ایضاً /۶۴ [22] دیوان مصحفی ج ۴ / ب (قلمی رامپور) ص ۸۰،

[23] کلیات انشاء /۵۷، ۱۶۵، ۱۹۶، نیز ملاحظہ ہو۔ میر منیر حسن علی /۶۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) کلیات انشاء میں نے دیکھی ہے اس کے کان میں لونگ /۱۹۹

مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، دریائے لطافت (ا۔ ت) ۹۹،

مجموعہ مثنویات میر حسن /۲۴۔ ۲۵، ۱۵۴۔ ۱۵۹ گذشتہ لکھنؤ /۳۰۳۔

۳۰۴، فسانۂ عجائب /۱۰۰، ۱۰۱، مثنوی سراپائے عشق (آزاد بلگرامی/ قلمی)

۱۰ ب، ۱۶ ب، ۱۷ الف، ۱۵ ب۔ تذکرہ مجمع الانتخاب / ۳۱۹ الف

۳۱۹ ب، ۳۱۳ ب۔

[25] رقعات مرزا قتیل /۲۳

لوازماتِ حسن کاجل[1]، مسّی[2]، حنا[3]، مہندی، سرمہ[4]، پان[5]، کنگھی[6]، شانہ[7] اور آئینہ[8] کا بھی استعمال کرتی تھیں۔ بالوں کی ترتیب چوٹی یا کھجوری چوٹی کی صورت میں کی جاتی تھی۔ انشا کے چند شعر اس موضوع پر ملاحظہ ہوں:

کھجوری چوٹی پہ کس کی تھی جھکے دھوکے میں[9]

کیا چڑھے دھیان کسی شخص کے کنگھی چوٹی ؛ میرے پاؤں تلے لال پری کی چوٹی[10]

چہرے میں جاذبیت پیدا کرنے کے لیے غازہ کا استعمال ہوتا تھا[11]

کب مقابل تیرے مکھڑے کے ہو گویا بادِ سحر ؛ عارضِ گل پہ ملے لاکھ طرح غازۂ صبح[11]

---

[1] دیوان مصحفی ج ۵/ (قلمی پٹنہ) ص ۷/ الف کلیات انشا ۸/، ۱۵، ۱۰۴، ۲۱۲

[2] ایضاً ۷/ ب، ۲، ب، دیوان ہشتم (قلمی پٹنہ) ۵ ب، دیوان ششم / ص ۱۰ الف، ۱۷ الف کلیات انشا /۳۶ [3] ایضاً /۱۰ الف، ۲۴ ب، دیوان ششم / ص ۱۴ ب، ۱۷ الف کلیات انشا /۸۸، ۱۵، ۲۱۷ [4] ایضاً / ص ۲۳ ب، دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ) ۱۰۵ ب، کلیات انشا /۳۶، ۱۵۸، ۹۴ الف [illegible] دیوان ششم (قلمی پٹنہ) ص ۷، الف، دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ) ۵ الف

[6] دیوان مصحفی چہارم (قلمی رام پور) ص ۳۱ ب۔

[7] دیوان دوم (رام پور) ص ۱۱ ب، کلیات انشا /۸۷ فسانۂ عجائب /۱۳۸

[8] کلیات انشا /۱۱۳

[9] ایضاً ۲۹، ۱۰۴

[10] ایضاً ص ۲۰۸

[11] ایضاً / ص ۲۳۴۔ لوازماتِ حسن کے لیے ملاحظہ ہو، میسز میر حسن علی /۵۷ ۔ ۶۰

ماکولات دہلی اور لکھنؤ کی ماکولات اور مشروبات میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا فرق تھا تو اتنا کہ لکھنؤ میں ثروت کی وجہ سے اعلیٰ طبقے کے لوگ مرغن کھانے کھاتے تھے۔ "کھانا پینا" کے عنوان کے تحت عبدالحلیم شرر نے اودھ کے کھانے پینے کی اشیاء کا مفصل ذکر کیا ہے۔ کھانوں کے متنوع ہونے کی وجہ یہ بھی کہ دہلی کے اجڑنے کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے باورچی اس علاقے میں چلے آئے تھے۔ اور انہوں نے یہاں آکر اپنے فن کا خوب کمال دکھایا۔ لہذا یہاں کے لوگوں کے ذائقے کے مطابق یہاں کے کھانوں کو اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ زیادہ ذائقہ دار اور مرغن ہوتے تھے۔

اس بات کی شہادت انشاء کے بیان سے بھی ملتی ہے۔ کہ یہاں کے امراء آدھ سیر پلاؤ کی تیاری میں بتیس روپے خرچ کرتے تھے۔ اور اس کے بعد عیاشی کرتے تھے۔ ایک تورہ۔ سے جس میں مندرجہ ذیل اشیاء خور ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کے کھانوں کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

پلاؤ، مزعفر، متنجن، شیرمال، سفیدہ (میٹھے چاول)، بورانی، شیر برنج، قورمہ، شامی کباب، مربہ، اچار، یا چٹنی ۱؎ مختلف قسم کی

۱؎ گذشتہ لکھنؤ / ۲۶۶-۲۲۷ / نیز دیکھئے مجموعہ مثنویات میرحسن / ۱۴۸-۱۵۱،
ثمرات البدائع / ۳۸ فسانۂ عجائب / ۱۰۲

نواب آصف الدولہ نے ٹیوننگ کی دعوت کی تھی۔ اس موقع پر مختلف ذائقے کے گوشت، مچھلیاں وغیرہ دسترخوان پر چنی گئی تھیں۔ کھانوں کے علاوہ طرح طرح کی مٹھائیاں بھی تھیں۔

TWINING TRAVELS IN INDIA-PP./67-68

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۰ پر دیکھئے)

مٹھائیاں[1]، ماش اور ارہر کی دالیں بھی امرا اور غربا دونوں کھاتے تھے[2] میر نے لکھنؤ کے کھانوں میں قسم قسم کی روٹیوں جیسے نان بادام، شیرمال، باقرخانی، نان جو، نانِ ورقی، نان زنجبیلی، قسم قسم کے قلیے دوپیازے، کئی قسم کے کباب، کباب گل، کباب ہندی، کباب قندھاری، کباب سنگ، طرح طرح کے پلاؤ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔[3]

علاوہ ازیں مختلف قسم کی مٹھائیوں کا رواج تھا۔ میرزا قتیل نے برفی کے تیاری کے بارے میں لکھا ہے :-

"برفی شیر کوچک کو چک ورق نقرہ برآں پیچیدہ طیارست یا کہنہ شدہ از مزہ افتادہ ۔ اگر نو ساختہ باشد ذائقہ وار شود"[4]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۹ شاہ برکت اللہ مارہروی کے عرس کے دن تیار ہونے والے کھانوں میں زیادہ تر ایسے کھانے تھے جو خالص طور پر ہندوستانی تھے۔ کاشف الاستار / ۸ ۳۵۸، ۳۶۱، نیز دیکھئے۔ رقعات مرزا قتیل / ۲۸، ۶۴، ۶۵، ۸۷، ۹۳ "ولیشب بجائے برنج یک پھلکہ باشوربائے چوجہ خوردہ خوابیدم"۔

نیز دیکھئے مثنوی خوان نعمت تفصیل مطبخ نواب آصف الدولہ، ملفوظ رزاقی / ۶۲، ۹۶، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۹۳، ۱۹۶

MRS MIR HASAN ALI OBSER VATIONS etc 174 [1]

[1] رقعات مرزا قتیل / ۲۳۔

[2] رقعات مرزا قتیل / ۹۳

[3] میر کی آپ بیتی / ۱۸۳، ۱۸۴

[4] رقعات مرزا قتیل / ۹۳

برفی کے علاوہ مرزا قتیل نے پیٹھا، لڈو مونگ، لڈو موتیا چور کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا قتیل کو برفی کھانے کا بڑا شوق تھا اور خود بھی مٹھائی بنانے کی شدید رکھتے تھے۔ اور بالعموم "دکان کولی" کے ہاں سے مٹھائیاں منگوایا کرتے تھے۔ بازار میں مٹھائیاں اس زمانے کے حساب سے سستی تھیں؛ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"خدا کند کہ برفی تازہ بدست آید۔ ہرگاہ احوال برفی تحقیق شود فردا المبیدہ منتظر من باید بود۔ امروز وقت سہ پہر بعد برگشتن لال بیگ از بازار خبر برفی کہنہ و نو باید نوشت۔ شیرینی۔ پیٹھہ وچیزہ دیگر اگر کہنہ باشید بیارد یا شش تنگہ را ہمیں برفی بیارد من اگر بسیاری خورم یکپاؤ و بلکہ کمتر خواہم خورد و چار آنہ رانیم سیر خواہد داد بلکہ تکرار بیارد۔ اگر دیروز ہم تیار شدہ باشد تا فردا کہنہ نخواہد شد بلکہ بجبوری ساختہ پریروز ہم تا فردا لذت نمی افتد۔ ۔ ۔ امروز برفی دکان کولی و قند در برنج پیڑہ خشک داخل کردہ ام"۔ [1]

مٹھائیوں کے علاوہ مختلف قسم کے حلوے مستعمل تھے۔ مثلاً حلوا سوہن [2]

---

[1] رقعات مرزا قتیل / ۳۹

[2] ایضاً / ۳۳ " باقر بیگ، چند قسم کی روٹیاں پکانے، حلوے اور مربّے تیار کرنے کی مہارت کلی رکھتا تھا۔ ایضاً / ۳۳

حلوہ حبشی، حلیائے خوبانی۔[1] پھلوں میں بالعموم شفتالو، انگور، سیب، انار، خربوزہ، نارنگی اور آم وغیرہ کھائے جاتے تھے۔[2] مرزا قتیل ولایتی انار روزانہ کھایا کرتے تھے۔[3]

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں انگریزی کھانوں کی طرف رغبت بڑھنے لگی تھی، اور ایسے باورچیوں کی تلاش ہوتی تھی جو ہندوستانی اور انگریزی دونوں قسم کے کھانے پکانے میں مہارت رکھتے ہوں۔[4] بازاروں میں ہر قسم کے کھانے پکے ہوئے مل جاتے تھے۔[5] جب کسی متوسط درجے کے آدمی کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تھی تو گھر میں پکوانے کے بجائے وہ نان بائی کو کھانے تیار کرنے کا ٹھیکہ دیدیتے تھے۔ وہ اپنے گھر سے پکوا کر کھانا لے آتا تھا۔[6]

اس زمانے میں باورچیوں کی تنخواہیں زیادہ نہ تھیں مگر ان کا اپنا ایک طریقہ تھا کہ وہ مشاہرے کے علاوہ بھی کچھ لیتے تھے۔ مرزا قتیل ہندوستانی باورچیوں کی ملازمت کی شرائط کا یوں ذکر کرتے ہیں:

۱؎ مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵

۲؎ رقعات مرزا قتیل / ۷۸

۳؎ ایضاً / ۲۳، ۲۴، ۵۸، ۷۸، ۸۳، ۹۳؛ ثمرات البدائع۔ ۲۸، ۳۰،
OBSERVATIONS etc 177-178.

۴؎ ایضاً / ۹۳ ۵؎ ایضاً / ۳۲

۶؎ OBSERVATIONS etc 173-174.

"حال باورچی ہندوستانی در لکھنؤ ایں صورت باشد
کہ ہفت روپیہ مشاہرہ ذات و یک پیش خدمت بدرماہہ
سہ روپیہ و یک آثار آرد ہر روز گرفتہ باشد"[1]

مشروبات بالعموم شربت کا رواج تھا۔ مختلف قسم کے شربت تیار کیے جاتے تھے۔[2] مرزا قتیل نے شربت انار کا ذکر کیا ہے۔[3] دہلی کی طرح لکھنؤ اور فیض آباد کے بازاروں میں قہوے خانے تھے۔ جہاں لوگ قہوہ نوش کرتے اور خوش گپیاں بھی کرتے تھے۔[4] انیسویں صدی ربع اوّل میں چائے نوشی کا بھی رواج ہو گیا تھا۔[5] مسز میر حسن علی نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں لوگ افطار کے وقت شربتوں کے علاوہ چائے بھی پیتے تھے۔[6] برف کا استعمال بہت زیادہ تھا۔[7]

---

[1] رقعات مرزا قتیل / ۳۸

[2] مسز میر حسن علی نے مختلف قسم کے شربتوں کے بنانے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو،
OBSERVATIONS - PP. 311, 310

[3] رقعات مرزا قتیل / ۲۲، ۲۳، ۴۲،

[4] مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۰، رقعات مرزا قتیل / ۹۳

[5] رقعات مرزا قتیل / ۹۲ "امروز دو پہر بخدمت شما حاضر خواہم شد چائے خواہم خورد"

[6] 176, 101 نیز دیکھئے۔ فسانۂ عجائب / ۱۰

[7] ملاحظہ ہو۔ تنقیح الغافلین / ۹۲
OBSERVATIONS etc. 244

سواریاں لکھنؤ کی مردانہ اور زنانہ سواریاں بالکل اسی طرح تھیں جن کا ذکر دہلی کے ضمن میں کیا جا چکا ہے مثلاً۔ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، چوپالہ، ہوادار، فینس، میانہ، سکھپال، ڈولی، پالکی، نالکی، رتھ اور بہلیں وغیرہ[1] نواب آصف الدولہ گھوڑے اور پالکی کی سواری کیا کرتا تھا[2]۔ جواہر علی خاں نے ایک قسم کی سواری ایجاد کی تھی جو سبک رواں کے نام سے موسوم تھی[3]۔ مرزا قتیل کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہل میں چار شخص بیٹھتے تھے۔

"یک بہل باتفاق دوکس بدوازدہ روپیہ تا اکبرآباد الفضال یافتہ بہل بان دریں فکر ست کہ شخص چارمیں ہم بہم رساند اگر امروز و فردا بہم رسید خوب ست، والا بہمیں سہ کس اکتفا ورزیدہ براہ می افتد"[4]

---

[1] برائے تفصیل دیکھیے۔ تاریخ فرح بخش ۲/ص ۸۴۴، ۹۴؛ رقعات مرزا قتیل / ۵۰، ۷۸، ۷۹، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۴۴ ملفوظ رزاقی / ۵۲، ۹۹، ۱۰۱، ۱۹۰، ۲۱۷ کلیات انشا / ۲۴۲، ۱۹۳، ۲۰۱، ۲۰۴، مجموعہ مثنویات میر حسن / ۶، ۳۴، ۱۲۲؛ دیوان مصحفی پنجم د ق۔ پ ۱۲۱ الف، چہار گلزار شجاعی / ۱۹۰ الف، ۲۶ ب، ۱۹۰ الف فسانۂ عجائب / ۷۰، ۷۱، ۹۹، ۱۰۲، OBSERVATIONS etc.) ،147-148, 170-172

[2] TWINING-TRAVELS IN INDIA P.168.

[3] تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۵۹،

[4] رقعات مرزا قتیل / ۲۷

کھڑکھڑیہ بھی کہار اٹھاتے تھے، جس میں بارہ کہاروں کی ضرورت ہوتی تھی[1]۔ ٹانگن بھی ایک قسم کی سواری تھی[2]۔ چھکڑا باربرداری کے لیے استعمال ہوتی تھی[3]۔

مسلم جشن تہوار اور تقریبات

عیدالفطر اور عیدالضحیٰ کے تہواروں کے تفصیلی ذکر پہلے حصہ میں کیا جاچکا ہے۔ دوبارہ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ مجملاً اودھ کے مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق ان تہواروں کو مناتے تھے۔ لکھنؤ میں ان ایام میں رقص و سرود کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی[4]۔ عیدین کے دن لوگ ایک دوسرے کے ہاں یا تو نماز کے فوراً بعد ملنے جاتے یا شام کو، کیونکہ ان وقتوں مالک خانہ کا گھر میں ہونا یقینی ہوتا تھا[5]۔

محرم — جیسا لکھا جاچکا ہے کہ نوابان اودھ شیعہ عقائد کے پیرو تھے، اور اپنے عقائد کی اشاعت و ترویج میں کوشاں تھے[6]۔

---

[1] ایضاً/۴۴، ۴۶، ۵۰ [2] ایضاً/۴۶

[3] ایضاً/۱۸

[4] برائے تفصیل دیکھئے۔ OBSERVATIONS etc 151-140، 111-98

[5] رقعات مرزا قتیل/۵۹

[6] عماد/۱۲۷، ہفت تماشا/۳ OBSERVATIONS, I-R/6- etc

لہٰذا ان کی تقلید میں محرم کے تہوار کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور یہ تہوار بڑے جوش وخروش اور دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ لکڑی اور کاغذ کے تابوت اور تعزیئے بنائے جاتے؛ لکھنؤ کے تعزیوں کی ساخت کا مسز میر حسن علی نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنی حسبِ حیثیت مختلف طرز کے تعزیئے بناتے تھے یعنی چاندی سے لے کر لکڑی اور کاغذ تک ہوتے تھے۔ کچھ لوگ ہاتھی دانت، صندل، اور صنوبر کی لکڑی کے بھی تعزیئے بنواتے تھے۔ ان تعزیوں میں بیش قیمت تعزیئے دفن نہیں کیے جاتے تھے اور ان کو آئندہ سال کے لیے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ معمولی تعزیئے دہم محرم کو کربلا میں دفن کر دیئے جاتے تھے۔ معمولی تعزیئے دو دو روپے کے بازار میں مل جاتے تھے۔[۱] ان تعزیوں کو برائے زیارت امام باڑوں میں رکھ دیا جاتا[۲] شمالی ہندوستان کے اکثر شہروں میں اور فیض اور لکھنؤ میں بہت سے امام باڑے تھے۔[۳] نواب آصف الدولہ

---

۱ تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ OBSERVATIONS etc. — I, 31-62

تذکرہ گلشن ہند/ ۱۵۹، شباب لکھنؤ/ ۱۴۵، ملفوظ رزاقی/ ۱۰۴

۲ OBSERVATIONS etc I. P 32 ملفوظ رزاقی/ ۱۰۴

۳ OBSERVATIONS etc. I P 32 عقد ثریا/ ۴۹، واقعات اظفری/ ۱۰۷، ۱۰۸، شباب لکھنؤ/ ۱۴۶ صدر النساء بیگم زوجہ نواب صفدر جنگ نے فیض آباد میں ایک امام باڑہ موتی باغ کے عقب میں بنوایا تھا۔ تاریخ فرح بخش ۱/ ص ۲۵۰، داراب علی خاں نے جواہر علی خاں کے قدیم لکڑی کے امام باڑہ کو پختہ کروایا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ پر دیکھئے)

نے بھی ایک امام باڑہ بنوایا تھا جو اب تک موجود ہے [1]

عاشورہ کے دنوں میں امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ روشنی اور کارچوبی کے کام کی چیزوں کی اس قدر چمک دمک ہوتی تھی کہ ناظرین کی نظر کو چکا چوند ھ لگ جاتی تھی؛ علموں کی طلائی اور نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے بھاری بھاری پٹکوں کی سجاوٹ، زردوزی کے کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور ان کی وجہ سے درودیوار کی آب و تاب؛ بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہو جاتا تھا [2]

ساتویں محرم کو حضرت عباسؑ کی درگاہ میں علمؑ چڑھائے جاتے تھے۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے "بتاریخ ہفتم محرم علم ہائے تمام شہر بر آں آستانہ عالیہ می آمدند بسوائے ایں تاریخ روز ہائے ــــ دیگر نیز در محرم ہمیں حال بود، لیکن بروز مذکور ہیچ جا علمی نبود کہ آنجا نیاید" شاہی امام باڑے سے جو علم اٹھتا تھا۔ اس کا جلوس بڑی شان و شوکت کا ہوتا تھا۔ اس جلوس میں سب سے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۶ ایضاً/۲۶۶، لکھنؤ میں مرزا حاجی نے ایک امام باڑہ بنوایا تھا/ رقعات مرزا قتیل/۲۷

---

[1] تفضیح الغافلین/۱۱۲، ۱۱۳؛ تاریخ اودھ ۳/۲۹۹-۲۹۷؛ واقعات اظفری/۱۰۷، ۱۰۸؛ شباب لکھنؤ/۱۴۶،

[2] شباب لکھنؤ/۱۴۶

[3] ایضاً/۳۶-۳۸

OBSERVATIONS etc 21-32

OBSERVATIONS etc 21-22

آگے چھ سات ہاتھی ہوتے تھے، جن پر مغرق جھولیں اور پاکھریں پڑی ہوئی تھیں، نقرئی اور طلائی عماریاں کسی ہوئی تھیں۔ اور ان ہاتھیوں کے گلے میں نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے۔ اور ان کے ساتھ سپاہ کا ایک محافظ دستہ ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے عقب میں ایک شخص خاص طور پر سوگوار جلسہ میں ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک بڑی چھڑ سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوئی تھی اس چھڑ کے اوپر ایک اُلٹی کمان میں دو ننگی تلواریں آویزاں ہوتی تھیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے۔ ان کے اردگرد خاندان شاہی کے افراد، مقرب اور علماء ہوتے تھے۔ ان کے پیچھے "دلدل" ہوتا تھا۔ اس کے پیر اور پہلو سرخ کر دئے جاتے تھے، اور اس کا بدن تیروں سے چھدا ہوتا تھا۔ اس کی پشت پر نہایت مغرق زرتار و جواہر نگار ایک چار جامہ کسا ہوتا تھا۔ گھوڑے کا سب ساز و سامان طلائی ہوتا تھا۔ اور اس کی زین پر ایک عربی عمامہ، کمان اور تیروں سے بھرا ایک ترکش بھی رکھدیا جاتا تھا۔ اس کے پیچھے مغرق اور زرتار کے لباسوں میں ملبوس چند خادم ہوتے تھے۔ اور تماشائی خلقت ساتھ ہوتی تھی [1]

ساتویں تاریخ کو "شادی امام قاسم" کی یادگار میں ایک شاندار جلوس نکلتا تھا۔ اور یہ جلوس "مہندی کا جلوس کہلاتا تھا۔ مسیز میر حسن علی کا بیان ہے۔ "شادی سے متعلق مہندی کی کئی کشتیوں کے علاوہ

---

[1] شباب لکھنؤ ، عماد / ص ۱۷۲، ۱۷۳

مٹھائیاں، میوؤں، چنبیلی کے پھول کے ہاروں، دوسرے قسم کے پھولوں کے ہار، جن کے نیچے آتشبازیاں پوشیدہ ہوتی تھیں، کشتیوں میں رکھ کر نکالی جاتی تھی، اس موقع پر ایک تعزیہ بھی نکالا جاتا تھا۔ اس کے ہمراہ چاندی کی پالکیاں اور چنڈول بھی ہوتے تھے۔ ان سواریاں میں شاہی خاندان کی مستورات یا امراء کے گھروں کی عورتیں ہوتی تھیں۔ ان سواریوں کے پیچھے کئی عدد بینڈ ہوتے تھے۔ اور بے عدد روشنی کا اہتمام ہوتا تھا۔[۱]

دسویں محرم کو تمام تعزیوں کو بڑی دھوم دھام، اور باجے گاجے کے ساتھ کربلا لے جایا جاتا تھا۔ اس موقع پر تجہیز و تکفین کی ساری رسمیں ادا کی جاتی تھیں[۲]۔ دولت مند لوگوں کے قیمتی تعزیئے واپس لاکر امام باڑوں میں محفوظ کر دیئے جاتے تھے[۳]۔ تعزیوں کو گڈھے کھود کر مع کل تحائف عروسی، ہار، پھول، عطریات وغیرہ کے دفن کر دیا جاتا تھا[۴]۔ اپنے مکانوں کو واپس آنے کے بعد تعزیہ دار غربا و مساکین میں کھانا، روپیہ پیسہ اور کپڑے بطور خیرات تقسیم کرتے تھے۔ محرم کے زمانے میں جو باس وہ پہنتے تھے اسے

---

[۱] برائے تفصیل دیکھئے۔ OBSERVATIONS, PP. 42-54

نیز دیکھئے رسالہ تعزیہ داری (قلمی)، ص ۲، شباب لکھنؤ / ۱۵۰۔ ۱۵۵

[۲] تذکرہ گلشن ہند ۱۵۹۔ OBSERVAIONS etc 46-51-

[۳] برائے تفصیل دیکھئے۔ OBSERVATIONS etc->PP. 32 - 36

شباب لکھنؤ / ۱۵۵۔ ۱۵۷

[۴] شباب لکھنؤ / ۱۵۷، مدار الدولہ کی تعزیہ داری کے لیے دیکھئے۔ عماد / ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۹۸

بھی خیرات میں دیدیتے تھے۔ ؎۱

شیعہ سنّی تصادم

عاشورہ محرم میں شیعہ سنّی اختلاف دوبارہ تازہ ہوجاتا تھا اور فتنہ و فساد کا شعلہ بھڑک اٹھتا تھا۔ یعنی مصنوعی تجہیز و تدفین میں شور و شر اور حقیقی کشت و خون کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ اس موقع پر کچھ نہ کچھ جانیں تلف ہوجاتی تھیں۔ ؎۲

مجالس مرثیہ خوانی

عاشورۂ محرم میں روزانہ امام باڑوں میں دو مرتبہ تعزیوں کے روبرو مجالس عزا منعقد ہوا کرتی تھیں۔ نوابان اودھ خود ماتمی لباس پہنے اور سر پر طاؤس کے پروں کا تاج رکھے مرثیہ خوانوں کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ان کے پیچھے کثرت سے سرکاری ملازمین قطاروں میں بیٹھتے، واقعہ خواں واقعات کربلا بیان کرتا، سامعین بڑی خاموشی سے مغموم و حزیں بنے بیٹھے رہتے، اور ہمہ تن گوش ہوکر مرثیہ سنتے۔ لیکن سنتے سنتے ان کے دل گداز ہونے لگتے اور بالآخر حاضرین ڈاڑھیں مار مار کر گریہ و زاری شروع کردیتے۔ اس حالت میں بعض سامعین کی زبان سے "حسین، حسن" کا نعرہ بھی بلند ہوتا۔ اور آخر میں سب لوگ سینہ کوبی کرنے لگتے تھے۔ مجلس کے اختتام پر شربت سے سامعین کی تواضع ہوتی اور واقعہ خوانی کے بعد مرثیہ خوانی شروع ہوتی۔ ؎۳

؎۱ شباب لکھنؤ ۱۵، ۵۳ - OBSERVATIONS P.14, 62 ہفت تماشا ص ۱۵۵

ہدایت نامہ، ؎۲ رقعات مرزا قتیل ص ۸۹

؎۳ برائے تفصیل دیکھئے OBSERVATONS C.19-23 تاریخ فرح بخش ۲/ ۵۳

بقیہ حاشیہ ص ۵۳۱ پر۔

بیگمات شاہی کے امام باڑے محلات کے اندر علحدہ علحدہ ہوتے،
وہاں کی مجلسوں میں عورتیں حدیث خوانی اور مرثیہ خوانی کیا کرتی تھیں۔ ان
مجلسوں میں بھی سینہ کوبی اور حسن حسین کے نعرے بڑے جوش وخروش
سے بلند ہوتے تھے۔ [1]

بدیں سبب مرثیہ نویسی اور مرثیہ خوانی کے فن کو بڑا فروغ حاصل ہوا،
فیض آباد اور لکھنؤ کے تمام شعراء نے مرثیے لکھے ہیں۔ انیس اور دبیر نے
اس فن کو نقطۂ کمال پر پہونچا دیا تھا۔ میر علی نے عمدہ طرز مرثیہ خوانی کا
ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا[2]۔ ان کے علاوہ میاں دلگیر[3]
آغا محمد ندیم[4] مشہور مرثیہ خواں تھے۔ سودا، میاں حسرت، ثنا واقف،
میاں جرأت مرزا کدا علی کدا، شیخ اللہ سکندر جیسے مرثیہ خواں ایک وقت
میں فیض آباد میں جمع تھے۔ سید احسان حسن مخلوق سلام و مرثیہ کہتے
تھے[5]۔ مصحفی مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ ایک شعر میں خود کہتے ہیں:۔

تمہارے ساتھ میاں مصحفی کے ہیں جوق جوق ٭ مگر تم آئے ہو مجلس سے مرثیہ پڑھ کر[6]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۰ رسالہ تعزیہ داری ص ۳، ۱۴ ۔ ۱۵ گذشتہ لکھنؤ / ۲۷۲۔۲۷۳

---

[1] شباب لکھنؤ / ۱۴۸
OBSERVATIONS-24,27
[2] فسانۂ عجائب / ۸، وقائع عبد القادر خانی / ص ۱۶۲ [3] ایضاً / ۸
[4] تاریخ اودھ ۳/ ۱۵۱، مرزا محمد رضا فیض آباد کے نامی گرامی مرثیہ خوانوں
میں سے تھے۔ تاریخ فرح بخش ۲/ ۱۱۳ [5] ریاض الفصحا / ۲۰۷ برائے مرثیہ خوانان
لکھنؤ ملاحظہ ہو گذشتہ لکھنؤ / ۲۷۲-۲۷۹ [6] دیوان مصحفی سوم (رام پور) ص ۱۴۱ الف

فاتحہ کھانے پینے کی چیزوں مثلاً ریوڑی، الائچی دانہ، اور شربت کو تعزیوں کے سامنے رکھ کر فاتحہ دی جاتی تھی۔[1] اور علموں کے سامنے حلوے سے بھرے کونڈے رکھے جاتے تھے[2] دوسرے دن یہ حلوہ غربا، اور یتیموں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ عشرہ محرم کے زمانے میں پکا ہوا کھانا غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔[3] ہرچرن داس نے پینتالیس برسوں تک مرزا حسین علی خاں کے امام باڑہ میں کھانا تقسیم کرنے کی خدمات انجام دی تھیں[4] دورانِ محرم میں شربت کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں[5]

سوگ بالعموم مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص شیعوں کے لیے عاشورۂ محرم سوگ اور تمام لوازماتِ آسائش سے پرہیزگاری کا زمانہ ہوتا تھا۔ شیعہ حضرات نفس اور خواہشاتِ انسانی پر جبر کرتے تھے، کھری چارپائیوں پر سوتے، موٹا جھوٹا کھاتے، مثلاً جو کی روٹی، اُبلے چاول اور ابلی دال پر گذارا کرتے تھے۔ عورتیں زیورات اتار دیتیں، بناؤ سنگار، مسّی، پان، سرمہ وغیرہ چھوڑ دیتی تھیں۔ دسویں محرم کو تعزیہ دار ننگے سر اور ننگے پیر تعزیوں کے

---

[1] رسالہ تعزیہ داری/۱۰-۲۰

[2] ایضاً/۲۱-۲۲

[3] چہار گلزار شجاعی/۲۴۶ الف ۲۴۷ الف، کاشف الاستار/۳۶۸

[4] ایضاً/۲۴۷ الف

[5] OBSERVATIONS ETC. P. 13

ہمراہ کربلا تک جاتے تھے[1]

چہلم دسویں محرم کے بعد چالیسویں دن چہلم کی رسومات اسی پیمانے پر ادا کی جاتیں جس طرح کسی عزیز کی وفات کے بعد، ماتم کیا جاتا، اور علم نکالے جاتے تھے[2]

فیض آباد اور لکھنؤ کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی محرم منائے جاتے تھے۔ جارج فورسٹر نے الہ آباد میں محرم کے انعقاد کا ذکر کیا ہے[3] یہی حال بلگرام اور مارہرہ کا تھا[4]۔

ایک بات توجہ قابل یہ ہے کہ محرم میں الاؤ پر کودنے کا بھی رواج پایا جاتا تھا۔

مرزا قتیل نے سُنّی تعزیہ داروں کے بارے میں لکھا ہے کہ شریف سُنّی حضرات تعزیہ داری نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ وہ روضہ خوانی کی مجلس میں شریک ہوتے، خطبہ اور مرثیے پڑھتے، اور واقعۂ کربلا فارسی اور مرثیہ ہندی میں سنتے تھے اور گریہ وزاری کرتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس نچلے طبقے کے سنّی تعزیہ دار تھے، محرم کے دنوں میں ہر دکان کے سامنے تعزیہ

۱۔ برائے تفصیل دیکھئے OBSERVATIONS, 1, PP 43-47

شباب لکھنؤ/۱۴۸-۱۴۹ دیوان مصحفی (ق۔۱۱۰)

۲۔ فسانۂ عجائب/۱۱۱ رسالۂ تعزیہ داری OBSERVATIONS, 1, 99-100

۳۔ GEORGE FORSTER: TRAVELS IN INDIA, I PP. 88

۴۔ کاشف الاستار/۳۶۸

پایا جاتا تھا۔ مگر ان لوگوں کی تعزیہ داری ہندوؤں کی تعزیہ داری کے مانند تھی جو اپنی برادری میں نمود و نمائش کے لیے تابوت بناتے تھے، اہلِ سنت میں بھی بعض جاہل، جوانی کے غرور اور سرکشی کی وجہ سے عشرہ کے دن لڑائی جھگڑا کرنے کے لیے یا دوسرے تعزیہ داروں کے ساتھ راہ چلنے میں یا نیچ لوگوں کی صحبت کے اثر سے جوئے خانے میں یا ایسی ہی کسی دوسری جگہ پر جاتے تھے۔ اپنے گھروں پر تعزیہ داری کرتے تھے، جو شخص بھی اس کی زیارت کرنے آتا تو اس پر چار یار کا لگا کر سنّی ہونے کا بھی اظہار کرتے تھے۔ چونکہ شیعہ حضرات محرم میں سیاہ یا سبز لباس اور بعض اہلِ احتیاط نیلے کپڑے بھی پہنتے تھے، سنّی اپنے بچّوں کو سبز کپڑے اور سبز و سرخ ڈوریاں پہناتے تھے، اور جوان لوگ بھی پہنتے تھے، اور دس دن تک گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔ اکثر لوگ گھی بھی نہیں استعمال کرتے تھے، اور شبِ عاشورہ کو چہل منبر کی زیارت کے لیے بھی جاتے تھے۔ اور ہر منبر پر حصولِ مطلب کے لیے منّت کا ڈورا بھی باندھتے تھے[1] قصبات کے سنّی بھی تعزیہ داری کرتے تھے[2]

تورانی نسل کے لوگوں کی تقلید میں شیعہ حضرات بھی امیرالمومنین علیہ السلام کی نذر کا دسترخوان بچھاتے تھے۔ اور اس پر کھانے چُن دیتے تھے۔ پھر منتظر رہتے تھے کہ جناب امیرالمومنین تشریف لائیں گے،

---

[1] ہفت تماشا / ۱۵۴، ۱۵۵

[2] ایضاً / ۱۶۷

اور ان میں سے بعض کھانے نوش فرمائیں گے۔ پھر ان کھانوں پر جناب امیر کے دست مبارک کے نشانات ڈھونڈھتے تھے۔ [1]

مرزا قتیل نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض قصبات میں یہ بھی رسم ہے کہ عاشورہ کے دن نیچ ذات کی عورتیں نئے لباس میں آراستہ ہو کر تعزیہ داروں کے ساتھ شہر سے باہر جاتی ہیں اور ضریح مبارک اور کاغذ کے تابوت کو دفن کرتے وقت ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر زار زار روتی ہیں [2]

بعض مرتبہ ان جلوس اور جلسوں میں اتنا اژدحام ہوتا تھا کہ کافی تعداد میں لوگ زخمی اور جان سے ہاتھ دھو لیتے تھے۔ ایک مرتبہ قریب سات سو آدمی تلف ہوئے۔ [3]

ولادت امام حسین سعادت علی خاں کے زمانے میں حضرت امام حسین کی ولادت کے دن ایک جشن منعقد ہونے لگا تھا۔ اس دن دربار میں بھی جشن منایا جاتا۔ امراء اور خواتین نواب کی خدمت میں نذریں پیش کرتے اور خلعتیں پاتے تھے [4]

---

[1] ہفت تماشا/۱۵۵-۱۵۶

[2] ایضاً/۱۶۹

[3] چہار گلزار شجاعی/۱۹۲/الف

[4] عماد/ص ۱۴۷۔ مرزا رجب علی بیگ کا بیان ہے کہ ہر امام کی ولادت اور شب وفات کو جشنوں میں لاکھوں روپے صرف کر دیئے جاتے تھے۔

فاتحہ حضرت علی | (کاشف الاستاد ۳۶۸)

عید غدیر[1] | لکھنؤ میں عید غدیر کا جشن منایا جاتا تھا۔ انشاء اللہ خاں نے عید غدیر کی تہنیت میں ایک ترجیع بند شہزادہ سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کا پہلا بند یہ ہے:-

بلطف صفدر ضرغام دیں جناب امیر | چمک کھڑی ہو سلیمان شکوہ کے شمشیر
یہی کہے ہے دعا مانگ ہر صغیر و کبیر | خدا کرے یہ مبارک ہو ایسی عید غدیر
کہ نذر جشن جلوس اب کی سال لیوے وزیر[2]

شب برات | لکھنؤ میں اس تہوار کے منائے جانے کا اندازہ مسیز میر حسن علی کے اس بیان سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:-

---

[1] آخری حج سے واپسی کے موقع پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر کے مقام پر قیام کیا۔ آپ نے خطبے کا اعلان کیا اور جو لوگ آگے جا چکے تھے ان کو بھی واپس بلا لیا۔ اسی طرح اس موقع پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جمع ہو گئی۔ اونٹوں کے پالان کا منبر بنایا گیا۔ اس پر کھڑے ہو کر آنحضرت نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ مابعد آنحضرت نے حضرت علی کا شانہ پکڑ کر فرمایا۔ میں جس کا مولا ہوں حضرت علی اس کا مولا ہے۔ جس نے حضرت علی کو عزیز رکھا اس نے مجھے عزیز رکھا، جس نے اس سے دشمنی کی، وہ میرا دشمن ہے۔ حاضرین نے حضرت علی کو مبارک باد دی۔ وہ دن شیعوں کی نظر میں خوشی کا دن ہے۔ لہٰذا اس دن کی یاد میں عید غدیر کا جشن لکھنؤ میں منایا جاتا تھا۔ [2] کلیات انشاء ۱۹ھ نیز ملاحظہ ہو۔ دیوان مصحفی ششم دق۔ پٹنہ، ص ۲۰۶ (الف) فسانۂ عجائب ۳/

کہ چاند کی چودھویں کی رات، شب برات کی رات ہوتی تھی اور یہ رات ہر طبقے اور حیثیت کے مسلمانوں کے لیے بڑی دل چسپی اور اہمیت کی ہوتی تھی. کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ اس رات کو ہر ایک شخص کا اعمال نامہ کھولا جاتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے. اس دن مخصوص قسم کے کھانے تیار کر کے مرحومین کی ارواح کو ایصال ثواب کے لیے الگ الگ فاتحہ دی جاتی تھی. اس کے بعد ہر ایک متوفی کے نام کا حصّہ اس کی قبر پر پہونچا دیا جاتا تھا. اور اگر بآسانی اس کی قبر پر نہ پہونچایا جا سکے تو اس فاتحہ کے کھانے کو غریبوں اور مسکینوں میں بانٹ دیا جاتا تھا. مگر اس موقع پر پکائے جانے والے کھانوں میں کسی بھی صورت میں گوشت شامل نہیں کیا جاتا تھا. مختلف قسم کی روٹیاں، میٹھے چاول اور دوسری طرح کا میٹھا اس موقع کے لیے مخصوص تھا[1]

اس رات کو آتشبازی اور چراغاں کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا[2]

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے:- OBSERVATIONS ETC. I, PP. 300-302

[2] ایضاً، ص ۳۰۲ نیز ملاحظہ ہو. معدنِ معانی/ ۳۰ ب؛ رسالہ نو بادہ/۴۴ ب
دیوان عیشی (قلمی) ص ۱۰۴، ۱۰۳

شب برات ہے آج اور یہ نور کا ہے وفور — کہ چشم روزن دیوار تک نہیں بے نور
پری رخوں کے نہیں ہاتھ میں یہ پھلجھڑیاں — ہیں نکلیں نور کے پھولوں کی لیکے چھڑیاں حور
یہ ہر گلی میں ہے گلہائے آتشیں کی بہار — کہ جس کو دیکھ کے کہتے ہیں اہل فہم و شعور
زیادہ سب سے اناروں نے سرکشی کی ہے — بھرا دماغ میں ہے کوٹ کوٹ کر شر و شور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۸ پر

دین دار اور پرہیزگار مسلمان وہ رات توبہ و استغفار میں بسر کرتے تھے، اور متوفین کی نجات کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ شیعہ حضرات اس رات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ مسنر میر حسن علی کا بیان ہے۔

"اثنا عشری فرقے کے لوگ اس رات کو اور بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ یہ دن امام مہدی کی ولادت کا دن بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ امام حسین اور حسن کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ان کے مصائب کی یاد میں اپنے گھروں کے سامنے کی زمین پر (یا صحن میں) چکر لگا کر زیارت کی رسم ادا کرتے تھے۔ تجہیز و تکفین کے مراسم ادا ہوتے تھے اور خاتم النبیین اور اماموں کے نام پر درود اور سلام پڑھے جاتے تھے۔ یہ سب رسمیں شب برات کی رات کو ادا ہوتی تھیں" لے

شعبان اس تقریب میں کشتی نما لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنایا جاتا تھا۔ رنگین ململ یا ریشمی زربفت کے سنہرے اور نقرئی کپڑوں سے جن کے کناروں پر خوبصورت اور زری کے کام کے کاغذ کی گوٹ لگی ہوتی تھی، اس ڈھانچے کو ڈھک دیتے تھے۔ اس کشتی میں مٹی کے دئے جلائے جاتے تھے۔ اس کشتی کو الیاس کی کشتی کے نام سے موسوم کیا جاتا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۷ کا

یہ شب کہ جس کو شب قدر سے ہے نسبت تام ؎ یہ شب کہ جس میں ہے عالم تمام عالم نور

کلیات انشاء ۱۹۳/

شب برات جو آئی تو دیکھیو انشاء ؎ کر رہی ہے پٹاخوں کی کیا چٹاخ پٹاخ

لے برائے تفصیل دیکھئے۔ OBSERVATIONS ETC-1, P.303.

تھا اور ایک بڑے جلوس، باجے گاجے کے ساتھ دریا تک لے جاتے تھے، گھروں کے ملازمین، امراء کے سپاہی، اس جلوس میں دستور کے مطابق شامل ہوتے تھے۔ جوں جوں یہ جلوس دریا کے قریب تر ہوتا جاتا اس میں تماشہ بینوں کی کثرت ہوتی جاتی۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ وہ کشتی پانی میں چھوڑ دی جاتی۔ جوں جوں کشتی پانی میں دور ہوتی جاتی اس کا منظر قابلِ دید ہوتا جاتا۔ وہ روشنی دور سے بہت دل کش معلوم ہوتی تھی[1]

ہلال ہر ماہ کی پہلی تاریخ کے چاند کو دیکھ کر ہر طبقے کے مسلمانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اور ہر نیا چاند ایک تقریب کا موقع بہم پہونچاتا تھا۔ نوابوں اور امراء کے ہاں اس موقع کے اعلان کے لیے توپیں داغی جاتی تھیں[2]۔ مذہبی لوگ اس دن غسل اور کپڑے تبدیل کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ توپیں دغنے کے بعد تو وہ لوگ قرآن منگواتے اور اس حصے کو کھولتے جہاں کا آنحضرت نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی۔ آئینہ سے چاند دیکھا جاتا۔ لوگ ایک دوسرے کو بغلگیر کرتے اور بڑوں کا احترام کرتے۔ غلام اور ملازمین مبارک باد پیش کرتے اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتیں۔

---

[1] برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS ETC-IPP.289-290

دیوان مصحفی دوم (ق رام پور) ۹۱ ب

[2] ایضاً، ص ۲۹۲ (۱۵۷-۱۵۸)۔

عرس غوث الاعظم بڑی کوشش کے باوجود کسی ہمعصر کتاب میں اس بات کا ذکر نہیں مل سکا کہ اودھ میں یازدہم پیر دستگیر کے جلسوں کی کیا نوعیت تھی اور کیا اسی پیمانے پر یہ جلسے اس علاقے میں بھی منعقد ہوتے تھے جس طرح دہلی کے ضمن میں ہم لکھ چکے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ نوابوں کو اس جلسے سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس وجہ سے اودھ میں یازدہم کے جلسوں کا رواج نہ ہو سکا۔

غوث الاعظم کے عرس کے جلسے کا علم صرف عماد السعادت کے مطالعہ سے ہوتا ہے جو کتاب ۱۲۳۶ھ میں لکھی گئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یازدہم کے جلسے اودھ میں منعقد ہوتے ہوں مگر کسی مورخ نے ان جلسوں کے بارے میں لکھنے کی تکلیف گوارہ نہ کی ہو۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ شاہ مدنؔ[1]، جو پیرزادہ تھے اور ان کا سلسلۂ نسب غوث الاعظم تک پہونچتا ہے۔ شاہ آباد میں سکونت رکھتے تھے۔ اور بعد میں خالص پور میں رہنے لگے تھے۔ ہر سال وہاں غوث الاعظم کی یازدہم کا عرس منعقد کرتے تھے۔ جوق جوق علما، طلبا، فضلا، اور مشائخ قرب وجوار کے علاقوں مثلاً عظیم آباد، سہسرام، جونپور، الہ آبا، اودھ، شاہ آباد، کوڑہ جہان آباد، کالپی، اٹاوہ، خیر آباد، سندیلہ، کاکوری، لکھنؤ، سلون، بریلی وغیرہ

---

[1] شاہ شرف الدین قادری جیلانی شاگرد ملا کمال الدین سہالوی، معارف نومبر دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۳۵۹

آ کر جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ تین دن تک یہ جلسہ ہوتا رہتا تھا اور زائرین کے طعام و قیام کا انتظام شاہ صاحب خود کرتے تھے۔ تقریباً تیس ہزار آدمی یہاں جمع ہوتے تھے۔ عبدالرحیم قوال شاہ صاحب کا مرید تھا اور اس موقع پر اور دوسرے قوالوں کے علاوہ مجلس میں قوالیاں گاتا تھا۔[۱]

بارہ وفات بارہ وفات کے جلسے اور مجلس بلگرام میں منعقد ہوتی تھیں۔ سید حمزہ کا بیان ہے کہ شاہ برکت اللہ اپنی خانقاہ میں مجلس کا اہتمام کرتے۔ بڑا بھاری مجمع ہوتا۔ اور اس کے دوران زیارت موئے مبارک عمل میں آتی۔[۳] مختصر بلگرام اور مارہرہ میں ہر ماہ یازدہم اور دوازدہم کا کھانا لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔[۴]

---

[۱] عماد/۱۱۶ کاشف الاستار/ص ۳۶۸ شجاعت خاں افغان اور یازدہم کے جلسے۔ تفصیل دیکھئے، کاشف الاستار/ ۵۲۵-۲۷۰ رسالہ تعزیہ داری/۱۸

[۲] ایضاً/۱۳۱ اکبر آبادی کے مشہور شعر میں انہیں شاہ مدن کی طرف اشارہ ہے۔
اگرچہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی ؛ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی
(ملاحظہ ہو: دید و دریافت از نثار احمد فاروقی)

[۳] کاشف الاستار/ص ۱۵۱-۱۵۲، ۱۹۱-۱۹۲

[۴] ایضاً/ ۳۶۸ ؛ نیز ملاحظہ ہو، دیوان مصحفی دوم (ق. را) ص ۸۶ ب

کھیل اور تفریحی مشاغل

چوپڑ انشاؔ[1] اور دیگر شعراء کے کلام میں چوپڑ کھیلنے کے بارے میں کثرت سے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے عوام میں چوپڑ بازی کے رواج کے متعلق روشنی پڑتی ہے۔ مصحفی نے پوری ایک غزل شطرنج کی ردیف میں لکھی ہے[2] لکھنؤ کی عورتوں میں چوپڑ کھیلنے کا شغل پایا جاتا تھا[3]

نرد بازی مسز میر حسن علی نے لکھا ہے کہ عورتیں تاش کھیلا کرتی تھیں۔ مرد نرد بازی کے ذریعہ قمار بازی کا شغل کرتے تھے[4]۔

---

[1] کلیات انشاء/

یوں لگی کوسنے چوپڑ میں جو ہاری وہ پری   ستی ہو جائے دشمن مر ترا راجہ نل جائے

۲۰/، ۴۷، ۴۸، ۵، ۷۶، ۱۲۱، ۱۲۹

[2] دیوان مصحفی (ق۔ پ) ۱۲۲ الف، ۱۲۵ ب

[3] OBSERVATONS ETC P. 252

مجموعہ مثنویات میر حسن / ۲۸، ۷۰

[4] ایضاً ص ۲۵۲ گنجفہ مثنویات میر حسن / ۷۰، کلیات انشاء / ۱۳۸

پچیسی عورتوں اور مردوں دونوں میں پچیسی کھیلنے کا رواج عام تھا۔[1]

شطرنج بازی کا عام رواج تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں اس کھیل کا مفصل ذکر کیا ہے۔[2]

پتنگ بازی لکھنؤ کے عوام و خواص، ہر طبقے کے لوگوں میں پتنگ بازی کا شوق پایا جاتا تھا۔ مسز میر حسن علی نے لکھا ہے یہاں ہر عمر کے لوگ پتنگ بازی کا شغل کرتے ہیں۔ میں نے معمر لوگوں کو اس شغل میں مشغول دیکھا ہے جنہیں اس بات کا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے کام میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں جو صرف بچوں کو زیبا دیتا ہے۔ پتنگ مکانوں کی چھتوں سے اڑائے جاتے تھے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے لوگ چھتوں پر جاکر اس شغل کے لیے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہ پتنگ بازی میں بہت مسرت محسوس کرتے تھے۔ پتنگ لڑانے کا یہ طریقہ تھا کہ لوگ مانجھا والی ڈور سے اپنے پڑوسی کے پتنگ سے اپنا پتنگ لڑاتے تھے۔ جب ہوا میں پتنگ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں تو دونوں پتنگ باز اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ڈور اوپر آ جائے۔ اوپر والی ڈور نیچے والی ڈور کو کاٹ دیتی ہے۔ پتنگ کٹنے کے موقع پر ان میں سے

---

[1] کلیات آتش ر ۱ ۹ ، ۲۰۴ ، ۲۱ ، ۲۱۱ ،

[2] فسانۂ آزاد ر ۵۹۰ ۔ ۵۹۵

فاتح اور تماشہ بینوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بچے شور وغل کرتے ہوئے کٹی پتنگ کو لوٹنے کے لیے دوڑتے ہیں۔ لیکن کسی ایک شخص کے ہاتھ وہ پتنگ نہیں آتا بلکہ اس کے پرزے پرزے ہو جاتے ہیں۔ اپنی پتنگ کی ڈور کو اوپر کرنے کے لئے بڑی جد و جہد کی جاتی ہے تاکہ وہ طرفِ ثانی کی پتنگ کو کاٹنے میں کامیابی حاصل کر سکے [۱]۔ بخشو اور سالاری کامل پتنگ باز تھے [۲]۔

کبوتر بازی لکھنؤ میں کبوتر بازی کے شوق کا آغاز خاندان نوابان کے قیام کے ابتدائی زمانہ سے ہی ہو گیا تھا۔ وہاں کے عوام کو اس بازی سے بڑی دلچسپی تھی۔ مسز میر حسن علی نے کبوتر بازی کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔ اس شہر (لکھنؤ) کے

---

[۱] OBSERVATIONS ETC 216-17. LUMSDON: A JOURNEY: P. 14.

ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ
وہاں سایے ڈور پر نہیں اُڑتا پتنگ سرخ — کلیات انشاء/ ۲۰۰
فسانۂ عجائب/ ۹

[۲] فسانۂ عجائب/ ۹

[۳] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گذشتہ لکھنؤ ۱۸۲۔ ۱۸۷، ثمرات البدائع ۱۸۳ء، ۳۰۲ تاریخ احمد شاہ تا آصف الدولہ/ ص ۷، عماد/ ۱۴۴

LUMSDON: A JOURNEY ETC., 14., ORLICH: TRAVELS, 1/P. 93-94.

مرد کبوتر بازی کے فن میں بڑے مشاق اور کامل فن ہیں۔ اور وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے پاس عمدہ اور اچھی نسل کے کبوتر ہوں۔ اس لیئے وہ دنیا کے مختلف حصّوں سے بڑی قیمتوں پر کبوتر منگواتے ہیں۔ کبوتر باز اپنے کبوتروں کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اور دوسرے غول میں گڈ مڈ ہو جانے کے باوجود وہ پہچان لیتا ہے۔ چھتوں کے اوپر لکڑیوں کی جھنجریاں بنائی جاتی ہیں اور اُن میں اُن کبوتروں کو رکھا جاتا ہے۔ روزانہ صبح و شام وہاں جاکر کبوتروں کا مالک انہیں دانہ کھلاتا ہے اور پھر انہیں پرواز دیتا ہے۔ بالعموم اسی وقت اس کا کوئی پڑوسی بھی اپنی کبوتریں اُڑاتا ہیں۔ یہ کبوتریں ان میں شامل ہو کر طرفِ ثانی کے دو ایک کبوتر اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ آئے ہوئے کبوتر اس کی قانونی ملکیت ہو جاتی ہیں۔ طرفِ ثانی اس وقت تک تو گرفتار کبوتروں کو ان کے مالک کو واپس نہیں کرتا جب تک وہ ان کی قیمت ادا نہ کرے یا ان کے بدلے میں وہ کبوتر واپس نہ کردے جو اس نے طرفِ ثانی کے غول سے پکڑ رکھے تھے۔ اگر طرفِ ثانی سے کسی قسم کا عناد ہوتا ہے تو ایسی صورت میں پکڑے گئے کبوتروں کو واپس حاصل کرنے کے لیے بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے بعض مرتبہ ایسی صورت میں بات جھگڑے ٹنٹے تک نوبت پہونچ جاتی ہے [1]

---

[1] OBSERVATION etc. pp. 217-18

یار علی، بریلی کا باشندہ تھا۔ اپنے وطن سے آ کر اس نے فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے اس فن کی وجہ سے عہد شجاع الدولہ میں اس نے بڑا عروج پایا۔[۱] شرفاء کے خاندانوں میں بھی کبوتر بازی کا شوق سرایت کر گیا تھا۔ ابتدائی جوانی میں ملا نظام الدین سہالوی کے صاحبزادے ملا عبد العلی (بحر العلوم) کو کبوتر بازی کا شوق تھا۔ ایک بزرگ کے لعنت ملامت کرنے پر اس شغل کو ترک کر دیا تھا۔[۲] دہلی، فیض آباد اور لکھنؤ میں ایک ایسا طبقہ پایا جاتا تھا جو کبوتر فروخت کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ وہ جنگلوں میں جا کر کبوتروں کا شکار کرتے یا جالوں سے پکڑتے تھے۔[۳]

مرغ بازی

لکھنؤ اور فیض آباد میں مرغ بازی کا شوق عوام و خواص ہر طبقے کے افراد میں پایا جاتا تھا۔ عبد الحلیم شرر نے لکھا ہے "مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نواب سعادت علی خاں باوجود بے دار مغز کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امراء و دربار و رکنا ر اس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے، انہیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا

[۱] محمد فیض بخش نے یار علی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ فرح بخش ۱/۲۲۵، ۲۲۹
[۲] معارف دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۴۱۴-۴۱۵ [۳] مجموعہ مثنویات میر حسن ۲/۱۵۲،
فسانۂ عجائب / OBSERVATIONS ETC., P225-226.



نواب آصف الدولہ کے عہد کی مرغ بازی کا ایک منظر ۱۷۸۶

چنانچہ جنرل مارٹن... اوّل درجے کے مُرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں سے بازی بد کر لڑایا کرتے تھے[۱]

میر تقی میر نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں اتنا کم لکھا ہے جو نا کے برابر ہے مگر انھوں نے ایک مثنوی وہاں کے مُرغ بازوں کے بارے میں لکھی ہے۔ مرغ بازی بالعموم جمعہ اور منگل کو ہوا کرتی تھی۔ وہ مثنوی یہاں نقل کی جاتی ہے تاکہ مُرغ بازی کی پوری تصویر قارئین کی نظروں کے سامنے آ جائے۔

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یہاں پائے
پر و پُر زاد رست یکساں ہے — مُرغ تصویر کا بھی حیراں ہے
مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ — قاز و سارس سے جنگ جس کا ننگ
حوصلہ کس قدر حواصل کا — ذکر کیا کرگس شتر دل کا
لات کی گھات کر جو ٹُر جاوے — نسر طائر کا رنگ اڑ جاوے
زہرۂ ققنس کا اس خطرے سے آب — شب نہ سووے ہراس سے سُرخاب
بکری سا فیل مرغ کو مارا — کب شتر مُرغ سے ہوا چارا
آدمی جو بڑے کہلاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
شہرہ و سبزوار کے سب مرغ — ہیں ثنا گستر ایسے تھے کب مرغ
ہو جو گئیں مرغِ خانگی کے تیئں — مست سُن اس ہرزہ چانگی کے تیئں

---

[۱] گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۷۶

لات ماری جو کاٹ کر حلقوم — حیدر آباد تک پڑی ہے دھوم
کھا کے سینے کی مدّعی سووے — نسر واقع کا واقعہ ہووے
نے ثنا سے بطیں ہی ہیں تر لب — مرغِ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب
ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے — اس کے آگے کنیل پھیکا ہے
کیا عجب ان کی رہ گزر کا فرش — ہوں پر افشاں تو ہو خروس عرش
اڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست — کی صدا مرغ دوست نے ہی دوست
کیس اس رنگ ہوتے ہیں محوس — جوں گلستاں میں ہوویں تاجِ خروس
شور جنگ آوری کا تا کہسار — کبک کا گھر خروس پہ ہے بار
کب ہیں پہلے سے مرغ زرین بال — حسن لاکھے کا سمجھے مرغ خیال
کر سکے وصفِ مرغ کیا کوئی — مرغِ آمین کو دعا گوئی
وفرا اتنا کہ دیر بیچے لیں — جان دے کوئی تخم مرغ نہ دیں
مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا — ور الطاف باز کر دیکھا
ربط رکھا بہت انہوں کے ساتھ — ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ
مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز — مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز
یعنی اپنا حریف جب پاوے — پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے
سینہ کیا سینہ بال کیا پر و بال — جیسے چشمِ خروس آنکھیں لال
بازی بذ بذ کے جب لڑاتے ہیں — کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں
آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار — پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسار
ہاتھ جس مرغ باز کے تھا وہ — پانی کرنے لگا تر آ کر وہ

کچھ تو ٹھہرا تو دم دیا اُن نے — تعبیہ کر کے رکھ لیا اُن نے
اور جو سست ہو ہُوا ٹھیلا — دونوں بازو کے پر دیئے پھیلا
دم سے کیا ہو یہ بیدم و مجروح — قصد پرواز میں تھا مُرغِ رُوح
ہو چکا ہو چکا ہوا یہ شور — ڈھلکی گردن گیا وہ سارا زور
پھیلا پانی میں وہ غمِ جاں سوز — دل زرہ پھر ہیں مُرغِ دست آموز
جانور رنگ باختہ سب ہیں — یعنی حیران فاختہ سب ہیں
مُرغِ قبلہ نما کو وحشت ہے — بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے
ورنہ اڑ کر کہیں چلا جاتا — دیر اپنے مقام پر آتا
جیسے منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روزِ محشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
اُن نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — اُن نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پَر فشانی ہے — اُن کی صد رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منہ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے — تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
گرمیِ ہنگامۂ مرغ صحبت ہے — بعد نصف النہار رخصت ہے

کھا پچھے سر پر بغل میں مارے مرغ　　لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روز معین آ دے گا　　نالہ مرغ سحر سنا دے گا
عالم آدے گا گرد دیسا ہی　　گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی
میراں کا نہ ہووے گو قائل
مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل[1]

مصحفی نے "مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی فیض آبادی" میں مرزا تقی کے مرغوں اور اُن کی مرغ بازی اور مرغوں کی تربیت اور غذا کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مرزا تقی کو اس فن کی اچھی مہارت تھی۔ مشہور و معروف مرغ باز تھے۔ اور تین تین ہزار روپے کی بازی بد کر مرغ لڑاتے تھے۔ اپنی دولت انھوں نے اس بازی کے نذر کر دی تھی[2]

انشاء اللہ خاں انشاء کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ انشاء نے ایک مثنوی "مرغنامہ" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

اب مجھے بھی یہ شوق ہے اس کا　　کہ سمجھتا ہوں مرغ کو عنقا
قصد پالی کا جب کہ کرتا ہوں　　گیا ہے ڈگ لینے لینے پھرتا ہوں

---

[1] کلیات میر ص ۸۰۸-۸۱۰، نیز دیکھئے گذشتہ لکھنؤ ص ۱۷۵-۱۷۸، عماد ر ۱۴۴؛
OBSERVATONS ETC-P.220 LUMSDON: P-14.

[2] دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ۱۲۵ ب، ۱۲۷ الف، دیوان مصحفی سوم (ق۔ رام پور) ص ۳، نیز کلیات سودا ا ر ص ۴۰۴

داب اپنی بغل میں ایک مُرغا | چلتا رپ رپ قدم ہوں میں پُرغا
مثل فولاد مُرغ ہیں اپنے | داد بے داد مُرغ ہیں اپنے
پاس اپنے جو مرغ ہے جاوا | ہے وہ اسفند یار کا باوا
ہیں غرض خوب خوب عالی مُرغ | ہے بجا کہیے اگر انھیں سیمرغ[1]

بٹیر بازی

بقول عبدالحلیم شرر بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا وہاں کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کیا کرتی تھیں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ میں وارد ہوئے اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُن کو وہ لڑاتے تھے۔ چونکہ بٹیر لڑانے کے لیے کسی میدان وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر بیٹھ کر اس کی لڑائی کا تماشہ دیکھا جاسکتا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے معاشرے نے اس کو بہت پسند کیا۔[2]

مسنر میر حسن علی کا بیان ہے کہ بٹیر بہت لڑاکو پرند ہوتا تھا۔ ان کی غذا کا بڑا اہتمام کیا جاتا۔ اور لڑنے کی تربیت دی جاتی اور مشق کرائی جاتی تھی۔ یہ چھوٹے غریب پرند جب ایک مرتبہ لڑنا شروع کر دیتے تھے۔ تو اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک ان کا سانس باقی رہتا تھا۔[3] اس عہد کے شاعروں کے کلام میں بٹیر بازی پر اشعار بآسانی مل جاتے ہیں۔ مصحفی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ کلیات انشار/۴۴۷-۴۴۸

[2] بٹیر بازی کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے دیکھیے۔ گذشتہ لکھنؤ/۱۷۸-۱۸۰

[3] OBSERVATIONS ETC-P.220 عماد/۱۴۴

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث   رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث[1]

دیگر پرندوں کی لڑائیاں

مرغ اور بٹیر بازی کے علاوہ تیتر بازی، لوؤں کا لڑانا، گلدم لڑانا، لال لڑانا۔ اور طوطے بازی کا شغل بھی تفریح کا ایک اہم ذریعہ تھا[2] اودھ کے اکثر اضلاع میں موجودہ زمانے میں بھی تیتر بازی کا رواج پایا جاتا ہے۔ تیتروں کو لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے اور انہیں مقوی غذائیں کھلائی جاتی ہیں۔ طوطے بھی عام طور پر پالے جاتے تھے اور انہیں بولنا سکھایا جاتا تھا۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں ایک طوطے کی دلچسپ داستان لکھی ہے[3] مرزا قتیل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "مینا۔ چڑیا بھی پالی جاتی تھی" میر یوسف علی در خریدن مینا خیلی اہتمام دارد[4] مسٹر ن نے لکھا ہے کہ ہندوستانی بالخصوص لکھنؤ کے باشندے کوئلیں لڑایا کرتے تھے۔ اور بازی لگایا کرتے تھے۔[5]

درندوں اور چوپایوں کی لڑائی

درندوں اور چوپایوں کے لڑانے کا شغل عام طور پر خواص میں پایا جاتا تھا۔

---

[1] دیوان مصحفی ششم (رام پور) ص ۱۲۹، ملا نظام الدین سہالوی کے صاحبزادے ملا عبد العلی (بحر العلوم) کو عنفوانِ شباب میں بٹیر بازی کا شوق تھا۔ (معارف دسمبر ۱۹۰۷) ص ۴۱۵

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو، گذشتہ لکھنؤ ص ۱۸۲-۱۸۴، ۱۸۸

[3] فسانۂ عجائب / ۱۹، مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۲

[4] رقعات مرزا قتیل / ۷۰، مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۲

[5] A JOURNEY: FROM MEERUT TO LONDON - P. 14

اس کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :۔

جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدانِ جنگ میں لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کر جانبازی و خوں ریزی کا تماشہ دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت ہر جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہلِ لکھنؤ کو ہوا۔ اور اُن بے نتیجہ اور سنگدلی کی دلچسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجۂ کمال کو پہنچا دیا اور مقامات کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ گذرا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دل کش تماشے سوادِ لکھنؤ میں دیکھے گئے، دہلی یا ہندوستان کا کوئی دربار تو درکنار غالباً ساری دنیا کے کسی شہر میں نہ دیکھے گئے ہوں گے [1] درندوں میں شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے، بارہ سنگھے، مینڈھے اور سانڈ لڑائے جاتے تھے اور تماشا دیکھ کر دل بہلایا جاتا تھا۔ [2]

فنونِ حرب فنونِ جنگ میں سپہ گری کے فنون کے علاوہ لکھنؤ میں ذیل فنون کا عام رواج تھا۔ جن کے باکمال استاد وہاں موجود تھے۔ مثلاً کُشتی، لکڑی، پٹہ ہلانا، بانک بنوٹ برچھا، بانا، تیراندازی، گتکا بازی اور جل بانک

---

[1] گذشتہ لکھنؤ/۱۶۳۔۱۶۴ [2] برائے تفصیل دیکھئے گذشتہ لکھنؤ/۱۶۴۔۱۶۷، نیز شباب لکھنؤ/۱۱۹۔۱۴۴، OBSERVATIONS etc PP 22 & 225

کشتی گیری شمالی ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص اس فن کو کافی عروج حاصل ہوا لیکن بقول عبدالحلیم شرر لکھنؤ کی آب و ہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت ہی نہیں دی تھی کہ اس کی خاک سے پہلوان پیدا ہوں۔ اس لیے لکھنؤ کی کشتی کا فن صرف پھیلی کا کمال دکھانا تھا۔ جس میں اپنے سے دونے پر غلبہ حاصل ہو جاتا تھا لیکن اس سے زیادہ طاقت ور کو زیر کرنا مشکل تھا۔[۱]

مسز میر حسن علی کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے لوگ اپنی چھاتی کو چوڑا کرنے اور پٹھوں کو مضبوط کرنے کے لیے مگدر گھماتے تھے[۲] مرزا قتیل نے مرزا پہچو بیگ پہلوان کا ذکر کیا ہے:۔[۳]

لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں کشتی کے فن کے بارے میں اکثر شعر مل جاتے ہیں:۔

فن کشتی میں قیامت ہے وہ بت کا درکا
دھوم دیتا ہے مچا آوے ہے جب ھوبی پاٹ[۴]

وہ پہلوان سادہ لب جوڑ نڈ بیل
ہو لاکھ کوئی غش ہو تو اسے بہنڈ پر[۵]

---

[۱] گذشتہ لکھنؤ / ۱۵۹، ۱۶۰۔ چہار گلزار شجاعی / ۲۲۲ ب

[۲] OBSERVATIOS-ETC P. 218.

[۳] رقعات مرزا قتیل / ۸۵

[۴] دیوان مصحفی ہفتم (ق، پ) ص ۲۶ (الف) [۵] کلیات انشا / ۵۱

لکڑی بازی اس فن کو پھکیتی کہتے ہیں[1] لکھنؤ میں اس فن کے مشہور معروف استاد گذرے ہیں۔ ان سے محمد علی خان، رستم علی، میر نجم الدین خان قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ صرف شریف زادوں کو اپنی شاگردی میں قبول کرتے تھے۔ اور اس موقع پر فاتحہ کی مٹھائی لیتے تھے۔ جب تک لکھنؤ میں نوابی کا زور رہا اس فن کے بہت سے استاد وہاں موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے دربار سے وابستہ تھے[2]

بنوٹ بازی اس فن کی تعلیم کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی انسان دشمنوں کے نرغے میں پھنس جائے تو لکڑی ہاتھ میں لے کر چاروں طرف پھینکتا ہوا سب کو پیچھے ہٹا کر۔ سب کو مارتا ہوا جان بچا کر محفوظ باہر نکل جائے۔ یہ فن دہلی میں مروج تھا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کو اس فن کی پوری مہارت تھی۔ پورب کے جلاہوں میں یہ فن عام تھا۔ بعد میں شرفا اور بالخصوص شیخ زادوں نے اس فن کو اختیار کر لیا تھا۔ لکھنؤ میں اس فن کے صاحب کمال میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ حریف کے ہاتھ میں کتنا زبردست ڈنڈا کیوں ہی نہ ہو۔ وہ اس کو توڑ دیتے تھے[3]

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے۔ گذشتہ لکھنؤ ص ۱۵۲-۱۵۳

[2] عماد / ۱۵۹

[3] گذشتہ لکھنؤ / ۱۵۳-۱۵۴

[4] ایضاً / ۱۵۴-۱۵۵

محرم کے زمانے میں پٹہ بازی کے رواج کے سبب سے بھی اس فن کو ترقی ہوئی تھی۔ مرزا قتیل اس فن کے بارے میں لکھتے ہیں۔ پٹہ باز[1] حضرت علی کو اس فن کا کامل جانتے ہیں۔ اس فن کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔ لیکن اب ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں اس کا رواج ہوگیا ہے۔ کوئی شہر اس کی تربیت گاہوں سے خالی نہیں ہے۔ استاد کو خلیفہ جی کہتے ہیں اور یہ بے حقیقت لوگ جوان کاموں میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں ان کا سلسلہ اس فن میں ایک ہندو پر منتہی ہوتا ہے جو تمام عمر فاقے کرتا رہا اور لوگوں کے کہنے کے باوجود سوکھی روٹی اور موٹے کپڑے کے سوا دنیا سے کوئی تمتع اس نے نہیں کیا۔ یا رذیل اور بازاری مسلمان مثلاً سبزی فروش، رنگ ریز، باورچی حجّام۔ یا اسی قبیل کے لوگ جو حضرت علی کو اس فن کے استادوں کا استاد اور حضرات حسنین کو استاد زادہ تصور کرتے ہیں اور اِسی نسبت سے اپنا پیر مانتے ہیں۔ اس لیے اس گروہ کے بہت سے لوگ خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنّی ننگے پیر ننگے سر تعزیے کے ساتھ ساتھ اپنے استاد کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ راہ چلتے میں جہاں کہیں دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ چھتوں پر یا چبوتروں پر بیٹھے تماشا کر رہے ہیں تو ماتم داروں کو روک دیتے ہیں۔ سقہ چھڑکاؤ کرتا ہے اور پھر تماشائیوں کے سامنے لکڑی اور پٹے کے فن کا مظاہرہ شروع

---

[1] لوہے کی ایک چیز ہوتی تھی، دودھاری سیدھی تلوار کی طرح۔ اُسے چلانے والا ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہر طرف ہلاتا تھا۔ بلکہ عجب نہیں اس کا خیال ہاتھی کی سونڈ ہی سے ماخوذ ہو۔ ہفت تماشا / ۱۷۸

کر دیتے ہیں۔ یہ کرتب دکھانے کے بعد پوری آواز سے یا حسین کا نعرہ لگاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ راہ چلتے میں تابوت کے آگے کود پھاند کرتے ہیں اور "ہے دوست کے نعرے لگاتے ہیں"۔[1]

بانک فنونِ حرب میں یہ فن بڑی اہمیت کا حامل تھا اور بالخصوص شریف زادے خاصی جدوجہد اور شوق سے اس فن کو سیکھتے تھے۔ اس فن کی ابتدا اس مقصد سے ہوئی کہ چھڑیوں کی مدد سے حریف کا مقابلہ کرنا تھا۔ اودھ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں منصور علی خاں نیکیت اس فن کے استاد کامل تھے[2] نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں شیخ نجم الدین کا شمار اس فن کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ میر بہادر علی[3] اور آغا مرزا بیگ[4] بانک کے فن کے کامل استاد تھے۔

مندرجہ بالا فنون کا ذکر کرتے ہوئے مراۃ الاوضاع کے مصنف نے لکھا ہے:۔

جوانان ایں محلہ با دمفتی گنج، رستم نگر، محمود نگر، منصور نگر[5]
روزانہ بہ اشتغال آموختن بانک، دپٹہ و لکڑی و کشتی گیری میگذرا نیدند[6]

---

[1] ہفت تماشا ۱۷۱، ۱۷۲ [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو گذشتہ گفتگو ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

[3] عماد ۱۳۵

[4] یہ سب لکھنؤ کے محلے تھے۔ فسانہ عجائب میں محمود نگر کا ذکر ملتا ہے۔ ص ۱۲

[5] مراۃ الاوضاع ۹۰ ب نیز دیکھیے دریائے لطافت د۔ ت، ص ۹۵

بنوط اس فن کی غرض وغایت کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ حریف کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہو، مثلاً تلوار، لٹھ یا کوئی دوسرا حربہ، اُسے گرادے۔ ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوا کرتا تھا۔ یا اپنے ہاتھ سے حریف کو ایسا صدمہ پہونچائے کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے صاحب کمال استاد تھے۔ مثلاً محمد ابراہیم خاں رام پوری اور طالب شیر خاں [1]

برچھا یہ قدیم زمانے میں آریوں، ترکوں اور عربوں میں برچھے کا استعمال عام تھا۔ برچھا چلانے کے کام نے ایک فن کی صورت اختیار کرلی۔ لکھنؤ میں میر کلو اس فن میں پوری دسترس رکھتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں برہان کے عہد میں میر کلو کو بڑی شہرت نصیب ہوئی تھی۔ لیکن نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں اس فن کا مکمل زوال ہوگیا [2]

بانا یا لٹھ بازی بانا ایک لمبی لکڑی کا نام تھا جس کی ایک طرف لٹو ہوتا تھا۔ اور بعض کے دونوں طرف لٹو رکھتے تھے۔ بعض لوگ لٹودں میں کپڑا باندھ کر اور تیل میں ڈبو کر انہیں روشن کرتے اور اس طرح ہلاتے کہ ہلانے والے پر آگ کا مطلق اثر نہ ہوتا اور دشمن آگ کے خوف سے دور ہی دور رہتا۔ یہ فن لکھنؤ کے نچلے طبقے میں مروج تھا۔ اس کے نقوش اب بھی پائے جاتے ہیں [3]

---

[1] گذشتہ لکھنؤ ص ۱۵۸-۱۶۰ [2] ایضاً ۱۶۲ نیز OBSERVATIONS etc. 218-19

[3] ایضاً / ۱۶۰-۱۶۱

تیر اندازی یہ فن اودھ میں دہلی سے پہونچا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں استاد فیض بخش اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ انہوں نے نواب کے ایما سے مرزا حیدر کے والد کو جو ہاتھی پر سوار آرہے تھے، ایسی پھرتی سے تیر مارا کہ نہ کسی نے ان کو نشانہ لگاتے دیکھا اور نہ انہیں خبر ہوئی[۱] اودھ کے دوسرے قصبوں میں بھی اس فن کے ماہرین پائے جاتے تھے۔ میر غلام نبی بلگرامی در تیر اندازی کمال مہارت داشت۔[۲]

کٹار اپنی جان کی حفاظت کے لیے عام طور پر مسلمان اپنے ساتھ کٹار رکھتے تھے۔ کٹار چلانے کی فنی تربیت کسی استاد کی شاگردی اختیار کرکے حاصل کی جاتی تھی۔[۳]

جل بانک یہ شناوری اور تیراکی کا فن تھا۔ اس فن کا مقصد گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کرنا تھا۔ اس کو باندھ کر باہر لانا یا اس کا وہیں کام تمام کر دینا۔ لکھنؤ میں میرک جان اس فن کے استاد تھے، انہوں نے سیکڑوں شاگردوں کو اس فن کی تعلیم دی تھی[۴]

گھوڑ دوڑ بقول مسز میر حسن علی گھوڑ دوڑ کا شوق متول گھرانے کے نوجوانوں میں انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوا تھا۔

گذشتہ لکھنؤ/۱۶۷-۱۶۱، نیز: ۲۱۹-۲۰ OBSERVATIONS-219-20
دریائے لطافت (فارسی)، ص ۳۷ [۲] تذکرۃ الشعرا/۱۰۲، تذکرہ بے نظیر/۱۴۸ الف
[۳] گذشتہ لکھنؤ/۱۶۲
[۴] برائے تفصیل دیکھیے گذشتہ لکھنؤ/۱۶۳، فسانۂ عجائب/۸

— لکھنؤ والوں کو اس میں بہت زیادہ دل چسپی پیدا نہیں ہوئی تھی لہٰذا وہ گھوڑ دوڑ سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہوتے تھے [۱]

گھوڑے اور ہاتھی کی سواری متول خاندان کے نوجوانوں کو گھوڑے اور ہاتھی کی سواری کرنے کی خاص طور پر مشق کرائی جاتی تھی۔ یہ سواریاں میدان جنگ کے علاوہ سفر کے لیے بھی استعمال میں آتی تھیں [۲]

تلوار چلانا قرون وسطیٰ میں تلوار کو ایک حربہ کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل تھی اور میدان جنگ میں تلواروں کی جنگ ہوتی تھی۔ اس لیے فوجیوں اور شہزادوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی علاوہ ازیں جو لوگ مگدر چلانے کے مشاق ہوتے تھے وہ تلوار چلانے میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ یہ ایک ورزش بھی تھی۔ [۳]

بچوں کے کھیل

آنکھ مچولی انشار کے بیان کے مطابق لکھنؤ میں "آنکھ مچولی" کا کھیل کھیلنے کا عام رواج تھا۔ [۴] قیاس کہتا ہے کہ اودھ کے دیگر

---

۱ OBSERVATIONS ETC. 220-224 دریائے لطافت (ن) ص ۴۵

۲ ایضاً ۲۱۸ ۳ ایضاً ۲۱۸

۴ دریائے لطافت ذات ۲ ص ۲۳

اضلاع میں بھی یہ کھیل عام ہوگا۔ اس عہد کے شعراء کے کلام میں بچوں کے کھیلوں کے ذکر کے سلسلے میں آنکھ مچولی کے موضوع پر اکثر شعر مل جاتے ہیں۔

ہے تب مزا کہ آنکھ مچولی کے کھیل میں ؛ ہمسن کئی ہوں لڑکے پری رو صنم کیساتھ
دالان میں ہر ایک کو دوڑلے اور مجھے ؛ چپکے سے یوں کہے تو لپٹ رہیو تم کیساتھ
پھر چور چور کہہ کے پکڑلے جو میرا ہاتھ ؛ دے منہ سے موںھ ملا دیں لطف کرم کیساتھ [1]

جھولا ساون کے مہینے میں بچوں اور عورتوں میں جھولا جھولنے کا عام رواج پایا جاتا تھا۔ انشا کے کلام میں اس موضوع پر کثرت سے اشعار ملتے ہیں:۔

ہے بندھا مینھ کے تار کا جھولا ؛ کیوں نہ لے جھونٹے یار کا جھولا [2]
چل نہ امروں میں جھولیں لیں درختوں کی ہوا ؛ چھا گئی کالی گھٹا ہے تیرہ بختوں کی ہوا
جھولتے ہیں یہ جھولے میں سو کہتے ہیں مجھے ؛ ایک دھکے پہ تجھے برسوں جھلا سکتے ہیں
ہزار حیف کہ باغوں میں جاکے اب کے سال ؛ ہم نہ جھول سکیں ہم تم اور ساون جائے
لگی ہے مینھ کی جھڑی میں چلو جھولیں ؛ کہ جھولنے کا مزا بھی اسی بہار میں ہے

گیندہ بازی بچے اور جوان عورتیں باغوں میں جاکر گیندہ کے پھول سے کھیلا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی بچے گیندہ

---

[1] کلیات انشا/۱۲۰ نیز دیکھیے دیوان حسرت ص ۱۴۹ الف، دیوان مصحفی ہفتم (ق.پ، ۱۷۵/ب) [2] ایضاً/ ۱۵، ۱۹، ۹۰، ۱۵۹، ۱۷۹

فسانۂ عجائب/۷

سے پھولوں سے کھیلتے نظر آتے ہیں :۔

گیند بازی میں مہارت ہے یہ تجھکو کہ تری
گومتی پار تلک پہونچی ہے اب وار کی گیند[1]

زعفرانی رنگ آتا ہے نظر صحن چمن
گیندہ بازی کو جو ہیں مشغول طفلاں[2]

بھانڈ، بھگتیے اور نقال اور لطیفہ گو ان پیشہ وروں کا ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے۔ بقول انشاء اللہ خاں دہلی کی تباہی کے بعد یہ پیشہ ور فیض آباد اور لکھنؤ آ گئے تھے اور عوام و خواص کے لیے تفریحی سامان مہیا کرتے تھے۔ انشاء نے لکھا ہے "چونکہ سپاہی اور مصاحب پیشہ، لطیفہ گو۔ اور نقال، گانے بجانے والے اور قصہ خواں جو لکھنؤ میں ہیں سب دہلی سے آئے ہوئے ہیں۔ اس جم غفیر میں کوئی بھی ایسا ہے جس کے بزرگوں کے مکان کو لکھنؤ میں بنے سو سال کا زمانہ گذر چکا ہو؟ راقم کے دیکھنے میں ایک مکان بھی ایسا نہیں آیا کہ اب سے پچاس برس قبل کا بھی بنا ہوا ہو اور شاہجہان آباد سے منسوب ہو۔"[3] مگر ان تمام پیشہ وروں میں تمام کے تمام دربار اودھ سے وابستہ نہیں ہوں گے۔ ان میں بہت سے عوام کو تفریحی سامان مہیا کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ

---

[1] کلیات انشاء، ۴۶

[2] دیوان مصحفی ہفتم، ق۔ پ، ۶۳ ب

[3] برائے تفصیل دیکھیے۔ دریائے لطافت (ا۔ ت) ص ۱۱۷ - ۱۱۸

کے زمانے میں اس فرقے کے اکثر لوگ دربار سے وابستہ تھے[1] لیکن نواب آصف الدولہ کے زمانے میں اقتصادی زبوں حالی کا دور دورہ شروع ہوا اور ان میں اکثر وبیشتر بے روزگار ہو گئے تھے۔ اس فرقے کے لوگ بازاروں، شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں کے موقعوں پر اپنے کرتبوں کے ذریعہ زر معاش تحصیل کرتے تھے۔

فیض آباد اور لکھنؤ کے بازاروں میں بھانڈ اور بھگتیے جم غفیر کو اپنے کرتبوں سے محظوظ کرتے۔

فرقۂ دارباز نٹوں کا فرقہ خالصتاً ہندوستانی تھا اور فرقے کے تمام افراد ہندو تھے۔ بعد میں ان میں سے کچھ خاندانوں نے اسلام مذہب اختیار کر لیا تھا[2] نٹ اور نٹنیاں اپنے مختلف کرتبوں سے ناظرین کے لیے تفریحی سامان مہیا کرتے تھے۔ اور بالعموم شادیوں میں ان کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں[3] لکھنؤ میں ایک پیشہ ور فرقہ دارباز کے نام سے پایا جاتا تھا یہ فرقہ نٹوں کے فرقہ کی ایک شاخ تھا۔ مرزا قتیل نے ان کے کرتبوں میں سے ایک کرتب کا ذکر ان سطور میں کیا ہے:-

ایک دن فرنگی دوستوں میں سے ایک شخص پالکی میں بیٹھا ہوا جارہا

---

1. بہار گلزار شجاعی/۲۰۱ ب۔
2. ایضاً/۲۴۷ الف، ۱۱۲ ب، مجموعہ مثنویات میر حسن/۲۳
3. برائے تفصیل راقم الحروف کا مضمون، "ہندوستان کے بازی گر" آج کل۔ اپریل، مئی ۱۹۶۲ء ملاحظہ ہو۔ [4] بہار گلزار شجاعی/۱۷۴ ب

تھا کہ ایک دار باز دائیں طرف اور ایک بائیں طرف سے ظاہر ہوا اور زمین سے بلند ہو کر پالکی کے اندر سے اِدھر اُدھر اس طرح کود کر نکل گیا کہ اس کا بدن پالکی سے نہیں لگا۔ اور دوسرے ساتھی کی گردن پر جا بیٹھا۔ اگر پالکی ٹھہری ہوتی تو اتنی حیرت اور تعجب کی بات نہ تھی۔ ہر چند اس صورت میں بھی سوائے دار باز کے اور کوئی شخص اِدھر سے اُدھر نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ اور کہاروں کے بھاگنے کی حالت میں تو، جب کہ آہستہ چلنا ان کی موت کے مترادف ہے، ایسا شعبدہ صوفیوں کے خوارقِ عادات سے کم نہیں ہے یا جادوگر ایسا کر سکتے ہیں"۔ [1]

جرہ باشہ دار بازوں کی طرح ایک دوسری جماعت جرہ باشوں[2] کی تھی۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں جہاں امیروں اور اربابِ کمال کا مجمع ہو، یہ لوگ بھی مل جاتے تھے۔ وہ اپنے شعبدوں کے ذریعہ اپنی روزی کماتے تھے۔ کسی امیرزادے یا شریف زادے یا کسی اور کے اشارے پر انعام کے لالچ میں سڑک پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور تماشا کوٹھوں پر ہوتے تھے۔

جرہ باشوں کی اصطلاح میں محرمِ راز کو داغی کہا جاتا تھا۔ راہ گیروں میں سے کوئی ایک شخص جرہ باشہ کے قریب جاتا، اس کا بشرہ دیکھ کر اپنا احوال بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ جو بالکل بے بنیاد اور من گھڑ

---

[1] ہنفت تماشا / ۱۸۹

[2] ایضاً / ۱۸۹

ہوتا تھا۔ مثلاً وہ کسی سے کہے گا میں سال بھر یا دو سال یا چھ ماہ پہلے فلاں شخص کا مصائب تھا اور فلاں سفر میں، ایک صبح کو دریا کے کنارے جا رہا تھا۔ اچانک ایک باؤلا گیدڑ میرے پیچھے آیا اور اس نے میرے پیر میں دانت گاڑ دیئے اور بھاگ گیا۔ میں اسی وقت دیوانہ ہو گیا اور رنگ برنگ کے جھاگ میرے منہ سے نکلنے لگے۔ اور باؤلوں کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگا۔ اور جو کوئی شخص بھی سامنے آتا اس پر حملہ کر دیتا تھا۔ اور کاٹ کھاتا تھا۔ اس کے سوا ان کی اور حرکتیں یہ تھیں کہ بعض جرے کسی رہ گیر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کے کان میں کوئی بات کہتے تھے، جسے سن کر وہ کپڑے اتار ڈالتا تھا۔ اور ننگا ہو جاتا تھا۔ پھر اُسے جرہ حکم دیتا تھا کہ گھوڑا بن کر چل پھر اس کی پیٹھ پر زین کس دیتا تھا اور جب ان کاموں سے نمٹ جاتا تھا تو پھر اشارہ کرتا تھا کہ وہ کپڑے زیب تن کر لے اور اپنا راستہ لے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں جروں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے یعنی پوری پوری پلٹن کو بھگا دیا تھا۔[1]

ایک دوسرا فرقہ بہروپیوں کا تھا۔ اس فرقے کے لوگ حسب خواہش ہر روپ میں ظاہر ہو جاتے تھے اور یہاں تک کہ جانوروں میں سے کسی جانور کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اور تماشبینوں میں سے کوئی شخص اس کی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ مرزا قتیل کا بیان تو یہاں تک ہے کہ وہ لوگ

---

[1] برائے تفصیل دیکھیے۔ ہفت تماشا ۱۸۹/ ۱۹۴

روپ بھرنے میں اتنے مشتاق تھے کہ کسی شخص کا روپ کے رات بھر اسکی بیوی کے ساتھ مباشرت کرتا رہتا تھا۔[1] یہ بات مبالغہ معلوم ہوتی ہے۔

قصہ خواں دہلی کے مہاجرین لطیفہ گویوں، نقالوں اور قصہ خوانوں نے لکھنؤ اور فیض آباد آکر یہاں کے معاشرہ میں قصہ خوانی کو مروّج کیا۔ اسی زمانے میں مثنویوں کے علاوہ یہاں کی مجالس میں کہانیاں لکھی جاتیں تھیں۔ انشاء نے سلکِ گوہر اور رانی کیتکی کی کہانی، کہانیاں لکھیں ان کے علاوہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھی فسانۂ عجائب کی تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے سرور نے لکھا ہے:

"حسبِ اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق و محبّان صفاکیش و موافق باہم بیٹھا تھا۔ مگر نیرنگی زمانہ ناہنجار و کجروی فلک سفلہ پرور دون نواز جفا شعار سے سب بادل حزیں و زار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور کثرت حرمان و افکار سے کہ ہر دم یہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے انہوں نے کہا...... اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی ہو...... یہ فسانہ انہیں بہت پسند آیا اور کہا کہ بدلجمعی تمام تو اس قصہ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم اور تحریر کردے"[2]

---

[1] ہفت تماشا / ۱۹۲ - ۱۹۶

[2] فسانۂ عجائب / ۱۴ - ۱۵

ان حالات کے تحت ۱۲۴۰ھ میں درمقام کان پور یہ کہانی مکمل کی گئی،
دوسری کہانیوں میں چار چمن مصنفہ عاجز، جو دورِ سعادت علی خاں میں لکھی گئی
اور گلدستۂ عجائب رنگ، مصنفہ حکیم جعفر علی مروت عرف حکیم بچھو ساکن سنبھل
نواب نصیر الدین حیدر کے عہد میں ضبطِ تحریر میں آئی، قابلِ ذکر ہیں[1]
مختصر یہ کہ لکھنؤ کی تعلیم یافتہ عورتیں اور مرد اور بالخصوص امرا اور ان کے
محل کی مستورات فرحت بخش اور ادبی کتابیں اور قصے کہانیاں پڑھکر اپنا
دل بہلایا کرتے تھے۔ مسز میر حسن علی کا بیان ہے کہ " اونچے مردوں اور
عورتوں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ بستر استراحت پر دراز ہو جاتے ہیں۔
تو انہیں نیند کے لئے قصے کہانیاں سنائے جاتے تھے[2]
انشا کے دو شعروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصۂ صنوبر گل بہت
دل عزیز تھا اور ان قصوں کے سننے کا واحد مقصد بے فکر ہو جانا اور نیند لانا تھا

ہاں کس طرح وہ قصہ صنوبر بہ گل چہ کرد
اے قصہ خواں ادھوری نہ یہ داستاں چھوڑ[3]

---

[1] مرزا قتیل نے کتاب افسانۂ عربی کے ترجمے اور افسانۂ زعفران پری کا ذکر کیا ہے۔
اول الذکر کتاب کا ترجمہ خود مرزا قتیل نے کیا تھا۔ رقعات مرزا قتیل / ۴۲۔ افسانۂ زعفران
پری کا مصنف مرزا اماجی تھا اور یہ افسانہ فارسی زبان میں تھا۔
ایضاً / ص ۴۵

[2] OBSERVATIONS etc. 251

[3] کلیات انشا / ۷۲

قصّہ خواں نیند جو تھوڑی سی بھی آجائے تو دوں
جوڑی سونے کے کڑوں کی بجھے کم خواب پہ رکھ[1]

سید احسان حسن بن میر حسن دہلوی "در فن افسانہ گوئی رونق تمام پیدا کردہ"[2]

حقّہ اور پان

لکھنؤ اور فیض آباد اور اودھ کے دیگر اضلاع کے عوام و خواص بالعموم حقّہ پیا کرتے اور پان کھایا کرتے تھے۔ محرم کے زمانہ میں شیعہ عورتیں اور مرد پان اور حقہ نوشی سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ مسز میر حسن علی کا بیان ہے "پان فرحت بخش پان جو اس ملک کے باشندوں کے لیے سب سے بڑی فرحت بخش شے ہے (محرم کے بعد) بازار میں نظر آنے لگتے ہیں۔ جس کو دیکھ کر ہر طبقے کے لوگوں کی نظروں کو فرحت اور دل کو مسرت حاصل ہوتی ہے، جو اس تھوڑے سے پرہیزگاری کے وقفہ کے بعد بڑے چاؤ سے کھایا جاتا ہے"[3]

شاہ عبدالرزاق بانسوی پان اور اس میں تمباکو بھی کھاتے تھے۔[4]

---

[1] کلیات انشاء / ۱۲۲

[2] ریاض الفصحا / ۳۰۷

[3] برائے تفصیل دیکھیے OBSERVATIONS PP. 57, 177, 78 نیز ملاحظہ ہو۔ ثمرات البدائع۔ اس سلسلے میں خط ہیں۔ مہمانوں کو رخصت کرتے وقت پان پیش کیا جاتا تھا۔ ص ۳۰۔۳۱۔ چہار گلزار شجاعی / ۱۳۵ الف و ب ملفوظ رزاقی / ۲۲۸

[4] ملفوظ رزاقی / ۹۷

سحر البیان، گلزار ارم، اور فیض آباد اور لکھنؤ کے تمام شعراء کے کلام میں پان کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ [1]

نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں حقہ پیا کرتے تھے۔ آخر الذکر کے بارے میں مرزا قتیل نے لکھا ہے "از حضور بردار تقید بسیار است بجائے حقہ بلکہ نوشتہ اند ہیچوا ہید کہ من نان خشک خوردہ باشم. یکحقہ بردار کہ سولئے اینکہ آتش بسر قلیان بگذارد و دیگر ہیچ سلیقہ دریں کار نداشتہ. لیکن قدرے خوش ظاہر و جوان باشد" [2]

ملا نظام الدین سہالوی [3] اور حضرت شاہ سید غلام دوست بن شاہ عبد الرزاق حقہ پیا کرتے تھے۔ [4] مرزا قتیل خود حقہ پیا کرتے تھے۔ اور سبحان علی خاں نے موسوم کے لیے کان پور سے حقہ بردار مہیا کیا تھا [5]

طوائفیں اور نچلے درجے کی عورتیں بھی حقہ پیا کرتی تھیں میر حسن دہلوی نے طوائفوں کے بارے میں لکھا ہے

---

[1] مرزا قتیل نے ڈلی، سپاری، الائچی، چکنی ڈلی، کشنیز کا ذکر کیا ہے۔ رقعات مرزا قتیل /۴۷، ۵۹،

[2] رقعات مرزا قتیل /۳۸

[3] ملفوظ رزاقی /۱۵۳

[4] ایضاً /۱۸۷

[5] ایضاً /۳۳ - ۳۵

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقے کے لیے [1]

شاہ کمال نے حقہ نوشی پر ایک قطعہ کہا تھا:۔

دھرا تھا سامنے حقہ جو فرشی — لگے کہنے کہ پی پیتا ہے تو پی
اوٹھا منہال میں نے کھول نیچا — لگا کر منہ سے ایک دم جو نہی کھینچا [2]

رقص وسرود دہلی کے اجڑے ہوئے ارباب کمال میں ارباب رقص وسرود بھی فیض آباد اور لکھنؤ پہونچے [3] دیگر ارباب کمال کی طرح ارباب رقص وسرود کو بھی دربار اودھ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اور یہاں کی فارغ البالی کی وجہ سے اس فن کو کافی فروغ نصیب ہوا۔ جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ نواب شجاع الدولہ بذات خود فن موسیقی میں دسترس رکھتا تھا [4] اس نے ہزار ہا گانے والی طوائفوں کو جن میں سے اکثر و بیشتر دہلی اور دیگر بلاد سے بلا کر اپنے ہاں جمع کر لیا تھا [5] عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ نواب شجاع الدولہ کی قدردانی اور فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین میں اکٹھا کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں اودھ میں قدیم الایام سے اجودھیا اور بنارس میں موسیقی کے

---

[1] مجموعۂ مثنویات میر حسن ر ۱۲۴، ثمرات البدائع ر ۳۸-۴۰، کلیات انشا ر ۷۹، ۱۴۶؛ ۲۰۶
[2] تذکرہ مجمع الانتخاب / ۳۱۶ الف، دیوان مصحفی دوم (رام پور) / ۲۰ ب
[3] دریائے لطافت (ا۔ ہ) ص ۱۱۷۔
[4] چہار گلزار شجاعی / ۲۲۳ الف [5] تاریخ فرح بخش ۱۱ ص ۱۰۹

قدیم اسکول قائم تھے۔ جونپور کے شرقی سلاطین کی قدر دانی کی کچھ نہ کچھ
یادگاریں باقی تھیں۔ ان میں جب دہلی کے باکمال گویئے اور تان سین خاں
کے مستند اسکول کے استادانِ موسیقی بھی آکر مل گئے تو ایک خاص
شان پیدا ہوگئی اور موسیقی کا در اصل ایک نیا دور شروع ہوگیا[1] بلگرام کی
سرزمین میں فنِ موسیقی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ سجان رائے بھنڈاری کا
بیان ہے:۔

"اکثر مردم آنجا خوش فہم و سرود سرا ہستند" [2]

یہاں کے مشہور گویّے ہوتے ہیں[3]

نواب آصف الدولہ نواب وزیر علی خاں اور سعادت علی[4] خاں کو بھی
رقص و سرود سے بڑی دل چسپی تھی۔ ہدایت نے نواب آصف الدولہ کے گلشن محل
میں رقص و سرود کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

---

[1] گذشتہ لکھنؤ / ۲۰۰

[2] خلاصۃ التواریخ / ۴۴

[3] برائے تفصیل دیکھئے۔ سروِ آزاد / ۴۰۰، ۳۵۴، تذکرۃ الشعراء / ۱۰۲، ۱۰۵،
تذکرہ بینظیر / ۱۴۸ الف

[4] دیوانِ مہجور / ۲۳۳۔ ۲۲۴، نیز مجلسِ ہولی نواب سعادت علی خاں ایضاً / ۲۲۸۔
۲۳۰، دریائے لطافت (اردو) / ۸۱۔ ۸۲

دیکھے جدھر ہے خوشی سے ادھر کو ناچ رنگ
سُر سے ہے ڈھولک کے پکھاوج کے ہے سرعود و چنگ
بزم میں حاضر ہے اہل رقص ہر یک سبزہ رنگ
کوئی الاپے ہے بھباس اور کوئی بھیروں اس کے سنگ
صبح کو بولے ہے اس جا... طنبورے کا تار الف

نواب شجاع الدولہ کے عہد سے نواب سعادت علی خاں کے عہد تک امیروں کی رقص و سرود سے دلچسپی کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ نواب سالار جنگ[۱] " در علم موسیقی سرآمد روزگار خود بودند۔۔ و بہر جمعہ مجلس فرمودے موسیقی دانایان جمع گشتہ باظہار ہنرہا پرداختند "[۲]

فیض آباد اور لکھنؤ میں بالخصوص خالص ہندوستانی موسیقی کی بڑی ترقی ہوئی[۳]۔ انشا نے سندیلہ کے مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فارسی راگوں کے مقامات کو بخوبی جانتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ بھیروی بھباس، بھیروی، للت، رام کلی، کھٹ، گن کلی، بھٹیار، سگھرئی، سوہا، گوجری

---

[۱] نواب سالار جنگ بن محمد اسحاق خاں موتمن الدولہ، برادر کوچک افتخار الدولہ نواب مرزا علی خاں۔ دریائے لطافت (ا۔ت) ۱۲۵

[۲] تاریخ سعادت جاوید/ ۳۸۹

[۳] برائے تفصیل دیکھیے۔ گذشتہ لکھنؤ/ ۱۹۲۔ ۲۲۰۔ سرد آزاد/ ۳۵۴۔ ۴۰۰، تذکرۃ الشعرا/ ۱۰۲، ۱۰۵ دیوان جعفر/ ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۲۸ - ۲۳۰ - الف۔ ملاحظہ ہو کلیات میر/ ۷۸۰، ۷۸۲، ۷۸۶

گندھار، اساوری، توڑی، بلاول، الہیا، دیوگری، اور دوسری راگ اور راگنیوں کو خیال میں گاتے تھے۔ اس فن میں انہوں نے اپنے بہت سے شاگردوں کی تربیت کی تھی[1] مرزا بزرگ پسر مختار الدولہ "وربشہ بدیہفیا دارد من و مرزا حاجی برای شنیدن میر علی خاں خواہم رفت۔"[2]

لکھنؤ کے سازندوں اور گویوں کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے "کلاونت قوال بے مثال جھجو خاں غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال حصول شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے پٹے کا موجد ہوا سب کو معلوم ہے بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا۔"[3]

اس عہد کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند بخش[4] شجاعت[5] خاں محمد خاں[6]

---

[1] دریائے لطافت (ا۔ت) ص ۸۱۔۸۲

[2] رقعات مرزا قتیل/ ۳۷

[3] فسانۂ عجائب/ ۹ میر محمد پناہ نامی گرامی سازندے تھے۔ اچھا برس کلاونت سے تربیت پائی تھی۔ سراج الدین علی خاں کو دھرپت کی تعلیم دیتے تھے۔

[4] دیوان شاہ کمال/ ۱۶۹، ۸۵۳ (دھرپت کی تعلیم دیتے تھے) /عادر/۱۶۱، فیروز خاں، بین نواز تھے۔ دیوان ہجو/ص ۱۹۱

[5] ایضاً/ ۸۵۵

[6] ایضاً/ ۸۵۵

دیبی داس، جیون خاں[2]، مصاحب خاں، دھنو خاں[3]، اور میر ضاحک مشہور و معروف موسیقی دان تھے۔[4]

نوابین کی موسیقی سے دلچسپی اور ان کی قدر دانی کی وجہ سے نواب آصف الدولہ کے عہد میں "اصول النغمات الآصفیہ" کے نام سے ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی۔[5]

ناچنے والوں کے دو گروہ تھے۔[6] مرد اور عورتیں۔ ناچنے والے مردوں میں ایک ہندو کتھک اور رہس دھاری اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ۔ مگر اصلی ناچنے والے کتھک تھے۔[7]

رنڈیاں ناچنے والیاں ہندوستان کے ہر شہر میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن بقول عبدالحلیم شرر "جیسی باکمال ناچنے اور بتانے والی رنڈیاں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں شاید کسی شہر میں نہ ہوئیں ہوں گی۔ آج سے

---

[1] کلیات سودا ۱/ص ۳۳۳

[2] ایضاً ۱/ص ۳۳۳

[3] ایضاً ۱/۳۴۰

[4] ایضاً ۱/۳۳۳

[5] گذشتہ لکھنؤ/ ۱۹۷، ۱۹۸

[6] ہفت تماشا/ ۷۹۔۸۰

[7] برائے تفصیل دیکھیے گذشتہ لکھنؤ/ ۲۱۰۔۲۱۲، مجموعہ مثنویات میر حسن/ ۱۵۲

چالیس[1] سال پیشتر لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی "منصرم والی گوہر" نے کلکتہ میں جا کے نمود حاصل کی تھی۔ میں نے ایک محفل میں اس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو ایسی خوبی سے بتاتی رہی کہ حاضرین محفل اوّل سے آخر تک محو حیرت و سکوت تھے۔ اور کوئی بچہ بھی نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو۔ زہرہ اور مشتری شاعرہ اور صاحب کمال گانے والیاں ہی نہیں بے نظیر رقاصہ بھی تھیں۔ جدّن نے ایک مدت تک زمانے کو اپنے رقص و سرود کا گرویدہ رکھا ہے[1]

سعادت یار خاں رنگین نے عزیز[2] طوائف اور مہتاب کے رقص و سرود کا بڑے پُر لطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ آخر الذکر کے رقص کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"در لکھنؤ بہ شادی پسر رام رتن مودی بادشاہی بندہ و ابوالحسن خاں بر پشت بام نشستہ بودیم و در و بروے مجلس زن مہتاب نام طوائف واقعی بہتر از ماہ بود، بکمال خوبی مجرامی نمود۔ چوں طرف او نگاہ کردم، دل از دست رفت۔ بدیہہ ایں مطلع گفتم و بآواز بلند از بیقراری خواندم ؏

تھی شعلہ یا وہ برق کہ جی میرا جل گیا
ایسی ہی کی نگاہ کہ بس دم نکل گیا[3]

---

[1] گزشتہ لکھنؤ / ۳۱۷ [2] وہ شاعرہ بھی تھی اور عزیز تخلص اپنایا تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے اس کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے۔ مجالس رنگین۔ ص ۰۷

[3] مجالس رنگین / ۴۲

اودھ میں تین قسم کی رنڈیاں پائی جاتی تھیں۔ کنچنیاں جو بنیادی طور سے رنڈیاں تھیں اور ان کا پیشہ بالعموم عصمت فروشی تھا۔ ان کا اصلی وطن پنجاب اور دہلی تھا لیکن نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں اودھ میں وارد ہوئی تھیں۔ دوسری چونے والیاں۔ ان کا پیشہ چونا بیچنا تھا مگر بعد میں بازاری پیشہ ور عورتوں میں شامل ہو گئیں۔ اس گروہ میں چونے والی حیدرا اپنی سریلی آواز کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ وہ اپنی برادری کی رنڈیوں کی سردار تھی اور تیسری ناگرنیاں[1] ان گروہوں کے علاوہ میر حسن دہلوی نے خانگیوں[2] اور کسبیوں[3] کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن دہلوی نے ایک مثنوی میں جوانہوں نے قاسم علی خاں کی محفل شادی کے موقع پر لکھی تھی۔ اس موقع پر نظر علی نامی ان کے دوست نے ان سے فرمائش کی جو طوائفیں وہاں موجود تھیں ان سب کے بارے میں علحدہ علحدہ فردیات لکھی جائیں۔ لہٰذا انہوں نے "در تعریف طوائف بنام ہر یک علحدہ فردیات لکھیں۔ ان میں مندرجہ ذیل کے نام موجود ہیں:۔

راجہ، جیونی، جلالو، ماہ رتن، فیضو، نقی، پنا، مصری، نور بخش، مانی، حمیت، دردانہ، اجاگر، الہی بخش، گوجری، ناجی، فیض بخش، دودی،

---

[1] گذشتہ لکھنؤ / ۲۱۷-۲۱۸

[2] فاحشہ عورتیں جو گھر میں بیٹھ کر اور پردہ دار بن کر پیشہ کرتی تھیں۔ مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۲ (فٹ نوٹ ۴)

[3] رنڈیاں۔ بازاری عورتیں۔ / ایضاً ۱۵۲ (فٹ نوٹ ۵)

واصلا، چوری، دولت آبادی، نورا، ظہورا، دل وجان، سبزہ، چت لگن، کاکو، مستم یار، اوجاگر، (دو بارہ) رکھی، نادرا، کریم بخش، برنی، مصری (دوبارہ) راجہ (دوبارہ) [1]

مرزا قتیل نے لکھنؤ کی طوائفوں میں سے جگیا، امیر بخش، بی بی مغلانی، بی بی گلو کے نام لکھے ہیں۔ کلیات انشا میں امیر بخش طوائف پر ایک شعر موجود ہے

بازاروں میں رنڈیوں کے اڈے ہوتے تھے۔ وہ پیشہ بھی کرتی تھیں اور رقص و سرود سے بھی روزی کماتی تھیں۔ فیض آباد کے بازار کے ضمن میں میر حسن لکھتے ہیں۔

کہیں ہیں رنڈیاں ہی ماہ پارہ انھوں کا کرتا ہے کوئی نظارہ [2]

میلہ ٹھیلوں کے موقعوں پر بھی رنڈیاں مع اپنے ڈیروں کے جاتی تھیں اور تماشہ بینوں کو محظوظ کرتی تھیں۔

فیض آباد میں لال باغ کے میلے کے موقع پر۔

ہزاروں خانگی اور کسبی آکر کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر [3]

مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے نصف اول تک لکھنؤ میں رنڈیوں کے رقص و سرود کی بڑی گرم بازاری تھی۔ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:-

---

[1] میر حسن اور ان کا زمانہ / ۳۰۱، ۳۰۲

[2] مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۲

[3] برائے تفصیل دیکھیے مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۳، ۱۵۹

"وہ رنڈیاں پری شمائل زہرہ پیکر مشتری خصائل، اس ناز و انداز سحر کرامات غمزۂ عشوہ اداگات بانکی کہ ہاروت و ماروت تو کیا معاذ اللہ اگر سب فرشتے عرش سے فرش خاک پر آئیں اُن کی چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں۔ گھر بھر ان سے زانو بزانو بیٹھے۔ توبۂ نصوحا ٹوٹے ان کا دروازہ نہ چھوٹے، لولی چرخ ان پر نثار ہے۔ ہر ایک حور کردار ہے"[1]

ادبی سرگرمیاں

نوابان اودھ کو شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ خود شعر کہتے تھے اور شعراء کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ نواب سعادت خاں برہان الملک کی فطرت شاعرانہ تھی۔ امین تخلص اختیار کیا تھا۔ ریاض الشعراء مصنفہ علی قلی خاں داغستانی میں ان کے کچھ اشعار نقل ہوئے ہیں[2] ان کے دربار سے کئی فارسی گو شعراء منسلک تھے۔ مثلاً میر امام قلی خاں حشمت[3]، سید محمد فدائی[4]، شیخ عبدالرضا متین[5]،

[1] فسانۂ عجائب/ ۹ [2] خزانۂ عامرہ/ ۴۶، سفینۂ ہندی/ ۳۴-۳۶، نتائج الافکار/ ۵۱، مخزن الغرائب ۱/ ۱۲۶-۱۲۸، تکملۃ الشعراء (قلمی رام پور) ص ۶۶-۶۷
[3] مخزن الغرائب ۱/ ۷۹۴-۷۹۵، نتائج الافکار/ ۱۶۶، عقد ثریا/ ۲۱، خزانۂ عامرہ/ ۲۴۶-۲۴۷، نشتر عشق (قلمی) ص ۴۲۷ [4] سفینۂ ہندی/ ۱۵۹

(بقیہ حاشیہ صفحہ پر دیکھیے)

علی قلی خاں والہ[۱]، آقا عبدالعلی تحسین[۲]، محمد رحیم خاں[۳]، میرزا محمد علی سخا[۴]، میر عبدالعلی طالع[۵] اور میر غلام نبی بلگرامی غلام[۶]

آزاد بلگرامی کی تحریر کے مطابق نواب صفدر جنگ کو علم و ادب سے کوئی دل چسپی نہیں ہونی چاہیے تھی[۷] لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر نواب کو علم و ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ شعراء اور علماء کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ شاہ باسط[۸] کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی اس سے محسوس

(بقیہ حاشیہ صفحہ کا)

۱۲ سفینۂ ہندی ۱۸۹۔۱۹۰، تذکرۂ مردم دیدہ/ ۹۰۔۹۱، سرو آزاد/ ۲۲۶۔۲۲۷، عقد ثریا/ ۵۱، خزانۂ عامرہ/ ۴۲۶۔۴۲۷ تذکرہ نتائج الافکار/ ۵۱۷۔ مخزن الغرائب (قلمی) ۱۱/ ۴۲۴

---

۱ سفینۂ ہندی/۲۳، عقد ثریا/ ۶۱، سفینۂ خوشگو/ ۲۹۳۔۲۹۴، خزانۂ عامرہ/ ۴۴۶۔۴۵۰

۲ سفینۂ ہندی/ ۴۱، سفینۂ خوشگو/ ۲۶۶، ۲۶۷، عقد ثریا/ ۱۸، تذکرہ ید بیضا (قلمی) ۴۲ ب

۳ ایضاً/ ۹۳، مخزن الغرائب (قلمی) ۱/ ۳۶۶

۴ ایضاً/ ۱۰۹، سفینۂ خوشگو/ ۱۹۳۔۱۹۴

۵ ایضاً ۱۲۸، سفینۂ خوشگو/ ۶۴، تذکرہ ید بیضا/ ۱۱۴ ب

۶ سرو آزاد/ ۳۱۲۔۳۱۳

۷ ماثر الکرام ۱/ ص ۲۲۱۔۲۲۲

۸ خواجہ جعفر کے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب خواجہ علاء الدین عطار تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں سے کوئی شخص ماوراء النہر سے ہندوستان آیا تھا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۰ پر دیکھیے)

ہوتا ہے کہ نواب کو تصوف سے بھی کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور رہا ہوگا۔ حالانکہ اس زمانے کا یہ عام دستور تھا کہ عوام و خواص کسی نہ کسی بزرگ سے بیعت ضرور کرتے تھے، کیونکہ ان کی فلاح و بہبود کا انحصار شیخ کی دعاؤں پر تھا۔ ان کے علاوہ شیخ محمد حسن (ایرانی)، سید زین العابدین طباطبائی (مشہدی)، سید محمد علی اورنگ آبادی میر غلام نبی بلگرامی[ا]، ملک العلماء مولوی فضل اللہ خاں[۲]، مرزا علی نقی جو نواب شجاع الدولہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷۹ کا)

اکبر آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اسی شہر میں خواجہ باسط تولد ہوئے۔ اپنے چچا صمصام الدولہ خاندوراں خاں کی سرپرستی میں خورد سالی میں دہلی پہونچے۔ وہیں ان کی نشو ونما ہوئی۔ اپنے والد کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ جب دہلی میں سیاسی افراتفری اور اقتصادی زبوں حالی کا دور دورہ شروع ہوا تو شجاع الدولہ کی درخواست پر لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں سے فیض آباد پہونچے۔ وہیں وفات پائی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد حضرت نصیر خلیفہ و سجادہ نشین ہوئے۔ دستور کے مطابق مجلس سماع منعقد ہوتی رہی۔ بھگوان داس ہندی کو ان مجالس میں شرکت کا شرف حاصل ہوا تھا۔
ملاحظہ ہو۔ سفینۂ ہندی/ ۳۳، ۳۷، مرقع دہلی/ ۶۸۔ ۶۹، مجموعۂ مثنویات میر حسن/ ۱۴۵۔۱۴۶، میر کی آپ بیتی/ (ذات) ۹۰۔

[ا] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مآثر الکرام ا/ص ۲۹۹۔۳۰۱، تذکرہ نتائج الافکار/ ۱۴۰۔۱۴۱، سرو آزاد/ ۲۷۱

[۲] تذکرہ علمائے ہند/ ۵۲۔۵۳

کے اتالیق تھے۔[1] قاضی احمد علی سندیلوی[2]، مولوی احمد حسین لکھنوی[3] ملا باب اللہ جونپوری[4]، مولوی محمد اعظم قاضی زادہ سندیلہ، مولوی عبداللہ[5] ابن مولوی زین العابدین مخدوم زادہ سندیلہ، درمرید شاہ عبدالباسط امیٹھوی، میر سید محمد بن سید احمد[6]، اور سید محمد اشرف[7] ان کے دربار سے وابستہ تھے۔

محمد علی خاں نے نواب صفدر جنگ کی شعراء پروری کے سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے نہ صرف نواب موصوف کے شعری ذوق کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کی دریا دلی اور سخاوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دن نواب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جاتے ہوئے لال قلعہ دہلی میں رواں دواں نہر فیض کی روانی کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ٹھہر گئے۔ چوں کہ وہ منظر بہت دل کش تھا لہٰذا نواب کچھ دیر کے لیے تخیلات کی دنیا میں کھو گئے۔ اس موقع پر نواب کے ہمراہ مرزا اعظمی[8] اصفہانی

---

۱ عماد/۵۲، سیر المتاخرین (فارسی) ۱/ص ۶۱۵، ۶۱۸ ۱۱۱/ص ۸۷۸

۲ تذکرۂ علمائے ہند/۲۰، ہفت تماشا/۱۷۳

۳ ایضاً/۱۳ (ملا احمد حسین فرنگی محلی)

۴ ہفت تماشا/۱۷۳

۵ تذکرہ علمائے ہند/۱۰۳

۶ ماثر الکرام ۱/ص ۱۰۵

۷ ایضاً/۱۹۲ ۸ تذکرہ انیس الاحباب (قلمی)، صفدر جنگ: خدمتش را از منہیات نگاشتہ، و درایک صحبت گرامی سعادت می پنداشتہ" ۸ ب

شاعر بھی موجود تھا۔ نواب نے اصفہانی سے حسب موقع شعر پڑھنے کو کہا۔ اصفہانی نے نواب کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

قد خمیدہ سد رہ گریہ ام نشد
ایں آب رفتہ رفتہ ز بالای پل گذشت

یہ شعر سن کر نواب کو بے حد مسرت حاصل ہوئی اور اس نے اصفہانی کو بطور انعام ایک گھوڑا مع سنہری ساز و سامان، اور پانچ ہزار روپے نقد عنایت کیے[1]

مرزا اعظمی اصفہانی کے علاوہ مرزا باقر حقیر[2]، میر محمد اسمٰعیل قربان[3]، شیخ محمد رضا متین[4]، میر فیض علی ناصری[5]، مرزا ابراہیم نور[6]، محمد یحییٰ خان خسرو[7]، مرزا عظیما اکسیر[8]، سید احمد، احمدی بلگرامی[9]، سید عظیم الدین[10] بن سید نجابت بلگرامی، اور سید غلام نبی بلگرامی محب[11] ہدایت علی خان ضمیر[12] نواب صفدر جنگ سے وابستہ تھے۔

---

[1] تاریخ مظفری ۱۱/ص ۲۹ (الف و ب)، [2] سفینۂ ہندی/۶۱
[3] ایضاً/۱۷۱ [4] ایضاً/۱۸۹-۱۹۰
[5] ایضاً/۲۴۴، ۲۵۵، سفینۂ خوشگو/۲۲۲، عقد ثریا/۱۹
[6] تاریخ مظفری ۱۱/۲۹ (الف و ب)
[7] تذکرہ مردم دیدہ/۱۶۱ [8] سفینۂ ہندی/۳-۴۔
[9] سرو آزاد/۳۳۲-۳۳۳ [10] ایضاً/۳۳۷-۳۳۸
[11] ایضاً/۳۳۸/۳۳۹ [12] عماد/۳۴

ان شعراء کے علاوہ دیگر شعراء کو بھی وقتاً فوقتاً انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ مرزا ابو علی ہاتف کو اس مصرعہ :۔

"مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت" کے عوض صفدر جنگ نے ایک بیش بہا خلعت اور گھوڑا عنایت کیا تھا۔ صفدر جنگ کے انتقال کے بعد ہاتف شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ اور تین سو روپے ماہانہ پاتے رہے[1]۔ شجاع الدولہ کی ولادت کے موقع پر رائے سناتھ سنگھ بیدار نے صاحبزادے کی تاریخِ ولادت کہی تو صفدر جنگ نے اُسے پانچ ہزار روپے عطا کیے[2]۔

نواب شجاع الدولہ کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور اس نے سراج الدین علی خاں آرزو کو دہلی سے بلاکر اپنے ہاں ملازم رکھا تھا اور تین سو روپے ماہانہ مقرر کر دیئے تھے۔ آرزو نے اپنی بقیہ زندگی فیض آباد اور لکھنؤ میں گذاری اور ۱۱۶۹ھ میں وہیں وفات[3] پائی۔ نواب نے مرزا سودا کو بھی مدعو کیا تھا لیکن پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا تھا مگر نامساعد حالات سے مجبور ہو کر فیض آباد چلے آئے تھے[4]۔ خان آرزو اور سودا کے علاوہ

---

[1] عقدِ ثریا / ۶۲ سفینۂ ہندی / ۲۴۰، ۲۴۱

[2] ایضاً / ۲۳، ۲۴

[3] تاریخ مظفری ۱۱ / ۱۴۴ الف، ۱۳۶ الف خزانۂ عامرہ / ۱۱۷، ۱۱۹، عقدِ ثریا / ۷، ۸

[4] تذکرہ ہندی / ۱۲۵، ۱۲۶، تذکرہ شعرائے اردو / ۳، ۸، تذکرہ بہار خزاں / ۶۴،

شیخ ثناء اللہ ثناؔ[1]، مرزا محمد سمیع ذرہؔ[2]، مرزا ابو علی ہاتفؔ[3]، مرزا احسن علی احسنؔ[4] شاہ واقفؔ، واقفؔ[5]، مرزا عنایت اللہ ساکنؔ[6] اور علی قلی والہؔ[7] جن کو نواب نے پرگنہ سندیلہ کا نصف حصہ بطور جاگیر عنایت کیا تھا میر فخرالدین ماہرؔ کو ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی[8]

نواب شجاع الدولہ کے صاحبزادے مرزا سیف علی خاں[9] شگفتہؔ خود شعر کہتے تھے اور سخن پرور بھی تھے۔ مرزا کاظم علی جوانؔ، منتظرؔ اور شاہ ملولؔ الہامؔ ان کے دربار سے منسلک تھے[10] دوسرے صاحبزادے نواب امیر الدولہ[11] عرف مینڈو کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا۔ ان شعراء کے علاوہ

---

[1] مخزن الغرائب/۴۸۰، صبح گلشن/۱۷۸، نتائج الافکار/۳۷، سفینۂ ہندی/۱۰۵

[2] عقد ثریا/۲۸، صبح ابراہیم (قلمی پٹنہ) ج ۱/ص ۳۲۲ الف

[3] ایضاً/۶۲، تذکرہ نتائج الافکار/۶۰۳

[4] تذکرہ شعرائے اردو/۱۶، تذکرہ ہندی/۱۷

[5] ایضاً/۱۹۰

[6] تذکرہ نشتر عشق/۷۷۸-۷۷۹

[7] کاشف الاستار/۴۲۰ ب

[8] مجموعۂ نغز ۲/۱۵۳

[9] سوانح سلاطین اودھ ۱/۲

[10] ریاض الفصحا ۱/۱۵۵

[11] سوانح سلاطین اودھ ۱/۲، مجموعۂ نغز ۱/ص ۷۲

شاہ واقف، میاں جراَت، مرزا گدا علی گدا، شیخ سعد اللہ سکندر وغیرہ شعرا فیض آباد میں موجود تھے اور "بازار شعر و سخن ہندی بسیار گرم بود"[1] نواب آصف الدولہ شعری ذوق رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ آصف تخلص[2] تھا۔ خاں آرزو سے تلمذ حاصل تھا۔[3] نواب نے شاہ کمال کو "دہ ہزار روپیہ نقد دیک دوشالہ الفی ویک رومال الفی" عنایت کیا تھا[4] نواب شاہ حیرت کا بڑا احترام اور ادب کرتے

---

[1] تذکرہ مجمع الانتخاب / ۲ ب

[2] تذکرہ ہندی / ۵، تذکرہ گلشن ہند / ۹۰۰، مجموعۂ نغز / ۳۵، ۳۶، تذکرہ گلشن سخن / ۵۱ تذکرہ طبقات الشعرا ہند / ۲۷۸، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے کہ اگرچہ شعر و شاعری مرتبہ شہنشاہی سے کم تر ہے لیکن شعرا کی قدر دانی کے خیال سے خود بھی فارسی اور ریختے میں آبدار موتیوں جیسے اشعار کہتے ہیں۔ آفتاب تخلص ہے ص ۲۷۔ مصنف ہذا نے غلطی سے شاہ عالم ثانی کا تخلص نواب آصف الدولہ کے نام سے منسوب کر دیا ہے اور اول الذکر کے تمام اشعار نواب کے کلام میں درج کر دیے ہیں۔ یہ مشہور قطعہ:۔ صبح تو جام سے گذرتی ہے ... نواب کے کلام میں درج ہے۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا / ۲۸، الف

[3] بعض تذکروں میں یہ بھی لکھا ہے کہ نواب کو بندہ علی خاں باسطی اور میر سوز سے بھی تلمذ تھا۔ عقد ثریا / ۱۵، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا / ۲۸ الف، ۲۸ الف تاریخ اودھ ۳۵۹/۲

[4] تذکرہ مجمع الانتخاب / ۵ الف

تھے[1] مختصراً نواب کے دربار سے رائے جسونت سنگھ دیوانہ[2]، سلام اللہ خان سلام[3]، مرزا صفی الدین محمد صفائی[4]، کرپا دیال عرف کنور سین مضطر[5]، خواجہ حسین علی روشن[6]، حکیم شفائی خان ارشد[7]، میاں منعم ندیم[8]، مرزا احسن علی احسن[9] وابستہ تھے اور اچھی خاصی تنخواہیں پاتے تھے[10]۔ نواب آصف الدولہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور بعض صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے عیش باغ کے مشاعرے کی صدارت

---

[1] مخزن الغرائب (قلمی)، ا/ص ۲۷۹

[2] عقد ثریا/۱۵

[3] ایضاً/۱۸ مخزن الغرائب ا/ایک فی البدیہہ شعر سن کر پانچ سو روپیہ انعام میں دیئے/ ۴۴۸، روز روشن/۲۵۲

[4] ایضاً/۳۶

[5] عقد ثریا/۵۷ (فٹ نوٹ ۱)

[6] تذکرہ شعرائے اردو/۷۴

[7] ریاض الفصحا/۱۷

[8] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/۴۴ب

[9] ایضاً/ا ب، میر فتح علی شیدا بھی نواب آصف الدولہ کے ہاں ملازم تھے۔ مجموعۂ نغز/ص ۲۵۶

[10] تذکرہ گلشن بے خار/۱۵

کی تھی [1]

وزیر علی خاں کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ وزیری تخلص کرتے تھے[2]
ان کا دورِ حکومت مختصر تھا اس لیے کسی تذکرہ سے یہ معلومات حاصل نہیں ہوتی کہ
ان کے دربار سے کون سے شعراء منسلک تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دربار سے مرزا قتیل[3]، میاں بشارت بشارت[4]
اور انشاء اللہ خاں وغیرہ شعراء وابستہ تھے۔

نوابان کے علاوہ ان کے امراء میں سالار جنگ، نواب محبت خاں، نواب
نواب خان عالم خاں، نواب شوکت جنگ سوزاں، راجہ ٹکیٹ رائے، جواہر علی خاں،
اور حسن رضا خاں شعراء اور ادبا، کے مربی تھے [5]

ہدایت[6] نے ذیل مخمسات میں اودھ کے ان امراء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے
سخن وروں کی سرپرستی کی تھی اور ان کے بعد شعراء کی بے قدری کا دور شروع ہوا۔

اول گویم قدر داں نواب حیدر جنگ — دوم نواب گویم امیرد ہ (کذا) داور جنگ
امیر ملک مروت سوم ہے صفدر جنگ — نہال گلشن توصیف کے گل خوش رنگ
سخن کے باغ کو آپ ثنا سے جن کے بہار (کذا)

---

[1] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/۴۴ ب

[2] تاریخ اودھ ۳/۳۸۶

[3] عقد ثریا/۴۶

[4] ریاض الفصحا/۵، تذکرہ گلشن ہند/۲

[5] میر حسن/۱۰۳ [6] تذکرہ شعرائے اردو/۱۹۶

کہاں ہے آہ وہ عبدالسلام خاں ساکبنہر — قیام دولہ نجلق و کرم امیر کبیر
سخی صاحب ایثار اور محبّ فقیر — غریب پرور و بندہ نواز با تدبیر
قدر شناس وسخن فہم و۔ ۔ گفتار
زیادہ ان کے پسران کے ہیں دلاور جنگ — امیر ابن امیر دکریم صاحب سنگ
نجلق ولطف و مروّت کرم سے نت یکرنگ — پھرا نہ گھر سے کوئی ان کے جاکر ہو دل تنگ
رہا ہمیشہ وہ خوش ان سے جو ملا ایک بار
گئے کدھر وہ مربی حسن خاں غازی — تھے ورسے جن کے غریبوں کو نت سرافرازی
سخا سے جنکے ملع خون بکہ جازی دکلذا) — جو گسفتہ بخشتے ہر ایک کو تازی
زیادہ غم ہے جن کے ثنا کے حرف شمار[۱]

سالار جنگ برادر نسبتی شجاع الدولہ نے میر حسن دہلوی کی سرپرستی کی تھی[۲] میر حسن نے ایک قصیدے میں ان کا یوں ذکر کیا ہے:۔

سخن شناس سخن سنج نکتہ دانِ سخن
سخن پذیر و سخن پرور اور سخن پر قدیر[۳]

مرزا سلیمان شکوہ دہلی میں آئے دن کی مصیبتوں سے تنگ آکر شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ بن شاہ عالم ثانی لکھنؤ چلے

۱؎ کلیات ہدایت (قلمی) ۲۸۴

۲؎ میر حسن/۱۷۷، ۱۸۰/۳۶، دریائے لطافت (ا۔ ت) ۱۲۵،
تذکرہ شعرائے اردو/۹۲

۳؎ دیوان میر حسن دہلوی (سبحان اللہ کلیکشن علی گڑھ)

آئے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے شہزادہ کی بڑی تعظیم و احترام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شہزادہ ہاتھی کی سواری پر نکلتا تو نواب ان کے ساتھ ہودے پر بیٹھ کر مگس رانی کیا کرتا تھا۔ نواب نے شہزادہ کے ذاتی اخراجات کے لیے پانچ ہزار ماہانہ اور سات ہزار برائے اخراجات مطبخ مقرر کر دئے تھے[1] لکھنؤ میں شہزادہ نے ایک چھوٹی سی اپنی دلّی بسا رکھی تھی۔ شعر و سخن کا ذوق تھا۔ سلیمان تخلص تھا، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ شعراء اور اہلِ فن کے قدر دان تھے۔ انشا، جرأت، سوز اور مصحفی[2] وغیرہ ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ با انعام و اکرام سے مستفید ہوتے رہتے تھے[3] ان کے علاوہ مرزا نعیم اللہ نعیم[4] سعادت یار خاں رنگین[5] میر صادق علی صادق[6] طالب حسین خاں طالب[7]، میر محمد حسین منشی[8] شیخ ولی اللہ محب[9] میرزا نعیم بیگ جوان

[1] تذکرہ ہندی / ۱۲۰-۱۲۱ تذکرہ طبقات الشعراء / ۳۹۸، عماد / ۱۴۶
۹ ذی القعدہ ۱۲۵۳ھ / ۲۴ فروری ۱۸۳۸ء کو اکبر آباد میں انتقال کیا۔ اور اکبر بادشاہ کے مزار کے قریب، جو سکندرہ میں واقع ہے مدفون ہوئے۔ مفتاح التواریخ / ۳۹۵

[2] تذکرہ ہندی / ۱۲۱

[3] ایضاً / ۷۶

[4] ایضاً / ۱۰۱ [5] ایضاً / ۱۴۰

[6] ایضاً / ۱۳۸ [7] ایضاً / ۲۲۱

[8] ایضاً / ۲۳۱، مجموعۂ نغز / ۱۶۴ [9] ایضاً / ۷۶ مجموعۂ نغز / ۱۴۴

وغیرہ بھی ان کے ہاں ملازم تھے۔ شہزادے کے دربار میں اکثر و بیشتر مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا[1]۔ اور بقول مصحفیؔ "اکثرے از کار دانان ایں فن درحضور آمدہ حاضر می شدند"[2]

نادر شاہ کے حملے (۳۹-۱۷۳۸ء) کے بعد سے مغلیہ سلطنت کے سیاسی اقتدار کے ساتھ دولت اور اطمینان ناپید ہوئے۔ خواجہ میر دردؔ جیسے بزرگوں کو ان حالات کے باوجود دہلی کی خاک پاک سے الفت تھی۔ دہلی کی گلیوں پر جان دیتے تھے کیونکہ وہ "اوراق مصور تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات ناقابل برداشت ہو گئے، افلاس نے آگھیرا، ہنرمندوں کے قدردان نہ رہے کیونکہ اب وہ خود نان شبینہ کو محتاج تھے اور میر جیسا شاعر کہتا ہے "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں" لہٰذا متاع ہنر کے جوہری دہلی سے رخصت ہوئے۔ "انشاؔ نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ دوسری بات یہ ہے کہ افلاس کی وجہ سے بہت سے اونچے گھروں کے لوگ اور فصیح اشخاص مدتیں ہوئیں۔ دارالخلافہ سے نکل آئے ہیں۔ اور پورب کے شہروں میں آباد ہو گئے ہیں"[3] قلندر بخش جرأتؔ نے حسن بخشی کے

---

[1] تذکرہ طبقات الشعراء/ ۳۹۸، تذکرہ ہندی/ ۷۶ مجموعہ نغز ۱/ ۳۰۱۔ شاہ کمالؔ نے ان مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ مرزا بیگ جوانؔ سے ان کی ملاقات مرزا سلیمان شکوہ کے مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ مجمع الانتخاب/ ۱۲۲ ب

[2] تذکرہ ہندی/ ۱۲۱

[3] دریائے لطافت (ا۔ت) ۶۴

حال پر جو مثنوی لکھی ہے اس میں اپنے لکھنؤ کے سفر کا ذکر کیا ہے:

ہوا تھا شہر دہلی جب سے غارت | تھی اپنی اُسی جگہ میں استقامت
فلک نے کر جہاں آباد کو برباد | کیا تھا خوب فیض آباد، آباد،
تو جو تھے ساکنانِ شہرِ دہلی | سکونت ان کی فیض آباد میں تھی [1]

اس زمانے میں اگر کہیں سر چھپانے کو جگہ مل سکتی تھی تو وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ابھی تک سیاسی حوادث سے محفوظ تھیں۔ ان ریاستوں کے حاکموں نے دہلی دربار کے طرز پر چھوٹے چھوٹے دربار آراستہ کر رکھے تھے اور ابھی تک ان کی اقتصادی حالت اتنی خراب نہ ہوئی تھی کہ وہ مہاجرین کو پناہ نہ دے سکتے۔ یہ ریاستیں، اودھ، فرخ آباد، ٹانڈہ اور مرشد آباد وغیرہ تھیں۔ دہلی کے مہاجرین ارباب فضل و کمال پہلے تو فرخ آباد اور ٹانڈہ گئے پھر ان ریاستوں کے اجڑنے کے بعد ان میں سے اکثر و بیشتر فیض آباد اور لکھنؤ پہونچے۔ [2]

ان مہاجرین شعراء و ادباء میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کے دم سے

---

[1] میر حسن / ۱۶۳ نیز دیکھئے۔ دریائے لطافت (ا۔ ت) ۱۱۹۔ ۱۲۰

[2] مصحفی نے صوبائی درباروں کے اجڑنے کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے "از انجا کہ فلک حقہ باز از قدیم الایام بازیہائے تازہ بروئے کار آرد۔ بیک ناگاہ بر شیشۂ انعقاد ایں مجلس بہشت آئین سنگ تفرقہ انداختہ شراب عیش یاران را بناکامی ہلاہل ہجران مبدل ساخت" تذکرہ ہندی / ۱۳۔ ۱۴

دہلی میں شعروشاعری کی بزم میں رونق تھی[۱] اس مجلس کے میر سراج الدین علی خاں آرزو تھے، جن کے شاگردوں سے دِلّی میں شاعری کا رنگ قائم تھا[۲] سب سے پہلے خاں آرزو لکھنؤ پہونچے۔ ان کے بعد شجاع الدولہ ہی کے دَور میں اشرف علی خاں فغاں[۳]، اور ان کے بعد سودا، میر، میر سوز[۴] ترکِ وطن کرکے لکھنؤ آئے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور ان کے علاوہ مرزا جعفر علی حسرت[۵]، میر حیدر علی حیراں[۶]، مصحفی[۷]، خواجہ حسن حسن[۸]، مرزا فاخر مکین[۹]، میر ضاحک[۱۰]، اور میر حسن[۹] اور جرأت[۱۰] بھی فیض آباد اور لکھنؤ پہونچے۔ ان کے علاوہ میر قمر الدین[۱۱] منت اور ضیاء الدین[۱۲] ضیاء وغیرہ کی شاعری

---

۱ لکھنؤ کا دبستان شاعری/۲۴

۲ تذکرہ ہندی/۱۵۹-۱۶۰، تذکرہ شعرائے اردو/۱۱۵، تذکرہ گلشن ہند/۱۸۴، طبقات الشعراء/۷۴

۳ تذکرہ ہندی/ص ۱۱۱، تذکرہ شعرائے اردو/۸۷-۸۸، تذکرہ گلشن ہند/۱۵۱، طبقات الشعراء/۲۳۱

۴ ایضاً/۷۴، تذکرہ شعرائے اردو/۵۲، تذکرہ گلشن ہند/۱۰۷، طبقات الشعراء/۲۹۰

۵ ایضاً/۱۷، تذکرہ گلشن ہند/۱۰۷، تذکرہ شعرائے اردو/۱۰۹، طبقات الشعراء/۲۸۳

۶ تذکرہ ہندی/۷۲، تذکرہ گلشن ہند/۱۱۵، طبقات الشعراء/۲۸۴

۷ سفینۂ ہندی/۱۸۱-۱۸۲

۸ تذکرۂ شعرائے اردو/۱۰۴، تذکرہ گلشن ہند/۱۷۲

۹ تذکرہ ہندی/۶۸، تذکرہ شعرائے اردو/۵۳-۵۴

۱۰ تذکرہ ہندی/۶۲-۶۳، تذکرہ گلشن ہند/۹۰، طبقات الشعراء/۳۰۲ ۱۱ تذکرہ ہندی/۲۳۰، تذکرہ شعرائے اردو/۵۸ ۱۲ تذکرہ گلشن ہند/۱۲۱، تذکرہ شعرائے اردو/۱۰۰

لکھنؤ ہی میں پروان چڑھی۔ اس طرح دِلّی کی اُجڑی ہوئی ادبی بساط لکھنؤ کی سرزمین میں از سرِ نو بچھی اور وہاں بھی شعر و شاعری کا ہنگامہ برپا ہوا۔ افسوس آرائشِ محفل میں لکھتے ہیں: "شعرا بھی جتنے اس شہر لکھنؤ میں کیا فارسی گو کیا ریختہ گو کہیں نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہجہاں آباد کے اکثر غریب امیر مرزایان ہندوستان سے نواب صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے عہد میں آکر اس شہر میں بہ سکونت دائمی ساکن ہوئے۔ پس شہر تو عبارت اشخاص سے ہے۔ یہی دِلّی ہو گیا اور باشندے بھی اس کے بسبب کثرت صحبت و تتبعِ زبان تلفظ صحیح کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جن کی طبع موزوں تھی شاعر ہو گئے" [۱]

مشاعرے مجلس ریختہ کی طرز پر[۲] لکھنؤ میں مشاعرے ہوا کرتے تھے جہاں شعرا اپنی ادبی تخلیقات سامعین کے سامنے پیش کرتے دربار اَودھ اور مرزا سلیمان شکوہ کے مشاعروں کے علاوہ قدرت اللہ قاسم نے لکھنؤ کے کئی ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جو پابندی سے مشاعرے کے انعقاد کا اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً مرزا تقی خاں ترقی،[۳] اور مرزا رضا بیگ آشفتہ، آخر الذکر کا تذکرہ کرتے ہوئے مصحفی نے لکھا ہے :۔

---

[۱] آرائشِ محفل/۱۲۱، نیز دیکھیے۔ دریائے لطافت/(د۔ت) ۶۴۔۶۵

[۲] تذکرہ نکات الشعرا/۵۰

[۳] مجموعۂ نغز/ص ۹۷،۲، تذکرہ گلشنِ بے خار/۱۳۲، عیار الشعرا/۲۴ب

"درایامے کہ فقیر از شاہ جہاں آباد در لکھنؤ آمدہ اول طرح مشاعرہ انداختہ" [1]

مصحفی نے لکھنؤ کے ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ بمشاعرہ مرزا سلیمان شکوہ[2]، مشاعرہ اُنس[3] پسر میر اعلیٰ علی[4]، مرزا حسین خاں اثر[5]، صدر الدین صدر، قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی بن مرزا جعفر، جعفر[6]، مشاعرہ در خانہ مصحفی در لکھنؤ[7]، منور خاں غافل[8]، میر مہر اللہ غیور[9]، شیخ مغل فانی[10]، مشاعرہ موتی لال[11]، سید جعفر زبیر پوری روحی کے تکیہ میں مشاعرہ ہوتا تھا۔[12] مرزا قتیل نے

---

[1] تذکرہ ہندی/۱۸-۱۹-۲۰، ۲۱، ۷۴، ریاض الفصحا/۳۷، ۲۴۵

[2] تذکرہ ہندی/۶۶، ۱۲۱

[3] ریاض الفصحا/۳۱-۳۲

[4] ایضاً/۳۲

[5] ایضاً/۳۵، ۱۱۷، ۱۵۷، ۱۷۷، ۳۱۸

[6] ایضاً/۶۹، ۱۱۵، ۲۶۰، دیوان مصحفی ششم/ (قلمی)، ص ۴۷ ب، مرزا جعفر، رقعات مرزا قتیل/۱۱ [7] ایضاً/۱۰۰، ۱۵۲

[8] ایضاً/۲۳۴

[9] ایضاً/۲۴۰

[10] ایضاً/۲۵۰

[11] ایضاً/۳۲۴

[12] سرو آزاد/۲۰۷-۲۰۸

لکھنؤ کے کئی مشاعروں کا ذکر کیا ہے[1] فیض آباد میں اپنے قیام کے دوران میں میر حسن دہلوی اپنے ہاں مشاعرہ کی مجلس ترتیب دیتے تھے[2]

ان مشاعروں میں شعراء اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ اس طرح ان کو منظرِ عام پر کلام پڑھنے کی مشق بھی کرادی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ان کی ہمت افزائی بھی ہو جاتی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ میر صدر الدین صدر کے مشاعروں میں وہ اپنے شاگردوں کو بھی لے جاتے تھے[3] اچھے اشعار کی تعریف ہوتی اور مکرر پڑھنے کی فرمائش کی جاتی تھی، میر حسن دہلوی اپنے ایک شعر میں اس بات کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

وہ جو ہیں سننے والے اہلِ دل سے مکرر مجھ سے پڑھواتے ہیں ہر بند[الف]

عبدالقادر خاں رام پوری نے اپنے سفرنامے میں لکھنؤ کے ایک مشاعرہ

---

[1] رقعات مرزا قتیل/ ۱۹، ۲۶، ۳۵، ۳۹، ۴۰، ۵۴، ۷۳، ۸۷

[2] تذکرۂ شعرائے اردو/ ۱۳۳، ۱۸۱،

[3] دربارِ لکھنؤ سے وابستہ تھے۔ نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں مرزا جعفر اور ان کے بیٹے قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی کو بہت عروج حاصل ہوا۔ نواب موصوف کو مسند نشین کرانے میں ان لوگوں کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ مرزا جعفر نے ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء میں وفات پائی۔ تاریخ اودھ ۴/ ۹، ۱۵، ۲۰۹، قیصر التواریخ ۱/ ۲۲۹ ریاض الفصحا/ ۴۹

[الف] مشاعروں میں داد و تحسین کے بارے میں معلومات کے لیے ملاحظہ ہو۔ رقعات مرزا قتیل/ ۴۲

کا ذکر کیا ہے :"ایک دن مشاعرہ کی محفل میں جو ان دنوں مرزا جعفر[1] کے مکان پر ہوتی تھی ، میں بھی چلا گیا ۔ مرزا قتیلؔ ، مصحفیؔ ، میر نصیر دہلوی ، اس زمرہ میں سرگروہ شمار ہوتے تھے ۔ اور شیخ امام بخش ناسخؔ[2] کو ان دنوں اس فن میں دن دونی رات شہرت حاصل تھی ۔[3]

انشاء کے ایک شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں میرؔ ، قتیلؔ ، مصحفیؔ ، جرأتؔ ، اور مکینؔ مبرز شعرا شاعری تھے ۔

میرؔ و قتیلؔ و مصحفیؔ ، و جرأتؔ و مکین
ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ[4]

پابندی اوقات بالعموم یہ مشاعرے عصر اور مغرب کے درمیانی وقفے میں ہوا کرتے تھے اور بعض مرتبہ مغرب کے بعد تک ۔

---

[1] دہلی کے باشندے تھے ۔ شاہ محمدی مائلؔ کے شاگرد تھے ۔ کچھ دنوں شاہ عالم ثانی کے دربار سے بھی منسلک رہے ۔ بعد میں لکھنؤ چلے گئے ۔ کچھ دنوں وہاں قیام کے بعد دیوان چندو لال کی شہرت سن کر حیدرآباد چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا ۔ ۱۸۳۸/۱۲۵۴ گل رعنا/۲۷۲ ، ۲۸ ، آب حیات/ ۲ ۴۴ - ۴۵۶ -
طبقات الشعرائے ہند د مرتبہ عطا کاکوی ، ص ۱

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو ۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری/ ۳۶۸ ، ۳۷۷

[3] وقائع عبدالقادر خانی / ۱۵۹

[4] کلیات انشاء / ۱۴۱

نشست رہتی تھی۔[1] مرزا قتیل ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"احوال مشاعرہ بریں منوال است کہ چوں روز ہائے موسم سرما کم عرست وتا فارغ شدن مردم از طعام و طے کردن مسافت تا باین جا و انعقاد پذیرفتن صحبت سہ پہری زنند، ازیں جہت صحبت دیروزہ بہ نصف شب کشیدہ جا بجا دروازہ بابند شدہ بود۔ حجرہ میر صاحب[2] با وصف خوش گوئی بدستور بودہ تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت و آواز راہم کسی نمی شنید لیکن من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند" [3]

اس عہد کے لوگوں کو ان ادبی مجالس سے اتنی زیادہ دلچسپی تھی کہ سوگ کے زمانے میں بھی ایسی مجلس کو ملتوی کرنا گوارہ نہ ہوتا تھا. کہا جاتا ہے کہ مہدی علی خاں عاشق کے ہاں ہر جمعہ کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اتفاقاً ان کے لڑکے نے وفات پائی اور سوم کی رسم جمعہ کی صبح کو ادا ہوئی مگر اسی دن سہ پہر کو دستور کے مطابق مشاعرہ منعقد ہوا۔[4] مگر بعد میں اوقات کی پابندی نہ رہی تھی بلکہ فرصت اور وقت کے تقاضے کو ذہن

---

[1] تذکرہ ہندی ص/۸۰

[2] غالباً میر تقی میر کی طرف اشارہ ہے۔

[3] رقعات مرزا قتیل/ ۵۴

[4] مجموعۂ نغز/ ۳۷۹

میں رکھا جاتا تھا۔[1]

شعراء کی باہمی چشمک اور مناظرے جس طرح سیاسی میدان میں درباری امراء کی باہمی رقابت اور چشمک اپنے شباب پر تھی اور دربار مغلیہ میں سازشوں اور افترا پردازیوں کے اکھاڑے جمے ہوئے تھے اسی نہج پر شاعری کے میدان میں بھی درباری شعراء میں باہمی رشک و رقابت بڑھتے بڑھتے کبھی کبھی مناظرہ اور شعری رزم کا انداز اختیار کر لیتی تھی۔ جب ایک شاعر کسی نواب کے دربار سے وابستہ ہو جاتا تھا تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ کوئی دوسرا شاعر اس دربار سے منسلک نہ ہونے پائے اور اگر بفرض محال ہو بھی جائے تو اسے جمنے نہ دیا جائے اس وجہ سے ان میں آپسی نفاق اور رقابت کی آگ بھڑک اٹھتی۔ اور یہ رقابت بعض مرتبہ دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی اور یہ ادبی مجلسیں میدانِ جنگ میں مبدل ہو جاتیں۔ اس سلسلے میں میر قدرت اللہ قاسم کا ذیل کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے جو انہوں نے مرزا مینڈھو کے دربار سے وابستہ شعراء کے بارے میں دیا ہے:۔

"مرزا صاحب در مشاعرہ خود با ہر کس سلوک مدارا پیش آمدند و از طبع ہر متنفسے کہ شعر تر می تراوید بہ تقاضائے انصاف مورد تحسین بلیغ میشود بہ دوستدار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق و شاعر طبع قدیم مرزا عظیم بیگ عظیم و خوشہ چین شعرائے

---

[1] رقعات مرزا قتیل، ص۔ ۴۸

بلاغت نشان اعنی قاسم ہمدان سراپا نقصان ہر چہ تمامتر عنایات و اشفاق مبذول می داشتند سخن سنج فصاحت اما انشا وسخن گوے سراپا خیر و برکت، برکت اللہ خان برکت و مشتاق علی خاں مشتاق را حسب اقتضاء ترکیب عنصری خوش می آمد کہ غیر ایں بزرگان احدے مورد تحسین و آفریں گردد . . . . .
واین بزرگان خاصہ انشاء خصوصاً از مرزا عظیم بیگ عظیم . . . سخت بے مزہ و ناخوش بودند و برائے تہجین و تذلیل ہر یکے از ما قابو می جستند"

اس رقابت نے اتنا طول پکڑا کہ عظیم نے یہ قطعہ سر مشاعرہ پڑھا۔

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہر ایک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کئی سخن باز کھنڈ گویوں ہو نہوا عتبار اپنا
جنہوں کی نظروں میں ہم سبک تھے دیا انہیں کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے سے بار اپنا[1]

ان جھگڑوں کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا :۔

مجلس میں چکے چاہیئے جھگڑا شعرا کا ٭ اس فن کے کسو صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا ٭ اکبر تئیں پاشاہ جہانگیر کے آگے[2]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو. مجموعہ نغز ار ص ۸۲-۸۶ نیز دیکھئے آب حیات / ۲۸۸-۲۹۳

[2] ایضاً ار ص ۸۶

ان ادبی مجادلوں کا ذکر کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں:۔

"اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہو گئی تھی۔ لہذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت و عداوت برتتے تھے اور ان کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کر گالی گلوج اور لپا ڈگی کے درجے تک پہونچ جاتے تھے۔ چناں چہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانے کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں،" [1]

مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔ "ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور سازو باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کو اکھاڑنے اور اپنے کو جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حرفتیں، اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشا، جرأت، اور مصحفی خواجہ تاش ہم پیشہ تھے۔ اوّل اوّل شاعرانہ چشمک رہی۔ بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشاء نے وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں سید انشاء بے حد ظریف، ٹھٹول اور بے چین طبیعت کے تھے اور اس پر ذہانت اور غضب تھی، مصحفی پختہ اور پرانے استاد تھے، ساتھ شاگردوں کا لشکر تھا۔ انشاء کی زیادتیاں گوارا نہ ہوئیں، ترکی بہ ترکی جواب دینے

---

[1] تاریخ ادب اردو/۱۲۶

لگے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جس کے مزے صاحب عالم (مرزا سلیمان شکوہ) اور نواب بھی لینے لگے۔ اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے، اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی۔ صاحب عالم کی نظر ان کی طرف سے پھر گئی۔ تنخواہ میں تخفیف ہوئی اور آخر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے"۔ [1]

یہ جھگڑا اس حد تک پہونچ گیا کہ کوتوال شہر کو نقضِ امن کی وجہ سے مداخلت کرنی پڑی۔ مصحفی خود لکھتے ہیں:

حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیا :: کیا ہو از پے تہدید شاعران شریر
تو کوتوال ہے بس اون سے اب سمجھ لے گا :: یہ دم بدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر [2]

دربار سے قطع تعلق ہونے سے پہلے مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں "قصیدہ در معذرت اتہام انشا" کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ اور

---

[1] تذکرہ ہندی (مقدمہ) ص ۵۔ (سلیمان شکوہ کے مشاعروں میں شعری معرکوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ ایضاً ص ۹۶، ۱۲۱، ۱۴۸) ان معرکوں کے بارے میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں۔

"بہ میاں غلام مصحفی کہ شاعر لیست مسکین نہاد سے ہیچ بجدے طرف شدہ کہ کار راز گفتگو ے رکیک کہ شایانِ شان ہنرمندان نبود واگذاشتہ، بہجو گوئی کشید، بلکہ آنچہ زبان زد اماو الناس است و بمجلس عامیان نسز تا بہ محفل بہشت آئین وسلاطین چہ رسد" مجموعہ نغز ا / ۱۸۰، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۸۸ الف۔ ۹۲ ب تذکرہ بہارِ بے خزاں۔ ص ۹۲ آبِ حیات ۲۷۲۔۲۴۸

[2] دیوان مصحفی ۱ ق / ۴ (رام پور) ص ۹۰

شہزادے کو حقیقت سے روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

قسم بذاتِ خدائے کہ ہے سمیع و بصیر ؛ کہ مجھ سے حضرت شاہ میں نہیں ہوئی تقصیر
سوائے اس کے کہ حال بنا کچھ کیا تھا عرض ؛ دے بطور شکایت بھی اندکے تقریر
مزاج میں یہ صفا ہے کہ کر لیا باور ؛ کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کیا تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو ؛ تو اس کی رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
دگر کریں تو پھر ایسی کہ نار طیش و غضب ؛ مزاج شہ میں ہو مشتعل بصد تشویر
سو تاب ذرہ کہاں نورِ آفتاب کہاں ؛ کہاں وہ سطوت شاہی کہاں غرور فقیر
مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے ؛ کہاں وہ مبقی و دیبا کہاں بلاس و حصیر
میں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام ؛ رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا ؛ کہ رزم و بزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر[1]

آخری زمانے میں نواب سعادت علی خاں اور انشا سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس بے روزگاری کے زمانے میں سبحان قلی بیگ راغب[2] نے انشا پر چند ہجویں لکھیں اور اس طرح

---

[1] ایضاً ج ۲/ص ۷۰۵، ۸ مصحفی اور انشا کے شعری معرکوں کے لیے نیز ملاحظہ ہو آبِ حیات/

[2] برائے حالات دیکھیے: تذکرہ طبقات الشعرائے ہند مرتبہ عطا کاکوی ۲۹۲ (ب)، ص ۲۷ مجموعہ نغز/ ص ۲۶۶

اس کی شہر میں تذلیل اور رسوائی کی۔ مرزا قتیل ایک خط میں مرزا امامی کو لکھتے ہیں۔
"احوال خان مرقوم انیست کہ از دو ماہ برطرف شدہ و سبحان قلی بیگ راغب
کہ آشنائے چہل سالہ اش بود اورا در تمام شہر رسوا نمودہ یعنی چند
ہجو برایش گفتہ کہ جا بجا نقل آں برداشتہ شد و او سوائے ایں کار دیگر
ایں کرد کہ ہجو بعضے اعزۂ شہر گفتہ نزد خان موصوف فرستادہ۔ ایں عزیز
بی تامل آں ہجو را نزد طرف ثانی با ایں خیال فرستاد کہ گوئندہ را شلاق
بکنند آنہا چوں ایں معنی مطلع شدند سبحان قلی بیگ را طلبیدہ پرسیدند
کہ اے عزیز تو خود را چہ فہیدہ بودی کہ ایں راہ رفتی حالا بتو چہ سلوک
بورزیم۔ سبحان قلی بیگ گفت کہ میانۂ من و صاحب کدام معاملہ دنیا بود
کہ بر سر آں ہجو میکردم اینقدر گفتہ قرآن را بر سر گذاشت کہ اگر من یک
مصراع در ہجو صاحب گفتہ باشیم قرآن مجید کمر مرا بزند۔ چوں من دریں
روز ہا ہجو انشاء اللہ خاں کردہ ام و او نمی تواند کہ چشم مرا بکند لہذا از راہ
جبن ایں تبارا گذاشتہ کہ ہجو اعزہ خود گفتہ تخلص من داخل نمودہ
است تا بزرگان و بزرگ زادگان در پے آزار من شوند چوں خان موصوف
ہجو بعض بیگناہان گوشہ نشین و دیگر اجلہ و اہالی کردہ بود ہمہ را بگفتہ
سبحان قلی بیگ راغب۔ یقین حاصل کہ ایں ہجو ہا گفتہ خان مزبور ست
دفعتہً مستعد آں شدند کہ بلای بر سر خان موصوف نازل بکند۔ ایں مرد
ازیں خبر دست و پاچہ شدہ داماد و پسر خود و دیگر آشنایان خودش
را نزد طرف ثانی فرستاد و با لحاح و زاری آمدند و بہ ایمان موکدہ و

اخلاف عرضیہ ازیں بلا محفوظ ماند" لہ

درباری معرکوں کا اثر عام مجلسوں پر بھی پڑا اور ان مشاعروں میں بھی معرکے ہونے لگے بقاءاللہ بقا کے حال میں مصحفی نے لکھا ہے :-

"طبع شوخش بطرف ہجو مائل افتادہ، در شاہجہان آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا (سودا) معرکہ گیر بپا کردہ و دقت طبع خود را ظاہر نمود" لہ

مرزا علی مہلت، شاگرد جرأت کے بارے میں لکھا ہے :-

" اورا پیش ازیں بہ علی نقی محشر مناظرہ درمیان آمدہ بود۔ آخر ہر دو بریں قرار دادند کہ از گومتی عبور کردہ آنروے آب بہ تیغ جنگ کنند، آخر ہمیں کردند کہ مشارالیہ چوں زخمی شدہ بخانہ رسید وارثانش ہر چند پرسیدند از ضارب خود نشان نہ داد و در عرصۂ قلیل از ہماں زخم جانستان زندگانی را جواب داد" سہ

لیکن اس کے وارثوں نے مہلت پا کر لطف علی کو قتل کر دیا۔

عام طور پر مشاعروں میں سامعین شعراء کے کلام کو سن کر بڑے جوش و خروش سے داد و تحسین کے نعرے بلند کیا کرتے تھے، مصحفی نے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے :-

---

لہ رقعات مرزا قتیل / ۱۷

لہ تذکرہ ہندی / ۳۴

سہ ایضاً / ۲۲۹ - ۲۳۰ ؁ تذکرہ خوش معرکہ زیبا / ۶۷ ب

ان لوگوں کی مجلس میں غوغا میں نہیں دیکھا

بزم شعرا ہے یہ یا مُرغوں کی پالی ہے[1]

درباروں سے وابستگی کے بُرے نتائج دہلی کے اکثر و بیشتر شعرا دربار مغلیہ سے وابستہ نہ تھے اس وجہ سے وہ اپنے مذاق اور مزاج کے مطابق کلام کہتے تھے۔ اور اپنی خودداری برقرار رکھتے تھے۔ اگر وہ کسی نواب کے ہاں وابستہ بھی ہوتے اور ان سے مالی امداد بھی ملتی ہوتی تو ایسی صورت میں بھی وہ بھانڈوں کا پیشہ نہ اختیار کرتے۔ مثلاً خواجہ محمد باسط، میر تقی میر کی مفلسی پر رحم کھا کر انہیں نواب امیرالامرا صمصام الدولہ کے پاس لے گئے اور مدد کی التجا کی۔ نواب نے ایک روپیہ روزینہ مقرر کر دیا۔ میر نے کہا یہ بات لکھ کر دے جائے تاکہ متصدیوں سے بلا پریشانی روزینہ مل سکے۔ میر نے درخواست نکالی۔ خواجہ صاحب نے کہا یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے۔ یہ سُن کر میر نے جملے کی ترکیب پہ اعتراض کر دیا[2] ایک مرتبہ رعایت خاں نے میر سے درخواست کی کہ وہ اپنے چند شعر ڈوم کے لڑکے کو یاد کرا دیں۔" چوں کہ ملازمت کا پاس تھا۔ طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اُسے یاد کرا دیے۔ مگر یہ بات میری طبع نازک پہ بہت گراں گزری، آخر دو تین دن بعد گھر بیٹھ رہا۔ اس نے ہر چند بلایا، نہیں گیا۔ اور اس کی نوکری چھوڑ دی[3]

---

[1] دیوان مصحفی دوم (رام پور) ۱۸۱ الف

[2] میر کی آپ بیتی/ ۹۱، ۹۲ [3] ایضاً/ ۱۰۳

راجا جگل کشور نے میرے کو اپنے ہاں رکھا" اور اپنے
اشعار پہ اصلاح کی خدمت سپرد کی، مگر میں نے اصلاح
کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ
دیا" [1]

لیکن دہلی کے اکثر و بیشتر مہاجرین شعراء کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہو گئے جس کا برا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اپنی آزادیٔ طبع سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور اپنے ولی نعمت نواب' یا امیر کے مذاق اور مزاج کے مطابق شعر کہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چوں کہ اودھ میں فارغ البالی تھی۔ نوابانِ اودھ تعیش پرست تھے اور ان پر رکیک جذبات کا غلبہ تھا۔ نواب شجاع الدولہ جنسی تلذذات کا دیوانہ تھا اور اپنا زیادہ وقت حسین و مہ جبین عورتوں میں گذارتا تھا سفر و حضر میں طوائفوں کے ڈیرے اس کے ہمراہ ہوتے تھے۔ درباری امراء پر بھی اس کا اثر غالب تھا" چنانچہ جس شاعری میں بگڑنے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ ان کے اعمال ناموں کی سیاسی سے آلودہ ہو گئی۔ ایسی شاعری کا ایک خاص نام معاملہ بندی ہوا جس کے پردے میں بداعمال اپنی سیہ کاریوں کا اعلان کرنے لگے۔ اس حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اربابِ فضل و کمال کے ساتھ ساتھ دہلی کی پیشہ ور عورتیں بھی فیض آباد اور لکھنؤ میں آ رہی تھیں [2]

---

[1] میر کی آپ بیتی / ۱۱ دریائے لطافت (۱۰۰۰) ص ۱۱

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری / ۳۲ - ۳۴۳

رفتہ رفتہ ہزل گوئی اور فحاشی ایک مستقل صنف بن گئی[۱] نسائیت اور فحش گوئی سے مل کر ریختی کی بنیاد پڑی۔ "یہ ایسی صنف ہے جو اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی شاعری میں موجود نہیں ہے" [۲] سعادت یار خاں رنگین اس صنف کے موجد تھے [۳] عیاش مزاج لوگوں کو یہ زبان بہت پسند آئی۔ انشا کا ایک دیوان ریختی اس زبان میں ہے۔[۴]

لکھنؤ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انشاء نے لکھا ہے :۔

"ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے، ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو[۵] اور میاں ناجی[۶] اور میاں حاتم۔ پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا، اور میر تقی صاحب، پھر حضرت میر درد صاحب . . . جو میرے بھی استاد تھے۔ وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدردانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ویسے ہی شاعر ہیں . . . تخم تاثیر صحبت اثر۔ سبحان اللہ، یہ کون میاں جرأت، بڑے شاعر پوچھو تو ہمارا خانماں دراے ماں) کس دن

---

۱ لکھنؤ کا دبستان شاعری/ ۳۳

۲ ایضاً / ۳۴

۳ دریائے لطافت (ا۔ ت) ۱۹۶، ۱۹۷

۴ کلیات انشا در ص ۱۸۵ا بعد

۵ ملاحظہ ہو دیوان آبرو، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن

۶ ملاحظہ ہو دیوان شاکر ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق

شعر کہتا تھا اور رضا بہادر کا کون سا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے اگر پوچھیے کہ "ضرب زید عمرا" کی ترکیب تو ذرا بیان کرو۔ تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آ کے قدم رکھا۔ ۔ ۔ ۔ اور سب سے زیادہ ایک اور بات سنیے کہ سعادت یار خاں کا بیٹا انوری ریختہ کو آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا دل پذیر نام رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہیے، سارے لوگ لکھنؤ کے اور دلی کے رنڈی سے لے کر مرد تک اسے پڑھتے ہیں۔

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی ⁂ کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

اور کرواہی پن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے، تو ریختے کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کریں[1]

مختصر یہ کہ اس دور کی لکھنوی شاعری سے ایک ایسے سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ جو عیش و عشرت، رنگ و بو اور مے نوشی میں غرق تھا۔ مثلاً انشاء

---

۱ تذکرۂ ہندی/۴۷

۲ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ دریائے لطافت (ا۔ت) ۹۵-۱۰۰

اور مصحفی، جرأت کے کلام میں حد درجہ کا ابتذال، سوقیانہ پن، فحاشی، رکاکت اور جنسی عریانی پائی جاتی ہے۔ ان شاعروں کا پورا کلام شاہد ہے۔ ان کے اشعار میں تخیلات، بلند پردازی، شعری حسن کا فقدان ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے سے جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ انشاؔ کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

شب میں نے جو ہی ہاتھ لگایا تو وہ پری ؛ بے اختیار شرم کے مارے سمٹ گئی
ہم دو گھڑی بھی ساتھ تیرے سو رہے نہ ہائے ؛ باتوں میں یوں ہی چار پہر رات کٹ گئی
مجھ سے لپٹ کے آخر شب یار نے کہا ؛ کیا جانے ان دنوں کی پہ کیوں رات گھٹ گئی

رضائی شال کی اوڑھیں چلیں ہم تم چھپر کھٹ میں
ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی آ رہی ہیں خوب جاڑا ہے
کیونکر نہ گدگداہٹ ہاتھوں میں اس کے اٹھے
وہ گوری گوری رانیں جس نے دبائیاں ہیں

جاڑے میں کیا مزہ ہو وہ تو سمٹ رہے ہوں ؛ اور کھول کر رضائی ہم بھی لپٹ رہے ہوں

میر حسن دہلوی

ساتھ سونے کو ہمارے سیم بر آتی نہیں ؛ جس سے چین آتا ہے جی کو وہ نظر آتی نہیں[1]
آج کی چاندنی وہ ہے کہ کسی گلرخ کے ساتھ ؛ کھول آغوش لپٹ جائیے اور سو رہیئے

---

[1] دیوان میر حسن (سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ)

مصحفی

کہا میں رات اس سے ایک بوسہ　　جو چپ کر دے تو دانائی ہے تیری
خفا ہو کر لگا مجھ سے یہ کہنے　　ارے کم بختی کیوں آئی ہے تیری [۱]

جرأت

کیا اکیلے تیرے بن جائیے اور سو رہیے　　تو نہ ہو پاس تو کچھ کھائیے اور سو رہیے
بزم میں بیٹھے ہو کیا رات چلی جاتی ہے　　لو ہمیں اب کہیں سلوائیے اور سو رہیے
پائینتی بیٹھ کے تلووں کو تو سہلاؤں میں　　اتنا منہ سے مجھے فرمائیے اور سو رہیے
جاگتے ہیں بس اسی فکر میں ہم تو دن رات　　کیونکہ گھر میں اسے لے آئیے اور سو رہیے
تم تو بیٹھے ہی رہے اور چلی وصل کی رات　　لو گر نہ بخشیے مل جائیے اور سو رہیے
نیند آنکھوں میں ہے اور کہتے ہیں ہم اے جرأت　　پاؤں اس کوچے میں پھیلائیے اور سو رہیے

شاعری کا معیار بالکل گر چکا تھا اور بقول مصحفی:-

کیا چمکے اب فقط میرے نالہ کی شاعری　　اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
سامان سو طرح کا ہو لڑنے کا جن کے پاس　　ہے آج کل انہیں کا رسالہ کی شاعری
شاعر رسالہ دالے نہ دیکھے نہ سنے　　ایجاد ہے انہیں کا رسالہ کی شاعری [۳]

---

۱ دیوان مصحفی چہارم (ق۔ رام پور) ص ۷۹

۲ ایضاً۔ دوم ص ۴۴ ب کلیات میر حسن دہلوی، میں خلیفہ سکندر شاگرد ناجی کی ہجو میں بے حد ابتذال پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جرأت کی ہجو میں فحاشی کی بدترین مثالیں ہیں۔

۳ دیوان مصحفی دوم (رام پور) ص ۸۲ ب۔ ۸۳ الف

مذہب اثنا عشری کے زیر اثر مرثیہ گوئی کو عروج حاصل ہوا۔ ہندوستان میں مرثیہ گوئی اگرچہ ابتدائی دور میں دکن میں رائج تھی اور شمالی ہند میں سودا، مسکین، سکندر، تقی، میر ضاحک نے مرثیے لکھے۔ اور دہلی میں مرثیہ خوانوں کو کافی عروج حاصل ہوا۔ جیسے کہ پہلے حصہ میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ لوگ ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر مرثیے لکھتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اسے فنی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ مگر جو ترقی اس خاص صنف کو لکھنؤ میں حاصل ہوئی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں انیس و دبیر اور دیگر شعرا مثلاً ضمیر، خلیق وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔

مرثیہ لکھنے کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کو لکھنؤ والوں نے ایک خاص فن بنایا اور اس زمانے میں بھی صاحب کمال مرثیہ خواں لکھنؤ میں ملتے ہیں۔

دہلی کی شاعری میں تصوف کو بڑا دخل تھا اور تصوف کے بہت سے مسائل نظم ہوتے تھے مثلاً مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور میر اثر کا کلام اس سے پر ہے لیکن اس کے برعکس مذہب اثنا عشری کے پیروؤں کو تصوف سے کوئی دلچسپی نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی شاعری میں تصوف کو خارج کر دیا گیا۔ لکھنؤ والوں نے عشق حقیقی پر عشق مجازی کو ترجیح دی اور اس کے مضامین نظم کیے۔ لکھنؤ کی شاعری میں معاملہ بندی اور اس کے متعلقات اسی غلط روی کے نتیجہ ہیں۔

اسی طرح مذہب کا اثر دوسرے اصناف سخن میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً دہلی میں لکھی گئی مثنویوں میں بالعموم حمد و نعت کے بعد ممدوح کی تعریف بیان کرکے اصل قصہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی مثنویوں میں ائمہ کرام کی مدح کو بھی جزو ضروری سمجھا گیا۔ میر حسن، دیا شنکر نسیم وغیرہ نے اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔

علم و ادب

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سرزمین پورب... معدن علم و علما تھی۔ اسی سرزمین سے مولانا نصیر الدین شافعی اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ مولانا علاء الدین نیلی اودھی[۱] نے وہاں کے شیخ الاسلام مولانا نصیر الدین سے کشاف کا درس لیا تھا۔ مولانا شمس الدین یحییٰ[۲] مولانا عبدالکریم شیروانی، قاضی محی الدین کاشانی[۳]، مولانا افتخار الدین محمد گیلانی[۴] اور دیگر علماء نے اس دیار میں علم و ادب کے چراغ روشن کیے

۱؎ شیخ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ مزار درگاہ نظام الدین میں ہے۔ سیر الاولیا/ ۲۲۲، ۲۷۵۔ ۲۷۸۔ اخبار الاخیار/ ص ۱۷۰۔ ۱۷۱، تذکرہ علمائے ہند/ ۱۴۰۔ ۱۴۱

۲؎ شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے اور اودھ کے باشندے تھے۔ تحصیل علم مولانا ظہیر الدین بھکری اور مولانا فرید الدین شافعی سے کیا تھا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے آپ کی خدمت میں زانوے ادب تہ کیے۔ ملاحظہ ہو۔ سیر الاولیا/ ۲۲۲۔ ۲۳۶، اخبار الاخیار۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹، تذکرہ علمائے ہند/ ۸۶۔ ۸۷۔ مآثر الکرام/ ص ۱۸۲۔ ۱۸۳ ۳؎ سیر العارفین/ ۹۲

۴؎ شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں سے تھے۔ اپنے تبحر علمی، زہد اور تقویٰ کی وجہ سے بڑی شہرت پائی تھی۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ سیر الاولیا/ ص ۲۹۔ ۲۹۶، تذکرہ علمائے ہند/ ۲۲۱۔ ۲۲۲، اخبار الاخیار/ ص ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ (بقیہ حاشیہ ص ۶۶۳ پر دیکھیے)

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے اپنی ابتدائی تعلیم مولانا عبدالکریم شیروانی اور مولانا افتخار الدین محمد گیلانی سے حاصل کی تھی۔ آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں۔ کہ دراصل مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے تمام صوبوں میں علم و ادب کے چرچے اور سرگرمیاں تھیں اور علوم معقول و منقول کا عام رواج پایا جاتا تھا لیکن صوبہ اودھ اور الہ آباد اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے خاص طور پر مشہور و معروف تھے اور اس بارے میں دوسرے صوبوں کا ان سے کوئی مقابلہ نہ تھا دور دور سے تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کشاں کشاں ان علاقوں میں چلے آتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام صوبہ اودھ اور الہ آباد میں ہر پانچ اور دس کوس کے فاصلے پر شریف مسلمانوں کی بستیاں تھیں جہاں کے مسلمانوں کو سلاطین اور حکام وقت سے وظائف اور مدد معاش کی زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مسجدیں، مدارس، اور خانقاہیں تعمیر کروائیں اس طرح معلموں نے ہر مقام پر درس و تدریس اور علم و ادب کے دروازے کھول دیئے اور دور دراز علاقوں سے طالب علموں کو وہاں بلایا گیا۔ ان شرفاء میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو ان طلباء کی امداد کرتے اور ان کی رہائش، خور و نوش اور لباس کا بھی انتظام کرتے تھے۔ اس گروہ کی خدمت کرنا وہ ایک نیک کام سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورب میں علم و ادب کا بہت چرچا ہوا اور ایک

صفحہ ۳۹۶ کا بقیہ حاشیہ،

ملہ ملاحظہ ہو۔ خیر المجالس (مقدمہ) ص ۴۰ (اشاریہ ۲۰)

وقت ایسا آیا کہ ایک موقع پر شاہ جہاں بادشاہ نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ "پورب شیراز مملکت ما است" مگر یہ سرگرمیاں ۳۰ /۱۱ ۱۷ ۱۷۱۶ء تک باقی رہیں۔ اس کے بعد مدارس اور خانقاہوں پر اوس پڑگئی۔ درس و تدریس کا بازار سرد پڑگیا اور وہ جوش دھیمے پڑ گئے۔ کیوں کہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری اس علاقے کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس بنا پر صوبہ الہ آباد کے عمدہ شہر مثلاً جون پور، بنارس، غازی پور، کڑہ، مانک پور اور کورہ جہان آباد وغیرہ اس کی حکومت میں آ گئے۔ برہان الملک نے قدیم اور جدید خانوادوں کے وظائف اور سیور غال یک قلم بند کر دیئے[1]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف اور نجیب معاشی اور اقتصادی افلاس میں گرفتار ہو گئے، اور اس اقتصادی بدحالی نے وہاں کے لوگوں کو تحصیل علم سے محروم کر دیا۔ اور انہیں پیشۂ سپہ گری اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس دیار میں درس و تدریس اور تحصیل علم کے کاروبار میں بے رونقی پیدا ہونے لگی اور رفتہ رفتہ پہلے جیسی سرگرمیاں باقی نہ رہیں اور وہ مدرسے جو قدیم زمانے میں علم و ادب کے گہوارے تھے، بالکل تباہ و برباد ہو گئے اور ارباب علم و فن کی انجمنیں منتشر ہو گئیں۔

برہان الملک کے بعد ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا دور آیا اور اس

---

[1] ملفوظ رزاقی میں لکھا ہے کہ برہان الملک نے سندیلہ کے شرفاء کے وظائف موقوف کر دیئے تھے جس کی وجہ سے وہاں بدحالی پیدا ہو گئی تھی "شرفائے آنجا بلکھنؤ رفتہ بنا بر معافی رفتند، وسعی کردند، بمقصد نرسیدند" ص ۹۹

کے دورِ حکومت میں بھی وظائف اور مددِ معاش بدستور سابق بند رہے۔ آخر میں ۱۱۵۹ھ میں محمد شاہ بادشاہ نے صفدر جنگ کو الہ آباد کی صوبہ داری بھی تفویض کر دی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے وظائف بھی موقوف کر دیئے گئے۔ جن کو کسی وجہ سے مل رہے تھے۔ اور موقوفی کی آفت سے محفوظ تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں صفدر جنگ، وزیر الممالک کے عہدے پر فائز ہوا اور ان علاقوں کی تنظیم کے لیے اس نے اپنے نائب مقرر کیے۔ اس زمانے میں وظیفہ خواروں کی زندگی تنگ تر ہو گئی۔ اور ۱۷۵۲، ۱۷۵۳ء تک یہی حالت رہی۔ مگر پھر بھی مدارس، مساجد، خانقاہوں میں علم و ادب کا چرچا رہا[1]۔

مآثر الکرام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مختلف شہروں میں اب بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مثلاً شمس آباد میں مولوی سید قطب الدین[2]، جنہوں نے ملا قطب الدین شہید سہالوی سے تحصیل علم کیا تھا، درس کا کام کرتے تھے۔ اور "جم غفیر را با افاضۂ دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل کرامت نمود"۔ شیخ غلام نقشبند[3] لکھنوی، شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون[4] امیٹھوی ملا نظام الدین

۱؎ مآثر الکرام (دفتر اول) ص ۲۲۱ - ۲۲۲

۲؎ امیٹھی وطن تھا۔ وہاں سے نکل کر شمس آباد میں سکونت اختیار کی۔ اپنے عصر کے علماء سے تحصیل علم کیا اور آخر میں ملا قطب الدین شہید سہالوی کے درس میں شریک ہوئے اور تکمیل علوم کیا۔ ۱۱۲۱ھ میں وفات پائی۔ مآثر الکرام، ص ۲۱۰

۳؎ گھوسی، قصبہ کے باشندہ تھے۔ شیخ پیر محمد لکھنوی سے تلمذ تھا۔ آپ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب کشف نقشبندی سلسلے کے صوفی بھی تھے۔ ۱۱۲۶ھ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱۹ پر دیکھئے)

ملا نظام الدین سہالوی[1]، سید عنایت اللہ[2]، مولوی اصغر[3]، میر عبد الہادی[4]، شیخ عثمان احمد[5]، سید غلام نبی[6]، مولوی قطب الدین گوپاموی[7]، حاجی صفت اللہ خیر آبادی[8] اور شیخ کمال الدین[9]، اپنے اپنے مقامات پر شغل درس و تدریس روشن کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح جونپور میں، جو قدیم الایام سے معدن علم و ادب

(صفحہ ۶۱۵ کا بقایا حاشیہ) وفات پائی اور لکھنؤ میں مزار ہے۔ مآثر الکرام ار ص ۲۱۳۔ ۲۱۶ تذکرہ علمائے ہند ۱۵۷۔ ۱۵۹ [1] امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ علوم عقلی و نقلی میں بحر لامتناہی تھے۔ اپنے عصر کے علماء سے کسب علوم کیا ملا لطف اللہ گوروی کی خدمت میں رہ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ اورنگ زیب نے اپنے لڑکوں کو ان کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے بھیجا تھا۔ اورنگ زیب اور بہادر شاہ اول ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ ۱۱۳۰ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ ان کی نعش کو امیٹھی لے جایا گیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ مآثر الکرام ار ص ۲۱۶، ۲۱۷

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] بلگرام وطن تھا۔ دور دور سے طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ۱۱۲۰ھ وفات پائی۔ مآثر الکرام ۱/ ۲۴۲۔ ۲۴۳ [2] مولوی اصغر اور ملا جیون ہم مکتب تھے اور مولوی لطف اللہ سے تکمیل علوم کیا تھا۔ مولوی اصغر نے لکھنؤ میں شیخ پیر محمد لکھنوی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس کے بعد قنوج چلے گئے اور تمام عمر درس تدریس کے شغل میں منہمک رہے، "خلقے کثیر در حوزۂ درس او منتہائے فضیلت حاصل کردند"۔ آخر عمر میں قرآن کی تفسیر "ثواقب التنزیل" کے نام سے لکھی۔ ۱۱۴۰ھ میں وفات پائی۔ مآثر الکرام ار ص ۲۵۰۔ ۲۵۱
[3] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ مآثر الکرام ار ص ۲۵۱۔ ۲۵۲ [4] ملاحظہ ہو۔ مآثر الکرام ۱/ ۲۹۹ [5] مآثر الکرام ۱/ ۲۹۹، ۳۰۰ [6] مآثر الکرام ۱/ ۳۰۰۔ ۳۰۱
[7] ایضاً ۱/ ۳۰۱۔ ۳۰۲ [8] ایضاً ۱/ ۳۰۲۔ ۳۰۳

تھا۔ علم و ادب کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ وہاں نامی گرامی علماء و فضلا وجود میں آئے۔ مولوی روشن علی، با مروت اور آشنا پرست انسان تھے، قاضی مرتضیٰ بلگرامی کے ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کے بھائی درویش علی علم و ادب کے زیور سے آراستہ پیراستہ تھے، مولوی علی حلیم و متواضع شخص تھے۔ اور دانشمندوں کی فہرست میں ان کا شمار ہوتا تھا۔[۱] مولوی باسط علی، رمضان علی، حسنِ اخلاق و تواضع میں اپنی نظیر آپ تھے۔

مرزا قتیل نے اپنے زمانے سے پہلے علم و ادب کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "اب سے پہلے (۱۲۲۶ھ) سے پہلے شاہ پیر محمد صاحب[۲] کے ٹیلے پر جو لکھنؤ میں دریا گومتی کے کنارے مشہور جگہ ہے۔

۱؎ حدیقۃ الاقالیم/۶۷۷-۶۷۸

۲؎ آپ اپنے زمانہ میں صاحب علم و دانش علوم باطنی اور ظاہری سے آراستہ ایک بزرگ تھے۔ جونپور کے مضافات میں واقع مقام منڈیاہوں کے باشندہ تھے۔ انہوں نے جونپور، مکہ و مدینہ، دہلی و اجمیر اور قنوج میں تحصیلِ علم کیا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ بہت زمانے تک شاہ مینا نامی مقام پر ریاضیات شاقہ اور مجاہدات میں مصروف رہے۔ مولوی قاضی عبدالقادر لکھنؤی سے سند حاصل کی اور فاتحہ فارغ التحصیلی انہیں کے ہاتھوں انجام پایا۔ علم باطنی میں شاہ مینا کی روح پاک سے استفادہ کیا۔ بعد میں شاہ عبداللہ سیاح چشتی کے مرید ہوئے۔ اپنے پیر کی وصیت کے مطابق درس و تدریس میں زندگی گذاری۔ ۱۰۸۰/۱۶۶۹ء میں وفات پائی مزار لکھنؤ میں گومتی کے کنارے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ ۴۴، خزینۃ الاصفیاء ار ۴۸۲-۴۸۳، تذکرہ علمائے ہند/۴۴-۴۵

سات سو طلبہ کے رہنے، کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے لیے بادشاہ ہندوستان کی طرف سے ضروری مشاہرہ مقرر تھا، [1]

نواب شجاع الدولہ نے بھی اپنے آبا و اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وظیفہ خواروں کو دوبارہ وظیفے مقرر نہیں کیے بلکہ جو اب بھی باقی تھے ان کے بھی وظائف بند کر دیئے۔ طباطبائی نے نواب کی اس حرکت کی بڑی مذمت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "اپنے وظیفہ خوار ان ممالک محروسہ کے حق میں ایسا بدگمان ہوا کہ اس جماعت کو جو لاکھوں سے مضاعف تھے یک قلم روزینہ اور وجہ معاش سے محروم کر دیا۔ اور اراضی اور دیہات ضبطی میں لایا جس کے نتیجہ میں خلق اللہ ایسی تنگ ہوئی کہ بعضوں نے تو اپنے گھروں میں غیرت کے مارے دروازے بند کر کے شرم سے منہ نہ دکھایا اور رفنا ہوئے۔ اور بعضوں نے کچکول گدائی لے کر در بدر بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ ممکن ہے دس بیس امور ناشائستہ کے مرتکب ہوئے ہوتے تو خیر انہیں کی تنبیہہ کی جاتی بلکہ بہتر یوں تھا کہ اغماض فرماتا" [2]

نواب آصف الدولہ، وزیر علی خاں اور نواب سعادت علی خاں کو ان امور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کچھ امرا ضرور علم و ادب کے فروغ میں دلچسپی لیتے تھے۔ مثلاً نواب ابراہیم الدین خاں اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں۔ آخر الذکر نے مولانا فضل عظیم خاں کی اس زمانے میں بڑی مدد کی تھی

[1] ہفت تماشا، ص ١٧٥ [2] سیر المتاخرین (ا۔ ت) ٣/ ٩٧

[3] تاریخ فرح بخش، ص ٣٣٣ برائے حالات مولوی فضل عظیم ملاحظہ ہو ایضاً، ص ٣٣٩ تا ٣٣٣

جب وہ ایک طالب علم کی زندگی گذار رہے تھے۔[1] مولانا محمد منیر اور محمد خلیل[2] کو جواہر علی خاں کی سرپرستی حاصل تھی۔

انیسویں صدی کے ربع اوّل میں طالب علموں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے۔ مرزا قتیل لکھتے ہیں۔

"اس ملک میں زیادہ تر طلبا کا طریقہ یہ تھا کہ بعض.. کسی دوسرے کی روٹیوں کا محتاج نہ تھے جب یہ لکھنؤ آتے تھے تو ان کے والدین تین چار روپے مہینہ یا اس سے زیادہ ان کے خرچ کے لیے ماہ بماہ بھیجتے تھے۔ اور بعض کو مدرسے سے کھانا ملتا تھا.. اس طرح امرا بھی حسب حیثیت اس فرقے کی خدمت کرتے تھے۔ چونکہ امرار کی طرف سے ہر عالم کے لیے ایک یا دو گاؤں مقرر تھے۔ اس لیے سب ہی علما اپنے شاگردوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ رات کے وقت مطالعہ کے لیے چراغ کا تیل بھی استاد کی طرف سے ملتا تھا۔[3] اب حال یہ ہے کہ وہ علما رہے نہیں اور فیاضی نے امیروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ طلبا حیران پریشان اور تباہ حال ہیں۔ بعضوں کو تو بے حد پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ جب کہیں آدھ سیر آٹا ہاتھ آتا ہے۔ جو فارسی جانتے ہیں وہ بچوں کو پڑھانے کی نوکری کسی ہندو کے یہاں

---

[1] ایضاً، ص ۱۳۳-۱۳۶

[2] ایضاً، ص ۲۳۰

[3] ایضاً، ص ۲۳۱

[4] ماثر الکرام ۱/۲۲۱

کر لیتے ہیں۔ اور مقررہ اوقات میں اپنے استاد کی خدمت میں پڑھنے کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔ جو طلبا، فارسی نہیں جانتے وہ معاشی طور پر بہت پریشان رہتے ہیں۔ اگر خوش نصیبی سے کوئی ہندو یا مسلمان جسے عربی پڑھنے کا شوق ہے۔ ان کے ہاتھ آگیا تو واہ واہ، ورنہ روتے جھینکتے بغیر تحصیل علم کے گھر واپس ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی طالب علم کے لیے آدھا سیر آٹا مقرر کرتا تو وہ طالب علم کہاوت کے طور پر بیان کرتا ہے کہ میرے لیے جاگیر مقرر ہو گئی ہے" [1]

علما، اور طلبا، کی بد حالی کا ذکر مرزا قتیل نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔ وہ مرزا امامی کو لکھتے ہیں:" بسا طالب علم و فاضل ہستند کہ بگدائی نان می خورند و از دعائے بد مطعون خلق خدا می شوند" [2]

بالعموم طالب علموں کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بعض مرتبہ تو تنگ معاشی کی بنا، پر انہیں تعلیم چھوڑنی پڑتی تھی۔ مرزا قتیل نے ایک ایسے طالب علم کے بارے میں لکھا ہے جس نے اپنی اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دی تھی اور اپنے وطن کو واپس چلا گیا تھا:" احوال برگشتن طالب علم دریافت شد، ہمہ کم قدر و آں در وقت بہم رسیدن تکہ' نانی بدبوزہ باشد باولاد خود ہمیں حال دارند۔ اگر چہ تعلق بخت و اتفاق دارد لیکن بظاہر باعث افلاس ہمیں حرکتہا می شوند و دولت مندزادہا ئیکہ باولاد خود شیوۂ

---

[1] ہفت تماشا / ۱۷۵، ۱۷۶۔

[2] رقعات مرزا قتیل / ص ۶۵

پیش میکردند۔ آنہا نیز داخل ہمیں جماعہ ہزار چانہ بی ننگ وعار اند"[۱]

طلباء کی زندگی

اس زمانے کے رواج کے مطابق ہر طالب علم کسی ایک فن میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ لہذا طالب علموں کو اپنے ذوق کے مطابق در بدر پھر کر تعلیم حاصل کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً چونکہ لکھنؤ علم وادب کا گہوارہ تھا اس لیے دور دور سے طلباء وہاں تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ مولوی فضل عظیم خاں کے حال میں محمد فیض بخش نے لکھا ہے کہ وہ شفیع پور کے باشندہ تھے۔ وہ اپنے وطن سے لکھنؤ فارسی پڑھنے آئے تھے۔ ایک مولوی سے انہوں نے گلستاں کا درس لینا شروع کیا۔ ان کے قیام کے لیے ایک جگہ مقرر کردی گئی۔ اور ایک گھر بتادیا گیا جہاں سے ان کو کھانا ملتا تھا۔ فارسی پڑھنے والے طالب علموں کا یہی طریقہ تھا لیکن عربی پڑھنے والوں کا نہیں[۲]۔ سید نور اللہ کے حال میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"در ایام شباب بہ شوق تحصیل علم در قصبات متردد گردید۔ از ملا محمد زماں ساکن کاکوری ودیگر فضلاء عصر تحصیل نمود۔ بعد ازاں بہ خدمت سید حسین شاگرد رشید میرزا ہد رفت و چندی تلمذ کرد۔ آخر کار بخدمت میرزا ہد شتافت و تحصیل را بہ انتہا رسانید"[۳]

---

[۱] رقعات میرزا قتیل ۵۸ [۲] تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۱۳۳۔ ۱۳۴ [۳] ماثر الکرام ۱/ص ۱۱۱
میر طفیل محمد بلگرامی کی طالب علمی اور ان کے اساتذہ کے ناموں کے لیے دیکھیے۔ ایضاً/ ۱۵۰ نیز دیکھیے حال۔ میر عبد الجلیل بلگرامی /۲۵۸

مختصر یہ کہ اس زمانے کے تذکروں کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تحصیل علم میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں تحصیل علم کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے جس قدیم عالم کا حال پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے کئی استادوں سے استفادہ کیا تھا۔

اس زمانے کے طلباء میں تحصیل علم کا بڑا ذوق پایا جاتا تھا۔ وہ دوران تعلیم میں اپنے گھر والوں سے تقریباً ناتہ توڑ لیتے تھے تاکہ یکسوئی سے علم حاصل کر سکیں۔ سید محمود آصغر بلگرامی کی طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :۔

"در مبادی حال بہ ارادۂ تحصیل علم بہ قنوج رفت و نزد علماء آنجا کتب درسی گذراند و کمال استعداد بہم رسانید و در ایام تحصیل باوجود قرب مسافت گاہی میل وطن نہ کرد چہ مسافت مابین بلگرام و قنوج پنج کردہ است و ہمت بر اکتساب فنون علم گذاشتہ"[1]

ریاضی پڑھنے کے لیے طالب علموں کو دہلی جانا پڑتا تھا۔ میر محمد یوسف کے بارے میں لکھا ہے " در دارالخلافہ شاہ جہان آباد از بعض علماء ریاضی داں آں بلدہ علوم ریاضی، ہیئت و ہندسہ و حساب وغیرہ را اخذ کرد و قدر رستے عالی در فنون ریاضی بہم رسانید"[2]

---

[1] مآثر الکرام ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۲۹

اس زمانے کے قاعدہ کے مطابق اعلیٰ درجے کے طلباء کم درجے والے طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے۔ میر طفیل محمد بلگرامی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے سے کم درجے کے طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے۔[1]

وقت درس بالعموم مدرسوں مسجدوں اور خانقاہوں میں صبح کے وقت تعلیم دی جاتی تھی، طلباء جزدان میں کتابیں رکھکر لے جایا کرتے تھے۔ فضل اعظم خاں اپنی طالب علمی کے زمانے میں گلستان جزدان میں لے کر جاتے اور دوسرے طالب علموں کے ساتھ تحصیل علم کیا کرتے تھے۔[2]

مکتب و مدرسہ کے قواعد و ضوابط مدرسوں کے طلباء اور دار الاقامہ میں رہنے والے طالب علموں پر بڑی کڑی نظر رکھی جاتی تھی اور ان کے کردار، اخلاق اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ کی تربیت پر خاص طور پر دھیان دیا جاتا تھا۔ اگر ایک طالب علم کوئی ایسا کام کرتا جو اس کے استاد کی مرضی کے خلاف ہوتا تو اسے سخت سزا دی جاتی اور بعض مرتبہ تو اسے دار الاقامہ اور مدرسے سے بھی نکال دیا جاتا تھا۔ ملا نظام الدین سہالوی کے مدرسہ میں ایک طالب علم تھا۔ اس طالب علم نے ایک ایسے شخص کے ساتھ مباحثہ کیا جو ملا سے بھی بحث کر چکا تھا۔ اس

---

[1] مآثر الکرام ۱/ ۱۰۵

[2] تاریخ فرح بخش ۱۱/ ۱۳۳

طالب علم نے اپنے استاد کی طرف داری میں اس سے مباحثہ کیا تھا مگر ملا نظام الدین کو یہ بات ناگوار گذری اور وہ اس طالب علم سے نہ صرف ناراض ہوئے بلکہ اس کو اپنے ہاں سے خارج کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ اس قسم کی حرکتوں سے میں راضی نہیں ہو سکتا۔ کسی شخص کو بھی رنج پہونچانے کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتا ہوں۔ [۱]

نصاب

قرون وسطیٰ کے مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب کا ہمیں تفصیلی علم نہیں ہے کیونکہ اس زمانے کے مصنفین کی تصانیف میں کسی مستقل نصاب کی تفصیل دستیاب نہیں ہوتی۔ مثلاً مدرسہ فیروز شاہی میں تفسیر، حدیث، اور فقہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ چونکہ فیروز شاہ تغلق کو علم نجوم، تاریخ اور فن ادبیات سے دلچسپی تھی۔ اور بہت ممکن ہے یہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہوں مگر اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ درس نظامی سے قبل ہندوستان میں کوئی جامع نصاب نہ تھا [۳] مختلف اساتذہ اپنی دلچسپی کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ مثلاً دارات علی خاں [۴] نے بہار دانش، نظامی گنجوی کی شیریں خسرو، اور غنیمت کی مثنویاں پڑھی تھیں۔ اور انشاء پردازی

---

۱ معارف (ماہ دسمبر ۱۹۷۰ء) ص ۴۲۱-۴۲۲

TRAVELSIN INDIA PP. 155-157

۳ برنیر کا واقعہ دیکھیے جہاں اورنگزیب نے اپنے استاد ملا صالح سے اس بات کی شکایت کی ہے کہ جو علم انہوں نے اسے پڑھایا تھا وہ بے حد ناقص تھا۔

STUDIES IH MEDIEVALINIAN HISTORYAND, CULTURE ص P76 ۴

۵ ایضاً برائے حالات ملاحظہ ہو۔ تاریخ فرح بخش / ۱۹۲-۱۹۳

سیکھی تھی[1] کیونکہ اس زمانے میں ملازمت کے لیے انشاپردازی لازمی تھی۔ جواہر علی خاں کے درس میں قرآن، گلستان و بوستان اور دیگر فارسی کی کتابیں شامل تھیں۔ مثلاً بہار دانش سکندر نامہ (نظامی)، یوسف زلیخا (جامی)، مثنوی غنیمت، خوشنویسی، انشاپردازی، اور قرات۔[2]

لیکن صحیح معنوں میں اسلامی مدارس کے لیے ایک جامع نصاب ملا نظام الدین سہالوی نے ترتیب دیا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

درس گاہ فرنگی محل کا ارتقاء موجودہ زمانہ میں فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ ابتدا میں اس جگہ پر ایک فرانسیسی تاجر سکونت پذیر تھا۔ جس کی وجہ سے وہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر اپنے وطن کو واپس چلا گیا تو یہ زمین سرکاری ہو گئی۔[3] اورنگ زیب کے دور حکومت میں ملا قطب الدین سہالوی[4] نے عروج پایا۔ ان کا وطن

---

[1] تاریخ فرح بخش ۱۱/ ص ۱۹۳ [2] ایضاً ۱۱/ ۲۸ [3] تذکرۂ علمائے ہند/ ۱۶۸

[4] ملا قطب الدین نے ملا عبدالسلام کے شاگرد ملا دانیال اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے شاگرد رشید قاضی گھاسی سے کسب علوم کیا تھا۔ اور قاضی گھاسی کے دست مبارک پر بیعت بھی کی تھی۔ آپ کی تصانیف میں شرح عقائد علامہ دوانی پر حاشیہ تھا جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہو گئی۔ ملا صاحب نے تمام عمر درس تدریس کا فیض جاری رکھا اور ہزاروں طالب علموں کو منزل تکمیل تک پہونچایا۔ بعد کے علماء نے ان کے شاگردوں سے استفادہ ... کیا۔ برائے تفصیل دیکھئے مآثر الکرام/ ص ۲۰۹، ۲۱۰ تذکرۂ علمائے ہند/ ۱۶۷، ۱۶۹، ہفت تماشا/ ۱۶۲، معارف دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۴۲۴، ۴۲۵ تذکرۂ فرحت الناظرین (قلمی پٹنہ/ ۵)

مالوف قصبہ سہالی تھا۔ وہاں کے انصاریوں اور عثمانیوں کے مابین زمینداری کے معاملہ میں کچھ تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چونکہ ملا قطب الدین انصاری تھے، لہذا ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں ایک رات کو چند عثمانی ان کے گھر پر چڑھ آئے۔ ملّا کو شہید کر دیا۔ اور ان کا گھر نذر آتش کر دیا۔ ان کے صاحبزادے ملّا محمد سعید سہالوی نے عالمگیر اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو کر داد فریاد کی۔ بادشاہ نے فرنگی محل کا علاقہ ان کو معافی میں دیدیا۔[۲] موجودہ علمائے فرنگی محل کا سلسلہ ملّا قطب الدین سہالوی تک پہونچتا ہے [۳]

ملّا قطب الدین سہالوی کے بیٹوں میں ملّا نظام الدین اپنی علمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ برگزیدہ تھے۔ ان ہی کے نام سے "درس نظامی" مشہور ہے۔ ابھی ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی کہ والد نے شہادت پائی۔ تحصیل علم کے لیے پورب کے قصبوں میں پھرے اور علمائے وقت سے درسی کتابیں پڑھیں۔ آخر میں شیخ غلام نقشبند لکھنوی کی خدمت میں زانوے ادب تہہ کیا۔ اور بقیہ درسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور فارغ التحصیل ہوئے۔ فاتحہ کی رسم ادا ہوئی۔ اس کے بعد ملّا نظام الدین نے لکھنؤ ہی میں سکونت اختیار کی تمام عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا۔ اپنے تبحر علمی کی

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ تذکرہ علمائے ہند/ ۱۹۰

[۲] تذکرہ علمائے ہند/ ۱۶۸-۱۶۹

[۳] مآثر الکرام ۱/ ۲۰۹

[۴] معارف دسمبر ۱۹۱۸ء، ص ۲۴

وجہ سے بڑی شہرت[الف] پائی۔ ان کے بعد کے اکثر علماء کا سلسلۂ تلمذ ان تک یا ان کے شاگردوں تک پہونچتا ہے۔ بعض عالم ایسے بھی تھے جو دوسرے استادوں سے کسب علم کرتے لیکن فارغ التحصیلی کی سند لینے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ عبدالرزاق[۱] بانسوی کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی اور شیخ عبدالرزاق کے خلیفہ میر سید اسمٰعیل[۲] بلگرامی سے بھی روحانی فیضان حاصل کیا تھا۔ ملا صاحب کی تصانیف میں حاشیہ شرح ہدایہ حکمت حکیم صدر رائے شیرازی اور شرح مسلم الثبوت مشہور ہیں۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ کو انہیں ایک صحبت میں ملا موصوف سے نیاز حاصل کرنے کا شرف ملا تھا۔ ۹ رجمادی الاول روز چہارشنبہ، ۱۱۶۱ھ کو ملا صاحب نے

---

۱ قصبہ محمود آباد کے باشندے تھے لیکن بانسوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ چونکہ ان کی والدہ کا تعلق بانسہ کے ایک شیخ قدوائی خاندان سے تھا لہٰذا انہوں نے اپنے ننہال میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ابتداء میں نوکری کے ذریعہ کسبِ معاش کرتے تھے بعد میں نوکری سے سبکدوش ہوکر سیر و سیاحت پر قدم رکھا۔ گجرات احمد آباد میں جاکر شاہ عبدالصمد خدا نما کے مرید ہوئے۔ اور روحانی منزلیں طے کیں۔ اس کے بعد وطن واپس چلے آئے اور کھیتی باڑی کے ذریعہ تحصیلِ معاش کرنے لگے۔ اس علاقے کے عوام و خواص ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ۱۱۳۶ھ میں وفات پائی اور بانسہ میں دفن ہوئے۔ برائے تفصیل دیکھئے ماثر الکرام ۱/ص ۱۹۰، ۱۹۱، ملفوظات رزاقی

۲ برائے تفصیل ملاحظہ ہو ماثر الکرام ۱/۲۳۳-۲۳۵، تذکرہ علمائے ہند/۲۴

الف قاضی مرتضیٰ بلگرامی کی ملا صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں "در علم و فضل ثانی نداشت" حدیقۃ الاقالیم/۱۵۴

رحلت فرمائی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ [1]

قرونِ وسطیٰ کے نصاب کی کوتاہیوں کا ہم نے پہلے ضمناً ذکر کر دیا ہے اس موقع پر مولانا عبدالحق کی رائے پیش کرنی ہے جو انہوں نے ازمنہ وسطیٰ کے نصاب کے بارے میں ظاہر کی ہے "لیکن جہاں ہمیں اس زمانے کے علمی ذوق کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے وہاں ایک بات کا بھی افسوس ہوتا ہے۔ اس زمانے کے نصاب پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو حلقہ کچھ عرصہ پہلے علماء نے کھینچ دیا تھا اس سے باہر قدم رکھنا انہیں قسم تھا۔ فقہ، حدیث، تفسیر، منطق و فلسفہ و علم کلام پر سارا زور تھا ساری طباعی اور ذہانت اسی پر ختم تھی۔ یہاں تک کہ کتابیں بھی زمانۂ دراز سے ایک ہی چلی آتی تھیں۔ اور انہیں پر حاشیہ پر حاشیہ اور شرح پر شرح اضافہ ہوتی جاتی تھی۔ علوم طبیعات وغیرہ کا تو کیا ذکر ہے۔ تاریخ، و جغرافیہ بھی جس میں مسلمانوں نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ خارج از بحث تھا۔ غرض صدہا سال سے ہمارے ہاں تعلیم حالت جمود میں تھی" [2]

ان تمام کوتاہیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ملّا نظام الدین نے ایک نصاب تیار کیا جو درسِ نظامیؒ کے نام سے مشہور ہے اور اس نصاب میں ذیل علوم وفنون کا درس دیا جاتا تھا۔

(۱) صرف: میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔

---

[1] مآثر الکرام ا رص ۲۲۰-۲۲۱، تذکرہ علمائے ہند/۲۴۱-۲۴۲، ہفت تماشا / ۱۴۲

[2] مآثر الکرام (مقدمہ) ا رص ۱۲

(۲) نحو: نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی،
(۳) منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایسا غوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر، سلم العلوم
(۴) حکمت: میبذی، صدرا، شمس بازغہ،
(۵) ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالۂ اول، تشریح الافلاک،
رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اول۔
(۶) بلاغت: مختصر معانی، مطول تا ما انا قلت۔
(۷) فقہ: شرح وقایہ اولین، ہدایہ آخرین،
(۸) اصول فقہ: نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)
(۹) کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔
(۱۰) تفسیر، جلالین، بیضاوی۔
(۱۱) حدیث، مشکوٰۃ المصابیح [1]

لیکن بعض علماء اور صوفیاء اس عام روایت سے اتفاق نہیں رکھتے کہ یہ نصاب مولانا نظام الدین نے ترتیب دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نصاب کا ہیولیٰ ملا فتح اللہ شیرازی [2] نے ترتیب دیا تھا جس میں بعد میں اضافہ

[1] شیخ محمد اکرام / رود کوثر۔ (۱۹۵۸ء) ص ۵۸۵

[2] شیراز وطن اور سید النسب تھے۔ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ تمام علوم عقلی، مثلاً حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم، رمل، حساب، طلسمات، جر اثقال وغیرہ پر پوری دسترس رکھتے تھے علوم عقلی کی طرح علوم نقلی، حدیث، تفسیر اور کلام پر بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں ہندوستان وارد ہوئے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۶۹۳ پر ملاحظہ کیجئے)

ہوتا رہا۔ اور ملا نظام الدین کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔[1] چند سالوں کے بعد اس نصاب میں ذیل مضامین کا اضافہ کر دیا گیا۔

(۱) ادب۔ (۲) فرائض (۳) مناظرہ اور اصول حدیث اور ان کے ساتھ اس موضوع کی کتابیں شامل کر دی گئیں[2]

مگر اس نصاب میں بھی تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین کو شامل نہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں فن خوشنویسی دہلی کے مدارس میں ایک مضمون کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس نصاب میں اس فن کا چرچا سرے سے غائب ہے۔

بہر حال ملا نظام الدین کے بعد مدرسہ فرنگی محل میں اس نصاب پر عمل ہوتا رہا۔ ملا حسن فرنگی محلی 'میرزاہد' وشرح مواقف کا درس دیا کرتے تھے۔ کرم اللہ خاں نے ملا موصوف سے ان کتابوں کا درس لیا تھا۔[3]

ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت عبد العلی بحر العلوم لکھنوی کو نصیب ہوئی۔ سترہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتداء میں مدرسہ فرنگی محل میں درس کا شغل کیا لیکن شیعوں کے ہاتھوں تنگ آکر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ پہلے شاہجہاں پور گئے۔

(بقیہ حاشیہ صـ۶۲۹ کا) عضد الملک کا خطاب پایا۔ ۷۹۹ھ میں کشمیر میں وفات پائی۔ منتخب التواریخ (ا۔ت) ص ۵۸۸-۶۸۸ھ۶، ماثر الکرام ۱/ ۲۳۶-۲۳۸

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رود کوثر/ ۵۸۶-۵۸۷

[2] ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ GLIMPSES OF MEDIEVAL INDIAN CULTURE-P 90

[3] عماد/ ۱۵۶

وہاں سے رام پور، اور بنگال ہوتے ہوئے مدراس پہونچے۔ وہاں سے کرناٹک گئے۔ نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی اور بحرالعلوم کا خطاب عنایت کیا۔ درس کے لیے ایک بڑا شاندار مدرسہ تعمیر کروایا۔ جہاں مولانا بحرالعلوم اپنی وفات ۱۲۲۵/۱۸۱۹ء تک درس و تدریس میں منہمک رہے[۱] حالانکہ ملا بحرالعلوم فرنگی محل چھوڑ کر چلے گئے لیکن یہ درس گاہ ان کے بعد بھی علم و ادب، درس و تدریس کا مرکز بنی رہی۔ ان کے بعد ملا محمد حسن[۲] فرنگی محلی، ملا ولی فرنگی محلی اور احمد حسین[۳] فرنگی محلی وہاں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ رجب علی بیگ سرور نے اس درس گاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

منڈیر نگی محل کا حال کیا لکھوں کہاں زبان دو سے [illegible] یارا۔ جو بشر لکھتا۔ مولوی فاضل عدیم المثال ہر شخص جمیع علوم کا استاد کتب درس ابتدا و سے انتہا تک یاد منقول و معقول میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کا پرتو فیض جہاں میں روشن مولوی مبین دوربین سراج انجمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ[۴] یہ معتبر تھے تکمال [illegible] ہیں

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند/۱۲۲-۱۲۳، رود کوثر/۵۹۱، ہفت تماشا/۲۰، مفتی محمد رضا صاحب کے مضمون میں بحرالعلوم کی وفات کا سن ۱۲۲۵ھ دیا ہے غالباً یہ غلطی کاتب سے سرزد ہوئی ہے۔ معارف (نومبر ۱۹۵۸ء) ص ۳۵۷ [۲] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ تذکرہ علمائے ہند/۱۸۵، ۱۸۶ [۳] تذکرہ علمائے ہند/۱۳

[۴] ایضاً/۹۹-۱۰۰، تاریخ اردو ۴/۷۸، عبدالقادر رامپوری نے اپنے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مولوی موصوف سے ملاقات کی تھی۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۲ پر دیکھیے)

یہی لوگ نادر الزمان ہوتے ہیں" [1]

اپنے زمانے میں علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے مرزا قتیلؔ نے لکھا ہے کہ قصبات میں علم معقول کا زور تھا اور اودھ کے بعض شہر تو بغداد اور بخارا، شیراز سے بازی لے گئے تھے۔ شمس بازغہ جو علم طبیعی و الٰہی کی کتاب ہے پُرانے لوگوں کی تصانیف سے پہلو مارتی تھی۔ اس کے بعد مرزا قتیلؔ نے اودھ کے بعض علماء اور ان کی تصانیف کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مرزا قتیلؔ کا یہ بھی بیان ہے کہ ہندوستان میں علم معقول جا بجا انہیں بزرگوں کے فیض سے پھیلا" کوئی طالب علم اور کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جو ان کی شاگردی کے حلقے سے باہر ہو۔ کوئی چھ واسطوں سے اور کوئی سات واسطوں سے اور بعضے اس سے بھی کم واسطوں سے تلمذ علمی ان حضرات سے رکھتے ہیں" [2]

مرزا قتیلؔ کے خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے نہر الفصاحت، چار شربت [3] اور رقعہای قتیل بھی فارسی نصاب میں شامل کر لی گئی تھیں۔ مرزا امانی کے والد ان کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔ میر حیدر حسین نامی شخص جو نواب شائستہ خاں کی اولاد میں سے تھا۔ ان کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا [4]

(حاشیہ صفحہ ۶۳۶ کا بقیہ) لکھا ہے "ایک دن مولوی ظہور اللہ صاحب کی زیارت سے بھی مشرف ہوا جو فرنگی محل (لکھنؤ) کے بزرگوں میں سے ہیں۔ اور وہاں کے معمول کے مطابق فنون مروجہ کی اصطلاحوں اور مسائل کی تعلیم دیتے تھے" وقائع عبدالقادر خانی ارص ۱۶۳ حاشیہ صفحہ ہذا

[1] فسانۂ عجائب ص ۸ [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا ، ص ۱۷۲-۱۷۰
[3] نہر الفصاحت اور چار شربت مرزا قتیلؔ کی تصانیف ہیں۔ [4] رقعات مرزا قتیل ۳۹/۔

باب ہشتم

مذہب اور اخلاق

نوابانِ اودھ کی زندگی

برہان الملک اور صفدر جنگ کی زندگی کا زیادہ تر وقت ملکی فتوحات اور انتظامی امور میں صرف ہوا تھا لہٰذا انہیں امن و امان کی زندگی گذارنے کا بہت کم موقع ملا۔ ہمعصر مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا کہ ان نوابوں کی زندگی بہت سی آلودگیوں سے پاک تھی[1] لیکن ان کے جانشینوں کو ورثہ میں ملک اور ثروت اور امن و امان ملا تھا۔ اس لیے ان کے پاس عیش و عشرت کے لیے کافی وقت اور وسائل تھے۔ نواب شجاع الدولہ کو عورتوں کی صحبت بیحد پسند تھی۔ لہٰذا نواب کے لیے ایک مینا بازار کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہرچرن داس کا بیان ہے کہ ۱۸ رشعبان ۱۱۸۴ھ کو نواب موصوف اور شیر جنگ بہادر وغیرہ رمنہ کی سیر کو نکلے۔ اس موقع پر طوائفوں، بھانڈوں، دیگر رقاصوں اور موسیقاروں کے طائفے ہم رکاب تھے[2]۔ نواب کے ہمراہ نواب بیگم، نواب کی والدہ ماجدہ،

---

[1] نواب صفدر جنگ کی صرف ایک منکوحہ بیوی تھی ان کے علاوہ اس کے محل میں نہ تو بیویاں تھیں اور نہ ہی داشتائیں ہی تھیں۔ عماد السعادت/۳۶

[2] چہار گلزار شجاعی/ ۲۰۲ ب

بہو بیگم، بخت النساء، خانم عرف بنجا خانم صاحبہ محل نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں نیز دوسرے اقربا بھی تھے۔ ان مستورات نے اس بازار سے کچھ چیزیں بھی خریدیں۔ چیزوں کے فروخت کرنے کی خدمات حسین وجمیل دوشیزاؤں کے سپرد تھی [1]

ہرچرن داس کے بیان کے مطابق نواب شجاع الدولہ کے محل میں " ہفت صد وچند عورات نکاحی اور متاعی تھیں [2] ان کے علاوہ تقریباً دو ہزار کنیزیں تھیں۔ [3] اس کے باوجود ہرچرن داس نواب کے زہد وتقویٰ کے بیان میں رطب اللسان ہے اور لکھتا ہے :-

" وبے متعہ یا نکاح بر عورت نظر نمی کرد وگرد شراب مسکرات
نمی گردید اگر فروش یا نوش شراب را می یافت گوش وبینی بر مید" [4]

فی الواقع نواب شجاع الدولہ جنسی تلذذات کا دل دادہ تھا اور خواہش نفسانی اور غلبۂ شہوانی کے وقت بدحواس اور مدہوش ہو جاتا تھا اکثر ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ راہ میں سواری چلی جا رہی ہوتی اور شہوت سے بیتاب ہو کر عورتوں کے ساتھ مباشرت کر کے نواب آگے بڑھتے تھے۔ اس وجہ سے ہمہ وقت اور ہمہ جا ان کے لیے عورتیں مہیا رکھی جاتیں تھیں۔ دن رات میں عورتوں کے ساتھ

---

[1] چہار گلزار شجاعی/۱۹۴ ب۔ ۱۹۵ الف

[2] ایضاً/۲۲۱ ب۔ ۲۲۲ الف

[3] ایضاً/۲۲۲ الف

[4] چہار گلزار شجاعی/۲۲۲ الف نیز دیکھئے۔ تاریخ فرح بخش ۱۱/۱۲۱

مباشرت کی نوبت دس پندرہ مرتبہ تک پہونچ جاتی تھی۔ چند کُٹنیاں اس کام کے لیے مقرر تھیں کہ جابجا سے خوبصورت عورتیں تلاش کر کے نواب کے لیے لائیں۔ ان کی مدخولہ عورتوں کی تعداد دو ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ کثرت مباشرت کی وجہ سے امراض مزمنہ میں گرفتار رہتے تھے اور آخرکار اسی عارضہ میں انتقال کیا۔[1]

نواب شجاع الدولہ کو امرد پرستی کا بھی ذوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمت بہادر جب تک کم سن اور امرد رہا، نواب کے ساتھ زنانہ اطوار سے پیش آتا تھا۔ اس کے علاوہ یوسف خواجہ سرا، جو اپنے حسن میں یوسف ثانی کہلاتا تھا، نواب کا منظور نظر تھا۔[2]

کثرت ازدواج کی وجہ سے اولاد کی بھی کثرت تھی۔ بہو بیگم سے صرف آصف الدولہ پیدا ہوا تھا۔ باقی اولاد دوسری عورتوں کے بطن سے تھی۔[3]

---

[1] تاریخ اودھ ۲/۶، ۱۵۰؛ ایضاً ۲/۳۰۵، عماد/۶۶ غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ بعد میں راجا ہمت بہادر نواب موصوف کے لیے عورتیں فراہم کیا کرتا تھا عماد/۶۶ طباطبائی کا بیان ہے کہ "عیاشی میں بجز شراب کے اور کل منہیات سے محترز تھا اکثر عورتوں کی مباشرت میں راغب اور لہو ولعب میں معروف رہتا تھا" سیرالمتاخرین (ا۔ت) ۳/۸۴

[2] تاریخ اودھ ۲/۲۰۱ عماد "حسن پرست و امرد دوست ہم بود با امرا دگر ہمت بہادر بسیار صحبت می داشت" /۶۶

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو تاریخ اودھ ۲/۳۰۵-۳۱۰

جارج فارسٹر کا بیان ہے کہ شجاع الدولہ جنسی اشغال میں بے حد مصروف رہتا تھا اور اس پر کسی قسم کی رکاوٹ قبول نہ کرتا تھا اور اس وجہ سے اس سے بعض مرتبہ ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوتی تھیں، جو اس کے شایان شان نہ تھیں۔ مزید برآں اس کی صحت کے لیے مہلک تھیں۔ حالانکہ ان وجوہ کی بنا پر وہ لاعلاج امراض میں گرفتار ہو چکا تھا لیکن وہ بڑی بے پرواہی سے عورتوں سے صحبت کرتا رہتا تھا۔ اس کے حرم کی عورتوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی جن میں منکوحہ اور غیر منکوحہ عورتیں شامل تھیں۔ اور ان سے پچاس بچے تولد ہوئے تھے [1]

نواب شجاع الدولہ کو رقص و سرود سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ فیض آباد میں ایک بڑی تعداد میں ایسی رقاصائیں تھیں جو نواب کے دربار سے وابستہ تھیں۔ بازاری عورتوں اور گانے والوں کے طائفے اس کثرت سے تھے کہ کوئی محلہ اور کوئی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں وہ موجود نہ ہوں [2] سفر اور حضر میں یہ طائفے نواب کے ہمراہ ہوتے تھے [3] پنو طوائف بڑی شہرت کی حامل تھی اور اُسے نواب کی خصوصی سرپرستی حاصل تھی [4] جس زمانے میں نواب کو نواب حافظ

---

[1] TRAVELS IN INDIA. I. PP. 213 & 14

[2] تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ۲/ ۹-۱۰

[3] چہار گلزار شجاعی "برائے سیر شکار رمنہ تشریف فرما شدہ قریب پنج ہزار کس از قوم طوائف و بھانڈ و چونہ پزنی و دیگر سازندگان و مطربان و کاسبان در آں مجمع حاضر بودند و از تماشا کسی را متعرض نہ بود" ۲۰۱ ب [4] ایضاً ۲۰۳ ب

رحمت خاں سے معرکہ کے موقع پر بھی نواب کے پڑاؤ میں شرفو نامی ڈومنی موجود تھی۔ اس جنگ میں فتح کی خوشی کے موقع پر شرفو نواب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ نواب نے فی الفور سات ہزار روپے اُسے بطور انعام عطا کیے۔ شرفو نے عرض کیا کہ چونکہ کہ باقی رقاصاؤں کے لیے بھی انعام عطا ہو اس پر نواب نے چار لاکھ روپے دیئے کہ ان میں تقسیم کردیا جائے۔ [1]

جارج فارسٹر نے اودھ اور روہیلکھنڈ کے لوگوں سے سنا تھا کہ حافظ رحمت خاں پر فتح حاصل کرنے کے بعد نواب نے اس کے حرم کی مستورات کی عصمت داری کی تھی۔ لیکن اس سیاح نے ان کے بیانات پر غیراعتمادی ظاہر کی ہے [2] اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب نواب شجاع الدولہ کو اس اتہام کا علم ہوا تو وہ شرمندگی کی وجہ سے زاروقطار رونے لگا [3]

نواب آصف الدولہ لہو ولعب سے شغف رکھتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ علت ابنیٰ کا شکار تھا [4] وہ دن رات غیر مہذب اوباش [5] ہندوؤں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور شراب کے نشے میں پوچ تفریحات میں عمل

---

[1] عماد/۱۱۷ [2] TRAVES IN INDIA, I P. 203

[3] ایضاً ۱/ ۲۰۲ (فٹ نوٹ)

[4] تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ۲/ ۱۷-۱۸، تاریخ اودھ ۳/ ۴ نواب قوت رجولیت سے عاری تھا ۳/ ۴-۷

[5] عماد/ ۱۴۴، سیرالمتاخرین (ا-ت) ۳/ ۹۹

پیدا ہوتا تھا وہ ممنوع تفریحات کے شغل میں اس درجہ بے شرم اور بے دھڑک تھا کہ بازاری لوگ بھی اس کی ناشائستہ حرکات سے خوف زدہ تھے۔ اور اس کی یہ حرکات خبیثہ اتنی مشہور ہو گئی تھیں کہ قرب و جوار کے ہزاروں لوگ ان پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ان لوگوں کی یہ رائے تھی آدم کے زمانے سے ان کے زمانے تک ہزاروں بادشاہ ہوئے لیکن ان کے بارے میں ایسی ناشائستہ حرکات کے ارتکاب کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں دستیاب نہیں ہوتا۔ کم مرتبہ اور کم عقل لوگوں۔ مثلاً حجام۔ چرداہے قصاب لکڑ ہارے، جہاوت، فراش اور چمار، میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اس کے طفیل میں اہلِ ثروت ہو گئے تھے۔ اور بڑے فخریہ انداز میں جھالردار پالکیوں ہاتھیوں اور سرکاری گھوڑوں پر سوار ہو کر بازاروں میں پھرتے تھے۔ محمد فیض بخش عالم حیرت میں لکھتا ہے " یہ تمام واقعات اس بات کے لیے کافی ہیں کہ آسمان ٹوٹ پڑے اور زلزلہ آجائے اور تمام زمین پانی میں دھنس جائے " [1]

نواب دن رات لہو و لعب، تفریحی مشاغل، تماشہ بینی، آتشبازی اور شان دار عمارتوں کی تعمیر میں مشغول رہتا تھا۔ وہ مالی اور ملکی معاملات کی طرف سے مکمل بے توجہی برتتا تھا اور مستقبل سے بالکل بے نیاز تھا [2] اور بقول خوب چند ذکا " طبع رنگین داشت و قدر رنگین طبعان می شناخت " [3]

---

[1] تاریخ فرح بخش ۲ / ۴ / ۲

[2] ایضاً ۲ / ۱۰۳ نیز سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۳ / ۱۰۴

[3] عیار الشعراء ۱ / ۴ ب

ابتدائی زمانے میں نواب شراب نوشی کا مرتکب ہوتا تھا بعد میں اس شغل سے توبہ کرلی اور بھنگ پینے لگا تھا اور اس کے افیون خوری اور حقہ نوشی کی طرف مائل ہوگیا تھا [1]

نواب موصوف کو رقص و سرود سے بھی دلچسپی تھی اور جب اس شغل میں مشغول ہوتے تو دوسرے کاموں سے بالکل بے نیاز ہو جاتے سمانورا بھانڈ اور بڑی مصری وغیرہ سفر و حضر میں نواب کے ہمراہ ہوتے تھے۔ [2] نواب کی رقص و سرود کی محفل کا ہدایت نے یوں نقشہ پیش کیا ہے۔ جو گلشن محل میں منعقد ہوئی تھی۔

ناچ اور راگ کے ایک طرف سما کر کے کہنا ÷ دھوم ایک طرف ہے ادلک سکا ودا ایک طرف بھگت
ایک طرف زمزمہ شہنائی سے فرحت کے پکار ÷ ایک طرف گوش مسرت میں سوا ہے نوبت
رقص رقاصوں کے میں رنگ کا کیا ذکر کروں ÷ کیوں کہ اندر کے اکھاڑے کو دوں نسبت [3]

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے نواب موصوف کو عورتوں سے دلچسپی نہ تھی اور

---

[1] عماد / ۱۵۷ در ابتدائے حکومت شراب بسیار می خورد و بعد چندی کہ ازاں توبہ کرد بنگ میزد لیکن با قلیان گاہے۔ رغبت نداشت... و چند سال پیش از واقعہ ناگزیر افیون استعمال میکرد و کم کم قلیان نیز میکشید" نیز ملاحظہ ہو۔ تفریح الغافلین / ۶۱ تاریخ اودھ ۳ / ۹۴-۹۳، ۵۰-۳۴۰، ۱۰۴-۱۰۱، ۲۷۳ دیوان مصحفی دوم / ۳۰ ب

[2] تاریخ اودھ ۳ / ۲۷۵ کلیات ہدایت۔ روز و شب عیش کا اس محل کا کیا بولوں بیاں ٭ خرم ہوئے دل کے جسے دیکھ کے بزم عشرت / ص ۹۰"

[3] کلیات ہدایت / ۹۱ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ص ۲۹۹ - ۳۰۰

بمعصر مورخین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اس میں قوت رجولیت کا فقدان تھا لیکن زمانے کے دستور کے مطابق اس کے محل سرا میں لگ بھگ پانچ سو خوب صورت عورتیں جمع تھیں لہ اور ان میں سے کئی ایسی بھی تھیں کہ ان کو نواب نے ان کو حاملہ ہونے کی حالت میں اپنے زنانے محل میں داخل کر لیا تھا۔ ابوطالب لندنی کا اس سلسلے میں بیان قابل مطالعہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ملازم او ہر زنے بے سراپا را کہ از جانے حمل بہمرسا ند در آغاز آں از وارثانی او را خودش در محل داخل می کنند و گاہے زنے حاملہ سر سواری وزیر رفتہ فریاد میکند کہ اگر با ہمیں کہ فلاں وقت بملاقات تو رسیدہ ام، وفاداری نمی کنی۔ امادر فرزند خود کہ در شکم من است التفات فرمائی"۔ وزیر تصدیق کردہ داخل خانہ می کنند" ٹے

یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ابو طالب لندنی نواب موصوف سے ناراض اور بد دل تھا۔ لہٰذا اس نے نواب کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا اور مزید برآں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نواب اس لائق نہ تھا کہ اس کو مسند نشین رکھا جائے۔ بلکہ انگریزوں کو جن کی ابوطالب کو سرپرستی حاصل تھی، صوبہ اودھ پر مکمل طور سے قبضہ کر لینا چاہیے تھا۔

لہ ایک موقع پر نواب دورے پر گیا ہوا تھا تو اس کے ہمراہ کوئی تین سو عورتیں تھیں اور اس کا حرم وسیع تھا۔ TNINING=TRAVELS IN INDA:P311.

ٹے تفضیح الغافلین / ۱۳۵

کثرتِ ازدواج کی وجہ سے نواب کی اولاد کی کثرت تھی۔ [1]

کہا جاتا ہے کہ کردار کے لحاظ سے نواب وزیر علی خاں بلند مرتبہ نہ رکھتا تھا۔ مسند نشینی کے بعد اس نے اپنے والد کے حرم کی پانچ چھ عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ [2]

نواب سعادت علی خاں کی عیش دوستی کا ذکر انشاؔ، نے اپنے اشعار میں کیا ہے :۔

تیرے ہی مجرے میں گایا کریں سب اہلِ نشاط ٭ قول و آہنگ دو نوا ماتھا ترانہ سرگم
بھیرویں کنکلی اور بانسری اور سارنگ ٭ پوربی گوری یمن پرچ ہیں اور جتنے نغم
راجہ اندر کے اکھاڑیں ہو جوں پریوں کا ناچ ٭ درِ دولت پہ ہمیشہ رہے یوں ہی چھم چھم [3]

ایک مرتبہ نواب موصوف سلطان پور کے دورے پر گئے۔ اس ضلع کے تمام رقاص اور لولیاں نواب کے خیمے میں حاضر ہوئیں اور رقص و سرود کی محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ مرزا قتیل کا بیان ہے :۔

"لولیان آں ضلع ہم در لشکر آمدہ اند عجب صورتی و طرزِ خواندنی دارند لیکن ایں قدر ہست کہ از طرزِ خواندن و پوشاک لکھنؤ دیگر چیز ست صورت باختیار خدا ست موقوف بر شہر نیست ہمہ زنہار در خواندن بلا بر سرِ غرہ لہای فقیری آرند" [4]

---

[1] ایضاً / ۱۳۴-۱۳۵ [2] عماد السعادت / ۱۵۹

[3] کلیاتِ انشاؔ / ۲۵۸ نیز ملاحظہ ہو دیوان ہجو در / ۲۳۳-۲۳۴۔ نیز دیکھیے۔

رقعات مرزا قتیل / ۳۸ [4] رقعات مرزا قتیل / ۴۹ نیز دیکھیے۔ ص ۵۲، ۳۸

نواب کو کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔ پرتاب گڑھ کے سفر کے دوران ان کے ہمراہ کبوتر خانہ بھی تھا۔[۱] دربار میں پہیلیوں کا بھی چرچا ہوا کرتا تھا۔[۲]

نصیر الدین حیدر کی عیاشی کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور رقمطراز ہیں: "عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی تو ایک ایک ادنیٰ کنجڑن ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ محمد شاہ کی گور بھرائی، ہر وقت راجہ اندر کا جلسہ رہا۔"[۳]

نوابوں کی طرز زندگی کا اثر ان کے امراء نے بھی قبول کیا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد کے ایک امیر مرزا جعفر کے بارے میں ابوطالب نے لکھا ہے:۔

"شب در ہجوم مسخرگان و ندیم پیشہ ہا نشستہ تا بہ ساعت صبح استماع سرود می فرمود۔"[۴]

اسی طرح حیدر بیگ خاں عیاشی کی طرف مائل تھا اور عوام کی فلاکت اور مصیبت زدگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کیا کرتا تھا۔ ابوطالب لندنی نے ۸۴-۱۷۸۳ء میں لکھنؤ کی قحط سالی کا حال لکھا ہے

---

[۱] رقعات مرزا قتیل / ۱۴

[۲] ایضاً / ۷۴

[۳] فسانۂ عجائب / ۱۱ نیز تاریخ اودھ ۴ / ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۵۲۔ ۳۷۳

[۴] تفضیح الغافلین / ۱۲۸، برائے حالات ملاحظہ ہو ایضاً / ۱۱۶، ۱۴۵ تاریخ اودھ ۴ / ۹۰۔ ۱۱۵ قیصر التواریخ ۱ / ۲۲۹ ریاض الفقی / ۹۹

اور ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ "علاوہ آں اکثرز نے خورد سال شیریں شمائل ودر آنجاعت بنظر درمی آید۔ فی الحال بجرم سرائے حیدر بیگ رسانیدند چنانچہ اکثر اطفال حیدر بیگ از بطن ہماں کنیزان است" اس کے بعد عالم حیرت میں مُصنف ہذا لکھتا ہے:۔

"معلوم باد کہ ہرگاہ آقا با خلق خدا ایں قدر بے مبالات باشد کہ درعین وقت تنگ بخیال شہوت رانی افتد، چنیں کساں مصاحب گردد" [1]

اپنی شہوانی قوت کو بڑھانے کے لیے وہ ادویات کا استعمال بھی کیا کرتا تھا۔ "درسال قحط زنان بسیار در خانۂ حیدر بیگ جمع آمدند، بداں سبب وہم بمقتضائے ہفتاد سالگی در قوت بہیمی او نقصان راہ یافت، اما حرص او شدید تر شدہ، از حکیم شفائی خاں استعلاج کرد۔ حکم موصوف بود کہ سیخ کاہی را در عطردار چینی فرد بردہ، در پان مالیدہ بروزے یک دو وقت خوردہ باشد، وحیدر بیگ نفعے ازیں عمل دیدہ، بے اطلاع حکیم موصوف بکثرت کرد۔ ولطافت وشدت حرارت عطردار چینی، رطوبات اصلی او را، کہ روو اذا انحطاط داشت، چکانیدہ حرارت غریبہ راکہ از قبیل دق متشبث باعضا بودہ، متولد گردانید، اطبا دست و پائے بسیار زدند، اما سود نکردہ" اور اس نے اسی مرض میں وفات پائی [2] حیدر بیگ کی اولاد کی تعداد

[1] ایضاً / ۹۵-۹۶

[2] ایضاً / ۱۱۹-۱۲۰

خاصی تھی۔[1]

مختارالدولہ ابتدا میں صاحب زہد و تقویٰ تھا لیکن اس نے بھی بعد میں عیش پرستی اختیار کر لی اور مے نوشی اور قمار بازی کا شغل کرنے لگا۔[2] نواب قاسم علی خاں[3] "در تمام عمر گرد شراب و بھنگ نگردید مگر معجون کہ درآن از قسم نشاء بنگ وغیرہ نمی بود تناول می فرمود و بمردمان مجلس ہم تقسیم می نمود"[4] اور ہمیشہ سیر و شکار میں منہمک رہتا تھا۔[5]

جواہر علی خاں کو رقص و سرود اور دیگر تفریحی مشاغل سے بڑی دلچسپی تھی۔[6]

نواب تاج الدولہ میرک حسین خاں کی بزم عیش و عشرت کا ذکر ہدایت نے ان اشعار میں کیا ہے :۔

سریر عیش پر بیٹھا تھا خرم — تھے اس کے گرد سارے اوس کے ہمدم
مہیا واں سب اسباب طرب تھے — وہاں حاضر سبھی اہل طرب تھے
خصوصاً علم موسیقی کا استاد — بہادر خاں تھا اس میں مثل بہزاد[7]

اس دور کا ایک اور امیر جھاؤ لال تھا جو فیض آباد کا باشندہ اور نیچ ذات کا تھا۔ ابتدا میں اُسے مشرف بیوتات کا عہدہ ملا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ترقی حاصل کی اس کی عیش و عشرت کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ کے قیام کے

---

[1] تفضیح الغافلین ۱۱۲ [2] تاریخ فرح بخش ۱۱/۲۳ [3] متوفی ۱۱۶۸ھ برائے حالات دیکھیے چہار گلزار شجاعی/ ۱۳۷ الف [4] چہار گلزار شجاعی/ ۱۴۸ الف و ب
[5] ایضاً/ ۱۴۸ الف [6] تاریخ فرح بخش ۱۱/ ۴۸-۵۱۔
[7] کلیات ہدایت/ ۲۲۱ - ۲۲۵

دوران میں طعام کے وقت اس کے روبرو مسلمان عورتیں رقص کرتیں اور گانا گاتی تھیں۔[1] یہی حال تکیت رائے کا بھی تھا" بمعاشرت جوانان صبیح الوجہ مبالغہ دارد"۔[2]

لیکن ان امیروں میں کچھ زاہد اور خدا ترس امیر بھی تھے مثلاً خواجہ عین الدین خاں کا یہ معمول تھا کہ شام کو ایک وسیع میدان میں ہزاروں فلاکت زدہ اور مسکین جمع ہو جاتے تھے اور خواجہ موصوف بذات خود اس جگہ جا کر اپنے ہاتھوں سے لوگوں میں زر تقسیم کرتا تھا۔ علاوہ ازیں بیواؤں، سیدوں، اور فقیروں اور گوشہ نشینوں کو ماہانہ روپے بھیجا کرتا تھا۔ بہرائچ میں حضرت سالار مسعود کے مزار کے قریب ایک عالی شان مسافر خانہ تعمیر کروایا تھا[3] بریلی میں عیدگاہ اور ایک اچھا باغ لاکھ لاکھ روپے صرف کر کے تیار کروایا تھا۔

علمائے سو بھی عیاشی کے مرض میں مبتلا تھے۔ مولوی علی اصغر بقول بعضے شاہ جہاں آباد اور بروایت دیگر نگینہ کا باشندہ اور ایک شر پسند

---

[1] برائے حالات دیکھئے تفضیح الغافلین/۱۴، ۲۵، ۲۶، ۶۰، ۸۹-۹۰، ۹۲، ۱۰۵، ۱۱۹، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۵-۱۴۸، ۱۵۷، ۱۵۹-۱۶۱۔ اس کا انتقال ۱۲۳۰ھ میں پٹنہ میں ہوا تھا۔ تاریخ اودھ ۳/۳۴۲۔

[2] تفضیح الغافلین/۱۴۲۔ اسی مکیت رائے کی ہجو میں قائم چاندپوری نے لکھا ہے:-

قائم ہے جہاراج سے کیا تجھ کو شکایت ✣ ہر چند یہ کہنا تو لگے گا تجھے کڑوا

کیوں تیری طرف وہ نگہ لطف سے دیکھے ✣ ہے کون سی نسبت؟ نہ تو... ہے نہ بھڑوا

[3] تاریخ سعادت جاوید/۱۰۴۸ا۴

انسان تھا۔ نثر گوئی میں دسترس رکھتا تھا۔ ۲۳ روپے ماہوار کی آمدنی میں گذر بسر کرتا تھا۔ میرزین العابدین نامی لڑکے سے عشق کرتا تھا۔ وہ لڑکا دہلی کا رہنے والا تھا ذات کا کھتری تھا۔ مولوی موصوف نے اس لڑکے کو مسلمان بنا لیا تھا۔ اور ہمہ وقت اس کی صحبت میں رہتا تھا۔ یہ مولانا لکھنؤ بھی پہونچے اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔[1]

محکمۂ عدالت میں زبوں حالی کا دور دورہ تھا۔ قاضی رشوت خور تھے۔ جس کی وجہ سے انصاف اُٹھ گیا تھا۔ ابو طالب لندنی کا بیان ہے :۔ "با وجود آں کثرت وعظمت لکھنؤ در رسم، حکومت قضا و عدالت درانجا نبوده است۔ وبدیں سبب ترک داد وستد شده۔ وہر کہ بیشتر فتنش می شود تعدی بر دیگرے می کند وطریق تنبیہہ ظالم منحصر دریں است کہ تا شخص مظلوم خود از جان گذشتہ بطلب انتقام درآید، و تا یکے از اقویائے شہر حمایت وے نماید و قاضی غلام مصطفیٰ و غلام حضرت مفتی، و بسیارے از علمائے اعلام کہ مردم کامل تمام عیار و از دیگر دیار در انجا بسیار اند۔ از بیم استہزا و تمسخر اہلکاران وزیر بہوار گوشہ نشین ماندند"۔[2]

میر حسن دہلوی نے اپنے ایک مشفق مہربان میاں اسرار کی مجلس رقص و سرود کا اپنے انداز میں یوں ذکر کیا ہے :۔

میاں اسرار کے بنگلے کا عالم نہ تھا بنگلے سے فیض آباد کے کم

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد / ۱۳۹ [2] برائے تفصیل دیکھئے۔ تفضیح الغافلین / ص ۸۸ تا ۸۹، ۹۱۔ اس سے قبل یہ محکمہ بھوانی سنگھ راجہ سے متعلق تھا۔ اور بعد میں اس جیسے لوگوں کی نگرانی میں تھا۔ ایضاً / ۸۸

انہوں نے بسکہ تھا اک نقش مارا — وہاں ہوتا تھا پریوں کا گزارا
سحر سے شام تک رہتا یہی حال — دکھاتا قرعہ کوئی اور کوئی فال
انہوں کے پاس سب جمع ہو آ کر — عطائی جی کو خوش کرتے تھے گا کر
انہوں کی چوب پر کبھی تھے آتے — کچھ اُن سے سنتے اور اپنا سناتے
طنبورے لے کے مرزائی و مرزا — سبھی لگتے تھے گانے بے محابا
اگرچہ تھے تو کہنے کو عطائی — ولے کبسی سے بھی حکمت اڑائی
طنبوروں کی وہ تانوں کا گرجنا — پکھاوج کا اور ان کے ساتھ بجنا
عطائی بھی ہر اک لیتا تھا وہ تان — کہ جس سے بوعلی سینا ہو حیران
غرض چرچے میں وہاں کتنی تھی اوقات — عجب صحبت تھی وہ ہیہات ہیہات[1]

قلندر بخش جرأت نے ایک زاہد کی ہجو لکھی ہے جس میں اُسے ریاکاری، بادہ نوشی اور نفسانی تلذذات کا گرویدہ بتایا ہے[2]

خواجہ حسن مودودی معروف بہ خواجہ کبھاری کی رقص و سرود کی دلچسپی کا بھی جرأت نے ذکر کیا ہے یہ بخشی نامی ایک طوائف سے عشق کرتے تھے اور اپنے ہر مقطع میں "بخشی" کا نام استعمال کرتے تھے۔ جرأت نے حسن و بخشی کے معاشقے کی داستان بھی لکھی ہے۔ یہ اودھ کے ممتاز صوفیہ میں تھے۔[3]

---

[1] مجموعہ مثنویات میرحسن دہلوی (نول کشور ۱۹۴۵ء) ص

[2] کلیات جرأت ۱/۲۴۵ الف و ب دیوان میرحسن (سبحان اللہ کلکشن)

اون کو بھی ان بتوں نے اب رام کر لیا — جو بچ رہے تھے زاہد اُن سے خدا خدا کر

[3] ان کے ملفوظات کا نسخہ علی گڑھ میں ہے اس کی تفصیل برہان مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء میں ملے گی

نہایت تھا سرود و رقص کا شوق — اسے دیکھنے سننے کا تھا ذوق
جو مطرب خوبرو تھے اس نگر میں — نہ تھا پنہاں کوئی سب تھے نظر میں
کبھی جاتے کبھی ان کو بلاتے — وہ آ کر ناچتے گاتے بجاتے
سدا تھی خوبرویوں سے ملاقات — کہوں کیا کچھ عجب کٹتے تھے اوقات[1]

عوام کی عیش پرستی

نوابین اور امیروں کی زندگی کا اثر عوام پر پڑا کیوں کہ صوبہ اودھ تباہی و بربادی سے محفوظ تھا۔ اس علاقے تک مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور ابدالیوں کے تباہ کن قدم نہ پہونچ سکے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ قدرت نے اس علاقے کو بہت سے مصائب سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس وجہ سے اودھ کا علاقہ اپنی فارغ البالی اور ثروت کے لیے اٹھارھویں صدی میں مشہور تھا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دہلی سے ہر فن کے لوگوں نے فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ کا رُخ کیا۔ انشاءاللہ خاں انشا کا بیان ہے:

"یہی حضرات جنہوں نے لکھنؤ میں حسب دل خواہ روپیہ میسر آنے کی وجہ سے چند دل پسند ایجادیں کی ہیں اگر شاہجہاں آباد میں رہتے اور فارغ البالی ملتی تو وہاں بھی اپنی قوت ایجاد کو ظاہر کرتے۔ ان کا یہ کہنا کہ لکھنؤ کی کسبیوں کو جو شوخ ادائی، راگ اور پوشاک میں خدا نے بخشی ہے، وہ شاہ جہاں آباد کی عورتوں کو نصیب نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں دہلی کے اس قدر صاحبِ سلیقہ زن و مرد ٹوٹ پڑے کہ دہلی خالی ہوگئی۔ چونکہ سپاہی اور مصاحب پیشہ، لطیفہ گو اور نقّال، گانے بجانے والے، اور قصّہ خواں جو لکھنؤ

[1] کلیاتِ جرأت ۴۷۲ ۔ ۴۶۸ ۔ الف

میں ہیں، سب دہلی سے آئے ہوئے ہیں"[1]

ایسی صورت میں لکھنؤ کے معاشرے کی امتیازی خصوصیات عیش پرستی[2]، تفریح بازی اور قمار بازی[3] تھیں۔ رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد ہر تقریب کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ پتنگ بازی، بٹیر بازی اور دیگر کھیل تماشے اپنی ترقی کے لحاظ سے نقطۂ کمال کو پہونچ گئے تھے۔ عوام اس عیش پرستی کے مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان میں ہر قسم کی اخلاقی کمزوریاں سرایت کر گئیں۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے :۔

"در ہر خانہ از خانہائے ہنود بے محل رقص و سرود منعقد بود، و در
اماکن مسلمانان گاہ گاہی ایں جلسہ و اکثر مرغ بازی و پودنہ بازی
در یک روز دہ دہ ہزار روپیہ یکی می یافت و یکے می برد"[4]

مرزا قتیل جیسا قلندر مشرب شخص بھی رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت کرتا تھا۔ رقعات قتیل میں ایسی مجالس کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ جن میں مرزا مذکور شریک ہوئے تھے۔ ایک محفل کا ذکر کرتے ہوئے موسیقاروں اور رقاصاؤں اور

---

[1] دریائے لطافت دا۔ ت ص ۱۱۶-۱۱۷، نیز دیکھئے عماد/۱۴۴ کلیات جرأت/۲۶۸ الف

[2] کلیات آتش/۔ سہ ہزاروں دیوں کو، یہاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے
نہیں لکھنؤ اک راجہ اندر کا اکھاڑا ہے/۲۰۷

عیش و عشرت سے ہے سدا دم ساز :- پیر ہو کوئی یا جواں ہو وے، کلیات سودا/۲۱۴

[3] رقعات مرزا قتیل" با قمر بیگ را در تنہائی بجای خود از طرف من با ید فہمانید کہ قمار را نگہ باز د/۷۵ [4] عماد/۱۴۴

امردوں کے رقص و سرود پر تنقید کی ہے۔ اس نے لکھا ہے :۔

"در کوٹھی بودم، شش طائفہ، زنان و یک طائفہ مردانہ بود و محبوب شاہ حسینی را کسل طبیعت رخصت حرکت نداد ہمیں طائفہائے بیرنگ و بد گلو بودند الا جاجی کہ خواندنش سحر حلال ست و بے چند مجلس را گرم کردہ بود، لیکن ایں درچہ حساب اند فرحت اللہ خانہ خراب آتشی باریدکہ بہزار آب قلزم فرو نمی تواند نشست۔ جائے شما خالی بسے خوبی چند ساعت گذشتہ است۔ من و مرزا حاجی در مکان جداگانہ از مجلس نشستہ مزۂ خود را حاصل کردیم[1]

لکھنؤ میں امردوں کے رقص کا بھی عام رواج تھا۔ ہندوستان میں کتھک نامی ہندوؤں کا ایک فرقہ پایا جاتا تھا جس کے لڑکوں کو رقص و سرو کی تعلیم دی جاتی تھی اور دولت مندوں اور بازاروں میں انہیں نچوا کر تحصیل دولت کی جاتی تھی۔ مرزا قتیل نے ایسی مجلسوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"امیروں کی مجلسوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کا یہ معمول ہے کہ چند لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ان لڑکوں کو ناچنے کے لیے مامور کرتے ہیں۔ رقص کی حالت میں ان میں سے ایک شخص جب اپنی جیب سے ایک پیسہ یا ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے تو مجمع کے دوسرے لوگ بھی یہ عمل دیکھ کر اُن میں سے اُسے حسب حیثیت کچھ نہ کچھ دیتے ہیں"

مسلمانوں کا شریف النسب طبقہ اس قسم کے رقص و سرود میں شرکت سے پرہیز کرتا تھا لیکن رذیل پیشہ مسلمان ایسی مجالس کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے

[1] رقعات مرزا قتیل/۲۴

مثلاً بعضے چناری، بازاری اور دہقانی جو قصبات اور دیہات میں سکونت رکھتے تھے، اور ملکیوں کے نام سے موسوم تھے، اس فرقے کے لوگ لڑکوں کے ناچ کے عاشق ہوتے تھے۔ اگر کسی عزیز کے وہ کسی تقریب کے سلسلے میں طوائف کے رقص کی خبر سنیں تو وہاں نہیں جاتے، چاہے ان کو مدعو ہی کیوں نہ کیا گیا ہو اور کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتے تھے لیکن اگر کسی سے سن لیں کہ فلاں بازار میں، یا فلاں دکان کے سامنے کسی ہندو یا مسلمان لڑکے کا ناچ ہو رہا ہے تو کچھ لوگ جمع ہو کر بڑی خوش دلی سے وہاں جائیں گے چاہے راستہ میں کیچڑ پانی اور شدید بارش ہی کیوں نہ ہو[1]

فیض آباد کے بازار میں لونڈوں کے رقص کا ذکر کرتے ہوئے میر حسن نے لکھا ہے:۔

کہیں بن ٹھن کے لونڈے ہی کھڑے ہیں انہوں کے گرد عاشق جا اُڑے ہیں
کھڑا کوئی اکھیس پونگی بجا دے کوئی لونڈے کو آگے سے نچا دے[2]

عرسوں، میلے ٹھیلوں اور دیگر تقریبات کے موقعوں پر بھی رقص امارد کا اہتمام ہوتا تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے لکھا ہے کہ الہ آباد کے قیام کے دوران میں پنجشنبہ کو وہ ایک درگاہ میں زیارت کی غرض سے گئے۔ وہاں ایک لڑکا رقص کر رہا تھا۔ اور مصحفی کا یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

گل کھا موئے تھے جن کے لیے جسم زار پر دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر[3]

---

[1] ہفت تماشا (ا۔ ت)، ۷۹-۸۰ [2] مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۲

[3] مجالس رنگین / ۷۴

اس عہد کے لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں رقص امارد کے سلسلے میں اشعار ملتے ہیں۔

میر حسن:۔
کیا دل میرا اس مطرب پسر نے
عجب حرفت سے گا کر چھند پر بندا[1]

شاہ کمال
کہیں لونڈے کھتک کے ہیں گا رہے
رو ٹھا ہاتھ ہیں بھاؤ بتلا رہے[2]

امرد پرستی کی وبا بھی عام تھی۔ میر حسن دہلوی نے اس وبا کا یوں ذکر کیا ہے:۔

زبس افراط ہے یہاں بھیڑیوں کا | سدا دھڑکا ہے یوسف طلعتوں کا
رکھے ہے جو کوئی فرزند اطفال | ہوا ہے اس کو رہنا یہاں کا جنجال
سحر تک شام سے رہتا ہے دھڑکا | مبادا بھیڑیا لے جائے لڑکا

---

[1] دیوان میر حسن (سبحان اللہ کلیکشن علی گڑھ) [2] دیوان شاہ کمال /۵ ۸۵ ڈونالڈ کیمپل نے ۱۷۸۴ء میں ہندوستان کے اپنے سفر کے دوران میں محسوس کیا تھا کہ اس ملک سے طوائفوں کے رقص کا رواج اٹھتا جا رہا تھا اور عوام کو امردوں کے رقص سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

A JOURNEY OVER LAND TO INDIA

(L.1796) PART III, P125-

GEORGE LLOYD: NARRATIVE OF A JOURNEY etc.
(L.1840) I, 94-97

بھلا اس طرح سے آرام کہ ہو رہے یہاں وہ جو لاولا ہو [1]

غلام علی نقوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے :۔

"از کثرت لولیہا و تمول شان کہ از سبب اولاد ہنود و مسلمانان
در ہر کوچہ سامان جشن یافتہ می شد" [2]

مرزا میرزا صر[3] سے تذکرہ میں مصحفی نے لکھا ہے :۔

"قضائے کار روزِ مشاعرہ ارادۂ آمدن مشاعرہ کردہ از خانۂ
خود رواں شدہ بود کہ در اثنائے راہ بابت کودکی حسین بہ
پیادہ ہائے چوکی مناظرہ درمیان آمد حتی کہ نوبت بکشت و
خون رسید آخر بزخم شمشیر زندگی را جواب داد" [4]

محمد فیض بخش نے نوابان اودھ کی عیش پرستی اور اس کے اثرات کا ذکر
کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہی افواج کے سوار و پیادے بلا کسی خوف و خطر
کے تلذذات نفسانی میں ملوث ہوتے تھے[5] جارج فارسٹر نے ایک افغان کی
طوائف بازی اور عیش دوستی کا تفصیلی حال چشم دید مشاہدہ کی بناء پر لکھا ہے

---

[1] مجموعہ مثنویات میرحسن / ۴۴۔ ہدایت نے 'اختلاف زمانہ' کے نام سے ۴۶ بند کی ایک نظم لکھی ہے جس میں لکھنؤ کی عام بداخلاقیوں کا ذکر کیا ہے۔ کلیات ہدایت / ۲۷۵ مابعد

[2] عماد / ۱۴۴

[3] یہ واقعہ ۱۲۳۰ھ میں پیش آیا تھا برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ریاض الفصحا / ۳۲۲

[4] ریاض الفصحا / ۳۲۳۔

[5] تاریخ فرح بخش / (انگریزی) ۲ / ص ۱۰

جو اس کا ہم سفر تھا۔ اور لکھنؤ سے واپس اپنے وطن کو آرہا تھا۔ اس افغان نے اپنی ملکیت کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں طوائف بازی اور شراب نوشی کی نذر کر دیا تھا آخرکار وہ بے حد شراب نوشی کا مرتکب ہونے لگا تھا۔ ڈھائی گھنٹے کے وقفہ میں اس نے دو بوتلیں خالی کر دیں۔ جارج فارسٹر بڑی حیرت سے اس کے اس فعل کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ شراب اتنی سخت تھی کہ صرف ہاتھی کے لیے ہی مناسب تھی۔ اس عیاش مسلمان کے ساتھ ایک زنِ رقاصہ بھی تھی۔ جو بدنما لباس پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کے کئی دانت ٹوٹ چکے تھے۔ وہ رقاصہ اس کے سامنے رقص کر رہی تھی اور حافظ شیرازی کی غزلیں گا رہی تھی مگر اس کی آواز بڑی کرخت تھی۔ بانگر مئو کے مقام پر پہونچنے کے بعد اس افغان نے ان سب پیسوں کی شراب خرید لی۔ جو اس کے پاس بچ رہے تھے۔ اور خاندانی ایک رکابی بھی تین روپے میں فروخت کر دی۔ اُس شام اُس نے چھک کر شراب پی اس موقع پر اس نے وہاں کی ایک رقاصہ کو بلایا اور اُسے ڈیڑھ روپیہ دے کر اس کا کافی رقص دیکھا [1]

مہجور نے اپنے ایک شعر میں یہ بتایا کہ باپ بیٹے ایک ہی طوائف کے ہاں خفیہ طور پر آمد و رفت رکھتے تھے۔

کرتے تھے رنڈی بازیاں وہ ہم نشین ؛ دونوں آپس میں خفیہ بہت کم و بیش [2]

جرأت نے ایک فاحشہ عورت کی ہجو لکھی ہے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر

---

[1] TRAOELS IN INDIA, 1/P.104.

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ دیوان مہجور / ۱۳-۱۴

کیا ہے جو اس کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ[1] لکھنؤ اور فیض آباد میں بالخصوص اور اودھ کے دوسرے شہروں میں بالعموم زنا کا رواج پایا جاتا ہے مرزا قتیل نے اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بعض عورتیں، کشمیری عورتوں کے فیض صحبت سے جو امیروں کے گھروں میں آتی جاتی تھیں۔ بہت سے فوائد کی امید میں ان امیروں کے گھروں میں آمد و رفت شروع کر دیتی تھیں اور بعض گھروں میں ڈولیوں کے ذریعہ آنے جانے کی راہ کھل جاتی تھی بعض امیرزادے اور شرفاء عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتے تھے اور امیروں کے گھروں میں اکثر لونڈیوں کی اولادیں ہوتی تھیں۔ بعض خالائیں اپنی بھانجیوں کو اور بعض پھوپھیاں اپنی بھتیجیوں کو طالبوں کے پاس پہنچا کر خوب روپیہ بناتی تھیں اور کبھی مائیں خود اپنی بیٹیوں کو زر نقد کے لالچ میں آدھی رات کو کسی بزرگ کی قبر کی زیارت کے بہانے یا کسی اور حیلے سے عشاق کے پہلو میں سلا دیتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مشائخ شہر یا ان کے خلیفہ طالب اور مطلوب کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ یعنی دونوں کو اپنا مرید بنا لیتے اور پھر ان دونوں دینی بھائی اور دینی بہن کو اپنے جدِ امجد کے عرس کے دن اپنے گھر بلا کر حضرت مقرب درگاہ الٰہی کے حجرۂ عبادت کو شاہی "عیش محل" کے لیے بھی باعث رشک بنا دیتے تھے۔[2] شراب نوشی کے علاوہ افیون خوری، چرس اور گانجا پینے کی لت بھی

---

[1] کلیات جرأت/۴۵۱ ب

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا (اردو ت) ۱۴۳-۱۴۶

عوام میں پائی جاتی تھی۔ رہجور نے ایک افیونی کا قصہ بیان کیا ہے۔ مطلع یہ ہے

قاعدہ افیون کا ہے اے دوستو ؛ قبض کرتی ہے اُسے کھاتا ہے جو[1]

فیض آباد کے بازار کے عام منظر کو پیش کرتے ہوئے میر حسن دہلوی چرس اور گانجا پینے والوں کا یوں ذکر کرتے ہیں :۔

کہیں گُڑگُڑ کوئی پیتا ہے باہم لگاتا ہے چرس کا ہی کوئی دم[2]

میلے ٹھیلوں میں مرد اور عورتیں شرکت کرتیں اور ان موقعوں پر وہ اپنے ہر قسم کے جنسی جذبات کی تسکین کرتے تھے۔ انہی اغراض و مقاصد کو لے کر وہ لوگ ان جگہوں پر جاتے تھے۔ انشاؔ اپنے ایک شعر میں میلوں میں عورتوں کی شرکت کا ذکر کرتا ہے :۔

کچھ نہیں معلوم پوچھو کونسا میلا ہے آج ؛ جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں[3]

اسی طرح عاشورۂ محرم میں امام باڑوں میں مجالس مرثیہ خوانی منعقد ہوتیں۔ عورتیں اور مرد ان میں شریک ہوتے ان موقعوں پر طالب اور مطلوب کو اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آجاتا تھا[4]

لکھنؤ اور فیض آباد کی معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی کیوں کہ اودھ کی حکومت کا پہلا دارالخلافہ فیض آباد ہی تھا اور پھر

---

[1] دیوان رہجور / ۱۱

[2] مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۲

[3] کلیات انشا / ۲۰۱

[4] ہدایت المومنین / (قلمی)، ص ۱۴۔۱۵

آصف الدولہ کے زمانے میں معاشرت کی جو بساط وہاں سے اٹھی وہ اسی انداز اور طرز سے لکھنؤ میں بچھائی گئی۔ میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی گلزار ارم میں فیض آباد کی معاشرت کا بہت دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے:۔

چلا میں وہاں سے اپنا دل اٹھا کر　　کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر
جونہی داخل ہوا میں اس نگر میں　　کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
عجب معمورہ آباد پایا　　مثل گل ہر اک دل شاد پایا
وہ انگوری وہ موتی باغ دیکھا　　ارم جس کے حسد سے داغ دیکھا
عمارت شہر کی دیکھی وہ عالی　　کہ جس نے عرش کی خوبی اٹھالی
کھلا بازار اور رستے کشادہ　　بیاض جدولی ہو جیسے سادہ
دو رستہ اہل حرفہ اور دوکاندار　　لڑی موتی کی ہو جیسے نمودار
جو کوئی شام کو واں چوک جاوے　　شب راحت کا دن کو حظ اٹھاوے[1]

اس کے بعد میر حسن نے فیض آباد کے بازار کا نقشہ پیش کیا ہے جو اپنی دلچسپی کے علاوہ، فیض آباد کی معاشرت کا بھی بہترین مرقع ہے۔

کہیں بن ٹھن کے لونڈے ہی کھڑے ہیں　　انہوں کے گرد عاشق جا اڑے ہیں
کہیں ہیں رنڈیاں ہی ماہ پارہ　　انہوں کا کرتا ہے کوئی نظارہ
پھریں کھتر انیاں سنتوں کے ہمراہ　　کہیں ہندو بچے پھرتے ہیں [illegible]
کہیں تکڑ کوئی پیتا ہے باہم　　لگاتا ہے چرس کا ہی کوئی دم
[illegible] ہاتھ اپنے　　[illegible]
کوئی سیٹی سے زمیں چوچو کرے ہے　　کوئی دم منہ سے [illegible] ہے

---

[1] [illegible] مثنویات میر حسن ص [illegible]

ضلع بولے ہے کوئی کوئی پھکڑ — کہیں ٹھٹھا کہیں ہے دھول تھپڑ
کہیں سکھیاں کہیں کھنڈا ور جگت ہے — ادھر ہے سانگ کنگت لگے ہے
کھڑا کوئی کہیں پونگی بجاوے — کوئی لونڈے کو آگے سے نچاوے
روا نیچے کوئی کوئی کرے کھیل — لیے بیٹھا ہے سانڈے کا کوئی تیل
کوئی کھولے کتابیں مورتوں کو — دکھا دے نیک و بد کی صورتوں کو
زبس ہے عیش و عشرت کا وہاں ماٹھ — کہیں ناچیں ہیں کشمیری کہیں بھانڈ
کبوتر کے کہیں شوقین ہیں جمع — کہ جوں پروانے اڑویں بر سر شمع
غرض موجود ہے سب جنس دنیا — کہیں بلبل کہیں ہے لال نمنیا
کہیں انڈے پھیک اور سر لڑتے ہیں — ید بیضا لیے مرو کھڑے ہیں
فقط نو روز پر کیا برس کے برس — ابھی تفسیر بیضاوی کا ہے درس
کسی کا کوئی وہاں مانع نہیں ہے — کہیں ہے نقل اور قصا کہیں ہے
بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد — کسے را با کسے کارے نہ باشد[۱]

اٹھارویں صدی کی دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت کا ہم مختصراً جائزہ پہلے حصے میں لے چکے ہیں۔ یہاں اعادہ لاحاصل ہے۔ [illegible] علاوہ ان مذہبی اور اخلاقی حالات میں کوئی مستقل نہیں سمجھا

۱۔ کلیات مثنویات میر حسن۔ ص ۱۵۱-۱۵۲ نیز ملاحظہ ہو ص ۱۵۳ تا ۱۵۵ [illegible]
[illegible] طرح جش۔

جانا چاہیئے۔ یہاں کے معاشرے میں بھی وہ سب خرابیاں موجود تھیں۔ جن کا مطالعہ ہم دہلی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اودھ میں ایک آزاد اور مطلق العنان حکومت کے قیام سے شیعی عقائد کا فروغ ہوا جس کا اختصار سے یہاں جائزہ لیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا سعادت خاں برہان الملک نیشاپوری کا ایرانی النسل تھا اور اس لحاظ سے اثنا عشری مذہب کا پیرو تھا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی (جلوس ۹۰۷/۱۵۰۱ء) نے مذہب اثنا عشری کی ترویج و اشاعت میں بڑی گرم جوشی سے کام لیا اور بابر کو بھی اس کے زیر اثر اور نامساعد حالات میں شیعی عقائد اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ بعد میں ہمایوں نے بھی اثنا عشری عقائد اپنا لیے تھے۔ شاہ اسمٰعیل کے جانشین شاہ طہماسپ کو اہل بیت کرام سے بڑی عقیدت تھی اور اس بنا پر بادشاہ کی فرمائش پر محتشم کاشی نے اپنا مشہور ہفت بند لکھا جس سے ایرانی ادب میں مراثی امام حسین کی ادبی حیثیت کی ابتدا ہوتی ہے [1]

ایران کا یہ رنگ جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان پہنچا اور نورجہاں کی سرپرستی میں اثنا عشری عقائد کو تقویت حاصل ہوئی۔ اورنگ زیب کے مابعد کے زمانے میں شیعی عقائد کو اس وجہ سے ترقی

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری (طبع [illegible]) ص ۲۸

اورنگ زیب کے زیادہ تر امراء شیعی فرقے کے تھے۔

MEMOIRS: I P. 146-147, 162

MEMOIRS: I P. 164-164-166.

حاصل ہوئی کہ سادات بارہہ کو سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ اور بعد میں نجف خاں نے ان عقائد کی اشاعت میں بڑا کام کیا۔ ان حالات نے دہلی کی سماجی اور مذہبی زندگی کو بہت متاثر کیا تھا۔ شیعہ امراء نے بالخصوص اور دوسرے شیعہ حضرات نے بالعموم سنی علماء پر بڑے مظالم توڑے اور سنی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا مجبوراً بہتوں نے اثنا عشری عقائد اپنا لیے تھے۔ نواب نجف خاں کی امیر الامرائی کے زمانے میں مصحفی دہلی پہونچے لوگوں میں اتنا خوف و ہراس تھا کہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ خود لکھتے ہیں :-

"دوازدہ سال در شاہجہاں آباد بہ دور نواب نجف خاں مرحوم بگوشہ عزلت گزیدہ[1]"

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اثناء عشری مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کیا گیا[2]۔ شاہ عبد العزیز کے چھپکلی کا ابٹن ملوایا گیا،[3] اور شاہ فخر الدین دہلوی کے قتل کی فکر میں لگے رہے[4]۔

سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ اثنا عشری عقائد اودھ کی سرزمین میں پہونچے۔ اس نے اور اس کے جانشینوں نے اثنا، عشری مذہب کی

---

[1] تذکرہ ہندی / ۲۴۸

[2] تذکرۂ گلشن ہند / ص ۲۱۷، عقد ثریا / ۵۵ سفینۂ ہندی / ص ۸۷ معمولات مظہریہ / ص ۱۴۰ - ۱۴۱

[3] تاریخ مشائخ چشت / ص ۳۶۳، ۳۶۷ [4] مناقب فخریہ / ۵۵

اشاعت و ترویج میں حتی الامکان کوشش کی[1] اور نواب سعادت خاں کے زیر اثر بہت سے سنی مسلمانوں نے شیعی مذہب اختیار کیا، مثلاً مدار الدولہ میر یوسف کے آباؤ اجداد سنی عقائد کے پیروکار تھے لیکن" در ہندوستان چوں صحبت نواب برہان الملک دریافت بمذہب اثنا عشری میل نمود لیکن باکمال اخفا و مدار الدولہ ہرگز اخفای مذہب کہ در اثنا عشری تقیہ ہمتیست نجاطر ندارد با علان تمام تعزیہ داری میکرد و می کند" [2]

اس کوشش میں نواب سعادت خاں اور نواب صفدر جنگ نے سنی علماء کو نان شبینہ تک سے محتاج کر دیا ان کی جاگیریں چھین لیں، وظائف سے محروم کر دیا اور علمی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں [3] سری واستو نے لکھا ہے کہ نواب سعادت خاں سنی مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اور انہیں اعلیٰ عہدے دیتا تھا۔ آگرہ کی گورنری کے زمانے میں اس نے نیل کنٹھ ناگر کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ ہنڈون اور بیانہ کی تقرری کے زمانے میں اس کا دیوان مالیات آتما رام تھا۔ اس طرح اس نواب کے دورِ حکومت میں سنی مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں اور شیعوں کو ہی اعلیٰ عہدے عطا ہوئے [4] اور یہی حال نواب صفدر جنگ کا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں نول رائے

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۸ تاریخ سعادت جاوید / ص ۳۰۷

[2] عماد / ۱۲۶

[3] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مآثر الکرام د دفتر اول) ص ۲۲۱، ۲۲۳

[4] برائے تفصیل دیکھیے۔ THE FIRST TWO NAWABS OF AVADH: P. 79.

کو اپنا نائب اعلیٰ مقرر کیا تھا[۱]

نواب صفدر جنگ نے شیعہ علماء کی سرپرستی کی اور ہر طرح سے انہیں اعزاز بخشا اور اس طرح شیعی عقائد کی اشاعت اور ترویج کا کام کیا۔[۲]

نواب شجاع الدولہ سادات کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آتا تھا اور انہیں خوب عطیات دیتا تھا۔ ہرچرن داس کا بیان ہے:

"اکثر اوقات نواب شجاع الدولہ زری بطریق نیاز حضرات نبا بر سادات بہ حکیم معالج خاں پسر مقرب خاں حکیم میداد۔ میگفت کہ ایں زر را بہ سادات برساں"[۳]

نواب بڑے اہتمام سے تعزیہ داری کرتا تھا اور بسا اوقات بذاتِ خود تابوت اپنے کاندھے پر اٹھا کر امام باڑہ تک لے جاتا تھا۔ ۱۱۸۱ھ کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ہرچرن داس رقمطراز ہے:

"نواب تعزیہ امام حسن و حسین گرفت و ... تعزیہ خانہ بہ تمام جلوس و شوکت استادہ کرد و نذر و نیاز بہ سادات و خیرات بمردمان فقرا بسیار داد"[۴]

ایام محرم میں نواب سیاہ لباس زیبِ تن کرتا تھا اور ماتم اور عزاداری کے تمام مراسم جزوی و کلی ادا کرتا تھا[۵] سفر و حضر دونوں

---

۱ چہار گلزار شجاعی/۲۰۲ ب

۲ ایضاً/ص ۱۹۲ الف

۳ عماد/۸۳

۴ ایضاً: ۲۲۴

۵ عماد/۲۵، سیرالمتاخرین (انگریزی ترجمہ) ۲/۶۵ – ۶۱۸ – ۳/۸۲۸

موقعوں میں ان مراسم کی ادائیگی میں کسی قسم کا فتور نہ آنے دیتا تھا یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی مراسم عزا ادا کرتا تھا۔ پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۲ء) کے موقع پر بھی میدان جنگ میں اس نے تعزیہ داری کے رسوم ادا کیے تھے۔[1] روہیلوں اور نواب شجاع الدولہ کے مابین جنگ کی سب سے اہم وجہ یہ بھی تھی کہ روہیلہ سنی عقائد کے پیروکار اور طاقتور تھے نواب ان کی ترقی کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتا تھا اس نے جب تک ان کا قلع قمع نہ کر دیا۔ اُسے چین نہ آیا۔

اپنے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے آصف الدولہ نے بھی مذہب اثناء عشری کی ترویج و اشاعت میں حتی الامکان کوششیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا اودھ کے بیشتر علاقوں میں اس زمانے میں عقائد اثناء عشری نے جڑ پکڑ لی۔ مؤلف گلِ رعنا کا بیان ہے :-

"نواب آصف الدولہ کے زمانے کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو و لعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انہوں نے دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں، جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں؛

---

[1] تاریخ اودھ ۲ / ص ۵۶

ضبط کر لی گئیں۔ شاہ علی اکبر چشتی مودودی[1] کے مشورہ اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ اور جماعت قایم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیرآبادی[2] کی اقتداء میں ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن تھا کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ جماعت

---

[1] وہ سلسلۂ چشتیہ کے شیخ طریقت تھے۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں اور نواب آصف الدولہ دونوں خواجہ مودودی کا بڑا ادب و لحاظ کرتے تھے۔ معارف (ماہ نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۳۵۵

[2] مولوی سید دلدار علی ابن مولوی معین الدین بن عبدالہادی ۱۱۶۶ھ قصبہ جائس یا نصیرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اہل تشیع میں مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس مذہب میں جمعہ اور جماعت کو رواج دیا۔ علوم عقلیہ انہوں نے سید غلام حسین دکنی الہ آبادی مولوی حیدر علی ولد ملا احمد اللہ سندیلوی اور باب اللہ کے شاگرد و ملا حمد اللہ سندیلوی سے تحصیل کیے۔ اس کے بعد کربلائے معلیٰ گئے اور وہاں آقا باقر بہبہانی و سید علی طباطبائی سے کسب علوم فقہ، حدیث، اصول کیا۔ اور مشہد میں سید مہدی بن سید ہدایت اللہ سے استفادہ کر کے ہندوستان واپس آئے۔ یہاں انہوں نے درس و تدریس کا شغل شروع کیا اور شیعی عقائد کی تبلیغی جد و جہد میں مصروف ہوئے۔ اثنا عشری عقائد پر ان کی کئی تصانیف ہیں۔ غازی الدین حیدر کے دور حکومت میں ۱۲۳۵ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ اور مقبرہ حسینیہ میں دفن کیے گئے۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ تذکرہ علمائے ہند/۶۰۔۶۱۔ مولانا سید دلدار علی، غفران مآب کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ معارف (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۳۵۴۔۳۵۵

علیحدہ کرلیے نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام مذہب دیدی"[1]

آزاد بلگرامی کی مصنفہ۔ ماثرالکرام کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ ان علماء و فضلائے بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہلِ تشیع میں سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے زمانے میں رواج پایا۔ اور اگر ان علماء میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ مذہب شیعہ پر ہے یا ان کے نسب ناموں میں ان علماء کے نام نکلیں تو ہمارا یہ خیال اور بھی قوی ہو جائے گا۔ یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ جونپور اور دیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقن کو پہونچ جاتا ہے جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اندیشہ ناک ہو جاتی ہے۔

[1] گل رعنا۔ مولوی عبدالحئی (دارالمصنفین اعظم گڑھ) ص ۱۵۳ نیز ملاحظہ ہو۔ عماد/۱۳۷، تاریخ فرح بخش (انگریزی) ۱۱/ص ۱۴۶۔۱۴۷، اشاریہ ۱۵۲

ڈاکٹر وحید قریشی نے محمد فیض بخش کے بیان کی بنیاد پر لکھا ہے کہ فیض آباد میں جواہر علی خاں کی کوششوں سے شیعوں میں باجماعت جمعہ کی نماز کا آغاز ہوا۔ میر حسن/۳۰۹، تاریخ فرح بخش ۱۱/۴۶ - ۵۹

میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام لیا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو، جو اعتقاد کے کچے ہوتے ہیں، ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔ ایسا ہر جگہ ہوا ہے اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا۔ اور قصبہ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانے میں اہلِ تشیع وہاں نہ تھے اور اگر تھے تو خال خال لیکن بعد کے زمانے میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا ہے“[1]

اپنے مذہبی جوش و عقیدت کی وجہ سے نواب آصف الدولہ بڑے شد و مد کے ساتھ تعزیہ داری کرتا تھا اور بعض مرتبہ سینہ کوبی کی وجہ سے لہولہان ہو جاتا تھا۔ ہرچرن داس کا بیان ہے :۔

”چوں در عشرہ محرم در ہر سال نواب آصف الدولہ بہادر بر سینہ بچھنہ زدہ سینہ کوبی در ماتم حضرت امام حسن حسین می نمایند امسال در عشرہ محرم ۱۱۹۹ھ کہ بچھنہ بر سینہ زدند، خون بسیار جاری شد۔ و در ہماں جانب سینہ کوباں و ماتم کناں تا بدریا رفتند“[2]

نواب موصوف ہر سال کئی لاکھ روپے اس تہوار میں صرف کرتے تھے۔[3] مجلس عزا کے لیے نواب نے ایک امام باڑہ بھی تعمیر کیا تھا جس سے آج بھی ان کا مذہبی

---

[1] مآثر الکرام (مطبع مفید عام، آگرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء) ص ۱۴۴
[2] چہار گلزار شجاعی ۲۷۵/۳ ب۔ تاریخ اودھ ۳/ص ۱۰۵ نیز تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۲۲۴
[3] تاریخ اودھ ۳/ص ۱ تفضیح الغافلین/۱۱۵

جوشِ عقیدت ظاہر ہوتا ہے۔[1] نواب نے ڈاکٹر بلیتن سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ولایت سے دو شیشے کے تعزیے بنوا کر بھجوائیں۔ ان میں سے ایک سیاہ اور دوسرا سبز ہونا چاہیے۔ ہر ایک تعزیہ کی قیمت لاکھ روپے طے ہوئی تھی۔ ۱۲۱۱ھ میں ایک تعزیہ ہندوستان پہونچا[2] بہو بیگم سالار تعزیہ داری کی مجالس میں شرکت کرتی اور فاتحہ پڑھتی تھی[3]

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور عقائد اثنا عشری کی نشر و اشاعت میں بڑی سرگرمیوں کا مظاہرہ ہوا۔ مرزا قتیلؔ جو پہلے سنی عقائد کا پیرو تھا بعد میں شیعی عقائد اپنا لیے تھے، لکھتا ہے کہ "یمین الدولہ ناظم الملک سعادت علی خاں کے عہد میں مرزا محمد حسین، کربلائے معلی سے تشریف لائے جو اثنا عشریوں کی کثرت کی وجہ سے "رشکِ شیراز و صفاہان ہے"[4] نواب کی ان سرگرمیوں کا انشاءؔ نے ایک شعر میں ذکر کیا ہے[5]

مدد ائمۂ اثنا عشری نمودندت ؛ خوشا سعادت طالع زہے ہمایوں فال

نواب بذاتِ خود مجلس تعزیت سید الشہدا کا اہتمام کرتے تھے اور لوگوں کو شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے۔ مرزا قتیلؔ کے ایک خط سے ایسا محسوس

---

۱ تفضیح الغافلین، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۲ ایضاً، ص ۱۱۵

۳ تاریخ فرح بخش ۱۱/۲۹۳

۴ ہفت تماشا (ار۔ت)، ص ۳

۵ کلیات انشا/۲۵۲

ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو نواب مدعو کرے اور وہ شرکت کرنے میں گریز کرے تو یہ بات نواب کے لیے بار خاطر ہوتی تھی ۔ مرزا قتیل مرزا امانی کو لکھتے ہیں :۔

"فردا در حضور پر نور مجلس تعزیت امام علیہ السلام است صبحی ارشاد شدہ بود کہ بخواجہ امامی بنو لیسد کہ فردا با ہر دو برادر خود چار گھڑی روز بر برآمدہ رنتجا برسند۔ عرض کردم کہ خواجہ امامی دریں مجلسہا کم می روند فرمودند کہ ایں چہ معنی دارد کہ آدم در مجلس تعزیت سید الشہدا حاضر نشود و در خانہ ما قاعدہ نیست کہ کسی سب اصحاب مکند گفتم کہ خواجہ امامی ایں ہمہ تعصب ندارد اگر کسی بد بگوید بد ہم نمیزند چرا کہ ایشاں کار با جناب امام علیہ السلام دارند اگر کسی بد خواہد گفت سزائے خود را خواہد یافت۔ یقین کہ مرد با لیاقت ایں حرکت نخواہد کرد کہ علی روش الاشہاد تبرا بکند و آدم رذیل مقام شکوہ نیست بہر صورت ایشاں حاضر خواہند شد۔ . . . فردا بہر صورت آمدن ضرور است زیرا کہ حضرت خود فرمودہ اند در نیامدن گمان تعصب خواہند برد سوائے ایں مکروہ است کہ در مجلس رقص باید آمد و در تعزیت کنارہ باید کرد" [1]

نواب سعادت علی خاں نے درگاہ حضرت عباس کی تعمیر کروائی۔ اور اس طرح حضرت عباس سے اپنی عقیدت کا مظاہرہ کیا نتیجتاً عوام کو بھی اس درگاہ سے ارادت اور عقیدت پیدا ہو گئی۔ اس درگاہ کے بارے میں غلام علی نقوی نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کا مرزا فقیر بیگ نامی ایک شخص رستم نگر میں

---

[1] رقعات مرزا قتیل / ۵۲

رہتا تھا۔ اس کے گھر میں ایک عَلم تھا جس کے بارے میں اس نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ عَلم حضرت عباس کا ہے۔ حالانکہ یہ بات بے بنیاد تھی۔ لیکن چونکہ اس نے اس عَلم کو حضرت عباس سے منسوب کر رکھا تھا اس لیے عوام و خواص اس کی زیارت کو جانے لگے۔ اور نذر میں جو رقم جمع ہوتی تھی۔ اس پر صاحب خانہ کی بسر اوقات منحصر تھی۔ ساتویں محرم کو تمام شہر کے علم اس مقام پر جمع ہوتے تھے۔ اس تاریخ کے علاوہ محرم کے دنوں میں وہاں بڑا مجمع ہوتا تھا۔ لیکن مذکورہ بالا تاریخ کو شہر میں کوئی ایسا عَلم نہ تھا جو وہاں نہ لے جایا جاتا ہو۔ مرزا فقیر بیگ کی وفات کے بعد، اس کا بیٹا۔۔۔ مرزا فتح علی اپنے باپ کا قائم مقام ہوا اور اس علم کا نگراں بنا۔ مختصر یہ کہ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں وہ مکان صرف ایک مکان ہی تھا۔ اس مکان کی کچی دیواریں کچی چھت اور مختصر سا صحن تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے وہاں ایک عالی شان عمارت تعمیر کروائی جس کا گنبد طلائی تھا اور وسیع صحن کو پختہ دیواروں سے گھیر دیا گیا تھا۔ ایک بلند دروازہ بنایا گیا تھا۔ جس کے سامنے صبح و شام گل فروش اور حلوائی بیٹھنے لگے۔ علاوہ ازیں شہر کے اکثر اجلاف اور اراذل وہاں جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اب کوئی کم مرتبہ کا انسان وہاں رات بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اس درگاہ کی حفاظت کے لیے پیادہ سپاہی اور داروغہ حکومت کی طرف سے تعینات تھے۔[1]

---

[1] عماد / ۱۷۲، تاریخ اودھ ۳۰ / ص ۳۰۰ - ۳۰۲

نواب غازی الدین حیدر کی بیگم نے باقاعدہ امام مہدی کی چھٹی کی رسم شروع کی۔[1] ایک دوسری رسم کی ابتداء بادشاہ بیگم سے ہوئی کہ سیدوں کی خوب صورت لڑکیوں کو محل میں بلا کر رکھا جاتا تھا اور انہیں گیارہ (یازدہم) اماموں کی بیبیوں کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کے والدین کو بھاری رقم ادا کی جاتی تھی اگر وہ بخوشی اپنی بیٹیوں کو بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس، اگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے تو زبردستی اور دوسرے طریقوں سے لڑکیاں حاصل کی جاتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک لڑکی یازدہ اماموں میں سے کسی ایک کے ساتھ منسوب کر دی جاتی تھی۔ اسلامی تاریخ سے تلاش کر کے ان کے نام رکھے جاتے تھے۔ وہ تمام لڑکیاں "اچھوتن" کہلاتی تھیں۔[2] یہ رسم ہندو تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں میں آئی تھی۔

نواب امجد علی شاہ ایک متقی اور پرہیزگار نواب تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں حکومت کی باگ ڈور علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ نواب واجد علی شاہ عیش پرست تھا اور لہو و لعب میں مصروف رہتا تھا۔ لیکن اپنے عقیدے میں وہ بھی بڑے غلو سے کام لیتا تھا۔ ان نوابوں کی کوششوں سے شیعی مذہب لکھنوی تہذیب کا سب سے نمایاں عنصر بن گیا۔[3]

---

[1] تاریخ بادشاہ بیگم (انگریزی ترجمہ) ص ۶ تاریخ اودھ ۴/ص ۱۶۸، ۱۷۰

[2] ایضاً / ص ۶-۷

[3] لکھنؤ کا دبستان شاعری/ ۲۸

نوابان اودھ کے زیر اثر ہندو اور سنّی امراء ... بھی بظاہر اثنا عشری عقائد سے دلچسپی رکھنے لگے اور بہتوں نے تعزیہ داری شروع کر دی۔ مثلاً[1] خواجہ عین الدین انصاری، صوبہ دار بریلی، سنّی ہونے کے باوجود آئمہ اطہار سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عشرہ محرم میں اس کا یہ معمول تھا کہ عشورہ کے دن وہ اپنا تمام مال و متاع، نقد و جنس، عمارات اور زن و فرزند بلکہ اپنی ذات سمیت جناب سید الشہداء کے نام خیرات کر دیتا تھا۔ موجودہ زمانے میں سارے بندیلکھنڈ کے سُنّی مسلمان تعزیہ دار ہیں۔

اس طرح جھاؤلال ایک ہندو امیر بڑے تکلف سے ہمیشہ تعزیہ داری کے رسوم ادا کرتا تھا[2] اس کی سرکار سے برسوں تک شیخ محمد عطا مرثیہ خواں وابستہ رہا تھا[3] ہندو عوام بھی تعزیہ دار اور مسلمانوں کی تقلید میں اپنے دروازوں پر تعزیہ رکھواتے تھے[4] نواب کے فوجی ملازمین، چاہے شیعہ ہوں یا سنّی سب تعزیہ دار تھے[5]

---

[1] تاریخ اودھ ۲ / ۱۵۳

[2] ایضاً ۲ / ۳۴۴

[3] تاریخ فرح بخش (انگریزی) ص ۱۱ / ص ۲۵۶

[4] ہفت تماشا / ۱۵۶، مرأۃ الاوضاع ص ۱۰۱ الف - ۱۰۲ الف، نیز OBSERVATIONS etc-P.27.

[5] عماد / ۱۴۸، ۱۴۸

شیعہ سنی مناظرے نوابانِ اودھ کی پشت پناہی کی بناء پر شیعوں نے تشدد سے کام لیا اور سینوں سے مناظرے کر کے انہیں ذلیل وخوار کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً ملا عبدالعلی بحر العلوم لکھنؤی کو ایک خونریز شیعہ سنی قضیہ کے سبب سے ترک وطن کرنا پڑا۔ [1] ایسا ہی واقعہ ملا حسن فرنگی محلی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ شجاع الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ اس کا دار المستقر فیض آباد تھا۔ جب شیعہ حضرات نے علمائے فرنگی محلی کو تنگ کرنا شروع کیا۔ تو ملا حسن ایک وفد لے کر نواب کے پاس فیض آباد آ گئے۔ اور نواب سے شکایت کی کہ لکھنؤ کے حکام شیعہ سنی قضیہ بھڑکاتے اور خون ریزی کراتے ہیں اس وفد نے خیر اللہ حسینی اور محمد عطا حسینی کے خون ناحق کی بھی فریاد کی۔ مگر نواب نے ان کی کوئی شنوائی نہ کی۔ اس کے بعد ملا حسن نے ترک وطن پر کمر باندھی [2]

اس ماحول کا اثر یہ ہوا کہ سنی علماء اور ادباء نے بھی ائمۂ اطہار سے عقیدت کا اظہار کرنا شروع کر دیا کیونکہ ان میں بہت سے ترکِ وطن کر کے اودھ گئے تھے اگر وہ وہاں کے ماحول کو سازگار نہ بناتے تو پھر کہاں جاتے۔

نوابان اودھ کے اسی جانب دارانہ رویے کی وجہ سے اودھ اور

---

[1] تذکرہ علمائے ہند/۱۲۲

[2] معارف (ماہ نومبر ۱۹۶۸ء) ص ۳۵۸-۳۵۹۔ فیض آباد میں شیعہ سنی پارٹیوں میں مناظرہ اور فساد کے لیے دیکھئے۔ تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۴۲۸،۴۲۷، میر حسن/ص ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۷ ملا محمد حسن۔ تذکرہ علمائے ہند/ ۱۸۵-۱۸۶

روہیلکھنڈ میں شیعیت کو خوب فروغ ہوا اور بعض شہروں میں جہاں شیعہ بالکل نہ تھے یا بہت ہی ناقابل لحاظ تعداد میں تھے ان کی اکثریت ہوگئی امروہہ، بلگرام، ہردوئی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ امروہہ کے قریب ایک بستی نوگاواں سادات کہلاتی ہے۔ یہاں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بھانجے اور داماد سید بدرالدین اسحقؒ کی اولاد آباد ہے ان میں نوابان اودھ کی حکومت سے پہلے کوئی شیعہ نہیں تھا لیکن اب نوے فیصدی مسلمان شیعی عقائد کے ہیں اور باقی دس فیصدی بھی ان کے اثرات سے آزاد نہیں ہیں۔ شیعیت کو یہ فروغ اودھ کی حکومت کی سرپرستی ہی میں ہوا تھا۔ خود امروہہ میں حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایت کا خاندان دو تین گھرانوں کو چھوڑ کر سب کا سب نوابان اودھ کے زمانے میں شیعہ ہوگیا۔ اس لیے کہ ان کی جاگیریں ضبط کرلی گئی تھیں۔ اور جو حکومت وقت کا عقیدہ اختیار کرلیتا تھا اسی کی جائیداد واگذار کی جاتی تھی بلکہ اس پر کچھ اضافہ بھی کردیا جاتا تھا۔

حکومت کی پشت پناہی دیکھ کر شیعہ علماء بھی مناظرے کرکے سنی علماء کو نیچا جھکانے کی فکر میں رہتے تھے اسی لیے علماء نے فرنگی محل نے درس نظامی میں منقولات کے ساتھ معقولات کا بڑا حصہ رکھا تھا کہ شیعہ علماء کو معقول دلیلوں سے قائل کرنا ممکن تھا۔

عام مسلمانوں کی مذہبی حالت | اسلام کے عقائد بالکل واضح ہیں اور اس میں توہم پرستی بالکل

نہیں ہے لیکن اودھ اور الہ آباد کے عام مسلمان آثار شریفہ اور مزاروں کی پرستش کرتے تھے۔ قاضی مرتضیٰ بلگرامی کا اس ضمن میں بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس دور کے عام مسلمانوں کے مذہبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے اگر ہم ان سطور کے لفظی معنوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی اس کی روح کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے

"متوطان ہندوستان اکثر بت پرست اندو دیگر ہر نوع ہر کسی کہ خواہد نماند۔ منعی و تکلفی نمی باشد۔ ۔ ۔ و ایں ساکنان ممالک دور دست چوں رومی، و فرنگی و ایرانی و تورانی ہم در ہند می آیند، و رفتہ رفتہ ہندوستانی می شوند،" [۱]

مزاروں کی زیارت شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح اودھ کی سرزمین میں بزرگوں کے بہت سے مزارات تھے کچھ ایسے تھے جن کے زائرین مقامی ہوتے تھے مگر کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جن کی زیارت کے لیے زائرین دور دراز کا سفر طے کر کے آتے تھے[۲]۔ مثلاً غازی سالار مسعود کے مزار پر بہرائچ میں ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے اور دور دور سے زائرین آتے تھے۔ علم اور نذریں چڑھاتے تھے اور منتیں مانگتے تھے[۳]۔ ملفوظ رزاقی میں مرقوم ہے کہ

---

[۱] حدیقۃ الاقالیم / ۳۵ [۲] OBSERVATIONS etc: P. 19

[۳] حدیقۃ الاقالیم / ۱۳۵، خلاصۃ التواریخ / ۴۳، کلیات انشا / ۸۶، ۹۴، ۱۵۷، منبعت تماشا / ۱۰۵۔۱۰۶، مفتاح التواریخ / ۳۶، دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ص ۴۵ الف،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵ پر دیکھیے)

"چوں مرشد زادہ (بن شاہ غلام علی) یازدہ سالہ شدہ والدہ ما بدہ شاں نیست کردہ بود کہ در سال یازدہم برای زیارت مرقد سالار مسعود غازی خواہم فرستاد، چنانچہ مرشد زادہ دام برکاتہ را بہ بہرائچ روانہ فرمود"[1] نواب آصف الدولہ بذات خود سالانہ عرس کے موقع پر بہرائچ جایا کرتا تھا[2]

مکھن پور میں شاہ مدار کا مزار زیارت گاہ خاص و عام تھا[3] اور اب بھی ہے۔ وہاں ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ علماء اور فضلاء بھی وہاں جاتے تھے۔ آزاد بلگرامی برائے زیارت جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"فقیر از کانت گولہ بتقریب زیارت مزار فائض انوار بدیع الحق والدین شاہ مدار قدس سرہٗ بہ مکھن پور رسید"[4] انشا نے اپنے اشعار میں مداری فقیروں کے حرکات و سکنات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً۔ دھمال کھیلنا۔ ملنگ فقیروں کا ایک خاص وضع سے ہل ہل کرنا چنا، کودنا اور شور و غل کرنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۲۴ کا) خزینۃ الاصفیا، ۲/۱۷؛ تاریخ سالار مسعود غازی

---

[1] ملفوظ رزاقی / ۲۳۲-۲۳۳

[2] تاریخ فرح بخش (انگریزی) ۱۱/۲۲۱؛ چہار گلزار شجاعی / ۵۵ ب

[3] برائے عوام دیکھیے۔ حدیقۃ الاقالیم / ۱۷۲، کاشف الاستاد / ۲۴۶، مجمع الاخبار / ۵۴۹، ہفت تماشا / ص ۹۸-۱۰۱، خزینۃ الاصفیا / ص ۳۱۰،

OBSERVATIONS etc: PP. 372-75.

[4] مآثر الکرام / ۲۸

کھینچتا ہوں نعرۂ حق کھیلتا دھمال ہوں ⁘ اے میرے سائیں مدد داتا مدد مولا مدد
جلتے ہیں ناسوت کی ابد ہوت بھاگیں ہو کے بھوت ⁘ ایک چٹکی بھر جو کر بیٹھے بھبھوت اپنا مدد[1]

یوں چلی مژگاں سے اشک جو لفشاں کی میدنی | جیسے بہرائچ چلے بالے میاں کی میدنی
لخت دل مسعود غازی نیلی گھوڑی داغ ہے | جلوۂ انوار ہی گرد بیاں کی میدنی
دم مدار آپہو نچے ملنا دیو ہو حضرت جنوں | کانپ اٹھی جنگلے آتے ہی جہاں کی میدنی
اے مکن پور کی ممتاز رہی کچھ شان ہے | کھیلے ہے دھمال تیرے عاشقوں کی میدنی
ہاں بدیع الدین الفت آتے ہیں حضرت مسیح | دیکھنے کو آپ کے دیوانگان کی میدنی[2]

بعض مرتبہ لوگ اپنے لڑکوں کا نام شاہ مدار رکھتے تھے۔ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ایک عزیز کا نام "شیخ مداری تھا" ملفوظ رزاقی/۱۳۸ اجودھیا

---

[1] کلیات انشاء ۸۴، نیز ملاحظہ ہو۔ نصیحۃ المسلمین/۶ ب' ۱۸ ب' ۲۰۱ الف' ۲۴ الف خلاصۃ التواریخ/۴۰۔۴۱ سلک گوہر، ص ۲۹۔ ہفت تماشا/۹۹۔۱۰۱ خزینۃ الاصفیا/۱ ص ۴۲۲ اخبار الاخیار (ا۔ت) ۲۹۲۔ دیوان مصحفی ہشتم (قلمی پٹنہ)

مصحفی مجھ کو نہ جنس دے سکا پای خیال ⁘ سیکڑوں چھڑیاں بھی آئیں سیکڑوں میلے ہوئے

/۴۵ الف بلگرام اور مارہرہ میں شاہ مدار کی فاتحہ کے لیے ملیدہ مخصوص تھا۔ کاشف الاستار/۳۶۸

[2] قاضی مرتضیٰ بلگرامی نے میدنی کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "ہر سال در عشرہ خلقی کثیر از دکن و بنگالہ و دیگر امصار ہند با علم ہای زنگارنگ آنجا جمع آیند و بعد از اختتام عرس باوطان خود باز روند و آن جماعہ را میدنی شاہ مدار نامند" حدیقۃ الاقالیم/۱۷۲

[3] کلیات انشا/۱۵۷

میں حضرت نوحؑ اور شیثؑ بن حضرت آدمؑ و ایوب پیغمبر علیہم السلام زیارت گاہ اہل اسلام است"[1] میر حسن دہلوی نے ان درگاہوں میں زائرین کے مجمع کا اپنے مخصوص انداز میں یوں ذکر کیا ہے

وہ سیر رمنہ اپنے حسب دل خواہ — وہ نوح اور شیث پیغمبر کی درگاہ
وہ پنجشنبہ کا درگاہوں میں جانا — ہزاروں پری زادوں کا آنا[2]

مجملاً ہر قصبے میں کسی نہ کسی صوفی کی قبر ایسی ضرور ہوتی تھی جنہیں مخدوم صاحب کہا جاتا تھا اور اس ولایت کا والی سمجھا جاتا تھا یعنی اس قصبے کی آبادی کو ان کے قدموں کی برکت سمجھتے تھے۔ ان کی کرامتوں کے دفتر کے دفتر محفلوں اور مجلسوں میں بیان کیے جاتے تھے[3] پیر اشرف[4] سلونی، کے مرید یہ کرتے تھے کہ طوطی خرید کر اُسے شیخ کا نام رٹا کر سلون کے جنگلوں میں چھوڑ دیتے تھے، وہ طوطی ہر درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر "پیر اشرف پیر اشرف" کی رٹ لگاتی تھی تاکہ جنگل سے گذرنے والے مسافر یا درخت کے نیچے آرام لینے والے ان کے فضل و کمال کے معترف ہوں اور طوطی کا ان کے نام کی رٹ لگانا۔ ان کی کرامت سمجھیں۔ اس طرح سننے والوں کے دلوں میں اعتقاد بیٹھ جاتا تھا کہ یہ اپنی اصل فطرت سے ایسی باتیں کرتے تھے[5]

---

[1] خلاصۃ التواریخ / ۳۴ -

[2] مجموعہ مثنویات میر حسن / ۱۵۹ [3] ہفت تماشا / ۱۶۸،

[4] مفتاح التواریخ / ۳۳۵، ۳۳۹، ملفوظ رزاقی / ۳۳

[5] ہفت تماشا / ۱۶۸-۱۶۹

لکھنؤ میں شاہ مینا[1] کا مزار زیارت گاہ خاص و عام تھا[2]۔ بلگرام میں خواجہ عماد الدین بلگرامی[3]، میر عبدالواحد[4]، میر عبدالجلیل[5] بن عبدالواحد، سید برکت اللہ[6]، اور بی بی خورد[7] کے مزارات پر زائرین کا اژدحام ہوتا تھا۔ خیرآباد میں شیخ سعد الدین خیرآبادی کے مزار پر لوگ زیارت کے لیے جاتے تھے[8]۔ کچھوچھہ شریف میں سید اشرف جہانگیر[9] کے مزار پر زائرین کا مجمع ہوتا تھا۔ شفیق علی خاں، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں زیارت کے لیے وہاں گئے تھے[10]۔ بانسہ میں شاہ عبدالرزاق کے مزار پر زائرین کا ہجوم ہوتا تھا[11]۔ نواب سعادت علی خاں درگاہ حضرت عباس سے بڑی عقیدت رکھتا تھا

---

[1] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ /۴۴، خزینۃ الاصفیا ۱/۴۸

[2] خلاصۃ التواریخ /۴۴

[3] ماثر الکرام ۱/ص ۹-۱۰

[4] ایضاً ۱/۲۵-۳۲، کاشف الاستار (قلمی) ص ۳

[5] ایضاً ۱/۴۳-۴۴ کاشف الاستار /۱۴۸-۱۴۹

[6] ایضاً ۱/۱۲۳

[7] ایضاً ۱/۱۷۵

[8] ایضاً ۱/۱۹۱

[9] برائے حالات دیکھیے۔ اخبار الاخیار (ا۔ت) ص ۲۹۴-۲۹۷، خزینۃ الاصفیا ۱/۳۷۱-۳۷۷ [10] چہار گلزار شجاعی /۶۴ الف

[11] ملفوظ رزاقی /۱۹۲، ۱۲۳

وہ بڑی شان وشوکت سے زیارت کے لیے جاتا اور عوام کو بھی رجوع کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگ بھی درگاہ میں نذر ونیاز چڑھانے جانے لگے۔ اور مصائب سے نجات پانے کے لیے منتیں ماننے لگے[1] نواب سعادت علی خاں ایک مرتبہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ زیارت کے لیے درگاہ گیا تھا۔ مرزا قتیل نے ان سطور میں اس جلوس کا ذکر کیا ہے:۔

"بدرگاہ حضرت عباس سواری جناب عالی بایں جبروت رفتہ بود کہ تمام بازار رنگین کردہ بطور آئینہ بندی اجناس فاخرہ در ہر مکان پہن شدہ بود چند جا در راہ بالای بام نوبت رقص می زدند بر سر ہر بام لولیہا رقص می کردند و سامان سواری چہ بگویم کہ در تقریر نمی آید۔ ہودج زریں جواہر نگار وزیں ہای مرصع کار و دیگر حشم و خدم کہ چشم فلک ندیدہ بود ہمراہ بود۔ واز کثرت خلق دو قدم راہ طے کردن برابر دو کردہ مسافت بود۔ مردم بسیارے در کوچہا بزمین غلطیدند و ضربہا خوردند۔ الحاصل جناب عالی در تمام راہ زر نقد بہر دو دست بر لولیاں و فقرای انداختند و بدرگاہ رسیدہ یکصد و یک اشرفی و یک نان طلا کہ پاؤ بالا یک سیر در وزن بودہ است نذر کردند۔ بعد مراجعت ہم تا شام انبوہ مردم کم نبودہ"[2]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد/۲، ۱۷۳-۲، مفتاح التواریخ/۲، نصیحۃ المسلمین/۱۸ الف، OBSERVATIONS ETC: 34-36

[2] رقعات مرزا قتیل/۲۳، ۲۴،

نوابِ وقت کا یہ طرزِ عمل عوام کی کشش کے لیے کافی تھا جب نواب بذاتِ خود نذر چڑھاتا تھا تو عوام کیسے اس بات سے گریز کر سکتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ نے اپنی ایک مثنوی میں درگاہ حضرت عباس کے میلے اور شاہی مستورات کا اس میلے میں جانا اور درگاہ میں نذر چڑھانے کا یوں ذکر کیا ہے:۔

کہ درگاہ عباس ابنِ علی — عَلم دار افواجِ سبطِ علی
جو اس شہر میں ہے بزیب تمام — زیارت کو جاتے ہیں واں خاص و عام
رجب کی جو نوچندی آئے قریب — رسا ہو گئے زائروں کے نصیب
ہوئیں ملتجی صاحبات محل — کہ نوچندی میں ہم بھی جائیں گے کل
کوئی کہتی تھی ہے زیارت کا شوق — کہ ہے یہ زیارت عبادت پہ فوق
کسی نے کہا دیں اجازت حضور — کہ چلّہ مجھے باندھنا ہے ضرور
کسی کی تمنا کہ جاؤں گی میں — کہ آنکھوں سے شمعیں جلاؤں گی میں

ہوا سانحہ یہ میری گور د — کہ کثرت تماشائیوں کی تھی حد
یہ گستاخی و میلہ سازی ہوئی — کہ در پردہ نظارہ بازی ہوئی[1]

نذر و نیاز کی رسمیں

عام مسلمان عورتوں کی دینی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مزاروں اور بزرگوں سے بے حد عقیدت رکھتی تھیں۔ یہ بات سنّی اور شیعہ دونوں میں یکساں پائی جاتی تھی۔ وہ بعض اکابر صوفیہ

---

[1] مثنوی واجد علی شاہ (قلمی) ص ۱۶۴-۱۶۵، تاریخ اودھ ۳/۳۰۱
مثنوی فریب عشق۔ از شوق۔ ملاحظہ ہو۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں ۱۴/

کی نذر کا کھانا پکاتی تھیں اور ان کو من جملہ اولیاء و مشکل کشا سمجھتی تھیں، مثلاً سید جلال منجاری[۱] بچوں کی سلامتی کے لیے عورتیں ان کے نام کے چاول پکا کر مٹی کے برتن میں بھرتی تھیں اور دہی اور شکر اس پر ڈال کر شریف اور غریب مسلمانوں کو کھلاتی تھیں[۲] ایسی ہی عقیدت سید احمد کبیر[۳] کے ساتھ تھی۔ ان کے نذر کی گائے ذبح کر کے اس کے کباب خود کھاتی تھیں اور دوسروں کو بھی کھلاتی تھیں۔ بچا ہوا گوشت ابدالی لوگ جو ان کے مرید کہلاتے تھے۔ نقد پیسہ سے خرید کر لے جاتے تھے۔ یہ ابدالی لوگ گائے کے ذبح کیے جانے کے وقت کوئلے روشن کرتے تھے، جب وہ خوب دہک جاتے تھے تو برہنہ ہو کر ان کوئلوں پر لیٹتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بجھ جاتے تھے۔ ان کے بدن کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا تھا۔ اس سبب سے شیعہ لوگ ان کے کمال کا لوہا مانتے تھے۔[۴] مختصر یہ کہ سید احمد کبیر کی گائے، شیخ سدو[الف] کا بکرا شاہ مدار کا مرغا، اور کھیت اور سوداگری میں منافع کے لیے غوث الاعظم اور شاہ مدار

---

[۱] اخبار الاخیار (ا-ت) ص ۲۲۶-۲۲۵ [۲] ہفت تماشا/۱۵۳

[۳] ان کا مزار راجپوتانہ میں تھا/ایضاً/۱۵۳ اگر بیگی نے وجے منڈل دہلی کے قریب لکھا ہے۔ [۴] ہفت تماشا/۱۵۳-۱۵۴/BEAL E:T.W. ORIENTAL BIOGRAPHICAL DICTIONARY: P

مسز میر حسن علی نے اس موقعہ کا حال جھلبیاروں کے ضمن میں لکھا ہے جھلبیار سید احمد کبیر کے پیروؤں کو کہتے تھے ص ۲۷۰، ۲۷۴

[الف] مسز میر حسن علی/۳۷۵-۳۸۲، نیز فٹ نوٹ ملاحظہ ہو:۔

کی نذور چڑھائی جاتی تھیں [1] اس طرح حضرت علی کے نام کا روزہ رکھا جاتا تھا بعضے تمام دن کا اور بعضے ہندوؤں کی طرح سوا پہر کا [2] مسلمانوں میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے نذر کے دسترخوان کا رواج بھی پایا جاتا تھا۔ مرزا قتیل کا خیال ہے کہ یہ رسم پہلے تورانیوں میں مروج تھی اور بعد میں ایرانیوں نے بھی اختیار کر لی تھی مجملاً امیرالمومنین تشریف لائیں گے۔ اور ان میں سے بعض کھانے تناول فرمائیں گے۔ اس لیے ان کے اعتقاد کے مطابق ایک وقت مقرر تھا پھر ان کھانوں پر جناب امیرالمومنین کے نذر کا دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ اور اس پر قسم قسم کے کھانے چن دیئے جاتے تھے۔ پھر منتظر رہتے تھے کہ جناب امیرالمومنین کے دستِ مبارک کے نشانات تلاش کرتے تھے [3] لکھنؤ میں مخدوم اخی کے مزار پر مرغ و نان ۔ کھچڑی، و روغن زرد، برہ، پر فاتحہ ہوتی تھی۔ [ج]

توہم پرستی

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اوّل زمانے میں اودھ اور الہ آباد کے صوبے اسی طرح سے اخلاقی اور مذہبی زبوں حالی میں گرفتار تھے جس طرح شمال ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی حالت تھی ان صوبوں میں بھی انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا اور نہ آرٹ اور ادب میں کوئی دائمی اضافہ کیا گیا۔ مسز میر حسن علی نے لکھا ہے کہ ہندوستانی بیحد توہم پرست

---

[1] نصیحۃ المسلمین/ ۹ الف میر حسن علی/ ۲، ۳۷۵۔ [2] ایضاً/ ۲۰ ب
[3] ہفت تماشا/ ۱۵۵۔۱۵۶
[ج] ملفوظات رزاقی/ ۱۰۲، ۱۰۳

ہیں اور کسی طرح سے بھی ان کے دل سے یہ بات نکالنی مشکل ہے۔[الف]

فال اور شگون

عوام و خواص دونوں شگون اور نجوم پر عقیدہ رکھتے تھے[1] صفدر جنگ، جس نے مسلم سماج کو ایک نئی شاہ راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے اودھ میں ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، جو لکھنؤ تہذیب کے نام سے موسوم ہوئی۔ بذاتِ خود کسی نئے کام کے کرنے یا فوج کشی پر جانے اور میدانِ جنگ میں جنگ شروع کرنے کے لیے کئی دن تک وقتِ سعید کا انتظار کرتا تھا۔[2] حیدر بیگ خاں (نائب سلطنت در عہد نواب آصف الدولہ) اہلِ تنجیم سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مرزا ابو طالب لندنی نے حیدر بیگ خاں کی اس توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"و حیدر بیگ بخیال تقسیم کہ دست و پا و سر فقرا شکستہ شود، از ابتدائے عہد خود معتاد بود۔ زیرا کہ بر قول ہائے منجمین اعتماد داشت و

---

۱ میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی "سحر البیان" اودھ میں لکھی تھی۔ اور جس بادشاہ کا اس مثنوی میں ذکر کیا گیا ہے وہ شاہِ مغلیہ یا نواب اودھ ہی ہو سکتا ہے اس کے نجومیوں اور وقتِ سعید کے متعلق عقیدے کے بارے میں دیکھیے مجموعۂ مثنویات میر حسن ص ۱۰۷، ۱۹، نیز دیکھیے فسانۂ عجائب / ۱۸، ۷۵

الف مسز میر حسن علی / ۳۸۷ ۲ سیر المتاخرین / نوابین اودھ اور نجوم پران کے عقائد کے بارے میں دیکھیے OBSERVATIONS etc 38-39

مرزا وزیر علی خاں کی توہم پرستی کے لیے دیکھیے تفضیح الغافلین / ۱۳۴

VON-ORLICH: TRAVELS IN INDIA (L. 1845) PP 100-101

آنجا عت گا ہے اور ادر ترازو نشانیدہ بوزن او نقرہ و مس و پارچہ می گرفتند' بگا ہے تقسیم فلوس بر فقرا ر ہنموئی میکردند' وخود ہم حیدر بیگ گا ہے کہ خوف از جہتے در دل داشت' باین امر اقدام می نمود"۔ [1] نئے مکان میں نجومی کے کہنے کے مطابق وقت سعید میں سکونت اختیار کی جاتی تھی۔ [2]

فیض آباد[3] اور لکھنؤ[4] کے بازاروں میں نجومی اور جوتشی اپنی دکان سجاکر بیٹھتے تھے اور عوام اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔

نصیرالدین حیدر اولاد نرینہ کی جستجو اور خواہش کے تحت فقراء اسلام اور ہنود کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے دعا کے لیے منت وسماجت کیا کرتا تھا[5] اور بالآخر اس نے ایک سنّی صوفی کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔[6]

---

[1] برائے تفصیل دیکھیے تفضیح الغافلین/۹۶، تاریخ فرح بخش (انگریزی) ۱۱/ص ۱۲۵

[2] رقعات مرزا قتیل /۷۴

[3] مجموعہ مثنویات میرحسن/۱۵۲

[4] فسانۂ عجائب /۸ نیز دیکھیے نصیحۃ المسلمین /۲۱ ب

[5] تاریخ اودھ ۴/۳، ۷۳، ۳-۷۴، ۳۱۶۔

[6] ایضاً ۴/۳۱۰۔ اولاد کے لیے لوگ دوسرے طریقے بھی استعمال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ میر عبدالجلیل بلگرامی کے مزار کے قریب واقع پیلو کے درخت کی پتیاں وہ عورتیں کھایا کرتی تھیں جن کے ہاں صرف لڑکیاں ہوتی تھیں اور وہ نرینہ اولاد کی متمنی ہوتی تھیں "اس کا طریقہ یہ تھا کہ" بعد گذشتن دہ ماہ کم بیش روز پنجشنبہ حاملہ غسل (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸۵ پر دیکھیے)

خواجہ خضر کی کشتی

اس رسم کا ہم پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا لکھنا مقصود ہے کہ اودھ میں بھی یہ رواج پایا جاتا تھا۔ مرزا قتیل نے بھی اس کا ذکر کیا ہے: "مادر محسن۔ ۔ ۔ ۔ بعد پنج و شش روز کہ برائے دو روز برائے فرستادن کشتی نیاز خضر بکنار دریا خرد و کلاں اینجا آمدند۔ بعد حصول فراغت ازیں مہم والدہ میاں کو با اولاد امجاد خود بجای خود مراجعت نمود" [1] یہ رسم شعبان، ہندی ساون کے مہینے میں ادا کی جاتی تھی

انشا نے متذکرہ موضوع پر شعر کہے ہیں۔

یقین کہ خواجہ خضر تھے بچھائی جائے نماز
جو بیٹھی جاتی تھی ایک بڑھی گھاگ پانی میں [2]

ایسے میں چلیے کیجیے تماشا اکثر پریاں آتی ہیں
ندی کے اندر خواجہ خضر کے نذر کے بیڑے پڑتے ہیں [3]

(صفحہ ٦٨٤ کا بقیہ حاشیہ) کنانیدہ پارچہ صاف و پاکیزہ پوشانیدہ دستورات قبیلہ را موافق استعداد جمع نمودہ برنج و جغرات شیریں کہ توشہ آنحضرت است پزانیدہ بر آں فاتحہ کردہ آں پی را کہ دو سہ برگ می باشند بآں حاملہ خورانیدہ آں توشہ را بعصلیان می خورانند و مطربہای سرانیدہ۔ غالب کہ پسر متولد می شود" کاشف الاستار/ ۱۴۸

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] رقعات مرزا قتیل/ ۱۴۷ میسنر میر حسن علی/ ۱۵۴-۱۵۶

[2] کلیات انشا/ ۶۰

[3] ایضاً/ ۸۸ نیز دیکھئے فسانہ عجائب/ ۱۰۰

ماتھے پر ٹیکے نظر بد سے بچنے کے لیے بچّوں کے ماتھے پر کالے ٹیکے لگائے جاتے تھے۔

سو کالے ٹیکے تھے گویا رخ نزاکت سے کہیں نظر نہ لگے اس لیے رہی تھی لپٹ[1]

بلائیں لینا اپنے کسی عزیز کے مصائب کو اپنی جانب منتقل کرنے سے متعلق فعل کو "بلائیں لینا" کہا جاتا تھا۔ یہ فعل ہر کسی خوشی کے موقع پر عمل میں آتا تھا۔ معاصر شعراء کے کلام میں اس مضمون پر اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً

مکھڑے پہ اس کے صرف نہ بلبل نے غش کیا
چٹ چٹ بلائیں غنچوں نے لیں گل نے غش کیا[2]

نچھاور اُتارنا اسی طرح رفع بلیہ کے لیے نچھاور اتاری جاتی تھی۔ اور مساکین و غربا میں وہ اشیا تقسیم کر دی جاتی تھی۔

انشاء کا شعر ملاحظہ ہو :۔

کیا فقطاں کے نچھاور کے لیے اے انشاؔ اپنی مٹھی میں ہر ایک غنچہ زر لیتا ہے[3]

کسی عزیز یا اولاد کی علالت کے زمانے میں شفاعت کے لیے بطور خیرات اور صدقہ غلہ اور زر غربا میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ ایک مرتبہ علیل ہوئے تو نائب سلطنت امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نے

---

[1] کلیات انشاء/۲۶۱

[2] ایضاً/ ۵

[3] کلیات انشاء/۱۷۱، نیز دیکھیے۔ فسانۂ عجائب/۱۸۲

۲۵ پیالے روغن سیاہ اور بیس من ماش، و پانچ سوتنکہ خام، بیس جاموش، ایک ہاتھی اور پانچ سو روپے نقد، و سو گوسفند "برائے تصدق فرستاد" اور دوسرے امراء نے اپنی حیثیت کے مطابق زرنقد و جنس برائے خیرات نواب کے محل میں بھیجی تھی"۔ نواب آں ہمہ را و بسیاری از نقد و جنس غلہ وغیرہ از سرکار خود بفقرا و مساکین داد"۔ [1]

گنڈے و تعویذ دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی گنڈے تعویذوں کے استعمال پر بڑا زور تھا۔ کاشف الاستار کے مصنف نے اس کتاب میں سیکڑوں تعویذیں لکھی ہیں جن میں ہر قسم کے امراض اور توہمات سے نجات کے متعلق تعویذ تھے۔ مثلاً برائے شفا و بیماری' برائے حاجت روائی' برائے حمل، برائے آسیب وغیرہ [2] اس مضمون کے بارے میں انشاء کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تعویذ و نقش سے جو نہ آیا تو اپنے ہاتھ صفحے پہ دل کے نام تیرا منتقش کیا [3]

بالعموم ان تعویذوں کو نیلے ڈورے سے گلوں میں ڈالتے تھے یا بانہوں میں باندھتے تھے۔

تعویذ لعل ہی کے نہ پھر ئیے کے گھنڈ پر ؛ ایک نیلا ڈورا باندھیے اس گوری ڈنڈ پر [4]

---

[1] چہار گلزار شجاعی / ۲۵۳ ب خیرات اور صدقے دینے کا عام قاعدہ تھا۔ بالعموم روزانہ شام کو کسی غریب کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ مسز میر حسن علی / ۱۳۹

[2] کاشف الاستار ص ۳۶۹، ۴۱۷

[3] کلیات انشاء / ۶ [4] ایضاً / ۵۱

دکھتی اگر ہے آنکھ تو تعویذ ان یکاد — بازو پہ اپنے تو بے رفع گزند باندھ[1]

یہ بھی ایک خیال تھا کہ اگر سپند (کالا دانہ) کو جلایا جائے تو بلیات دفع ہوتی ہیں۔ انشا نے اپنے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے :۔

سونے کا چھلا مور کا پر ہی نہیں فقط نہیں
ایک زرد پوٹلی میں بھی تھوڑا سپند باندھ[2]

انشا کے اس شعر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سونے کا چھلا اور مور پنکھ بھی بلاؤں سے نجات کے لیے استعمال میں آتے تھے۔

یہ بھی ایک عام تصور تھا کہ اگر ہُدہُد (ایک مشہور پرند، فارسی میں پوپک کہتے ہیں) کے خون سے کوئی تعویذ لکھا جائے تو زود اثر ہوتا ہے،

اب کوئی ہما ہو تو اسے ذبح کریں ہم — تعویذ بہت لکھ چکے ہُدہُد کے لہو سے[3]

انشا نے ایک غزل میں بہت سے ایسے افعال کا ذکر کیا ہے جن سے اس عہد کی توہم پرستی پر کافی روشنی پڑتی ہے :۔

غش ہوئے ہم تو آج قہر تھا اس کا فر کا
لال ناڑے میں بندھا ہائے وہ نیلا تعویذ

---

[1] کلیات انشا، ۱۱۷ [2] کلیات انشا، ۱۷۱

[3] ایضاً ۱۸۱، میر حسن دہلوی نے میاں اسرار کے مکان پر تعویذ گنڈے لینے والوں کے جم غفیر کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مجموعۂ مثنویات میر حسن ۱۶۰-۱۶۱

گرچہ سیانوں نے پڑھ افسوں بہت اتوار کے دن
خون ہُدہُد سے میرے واسطے لکھا تعویذ
جس پری کا مجھے سایہ تھا نہ اترا لیکن
کام آیا نہ کسی شخص کا گنڈا تعویذ
جی چلا اپنا سا پھونکا کیئے لونگ اور اسپند
مشک سیندور اگر مرچ فلیتا تعویذ
خیر انشاؔ کی جو چاہو تو پلا دو دھو کر
اس کے بازو کا وہ ننہا سا روپہلا تعویذ[1]

چھینکنا اگر کوئی شخص کسی نیک کام کے لیے روانہ ہو رہا ہو یا کسی کام کو انجام دینا شروع کر رہا ہو۔ تو ایسے موقع پر اگر کوئی چھینک دے تو اس فعل کو منحوس اور بدشگون سمجھا جاتا تھا۔

کوئی اللہ کرے چھینک پڑے جلدی سے
وہ چھپر کھٹ میں تو ہے چھوڑ کر بھاگا جیسے[2]
اے مصحفی نہ دیکھا روئے وطن پھر آخر
شاید کہ چھینکتے تو اے یار گھر سے نکلا[3]

جادو پر عقیدہ جادو اور ٹونے پر بھی عام لوگ عقیدہ رکھتے تھے۔

---

[1] کلیات/انشاؔ/ ۵۰ [2] ایضاً/ ۲۰۹ دائیں آنکھ کے پھڑکنے کو بدشگون یا نحس سمجھا جاتا تھا۔ فسانۂ عجائب/ ۱۰۹
[3] مینسر میر حسن علی/ ۸۸، ۳۹۳

ارواح خبیثہ پر عقیدہ پہلے حصّے میں اس بات کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ مسلمانوں میں بالعموم اور جہلاء میں بالخصوص ارواح خبیثہ پر اعتقاد پایا جاتا تھا۔ مثلاً شیخ سدو[1]، میاں زین خاں، میاں صدر جہاں، ننھے میاں، چہل تن، اور میاں شاہ دریا، اور میاں سکندر شاہ[2] اسی طرح کچھ اختراعی اور مصنوعی عورتوں کی ارواح پر بھی عقیدہ عام تھا۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری، آسمان پری، دریا پری۔ نور پری[3]۔ انشاء نے ان ارواح خبیثہ کے مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا ہے:۔

کیا ترے سر آچڑھے چاروں کے چاروں الاماں
شاہ دریا، شیخ سدو، زین خاں، ننھے میاں[4]

---

[1] دیوان مصحفی سوم (ق۔ رام پور) ۷۰/ ب
مقام اس کا گر امروہہ میں ہو تو کاش بازوں سے
کوئی یہ شیخ سدو کی ہے یہاں درگاہ بول اُٹھے
OBSERVATIONS etc. 375-382

[2] کلیات سودا ۱/ ۲۴۰۔ ۲۴۱ ' دریائے لطافت (ا۔ت) ص ۱۸۳

[3] دریائے لطافت (ا۔ت) ۱۸۳، تاریخ بادشاہ بیگم (انگریزی) ص ۱۰۹
نصیحۃ المسلمین ۱۱/ ب۔ ۱۲ الف

[4] کلیات انشاء/ ۲۰۲

نہ یہ حال لال پری سے کہہ نہ تو زین خاں ولی سے کہہ
ارے انشا اپنے ہی جی سے کہہ کہ کسی پہ دل نہ دھرا دھرے [1]

آسیب سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے تھے۔ شیخ سدو کی روح سے نجات پانے کے افعال کا پہلے ذکر آچکا ہے، بلگرام میں میر عبد الجلیل بلگرامی [2] کے مزار کے قریب ایک درخت پیلو کا تھا۔ اس درخت کی پتیوں کو کالی مرچ کے ساتھ پیس کر آسیب زدوں اور بالخصوص سدو کے آسیب زدوں کو پلاتے تھے۔ علاوہ ازیں اس فعل پر عمل پیرا ہوتے تھے [3]

مختصر یہ کہ جب چودہ ارواح خبیثہ میں سے کوئی کسی عورت کی روح میں حلول کر جاتی تھی تو آسیب زدہ کو آسیب سے نجات دلانے کے لیے ایک مجلس کا اہتمام ہوتا تھا۔ جسے بٹھیک [4] کہا جاتا تھا۔ مرزا قتیل نے اس

---

[1] ایضاً / ۲۰۷

[2] برائے حالات دیکھیے۔ ماثر الکرام ار ص ۳۴۳، ۴۴

[3] کاشف الاستار / ۱۴۸،۱۴۰ ارواح خبیثہ پر عقیدہ سے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے
OBSERVHTIONS etc: 393-99

[4] ہفت تماشا / ۷۰ "بٹھیک ایک مقررہ مدت تک بیٹھنے کے معنی ہوتے ہیں۔ اور برادری اور پڑوس کی عورتوں کا تمام رات اس عورت کے ارد گرد بیٹھنا جس میں چودہ عورت مرد میں سے کوئی حلول کر گیا ہو۔ اصطلاحی معنی ہوتے ہیں" ص ۱۲۸

مجلس کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :۔

"اس میں یہ شرط ہے کہ جس عورت کے لیے بیٹھک جمع ہو تو وہ خود کو عمدہ لباس اور زیوروں سے آراستہ کرے۔ بعض نسوانی اطوار رکھنے والے مرد بھی ان چودہ مرد عورتوں میں سے کسی کو اپنے سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ وہ اس دن کے لیے رنگین لباس اور زیور اور بلبچہ رکھتے ہیں"۔[1] ایک مرتبہ شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ایک آسیب زدہ عورت کو پانی دم کرکے پلایا اور اس کو نجات مل گئی اور دوسری مرتبہ پانی میں تھوک دیا اور اس پانی کو آسیب زدہ کو پلایا گیا اور اُسے ارواح خبیثہ کے اثرات سے خلاصی نصیب ہوئی"[2]

بدھی ریشم کے ڈورے کی طرح بٹی ہوئی ایک ڈور ہوتی ہے، یہ بازار میں بکتی تھی۔ شاہ مدار کے عرس کے دنوں لوگ اُسے دفع بلیہ کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالتے تھے[3]

یہ زوال نور بلا ہے بدھی اسی سے تنگ ہوں حد سے حد

کر دیا علی مدد اسی اپنے پانؤں کی خاک سے[4]

نقل و حرکت مسلمان امیروں میں یہ بات عام طور پر پائی جاتی تھی کہ جس مکان میں کوئی امیر فوت ہو جاتا تو کوئی دوسرا

---

[1] ہفت تماشا/ ۱۷۷

[2] ملفوظات رزاقی (قلمی) ص ۱۰-۱۱

[3] کلیات انشا/ ۷۶، ۱۸۰ [4] کلیات انشا/ ۱۴۲

امیر اس مکان میں سکونت نہیں کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ واسّاب علی خاں نے اس مکان کو امام باڑہ میں منتقل کر دیا تھا جس میں جواہر علی خاں نے رحلت کی تھی [1]

ستیلا کی پرستش پہلے حصے میں ہم ستیلا دیوی کی عظمت اور مسلمان عورتوں میں اس پر عقیدہ پائے جانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اودھ کے علاقوں میں بھی چیچک کی وبا کے زمانے میں ستیلا دیوی کا احترام کیا جاتا تھا اور اسے خوش کرنے کے لیے نذر و نیاز چڑھائی جاتی تھی [2] ایک دوسری دیوی بھوانی تھی جس سے مرادیں مانگی جاتی تھیں [3]

سورج و چاند گرہن ہندو تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی سورج اور چاند گرہن کے موقعوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور ہندوؤں کے طرزِ عمل پر مسلمان بھی بہت شور وغل کے ساتھ گرہن کی ابتداء کا اعلان کرتے تھے۔ بالعموم گرہن کا وقت نزولِ مصائب کا وقت تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا عام طور پر اس وقت تک مسلمان عبادت میں معروف رہتے اور روزہ رکھتے۔ جب تک سورج اور چاند کو گرہن سے چھٹکارا نہ مل جاتا

---

[1] وفات ۱۸۱۸ء تاریخ فرح بخش (انگریزی) ۲۱۹/۱۱

[2] تاریخ فرح بخش /۱۱/ص ۲۶۶

[3] ہفت تماشا ۸۴/۸۵، نصیحۃ المسلمین /۱۲ الف

[4] نصیحۃ المسلمین /۱۲ الف، ملفوظات شاہ عبدالرزاق (قلمی) ص ۱۴، ۱۸

میسنر میر حسن علی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں عورتیں غربا و مساکین میں غلّہ، تیل اور روپیہ پیسہ بطور تصدق اور خیرات تقسیم کرتی تھیں۔ شرفا مستحقین کو تحفے تحائف دیتے۔ جوتشی کو دو بار سے روپے، ایک جوڑا خلعت بطور انعام دیا جاتا۔ ایک منگیتر اپنے متوقع شوہر کو بطور صدقہ ایک بکری کا بچہ بھیجا کرتی تھی جسے گرہن کے دوران اس کی چارپائی کے پایہ سے باندھا رکھا جاتا تھا۔ اور مابعد صدقہ میں دے دیا جاتا۔ حاملہ عورتوں اور جانوروں کو گرہن کے منحوس اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ رسمیں ادا کی جاتی تھیں [1]

دیگر توہمات بعض گھروں میں کنواری لڑکی کا ہونا مبارک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح مربّہ اور اچار مدت العمر دوست کے گھر سے یا بازار سے خرید کر کھایا جاتا تھا۔ گھر میں نہیں تیار کرتے تھے [2] سفر پر جاتے وقت مسافر کے بازو پر امام ضامن کا روپیہ برائے تحفظ باندھا جاتا تھا [3] مشکلات کے وقت مختلف طرح کی منتیں ماننے کا رواج تھا۔ کوئی کہتی تھی ہمارا لشکر اس بلا سے نکل گیا تو مشکلکشا کا گھڑا دونا دوں گی' کوئی بولی میں سہ ماہی روزہ رکھوں گی، کونڈے بھر دوں گی، صحنک [4] کھلاؤں گی' دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤں گی۔ کسی نے کہا میں اگر جیتی چھٹی جناب

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے OBSERVATIONS etc 156-161

[2] ہفت تماشا/۱۴۲ [3] نصیحۃ المسلمین/۹ الف، فسانۂ عجائب/۱۰۲

[4] نصیحۃ المسلمین/۲۴ الف، فسانۂ عجائب/۷۲

عباس کی درگاہ جاؤں گی، سقائے سکینہ کا علم چڑھاؤں گی، چہل منبر کر کے نذر حسین کی سبیل پلاؤں گی [1] نقش سلیمانی پر لوگوں کو بڑا عقیدہ تھا [2] محرم کے زمانے میں تعزیوں کے سامنے بہت سے ایسے اعمال اور افعال ظہور میں آتے تھے جن کی بنیاد توہم پرستی پر تھی۔ مثلاً سُرخ اور سبز موم بتیاں جلانا [3] بعض مرتبہ عبدالقادر جیلانی کی فاتحہ بطور منت مانی جاتی تھی [4]

چاند سے متعلق بھی مسلمانوں نے کچھ ایسے تصوّرات قائم کر رکھے تھے جن سے ان کی وہم پرستی کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً پورا چاند شادی بیاہ کے لیے مبارک سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوتا تو اس بات کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر ایک اہم کام کے شروع کرنے سے پہلے جوتشی سے معلوم کرلیا جاتا تھا کہ چاند کس گرہ میں ہے۔ اسی طرح چاہے مکان کی تعمیر ہو، درخت کا لگانا ہو، دوا کا کھانا ہو، یا کسی معاملہ کا ضبط تحریر میں لانا ہو۔ لکھنؤ میں ایک عجیب وغریب رسم تھی۔ یہ "ایک گھونٹ میں چاند پینا" کہلاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا۔ ایک رو پہلے برتن میں پانی بھر کر اس برتن کو اس طرح ہاتھ سے پکڑا جاتا تھا کہ پانی پر پورے

[1] فسانۂ عجائب/۱۳۴

[2] ایضاً/۱۳۲

[3] رسالہ تعزیہ داری/۵،۲۱، ۱۹ نیز OBSERVATIONS etc) P. 51

[4] نصیحۃ المسلمین/۲۴ الف

چاند کا عکس پڑے اور جس شخص کو یہ پانی پلانا مقصود ہوتا تھا اس کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ ٹکٹکی باندھ کر اس برتن میں چاند کو دیکھے۔ پھر آنکھ بند کر لے اور اس پانی کو ایک گھونٹ میں پی جائے۔ یہ بھی عقیدہ عام تھا کہ اگر کوئی شخص پورے چاند کے موقع پر عبادت کرے اور دعا مانگے تو اس کی دلی تمنا بارآور ہوگی چودہویں رات کے چاند کے دنوں میں گنڈے تعویذ لکھے جاتے تھے اور سلامتی کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالے جاتے تھے [۱]

شادی بیاہ کے زمانے میں بہت سی ایسی رسموں پر عمل ہوتا تھا جنکی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی بلکہ ہندوؤں سے لی گئی تھیں اور وہ وہم پرستی کی وجہ سے عمل میں آتی تھیں۔ مثلاً "موسل سے ناڑا باندھنا"[۲] لکھنؤ کی عورتوں میں اور بلکہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ اگر خاندان میں کوئی شخص علیل ہو تو اگر پرند کو آزاد کر دیا جائے تو وہ مرض کو ساتھ لے کر اُڑ جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ جب کوئی بادشاہ یا خاندانِ شاہی کا کوئی فردِ علیل ہوتا تھا تو اس کی شفاعت کے لیے غلاموں کو آزاد کر دیا جاتا تھا غلاموں کے آزاد کرنے کے بہت سے مواقع تھے [۳]۔

---

[۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔

OBSERVATIONS etc: 156-158

[۲] برائے تفصیل دیکھئے OBSERVATIONS etc: PP. 206.209

[۳] ایضاً / ۲۲۶

ہندو جشن و تہوار

مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات کا ہم پہلے حصہ میں تفصیلی ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ دہلی کی طرح اودھ میں بھی ہندو مسلم تعلقات بڑے شگفتہ تھے اور تہذیبی یکرنگی پائی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طبقے کے مسلمان ہندو جشنوں، تہواروں اور میلہ ٹھیلوں میں بڑی گرمجوشی سے شرکت کرتے تھے۔ محمد فیض بخش کا بیان ہے کہ اجودھیا میں ہندوؤں کا ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں ہزاروں مسلمان شریک ہوتے تھے[1] میر حسن دہلوی نے اودھ کے میلوں میں مسلمانوں کی شرکت کا ذکر کیا ہے:

نہانوں کا اودھ کی سیر کرنا — ہر اک کافر کے غم میں جا کے مرنا
کہیں گپتار میں جانا گیست ہو — بہانا عشق کے دریا میں دل کو
وہ سورج کنڈ[2] کے میلے میں چلنا — ہر ایک خورشید کے غم میں جلنا[3]

---

[1] تاریخ فرح بخش ۱۱/۲/۲۸، دریائے لطافت (ا۔ ت) ص ۸۵

[2] معبد لیست۔ از دور دست خلائق بداں فراہم آیند، خلاصۃ التواریخ ۲۴/۴، مرزا قتیل نے اپنے ایک خط میں سورج کنڈ کے میلے میں شرکت کے بارے میں لکھا ہے۔ "از یک سال داماد کوچک میر انشاء اللہ خاں عرصۂ بر من تنگ کردہ بود کہ برای خدا یکبار مرا ہم ہمراہ خود در میلۂ سورج کنڈ باید برد" رقعات مرزا قتیل ۴۹/ ۔ ۵۰

[3] مجموعۂ مثنویات میر حسن/ ۱۵۹

مرزا امانی کو اپنے ایک مکتوب میں مرزا قتیل نے لکھنؤ کے چند میلوں کا اوران میں اپنی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ صرف مرزا قتیل ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے دوسرے مسلمان بھی ان میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ مرزا قتیل کا بیان ہے کہ جس دن سے لکھنؤ آیا تھا، تمہارے سر کی قسم اور امیرالمومنین علیہ السلام کی قسم میں نے میلہ ٹھیلوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی لیکن جس دن سے مولوی عبدالقادر[1] اور اس کے رفقاء اس شہر میں داخل ہوئے تھے اور مجھ سے گھل مل گئے تو ایک مرتبہ عصر کے وقت دو گھڑی کے لیے میلہ آٹھوں[2] دیکھنے گیا اور ایک دن میاں فتح علی کے تالاب پر منعقد میلے میں گیا تھا۔ علاوہ ازیں میلہ ہنومان، سورج کنڈ اور گومتی کے کنارے پر ہونے والے میلوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا جس کی وجہ تمہارے والد ماجد اور چچا خواجہ امیر خان تھے۔ کیونکہ وہ لوگ مجھے ہمیشہ میلہ ٹھیلوں میں جانے کی ترغیب دیتے تھے۔ اور مجھ پر کاہلی اور سستی کا الزام لگا کر مجھے اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ میں بھی ان کے ہمراہ ان میلوں میں شرکت کروں۔ آگے لکھتے ہیں: "شما بفضلِ الٰہی میلہا دیدہ رید و تماشاہا کردہ اید و سوائے ایں بیشتر ہم بتحریک پدر و عمومی می رفتند، مثل دیگر بچہا گاہی بے اختیار بودہ اند۔" [3]

---

[1] عبدالقادر رام پوری، مصنف وقائع عبدالقادر خانی [2] اس میلے کا ذکر دوسری جگہوں پر بھی ملتا ہے۔ انشاء نے کئی مرتبہ اس میلے کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کلیات انشاء ص ۲۳۵، ۲۰۱،۹، نیز دیکھیے تاریخ فرح بخش، ص ۵۳

OBSERVATIONS etc. 387-88

[3] رقعات مرزا قتیل، ص ۵۰

بسنت نوابان اودھ بسنت کے جشن کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ تاریخ اودھ میں لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ بسنت اور دوسرے جشنوں میں ہر سال لاکھوں روپے صرف کر دیتا تھا۔[1] سیف الملوک کے مصنف نے آصف الدولہ کے دربار میں جشنِ بسنت کی تعریف ان اشعار میں کی ہے:۔

بہار اور بسنت آمد و شگوفہ در باغ　　گل واشرفی و نرگس شگفتہ ہمچو ایاغ
سرور کرد بسند کشاد دست کرم　　گل و گلاب و ہم جعفری دھدا بلاغ[2]

ہولی میر تقی میر نے ہولی پر دو مثنویاں لکھی ہیں جن میں اس نے نواب آصف الدولہ کے دربار میں اس تہوار کے انعقاد، آتشبازی اور رنگ کھیلنے، رقص و سرود کی جو تفصیل کی ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ دونوں مثنویاں دورِ آصفی کی شان و شوکت اور عیش و عشرت کی منظر کشی کرتی ہیں۔ اور ان سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نوابان اودھ کو ہولی کے جشن سے کتنی گہری دلچسپی تھی۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر　　رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

رنگ کھیلنے کا منظر

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جوان　　جیسے گلدستہ تھے جوؤں پر رواں

---

[1] تاریخ اودھ ۳ ص ۱۔ [2] سیف الملوک (مصنف نامعلوم) ص ۸۴ الف مصحفی نے بسنت کی تعریف میں ایک پوری غزل لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ دیوان مصحفی ج ہشتم۔ (قلمی پٹنہ) ص ۱۷ ب نیز کلیات انشا ۲/۳۲-۳۳

زعفرانی رنگ میں رنگیں لباس　　　عطر پاشی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی تھی پھوار　　　رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال　　　جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہے لال
برگ گل ملواں اڑاتے تھے عبیر　　　تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر

روشنی و چراغاں

روشن الدولہ کی تھی یہ روشنی　　　کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک　　　تھے تماشائی گدا و شاہ تک
راہ میں تر پولیے مینار تھے　　　روشنی کے کوچہ و بازار تھے
اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں　　　دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہے یاں

سوانگ بھرنے کا ذکر

سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں　　　چھینکنے کا سوانگ تھا سارا جہاں
آئے کس کس رنگ سے دامن سنوار　　　باد کے رنگوں جنھوں کا تھا گذار
کیسی کیسی دیکھی شکلیں تازیاں　　　سحر کرتے تھے کرصوت بازیاں

آتشبازی

کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں　　　ذو ذنب جیسے ستارے ہوں یہاں
جا ہی جو ہی چھوڑتا ہے یاد بود　　　روشناں ذو ذوانب تھے نمود

گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ　　دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہے باڑ
اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے　　ناگہاں جو ہو ویں تارے ٹوٹتے
کیا ہے آتش دستیاں دے کر گئے　　شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے[1]

مہجور نے نواب سعادت علی خاں کی مجلس ہولی کا بہت ہی دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے:۔

موسم ہولی کا تیری بزم میں دیکھا جو رنگ　　ٹمٹکی نمٹ باندھی ہوں دامن کو اپنے ہوشیاں
بھرتے ہیں رنگ شفق میں سب ڈوبے ہوئے　　ہاتھ میں مثل ثریا سب لے کے پچکاریاں
آنکھ اُٹھا کر یکطرف دیکھا تو باندھے اپنا غول　　پھرتی ہیں اِدھر اُدھر اس روپ سے سب نٹیاں
ہاتھ میں لے کر کے دف اور گیندگل صد برگ کے　　چھاتیوں پر بھی ڈوپٹوں کے بندھی ہوویں گاتیاں
اور کہیں آپس میں ہولی کھیلتی تھیں وہ جو سب　　ان پری رُوؤں کا نقشہ کیا کروں میں اب بیاں
کوئی کسی کے منہ کو ملتی ہے عبیر اور گلال　　اور کسی کی کوئی پہنچی دے ہے تڑ تڑ تالیاں
اور کہیں آپس میں سب وہ باد فے جنگ و رباب　　یہ غزل مہجور کی پڑھتی ہیں ہر سو گاتیاں[3]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ کلیات میر د آسی نول کشور لکھنؤ ۱۹۴۱ء ص ۷۸۳۔۷۸۸، ۷۸۹۔۷۹۱۔ نیز ملاحظہ ہو۔ عماد السعادت / ۱۷۲، معاصر۔ ج/ا "آصف الدولہ کا جشن ہولی اور افسوس کی مثنوی" ص ۲۰۔۲۹ MEMOIRS ETC 11: P 231-32 ہفت تماشا / ۹۲۔۹۳

[2] نام شیخ محمد بخش، تخلص مہجور، ولد حکیم خیراللہ، جو فتح پور کے باشندہ تھے، مہجور لکھنؤ میں منشی گنج محلے میں رہتے تھے۔ ریاض الفصحا / ۳۱۵۔۳۱۶

[3] دیوان مہجور (قلمی)، ص ۲۲۸۔۲۳۴۔ نیز ملاحظہ ہو۔ عماد / ۱۷۲۔ دریائے لطافت۔ (ا۔ت ۱۰۷۔ نیز ملاحظہ ہو۔

مرزا قتیل کا بیان ہے کہ نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی کے ابتدائی دور میں بھی ہولی کا ہنگامہ گرم ہوتا تھا۔ لاکھوں روپے نقد اور مرصع جواہر نگار زیور اور قیمتی لباس لولی عورتوں کو بطور بخشش مرحمت ہوتے تھے۔ اور درباریوں کو قیمتی لباس عطا ہوتے تھے۔ ؎۱

دسہرہ ہولی کے علاوہ دسہرہ کا تہوار بھی بڑی شان وشوکت سے منعقد ہوتا تھا ؎۲

شہزادہ سلیمان شکوہ نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ بھی جشن ہولی بڑے اہتمام سے منعقد کرتے تھے۔ انشا نے ان کی مجلس کا یوں ذکر کیا ہے:-

سانگ ہولی میں حضور اپنے جو لادیں ہر رات
کہ کنہیا بنیں اور سر پہ وہ دھر لیویں مکٹ
گوپیاں ہو کے پڑی ڈھونڈیں کدم کی چھائیں
بانسری دھن میں دکھا دیویں وہی جمنا تٹ
گانوں گوکل کا ہے پنڈا ہی نرالا ہے کہیں
گوالنیں بن کے کہیں ہنس کے وہ ہے بنسی پٹ
گاگریں لیویں اٹھا اور یہ کہتی جاویں
دیکھت ڈھونڈری جو زرم ادی ہے پنگھٹ

؎۱ عماد/ قلمی/ ص ۱۹ الف
؎۲ ہفت تماشا/ ۹۳

سونے روپ میں جو لدجائیں گنواروں کی طرح
دہام گھر کو کہیں نزدیک کو بولیں دو نکہت[1]

عام مسلمان اور ہندو جشن و تہوار دسہرہ کے دنوں میں ہندوؤں کی طرح کچھ مسلمان بھی نیل کنٹھ کے دیدار کے اشتیاق میں شہر کے باہر جاتے تھے، اور خصوصاً وہ مسلمان امیر جو حاکم شہر ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ لازمی تھا کہ اس دن وہ اپنے گھوڑوں اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کر کے نقرئی اور طلائی ساز و سامان اور زرنگار جھول کے ساتھ سونے چاندی کے ہودے اور عماریاں لگا کر فوج اور خدم و حشم کے ساتھ اور ذی مرتبہ مصاحبوں کو ہمراہ لے کر بازار میں نکلتا تھا۔ وہ ہر فرقے کے لوگوں میں گراں بہا نقدی بطور انعام و اکرام تقسیم کرتا تھا اور شہر کے باہر جا کر میدان میں نیل کنٹھ کا دیدار کرتا تھا۔ شام کو گھر واپس آکر وہ پری نژاد شوخ وطناز رقاصاؤں کے رقص و سرود سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

ہندو بچوّں کی طرح مسلمان بچوّں میں بھی یہ رسم تھی کہ دسہرہ سے دس دن پہلے مٹی کی ایک صورت بناتے تھے اور اسے لکڑیوں پر لٹکاتے تھے۔ اس کا نام ٹیسو رائے ہوتا تھا۔ روزانہ شام کے وقت کچھ بچے اور کچھ جوان مل کر اپنے رشتہ داروں کے دروازوں پر اور ایک مخصوص لے میں بلند آواز اور خوش الحانی کے ساتھ ہندی کے چند بیت پڑھتے تھے اور ایک پیسہ یا

---

[1] کلیات انشا/۲۴۹

اس سے زیادہ لے کر دوسرے دروازے پر جاتے تھے۔ اس طرح جو رقم جمع ہو جاتی تھی ان پیسوں سے دسہرے کے دن مٹھائی خرید کر آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اس کے برعکس لڑکیاں ٹیسو رائے کے بجائے جالی دار کوزہ ہاتھ میں لے کر دروازوں پر جاتی تھیں اور پیسے جمع کرتی تھیں۔ مجملاً دسہرہ کے دن ہر شخص اپنے مخصوص ٹیسو رائے کو نشان و نقارہ کے ساتھ باہر نکالتا تھا۔ اور بڑی شان و شوکت سے جلوس کے ساتھ ندی کی طرف لے جاتا تھا۔ اور ٹیسو رائے کو پانی میں بہا کر واپس آتا تھا۔ [1]

مسلمان سلونو کے جشنوں میں شریک ہوتے تھے[2] یوپی کے گانوؤں میں اب بھی یہ رسم ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے بھائیوں کی کلائیوں میں راکھیاں باندھتی ہیں۔

دیوالی کے دنوں میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی قمار بازی کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور جو مسلمان جوا کھیلنے میں پرہیز کرتے تھے۔ وہ کم از کم اپنے گھروں میں چراغاں کرتے تھے۔ اور شب دیوالی میں عورتیں سب بچوں کے نام سے الگ الگ مٹی کے کھلونے منگواتی تھیں اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھانڈ کے کھلونے ان پر اضافہ کر کے پہلے گھر کو چراغاں کرتی تھیں پھر اس حصۂ مکان کو جہاں کھلونے اور مٹھائیاں رکھی جاتی تھیں، روشنی سے "رشکِ وادیٔ ایمن" بناتی تھیں۔ یہ رسم اصطلاحاً "دیوالی بھرنا" کہلاتی

---

[1] ہفت تماشا، (۱۔ت)، ص ۷۷-۷۸۔

[2] ایضاً، ص ۷۹-۸۰۔

تھی۔ اس عمل کو بچوں کی حفاظت کے لیے اچھا سمجھا جاتا تھا[1]

جنم اشٹمی کے تہوار میں مسلمان، اپنے ہندو بھائیوں کی تقلید میں کنس کا مجسمہ بنا کر اس کے پیٹ کو چاک کرتے تھے اور جو شہد اس میں پہلے سے بھر دیتے تھے، اُسے اس کا خون سمجھ کر پیتے تھے۔ اور ہسٹ[2] میں مسلمان بھی شریک ہوتے تھے[3]

بسنت کے دنوں میں گانے والے مسلمان اور دیگر لوگ مٹی کے برتن میں سبز خوشے اور گل شریف ڈال کر روزانہ کسی بزرگ کے مزار پر جاتے تھے۔ اور بسنت کی تہنیت نیز صاحب مزار کی مدح میں اشعار گاتے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ٹولیاں ان کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح لولیاں بھڑکیلے لباسوں میں قبروں پر جا کر رقص کرتی تھیں۔ اور اس دن مسلمان پیلے لباس زیب تن کرتے تھے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہو کر شہر کے باہر جاتے اور کاغذ کے پیلے پتنگ بنا کر زرد ڈوری سے اُڑاتے تھے۔[4]

افغانوں اور بعض پارسا مسلمانوں کے علاوہ سبھی مسلمان دل کھول کر ہولی میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ہر طبقے کے لوگ اپنے ہم مرتبہ لوگوں

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ۸۲-۸۳-۸۴۔ دیوان مصحفی پنجم (ق۔ پٹنہ) ۷ ب، ۸ الف، ۱۹۱ الف

[2] برائے تفصیل دیکھیے ہفت تماشا/ ۸۶-۸۷

[3] ایضاً ص/ ۸۷ OBSERVATIONS ETC. 387-88

[4] ایضاً / ص ۸۸ دربار اودھ میں بسنت منایا جاتا تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں سجتی تھیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ سیف الملوک ص ۸۴ الف

کے ساتھ ہولی مناتے تھے۔ جب ہولی جلانے میں تین دن باقی رہ جاتے تھے تو رنگ کو چھوڑ کر نالے کی کیچڑ بلا تفریق اچھالتے تھے۔ اس زمانے میں ہر مسلمان کے گھر پر روزانہ لولیوں کا رقص ہوتا تھا اور رات کو اس میں بہروپی اور نقلوں کا مزید اضافہ کر دیا جاتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ میں بڑی بے تکلفی سے ہولی کا جشن منایا جاتا تھا۔ تمام دن رنگ اور گلال وعبیر اڑتا تھا اور رات کو لولیوں سے اختلاط ہوتا تھا۔ ـــــــ دریا کے کنارے ایسی روشنی اور آتشبازی ہوتی تھی کہ اس کا تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ عوام ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے تھے۔ اور ہر قسم کا بہروپ بھرتے تھے۔ پھر ہر راہ رو کی خواہ وہ آشنا ہو یا بیگانہ، بے صرفہ گالی گلوج اور فحاشی سے تواضع کرتے تھے۔ [1]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے "تفریق پیدا کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کی تھی لہذا اس حکمت عملی کے تحت انہوں نے قانوناً مسلمانوں پر ہولی کا رنگ ڈالنا ممنوع قرار دے دیا۔ [2] اس طرح انہوں نے مسلمانوں پر بھی پابندی لگا دی کہ وہ ہولی کا تہوار نہ منائیں اور اس طرح انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ناقابل عبور خلیج پیدا کر دی۔

---

[1] ہفت تماشا/۹۲۔۹۳

[2] ایضاً/۹۲

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی اچھی نہ تھی۔ اکثر پیرزادے جھنڈے نشانوں سے روزی کماتے تھے۔ [1] چوری اور مکر و فریب کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ محرم کے زمانے میں ایک امام باڑے میں مرثیہ کی مجلس تھی۔ وہاں ایک چاندی کا پیکدان رکھا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے اس پر ہاتھ صاف کر دیا۔ [2] جارج فورسٹر نے ہو سکتا ہے۔ مبالغہ سے کام لیا ہو مگر اس کا بیان ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مذہب سے بیگانہ تھے، ان کو مذہب سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی۔ بہت سے لوگ آنحضرت کا نام بھی احترام سے نہ لیتے تھے۔ مسجدیں برباد اور اجاڑ تھیں۔ ان کی بے حرمتی کی جاتی تھی [3] شراب نوشی [4]، افیون خوری اور دیگر منشیات کے استعمال کی برائیوں کے علاوہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگوں میں زنا، کثرت ازدواج اور کنیزیں رکھنے کا عام رواج تھا اور ان آلائشوں میں غرق تھے۔ غلام رکھنے کی خرابی بھی پائی جاتی تھی۔ گورکھپور سے کنیزیں اور غلام خریدے جاتے تھے [5] مرزا قتیل نے زن فروشی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے: "دیگر امور غیرت ست۔ شاہ پیرائے مادر قحبہ کہ جہاں را مسخر کرد

[1] نصیحۃ المسلمین/۲۷ الف و ب

[2] تاریخ فرح بخش ۱۱/ص ۵۲

[3] GEORGE FORSTER: TRAVELS IN INDIA: I-P/06

[4] کاشف الاستار "مسلمانان ایں جا کلہم بودند شراب خور" /۸/۱۵ ہفت تماشا/۸۲

[5] حدیقۃ الاقالیم/۱۵۲، غلام بردوں کے لیے دیکھئے۔ مسز میر حسن علی/۱/۱۴

بہمیں صفات پسندیدہ ایں چک و چانہ داشت لیکن زن جلب مکرو فریب بسیار می فروخت" [1]

بیوہ گان کو نکاح ثانی سے محروم رکھنے کی وجہ سے بھی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ مرزا قتیل کا بیان ہے کہ "اگر لڑکی بناتِ خود ہزار مردوں سے تعلق پیدا کرے تو اس سے نہیں جھجکتے، مگر اپنی خوشی اور دِلی رغبت سے اس کا نکاح ایک دوسرے مرد سے نہیں کرتے" [2]

امراء اور دولت مندوں میں زنا کاری کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کی ولادت خوشی کا باعث نہ ہوتی تھی [3] اور بعض مرتبہ ایسے واقعات بھی پیش آتے تھے کہ اس خوف سے کہ لڑکی نہ ہو، حمل گرائے جاتے تھے۔ میر حمزہ نے پیلو کی بیتوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جن سے حمل گرائے جاتے تھے۔ "دربطن حاملہ دختر بودہ باشد، اسقاط حمل میگردد وایذا بحاملہ نمی رسد" [4]

قمار بازی کی وبا بھی پائی جاتی تھی [5]

اصلاحی تحریک ہمعصر کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ جیسا کوئی مصلح اودھ کی سرزمین میں جلوہ نما نہیں ہوا۔ جس نے وہاں کے مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کے ذریعہ ان کی دینی زندگی اور کردار کی اصلاح کی کوشش کی ہو مگر قتیل کے بیان سے معلوم

---

[1] رقعات مرزا قتیل/۶۵، غلام عورتوں کے لیے دیکھیے۔ مسیز میر حسن علی/ص ۱۴۱

[2] ہفت تماشا/۱۳۸، ۱۵۱ [3] مسیز میر حسن علی/۱۸۶ [4] کاشف الاستار [5] ملفوظ رزاقی/۹۷

ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں اودھ کے مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کی اصلاحی کوششیں ضرور ہوئیں اور یہ فرض شیعہ علماء نے انجام دیا۔ مرزا قتیل نے لکھا ہے: " ہندوستان میں فقہ کے عالم بھی ہوئے ہیں، اگرچہ کچھ نہیں ہوا تو مذہب اثنا عشری کے علماء نہیں ہوئے۔ اب خدا کے فضل سے یہ بھی ہونے لگے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے بعض ان علماء کی کوششوں کو دخل ہے جو ولایت کے ملکوں میں گئے اور وہاں کے مجتہدوں سے مل کر ہر گتھی کو سلجھایا پھر ہندوستان آکر ان علوم کو یہاں رواج دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے زمانے کے علماء کی کوششیں درجۂ کمال کو پہنچ گئیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے موجودہ زمانے تک شیعوں کے گھروں میں شاہ مدار کی بدھی ہر سال کالے نشان کے ساتھ طول عمر اور سلامتی کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ اور شیخ سدو کی نیاز کا بکرا ذبح کرتے ہیں۔ یعنی یہ علم دین کا عدم رواج ہے۔ کیوں کہ اگر ان شہروں میں علم دین رائج ہوتا تو یہ سب رسمیں کیوں رواج پاتیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مرد اس سلسلے میں سست عقیدہ ہو گئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے"[1]

---

[1] ہفت تماشا / ۱۷۶

باب نہم

میر کا لکھنؤ میں آخری دور

(۱۷۸۱ء-۱۸۱۰ء)

میر دلّی سے لکھنؤ کے لیے ہجرت کے بارے میں خود یوں بیان کرتے ہیں:۔

"فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ (بارے) میری عزت و ابرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو اسحاق خاں نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی اور وزیر الممالک کے خالو ہوتے تھے۔ ان پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں (خان آرزو) سے تھے، کہا، "اگر نواب صاحب از راہِ عنایت زادِ راہ کے لیے کچھ مرحمت فرمادیں (تو) میر ضرور آجائے گا۔ حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ انہوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے ایک خط لکھا" نواب والاجناب تمہیں طلب فرماتے ہیں۔ جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ"۔ میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا، خط پاتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ چوں کہ خدا کی امداد شاملِ حال تھی۔ بغیر یار و مددگار اور قافلہ یا رہبر کے چند دنوں میں فرخ آباد پہونچا۔"

وہاں نواب مظفر جنگ[1] نے میر کی بڑی خاطر تواضع کی اور کچھ دنوں قیام کرنے کی درخواست کی لیکن میر نے یہ درخواست قبول نہ کی۔ ایک دو دن کے قیام کے بعد لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور منزلِ مقصود پر پہونچ گئے[2]

اس کے برعکس سعادت خاں ناصر لکھنوی نے میر کے اس سفر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میر بیل گاڑی میں روانہ ہوئے۔ اور حسنِ اتفاق سے ایک سنّی بھی اس گاڑی میں سوار تھا۔ سوار ہوتے وقت اندھیرا ہو چکا تھا لہٰذا یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کون ہمراہ ہے جب صبح ہوئی اور اس کی صورت دیکھی تو منہ اپنا دوسری طرف پھیر لیا۔ اور لکھنؤ تک اس کی طرف منہ پھیر کر نہ دیکھا[3] لکھنؤ پہونچنے کے بعد مسافروں کے قاعدہ کے مطابق میر ایک سرائے میں جا اترے مرزا مغل سبقت[4] کا بیان ہے کہ وہ میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور شرفِ دست بوسی سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد مرزا مغل نے میر صاحب سے کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے بے تامّل فرمایا۔

---

[1] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ عہد بنگش از ولی اللہ فرخ آبادی دپاکستان۔ ۱۹۶۵ء ص ۱۶۹-۱۹۴ [2] میر کی آپ بیتی / ۱۷۸-۱۷۹

[3] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا دق، ص ۲۷ الف آبِ حیات / ۲۲۸۔ اس سفر میں غالباً میر کے ہمراہ میر ضیاء الدین ضیا رہے۔ ملاحظہ ہو۔ دلّی کالج میگزین (میر نمبر جلد اوّل)۔ مرتبہ نثار احمد فاروقی (۱۹۶۲ء) ص ۶۱-۶۳ گمان غالب ہے کہ میر کی مثنوی ننگ نامہ اسی سفر کے بارے میں ہے۔ کلیاتِ میر۔ ص ۹۵۹-۹۶۷

[4] برائے حالات دیکھیے۔ تذکرہ ہندی / ۱۳۲

"کہ تمہارے بشرہ سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی، سخن کے ضائع کرنے سے کیا حاصل" [۱]

ایک دوسرے موقع پر شاہ قدرت اللہ قدرت [۲] اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے۔ قدرت نے اپنے دیوان سے چند غزلیں پڑھیں اور بعد میں میر صاحب سے ملتمس ہوئے کہ وہ بھی کچھ سنائیں۔ ثانی الذکر نے کہا "صوابدید یہ ہے کہ تم دیوان کو دریا میں ڈال دو" [۳] یہ تھا میر کا مزاج اور خودداری اور نازک مزاجی بلا کی تھی۔ ان کی بے دماغی کے چند واقعات احمد علی خاں یکتا نے دستورالفصاحت [۴] میں لکھے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جس دن میر صاحب لکھنؤ پہونچے اسی دن کسی کے ہاں مشاعرہ تھا لہٰذا انہوں نے فوراً ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا شامل ہوئے۔ آزاد نے جس طرح یہ واقعہ لکھا ہے اُسے قبول کرنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ ایک تو میر نواب سالار جنگ کی دعوت پر گئے تھے۔ اس لیے لکھنؤ میں ان کا ورود کسی "اجنبی" کی طرح نہ ہوا ہوگا، دوسرے میر جیسا نازک دماغ انسان ایک طرف تو جو لوگ گھر پر کلام سننے آئیں انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے [۵] دوسری طرف وہ شہر کے

---

[۱] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا / ۲۷ الف

[۲] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ تذکرہ شعرائے اردو / ۱۳۳

[۳] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا / ۲۷ الف

[۴] برائے تفصیل دیکھیے۔ دستورالفصاحت / ۲۵-۲۶۔ [۵] آبِ حیات / ۲۴۳

ایک مشاعرے میں بغیر بلائے غزل لکھ کر پہنچ جاتا ہے اور سنانے پر اصرار کرتا ہے۔ واقعہ میں یقیناً کچھ رنگ آمیزی ہوئی ہے۔

محمد حسین آزاد نے جو قطعہ میر سے منسوب کیا ہے کہ انہوں نے فی البدیہہ کہا اور بر سر مشاعرہ پڑھا وہ

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

یہ قطعہ کلیات میر کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے لیکن بعد میں ایک قدیم قلمی بیاض کے حوالہ سے جناب نثار احمد فاروقی نے ثابت کیا ہے کہ یہ قطعہ میر ہی کا ہے [1]

اس کے بعد آزاد رقم طراز ہیں کہ یہ جان کر کہ موصوف میر صاحب تھے، حاضرین نے معذرت کی۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سُنا اور دو سَو [۲۰۰] روپے مہینہ مقرر کر دیا،، [2]

---

[1] دید و دریافت/ ۱۹۰

[2] آب حیات/ ۲۲۸-۲۲۹

اس کے برعکس میرؔ کا خود بیان ہے کہ "پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا۔ خدا انہیں سلامت رکھے، انہوں نے میری بڑی عزت کی اور میرے لیے ضروری چیزیں بندگانِ عالی (آصف الدولہ) سے کہہ کر بھجوا دیں" [1]

ان تینوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات کہیں نہیں ثابت ہوتی کہ میرؔ صاحب نواب آصف الدولہ کے مہمان رہے یا نواب سالار جنگ کے۔ میرؔ نے خود اس بات کی وضاحت نہیں کی بلکہ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ پہونچ کر ان کے ہاں مقیم نہیں ہوئے۔ میرؔ کا محولا بالا بیان "میرے لیے ضروری چیزیں بندگانِ عالی (آصف الدولہ) سے کہہ کر بھجوا دیں" اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرؔ کہیں اور ٹھہرے تھے۔ اگر وہ اپنے کسی آشنا کے ہاں ٹھہرے ہوتے تو مصحفیؔ کی طرح وہ بھی بیان کر دیتے۔ اس خاموشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ سرائے ہی میں ٹھہرے ہوں گے۔ اس لئے "آبِ حیات" اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کے اندراجات کو سراسر غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔

خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بھی آزادؔ کے بیانات کی تردید نہیں کی۔ بلکہ لکھا ہے "اس زمانے میں آزاد کی پہنچ جن تذکروں اور شہادتوں تک تھی آج ہماری نہیں۔ اس لیے اس کے ہر بیان کو بلا استثناء "خیالی طوطے مینا" کہہ کر رد کر دینا مناسب نہیں ہے۔" [2]

میرؔ کے خود کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے جتنے اشتیاق سے میرؔ کو لکھنؤ بلایا تھا اتنی خواہش اور اشتیاق ان سے

---

[1] میرؔ تقی میر حیات اور شاعری/۲۴۹

ملنے میں نہیں دکھایا۔ میر لکھنؤ پہونچ گئے۔ نواب سالار جنگ سے ملاقات بھی ہوئی انہوں نے میر کی بڑی عزت کی اور ضروری سامان مہیا کرادیا۔ نواب کو میر کے ورود کی اطلاع بھی مل گئی مگر ملاقات چار پانچ روز بعد اور وہ بھی دربار میں نہیں بلکہ مرغ بازی کے میدان میں اور حسنِ اتفاق سے۔ میر اس واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:۔

"چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے۔ میں بھی وہاں موجود تھا، حاضر خدمت ہوا۔ فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے: "میر تقی ہو؟" پھر بڑی عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے۔ اور مجھے مخاطب کرکے اپنے اشعار سنائے۔ میں نے کہا سبحان اللہ، بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے،" فرطِ مہربانی سے مجھے بھی شعر خوانی کا موقعہ دیا۔ اس روز میں نے غزل کے چند شعر کہے، جب نواب صاحب اٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ نے کہا کہ "میر حسب الطلب آئے ہیں اور بندگانِ عالی مختار ہیں انہیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں اور جب مرضی مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں۔ نواب آصف الدولہ نے فرمایا" میں کچھ دن تن خواہ) مقرر کرکے تمہارے پاس بھیج دوں گا" دو تین دن بعد بلا فرمایا تو میں حاضر ہوا اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سنایا، سماعت فرمایا اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں داخل کرلیا۔ اور اب تک میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے ہیں،" [1]

[1] میر کی آپ بیتی، ۱۷۹-۱۸۰

مندرجہ بالا اقتباس سے دو نتائج نکلتے ہیں، اوّل، لکھنؤ میں میر کی قدر و منزلت تو ضرور ہوئی[1] مگر نواب نے میر کا وہ خیر مقدم نہیں کیا جیسا اسے کرنا چاہیئے تھا کیوں کہ اس نے میر کو بڑے اشتیاق سے بلوایا تھا۔ علاوہ ازیں بعد میں نواب کو غالباً یہ خیال بھی نہ رہا تھا کہ انہوں نے میر کو بلایا ہے۔ کیونکہ جب نواب اور میر کی پہلی ملاقات ہوئی تو نواب سالار جنگ نے نواب کو یاد دہانی کرائی کہ میر حسب الطلب آئے ہیں" دوم، میر کا قیام نہ تو نواب کے ہاں تھا اور نواب سالار جنگ کے یہاں۔

میر نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ان کو ملازمین کی صف میں نوکر کر لیا گیا مگر کہیں یہ نہیں لکھا کہ ان کی تنخواہ کیا مقرر ہوئی۔ دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دو[2] یا تین سو روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر ہوئی تھی، اور تحسین خاں ناظر کے سپرد کیے گئے تھے[3]۔ غالباً میر اس تنخواہ سے خوش نہ تھے اس لیے انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس زمانے کے لحاظ سے یہ تنخواہ کم نہیں تھی[4]

---

[1] تذکرہ ہندی / ۲۰۴

[2] آب حیات / ۲۲۹

[3] تذکرہ گلشن ہند / ۲۱۰

[4] تذکرہ گلشن ہند / ۲۱۰ "

[5] میر تقی میر حیات اور شاعری / ۲۴۴ - ۲۲۵

بڑی حیرت کی بات ہے کہ میر ۲۹ سال لکھنؤ میں رہے اور وہیں سپرد خاک ہوئے لیکن نہ تو انہوں نے خود اور نہ کسی ہمعصر صاحبِ علم وفضل نے ان کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ اور نہ ہی ان کے کلام سے اس بات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ میں میر کی زندگی کس ڈھب سے گذری۔ ان کے اشعار سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ میر لکھنؤ میں خوش نہ تھے اور ان کے اشعار سے یہاں سے بے زاری کی نشان دہی ہوتی ہے۔ وہ "متاعِ ہنر" پھیر کر لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اشعار بعد میں پیش کیے جائیں گے۔ تذکرہ گلشن ہند اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں جو کچھ تھوڑا بہت میر کے حالات میں ملتا ہے اس سے میر اور نواب آصف الدولہ کے آپسی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں لکھنؤ میں میر کی زندگی کی صحیح تصویر نہیں ملتی اور ہمعصر تذکروں کی بنیاد پر کوئی واضح تصویر تیار نہیں کی جا سکتی۔ محولۂ بالا تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر اور نواب آصف الدولہ کے تعلقات خوش گوار نہ تھے اس کی وجہ میر کی خود داری اور نازک مزاجی ہو سکتی ہے[1] محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "عظمت و اعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں، اگرچہ انہوں نے لکھنؤ

---

[1] عقد ثریا میں مصحفی میر کی نازک مزاجی کے بارے میں لکھتا ہے۔ باوجود عیال داری توکل اختیار کردہ و روے نیاز بہ ایں و آں نمی آرد و از لسکہ از ابنائے زمانہ کسے را مخاطب صحیح نمی پندارد و سخن بہر کس و ناکس نمی کند۔ ازیں جہت اعزہ اور اکثر خلق و برخود غلط و انصاف دشمن قرار می دہند۔ ص ۵۲۔۵۴

میں بھی میر صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا، مگر انھوں نے بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصاحب تھے، اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔چناں چہ کبھی کبھی نواب کی خدمت میں جاتے تھے"! [1]

نواب آصف الدولہ کے کردار کا پہلے جائزہ لیا جا چکا ہے جس سے یہ تصویر بنتی ہے۔حالانکہ نواب علم و ادب، فن اور فنکاروں کی سرپرستی کرتے تھے مگر اپنے لہو و لعب و تغافل شعاری کی بنا پر اور مزید برآں، بہر حال دماغ ایک نواب کا پایا تھا۔ان فنکاروں کی ویسی عزت اور قدردانی نہیں کر پاتے تھے جوان کے شایان شان ہوتی، جو میر جیسے خوددار شاعر کے لیے بے حد گراں گذرتی تھی۔میر جن امیدوں کو لے کر لکھنؤ آئے تھے، ان پر پانی پھر گیا، روزی کا انتظام تو ہو گیا مگر قدر و عزت نہ ملی ہوگی جس کے لیے میر اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے اور سفر کی صعوبتیں اٹھا کر یہاں آئے تھے۔غالباً میر کو اس بات کا احساس نواب سے پہلی ملاقات کے بعد ہی ہو گیا ہوگا۔اس لیے وہ دربار میں کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔مرزا علی لطف کا بیان ہے "اگر چہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا"[2]

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دن نواب نے میر سے ایک غزل کی فرمائش کی۔دوسرے تیسرے دن جب وہ نواب کی خدمت

---

[1] آب حیات/۲۲۹

[2] تذکرہ گلشن ہند/۲۱۰

میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا کہ میر صاحب" ہماری غزل لائے؟
میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔

جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہیں نہیں، کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا:۔
خیر میر صاحب۔ جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجئے گا،، لہ

سعادت خاں ناصر لکھنؤی ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

ایک دن نواب صاحب کتاب خانہ میں تھے اور دواوین زیر و بالا رکھے ہوئے تھے۔ ایک جلد نواب کے ہاتھ سے بہت دور تھی اور میر صاحب سے نزدیک۔ نواب نے فرمایا "مجھے اٹھا دیجئے" میر صاحب کو یہ ارشاد ناگوار گذرا اور انہوں نے ایک خادم سے کہا جو وہاں موجود تھا "سنو، تمہارے آقا کیا فرماتے ہیں،، نواب نے راست ہو کر وہ جلد اٹھائی مگر یہ بات ان کو بہت ناگوار خاطر ہوئی۔ مگر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ چند لمحوں کے بعد فرمایا" میر صاحب، مرزا رفیع سودا کیسے شاعر ہیں مسلم الثبوت تھا" میر صاحب نے جواب دیا۔ بجا۔ ہر عیب را کہ سلطان بہ پسندد ہنر است" نواب نے کہا کہ "ہم عیب پسند ہیں" اسی دوران میں میر سوز جو نواب کے استاد تھے واسطے مجرا کے حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا" کچھ اپنے شعر پڑھو" حسب الحکم میر سوز نے اپنی دو تین غزلیں پڑھیں۔ نواب نے تعریف کی اور اس بارے میں مبالغہ فرمایا۔ میر صاحب کو میر سوز کی دلیری اور نواب کی تعریف بہت ناگوار

لہ آب حیات/۲۲۹

گذری۔ میر سوز سے کہا، "تمھیں اس دلیری پر شرم نہ آئی" میر صاحب نے آگے کہا، "صاحب بندہ کیا۔ میں شاہ جہاں آباد میں بھاڑ جھونکتا تھا۔ بزرگی اور شرافت میں تمہاری کیا تامل مگر شعر میں میر سی کسی کو ہمسری نہیں۔ موقع اور محل تمہاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کلیاں پکتی ہوں نہ کہ میر تقی کے سامنے" میر سوز سے تو یہ کہا اور وہ شقّہ جو میر کی طلب کا حضور نے لکھا تھا جیب سے نکال کر حضور کے سامنے رکھ دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے خانہ آباد دولت زیادہ، نواب صاحب نے فرمایا۔ "خدا حافظ" دو تین مہینے بعد تحسین علی خاں نے نواب سے میر کی تنگی اور عسرت اور غریب الوطنی کا ...... تذکرہ کیا۔ نواب صاحب نے پہلے تو میر کی بے اعتنائی کا گلہ و شکوہ کیا لیکن خواجہ سرا اور ناظر کی شفاعت قبول فرمائی۔ تحسین علی خاں خوشی خوشی میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور نواب سے جو اس کی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ بیان کی۔ میر صاحب نے ایک خواجہ سرا کی معرفت دربار میں جانا اپنے لیے کسر شان سمجھا اور دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب صاحب عتیق اللّٰہ کے امام باڑہ کی طرف تشریف لائے۔ تحسین علی خاں کو اشارہ کیا کہ وہ میر صاحب کو منا لائیں۔ خواجہ سرا نے میر صاحب سے درخواست کی "چلو، تمہارے لینے کو حضور آئے ہیں" [1]

---

[1] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۲۸ الف و ب

اس کے برعکس محمد حسین آزاد نے نواب اور میر کے تعلقات میں کشیدگی کا دوسرا واقعہ لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دن نواب نے میر کو بلوایا۔ جب میر وہاں پہونچے تو نواب صاحب ایک حوض کے کنارے کھڑے پانی میں مچھلیوں کے تیرنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان سے کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے ایک غزل سنانی شروع کی۔ نواب صاحب سنتے بھی جاتے اور اپنی چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے کھیلتے بھی جاتے۔ میر صاحب چین بہ جبین ہوتے، اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے۔ کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے! اور بولے پڑھوں کیا۔ آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب صاحب نے کہا جو شعر ہوگا، آپ متوجہ کر لے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گذری، غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے۔ اور پھر جانا چھوڑ دیا۔" چند دنوں کے بعد ایک دن کا واقعہ . . . . ہے کہ میر صاحب بازار میں جا رہے تھے کہ اتفاقاً نواب کی سواری کا گذر ہوا۔ دیکھتے ہی بڑی محبت سے کہا " میر صاحب آپ نے بالکل ہی آنا چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔" میر صاحب نے کہا " بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء نہیں" یہ کیا گفتگو کا موقع ہے" غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گذارتے رہے [1]

---

[1] آب حیات ص ۲۳۰

تذکرۂ گلشنِ ہند کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں میر صاحب نے نواب آصف الدولہ سے قطع تعلقی اختیار کرلی تھی۔ مرزا علی لطف رقمطراز ہیں "روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک ۱۵، ۱۲/۱۸۰۰-۱۸۰۱ء وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا"[1]

محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے قطع تعلق ہونے کی وجہ سے غالباً میر گم نامی کے شکار ہوئے اور نواب سعادت علی خاں کو اپنی مسند نشینی کے بعد یہ خیال نہ رہا کہ میر صاحب بھی دربار سے وابستہ تھے۔ ایک روز نواب صاحب کی سواری جارہی تھی۔ میر صاحب تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سواری سامنے آئی، سب کھڑے ہوگئے مگر میر صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے انشا، اور رنگین نے جو نواب کے ساتھ خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب موصوف کو بتایا کہ وہ میر صاحب تھے۔ رنگین نے انشا کی وساطت سے میر صاحب کو راضی کیا اور وہ کبھی کبھی دربار میں جانے لگے[2]

ان تمام تذکروں کے بغور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں میر صاحب کو بڑی عسرت، تنگدستی اور افلاس میں اپنی زندگی گذارنی پڑی آخری زمانے کے اپنے حالات کے بارے میں میر صاحب خود لکھتے ہیں:۔

---

[1] تذکرہ گلشن ہند/ ۲۱۰

[2] آب حیات/ ۲۴۴

"اس تھوڑی سی مدت میں اس ایک قطرہ خون نے جسے دل کہتے ہیں، طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہو گیا۔ میرا مزاج ناساز تھا۔ ہر شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دیا، اب بڑھاپا آگیا ہے یعنی عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو چکی ہے۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دن آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہا۔ بینائی کمزور ہو گئی اور عینک کی ضرورت پڑی۔ میں نے کف افسوس ملے۔ اور اس شعر کو یاد کر کے ذوقِ نظر چھوڑ دیا کہ:-

دیدہ چوں محتاج عینک گشت فکرِ خویش کن
برنفس دارند روزِ واپسیں آئینہ را

اور دانتوں کے درد کی بات کیا کہوں۔ حیران تھا کہ کب تک علاج کروں۔ آخر مجبور ہو کر ایک ایک دانت جڑ سے اکھڑوا دیا۔

روزی خود را برنج از درد دنداں می خورم
ناں بخوں تر می شود تا پارۂ ناں خورم

غرض کہ ضعفِ قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا زمانہ بھی (زندہ) رہنے کے لائق نہیں رہا ہے۔ اب اس سے دامن کھینچ لینا ہی اچھا ہے۔ اگر خاتمہ بخیر ہو جائے تو یہی آرزو ہے ورنہ اختیار تو اسی (ذاتِ بے ہمتا) کے ہاتھ ہے" [1]

لکھنؤ کے سوقیانہ اور پوچ ماحول میں وہ کم و بیش گمنامی میں رہے اس دور میں لکھنؤ میں اکثر و بیشتر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن کسی میں بھی میر صاحب کی موجودگی کا ذکر نمایاں حیثیت سے دستیاب نہیں ہوتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر صاحب

---

[1] میر کی آپ بیتی /۱۹۲-۱۹۱

وہاں کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے ہوں گے کیوں کہ وہ مشاعرے بالعموم رزمی میدان بن جاتے تھے۔ شاعر آپس میں ایک دوسرے کی ہجو کہتے، اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے درپے ہوتے اور کلام بھی ایسا پڑھا جاتا جو ابتذال اور فحاشی سے پُر ہوتا تھا۔ اشعار کے حسن اور تخیلات کی پرواز کی داد دینے والے کہاں تھے۔ میر زمانہ کے مزاج کے مطابق شعر نہ کہہ پاتے ہوں گے، اور عام پسند شعر کہنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہوں گے۔ مرزا قتیل کے رقعات تقریباً ۱۲۲۵ھ تا ۱۲۲۷ھ میں لکھے گئے تھے۔ اپنے ایک دوست کے نام ایک خط میں مرزا قتیل نے ایک مشاعرہ میں میر صاحب[۱] کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ آیا وہ میر تقی میر ہی تھے یا کوئی دوسرا شاعر تھا۔ مگر بعد کی عبارت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً یہاں قتیل نے میر تقی میر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "خنجرہ میر صاحب باوصف خوش گوئی بدستور بودہ است، تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت، و آواز را ہم کسی نمی شنید لیکن من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بود"۔[۲] اس عبارت سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً میر صاحب اپنی ضعیف العمری کے باوجود کسی مشاعرے میں شریک ہوتے ہوں۔

---

[۱] یہاں میر اسد اللہ کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ مرزا قتیل نے استاد کو کبھی بھی میر صاحب کہہ کر مخاطب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ خاں صاحب کہتے تھے اور لکھا بھی یہی کرتے تھے؛ رقعات مرزا قتیل / ص ۱۷ "احوال خان مزبور"

[۲] رقعات مرزا قتیل / ۴۵

میر کے کلیات میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ میر لکھنؤ جا کر پشیمان تھے اور وہاں کی زندگی اور ماحول سے بیزار رہتے[1] اور یہ بیزاری نواب آصف الدولہ کے بعد اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جس میں میر نے نواب آصف الدولہ کی تحسین و توصیف بیان کیے ہیں اور آخر میں اپنی بے قدری[2] کا نوحہ لکھا ہے:۔

بنے آصف الدولہ میں نے بھی میر　　کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو　　گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو
زہے آصف الدولہ داد گر　　سخن در نواز اور عاشق ہنر

اس کے بعد میر نے نواب کی سخاوت اور عدل گستری کی تعریف اور ان کی طول عمر کی دعا کی ہے اور پھر کہتے ہیں،

---

[1] میر کے کردار کے بارے میں مفصل مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو، میر تقی میر، حیات اور شاعری، ص ۴۰۹-۴۱۰۔ [2] اپنے عہد میں شاعروں کی بے قدری کا مرثیہ مصحفی نے بھی لکھا ہے ویسے ہر شاعر کے ہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن سے ہنروروں کی بے قدری کا علم ہوتا ہے۔

نکتہ چین اب تو سخن پر بھی سخن رکھتے ہیں　　قدر تھی اگلے زمانے میں سخن والوں کی

(دیوان مصحفی سوم (ق۔ ر) ص ۷۳ ب

قدر ہنر کی جو ہوئی دیکھ لی　　اب ہنر بے ہنری کیجئے
کون ہے ان باتوں کا مانع میاں　　خوب سی بیدادگری کیجئے

(دیوان مصحفی سوم ر ۸۷ الف

قفائے غزل اک رباعی کہو   سخن آگے موقوف چپکے رہو
بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس   کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا   خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر لے کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے بس گھر چلو[1]

مصحفیؔ نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں میرؔ کی وہ قدر نہ ہوئی جس کا مستحق تھا۔
"درعہد فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) اکثر ارکان پایۂ تخت (دہلی) وکسانے کہ نسبت داشتند او را تعظیم وتوقیر بمراتب بہتر از دگراں می کردند اکنوں کہ بایں خرابہ کسے درمیان نیست وزمانہ از قدر دان بکلی خالی شد"[2]

یہی وجہ تھی کہ میرؔ دلّی واپس جانے "متاع ہنر پھیر لے جانے" کے لیے بیکل تھے۔ اس بے چینی کا پتا ان کے ذیل کے اشعار سے چلتا ہے۔

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش
خرابہ دلّی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا، سراسیمہ نہ آتا یہاں[3]
مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے   سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

---

[1] کلیات میرؔ (مرتبہ آسی) ص ۸۸۲

[2] عقد ثریا/ ۵۳-۵۴۔ شعرا کی بے قدری کے لیے دیکھیے، مجموعۂ نغز ۱/۱۶۰۔

[3] کلیات میرؔ/ ۳۵۶

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذر
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

خاک دلّی سے جدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار

کیا قدر تھی سخن کی جب یاں بھی صحبتیں تھیں
ہر بات جائزہ ہے ہر بیت پر صلے ہیں

ہیں دلّی لکھنؤ کے خوش اندام لیک
راہ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ

اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

تاجر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں
پیش گئی میر نہ اپنے سوانگ بہت سے لائے ہیں

لکھنؤ میں شعراء کی بے قدری کا مرثیہ مصحفی نے بھی لکھا ہے:۔

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلّی سے نکل کر   کیا کہیے کہ ہم کتنے پشیماں ہوئے ہیں [1]

---

[1] دیوان مصحفی (مرتبہ حسرت موہانی) ص ۶۱

مصحفی لکھنؤ میں آیا دِلّی سے — آیا طے کر کے راہ دور و دراز
لیکن اب خاک میں بھی اس نے کہیں — کچھ نہ دیکھا بجز نشیب و فراز[1]

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے — ویرانے میں مجھکو لا بٹھایا تو نے
میں کہاں کہاں یہ لکھنؤ کی خلعت — اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے[2]

میر کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا کہ فلاں غزل یا مثنوی وغیرہ دلّی میں کہی تھی یا لکھنؤ میں بڑا مشکل ہے۔ میر نے اگر ہر غزل یا اپنے دوسرے صنف سخن کے ساتھ اگر سنہ تحریر لکھ دیا ہوتا تو ہماری مشکل بڑی آسان ہو جاتی اور ہم بڑی آسانی سے میر کے اپنے عہد کے تاثرات کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں صرف قیاس کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثلاً مثنوی مسمّٰی بہ تنبیہہ الجہاں میں شاعروں پر طنز کیا ہے کیونکہ اس زمانے میں ہر کس و ناکس شاعری کرنے لگا تھا[3]۔ جس کی وجہ سے ادبی ماحول پراگندہ

---

[1] دیوان مصحفی ص ۴۹ [2] ایضاً ۱۰۱/

[3] تذکرہ شعرائے اردو (مقدمہ) ص ۱۴-۱۶ قدرت اللہ قاسم اپنے زمانے کے شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "از حال ایں زماں چہ بر طرازم و از قال و مقال ایں دوراں چہ برنگارم کہ دریں ماتم خانہ سینہ چاک نمودہ سیاہ می کند و کاغذ جگر پارہ فرمودہ شکن بر پیشانی می افگند۔ بہر سو کہ می نگرم شاعرے می بینم و ہر طرف کہ گوش فرا می کنم زمزمۂ شعر می شنوم و طرفہ ایں ست کہ باہم نا اہلیہا ہر یک دم از ملک الشعرا می زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایانِ ایں فن می شمرد"، مجموعۂ نغز، ا/ ص ۱۶

ہو گیا تھا۔[۱] ہمعصر تذکروں اور شعراء کے کلام میں اس کے خلاف ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں بھی یہی حال تھا۔ بہت ممکن ہے کہ میرؔ نے یہ مثنوی لکھنؤ میں لکھی ہو اور وہاں کے شعراء پر طنز کیا ہو۔

گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو — ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
چار و نا چار اس کنے جانا پڑے — کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں — جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں[۲]

میرؔ کی وفات میرؔ کی تاریخ وفات میں اختلاف نہیں ہے لیکن عمر کے بارے میں ضرور ہے[۳] میرؔ کی وفات پر ناسخؔ نے اس مصرعہ سے تاریخ نکالی تھی۔ "واویلا مرد شہ شاعراں"[۴]

---

[۱] مجموعۂ نغز ۱/ ایں فن شریف ... بدست جاہلان افتاد، ہجوم عامیان مرتبہ ایں فرقہ را شکست ص ۱۶/ [۲] کلیات میرؔ / ۸۲۵

[۳] ملاحظہ ہو۔ کلیات میرؔ (مرتبہ آسی) مقدمہ ص ۶۰۷۔ تذکرہ ہندی کی تصنیف کے وقت یعنی ۱۲۰۹/ ۹۴-۱۷۹۴ء میں میرؔ صاحب کی عمر اسی سال لکھی ہے

[۴] آبِ حیات ۲۳۰/ مصحفیؔ نے میرؔ کی رحلت پر یہ تاریخی قطعہ کہا تھا۔

وہ محمد تقی میرؔ کہ تھا — ریختہ میں ہر ایک کا سرتاج
ہند جنّت نشان رکھتے تھے — غزل عاشقانہ اس سے رواج
خرمنِ عمر اس کا برق اجل — گر گئی جب دم آن کر تاراج
از میرؔ درد مصحفیؔ نے کہا — حق میں اس کے موا نظیری آج

دیوان مصحفیؔ ششم (قلمی رام پور) ص ۵۲۸

اس سے ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء نکلتی ہے۔ میر کا انتقال ۲۰ رشعبان ۱۲۲۵/۱۸۱۰ء کو ہوا تھا۔ ۲۱ رشعبان کی دوپہر کو اکھاڑہ بھیم سین میں اپنے اقربا کی قبروں کے درمیان مدفون ہوئے۔[1] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے کہ آخری زمانے میں میر صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا۔۔۔ اور صورت کسی کی آئینۂ خورشید میں معائنہ ہوئی۔ پیر جوان ہمت ایسوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ اس پیرانہ سالی میں کدخدا ہونے کا کیا باعث ہوا، فرمایا فقط اس واسطے کہ سسرال۔۔ والے کہیں لڑکا آیا۔ جب مرض الموت کے بیمار ہوئے وصیت کی کہ میرے جنازہ کو اٹھانے میں تعجل (تامل) نہ کرنا۔ جو سنے گا کہ میری رحلت ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ نقد اور سامان معقول بھیجے گا۔ بموجب وصیت کے صبح سے شام ہوئی۔ کسی نے کچھ نہ بھیجا۔ آخر شیخ ناسخ کی اعانت زاد آخرت ہوئی"۔[2]

میر کی قبر

میر کی قبر کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں اب اس کا پتہ نہیں ہے اور نہ اس مقام کی نشاندہی ممکن ہے۔ جہاں میر کو دفنایا گیا تھا۔ جناب شریف الحسن عثمانی صاحب اپنی یادداشت کی بنا پر میر کی قبر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں میر کی قبر دیکھی تھی اور اس پر فاتحہ بھی پڑھی تھی بیس سال قبل جناب شریف الحسن عثمانی صاحب گورنمنٹ جبلی انٹر کالج لکھنؤ میں

---

[1] کلیات میر (مقدمہ) ص ۸

[2] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/ ۲۸ ب میر نے اپنی آپ بیتی میں آخری زمانے کی اپنی حالت کی مجملاً عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ میر کی آپ بیتی/ ۱۹۱-۱۹۲

تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور ڈالی گنج میں رہا کرتے تھے۔ ڈالی گنج سے کالج جانے میں اس ریلوے چھتہ کے نیچے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جس سے ایک سڑک میڈیکل کالج کو چلی جاتی ہے۔ جو اب جگت نرائن روڈ کہلاتی ہے۔ دوسری سڑک جبلی کالج کو جاتی ہے۔ ریلوے چھتہ کے پاس بائیں جانب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس سے ملا ہوا ایک قبرستان کچی پکی قبروں کا تھا۔ اسی قبرستان میں میر کی قبر تھی۔ سفید پتھر کا کتبہ تھا۔ قبر چبوترے کے ساتھ نہایت خستہ حالت میں تھی۔ اس قبرستان میں شہر اسٹیشن سے لائن پار کر کے بھی آیا جا سکتا تھا۔ جب طلباء کی نگرانی ہونے لگی تو سگریٹ پینے والے طلباء کا اڈہ قبرستان میں جمنے لگا۔ یہ اڈہ میر کی قبر کے پاس ہی جمتا تھا۔"

۱۹۴۷ء کے بعد لکھنؤ میں بھی نئی نئی کالونیاں جگہ جگہ بن گئیں۔ اس قبرستان میں بھی کچے پکے مکانات بن گئے۔ پرانے نقشہ کی روشنی میں اب جو جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ میر کی قبر کی جگہ ایک مکان کا پاخانہ تعمیر ہے۔ اس طرح میر کی قبر کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ اور اب میر کی قبر لاپتہ ہے[۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ مراسلہ جناب شریف الحسن عثمانی۔ ہماری زبان (جلد ۲۷، شمارہ ۱۸، مئی ۱۹۶۸ء ص ۷، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میر تقی میر۔ حیات اور شاعری۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۲۶۰۔ ۲۶۴

اہم ماخذوں کی فہرست

فارسی

احوال الخواقین محمد قاسم اورنگ آبادی روٹو گراف۔ علی گڑھ یونیورسٹی

اخبار محبت محمد بن فیض عطا خاں ایضاً

احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ منشی مترسین قلمی۔ عبدالسلام کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی

انفاس العارفین شاہ ولی اللہ دہلی مطبع احمدی دہلی

اقتباس وقائع بدائع آنندرام مخلص، اورینٹل کالج میگزین، اگست، ۱۹۵۰ء، لاہور۔

ارشاد الطالبین ثناء اللہ پانی پتی (قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

بیاض یوسف علی خاں۔ یوسف علی خاں۔ قلمی مملوکہ جناب قاضی عبدالودود، پٹنہ

بیان وقائع نادرشاہ۔ خواجہ کریم الدین، قلمی عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

تذکرہ نتائج الافکار محمد قدرت اللہ گوپاموی

تذکرۃ الملوک، یحییٰ خاں میر منشی فرخ سیر بادشاہ، روٹو گراف، علی گڑھ یونیورسٹی

تاریخ مظفری، محمد علی خاں قلمی۔ علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ ہندی، رستم علی بن محمد خلیل شاہ آبادی روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ شہادت فرخ سیر بادشاہ وجلوس محمد شاہ بادشاہ مرزا محمد بخش آشوب، ایضاً
تاریخ چغتائی محمد شفیع ایضاً
تاریخ جہاں کشای نادری، محمد مہدی بن محمد نصیر الٰہ آبادی، مطبع حیدری بمبئی ۱۸۷۵
تاریخ راحت افزا، سید محمد علی الحسینی بن صادق الحسینی، اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد
تاریخ محمدی مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی علی گڑھ
تاریخ سعادت جاوید ہرنام سنگھ نامی روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ محتشم محمد محتشم خاں قلمی۔ خدابخش لائبریری پٹنہ
تاریخ فرح بخش (تاریخ رام پور) شو پرشاد، قلمی عبدالسلام کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ ممالک ہندوستان غلام باسط، روٹوگراف علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ احمد شاہ مصنف نامعلوم ایضاً
تاریخ عالمگیر ثانی ایضاً قلمی، خدابخش لائبریری پٹنہ
تذکرہ طبقات الشعرا قدرت اللہ شوق مرتبہ نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب لاہور
تفقیح الغافلین ابو طالب لندنی مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ رام پور ۱۹۶۵ء
تذکرہ علمائے ہند رحمان علی صاحب نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۴ء
تذکرہ مجمع الانتخاب شاہ محمد کمال قلمی انجمن ترقی اردو لائبریری، علی گڑھ
تذکرہ ریاض الفصحا غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ مولوی عبدالحق
برقی پریس دہلی ۱۹۳۴ء

تذکرہ ید بیضا — غلام علی آزاد بلگرامی، قلمی ضمیمہ فہرست فارسیہ، سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

تکملہ سیر الاولیا — خواجہ گل محمد احمد پوری — مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ

تذکرہ ریختہ گویان، سید فتح علی گردیزی — مرتبہ مولوی عبد الحق، اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء

تذکرہ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ مولوی عبد الحق، جامع برقی پریس دہلی ۱۹۳۳ء

تاریخ مبارک نامہ، میر مبارک اللہ اعظم خاں، قلمی عبد السلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

تذکرہ مشاہیر عالم — مصنف نامعلوم — قلمی انجمن ترقی اردو علی گڑھ

تاریخ شاکر خانی — شاکر خاں بن شمس الدولہ، روٹوگراف علی گڑھ یونیورسٹی

تذکرہ شعرائے اردو — میر حسن دہلوی — مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی دہلی ۱۹۴۰

تذکرہ گلزار ابراہیم — نواب امین الدولہ علی ابراہیم خاں، قلمی رضا لائبریری رام پور

تذکرۃ الشعراء — میر غلام حسن حسن، قلمی رضا لائبریری رام پور

تذکرہ مردم دیدہ — عبد الحکیم لاہوری — قلمی انجمن ترقی اردو علی گڑھ

تاریخ چہار گلشن محمد شاہی، رائے چترمن کایستھ، قلمی، فہرست لٹن، علی گڑھ یونیورسٹی

تذکرہ نتائج الافکار — محمد قدرت اللہ گوپاموی قلمی حبیب گنج، علی گڑھ یونیورسٹی

ثمرات البدائع — مرزا محمد حسن قتیل — مطبع محمدی ۱۲۶۱

جام جہاں نما — شیخ قدرت اللہ — قلمی رضا لائبریری رام پور

چہار گلزار شجاعی — ہرچرن داس — روٹوگراف علی گڑھ یونیورسٹی

چمنستان الشعراء — لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۲۸ء

چار چمن — آنند رام مخلص — قلمی انجمن ترقی اردو علی گڑھ

چمنستان — آنند رام مخلص — قلمی ایضاً

حدیقۃ الاقالیم — قاضی مرتضیٰ حسین المعروف بہ اللہ یار خاں عثمانی
نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء

خلاصۃ التواریخ، مہاراجہ کلیان سنگھ — قلمی مملوکہ جناب قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ

خزانۂ عامرہ — میر غلام علی آزاد بلگرامی — نول کشور کانپور

خلاصۃ التواریخ — آنند رام مخلص — قلمی

خلاصۃ التواریخ — سبحان رائے بھنڈاری — جی اینڈ سنس پریس دہلی ۱۹۱۸ء

خیر المجالس — حمید قلندر — مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ

خزینۃ الاصفیا — مولوی غلام سرور — مطبع نول کشور کانپور ۱۳۲۰ھ

دریائے لطافت، انشاء اللہ خاں انشا — مرتبہ مولوی عبدالحق اردو پنڈت برج موہن
دتاتریہ کیفی دہلوی مطبوعہ ۱۹۳۵ء

دستور الفصاحت، احمد علی یکتا — مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی
ہندوستان پریس رام پور ۱۹۴۳ء

رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں — مصنف نامعلوم — اوٹوگراف علی گڑھ یونیورسٹی

رقعات مرزا قتیل — محمد حسن مرزا قتیل — نول کشور کانپور ۱۸۸۱ء

رسالۂ نوبادہ — ملا منیر — قلمی سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

رسالۂ نالۂ درد — خواجہ میر درد — شاہجہاں پریس بھوپال

رسالۂ در تحسین المعہ در مبلغ محمد شاہ، مصنف نامعلوم، قلمی سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

ریاض السلاطین غلام حسین سلیم (انگریزی ترجمہ) کلکتہ ۱۹۰۲ء
روزنامچہ شاہ عالم ثانی رائے ٹیک چند قلمی خدابخش لائبریری پٹنہ
رسالۂ دردِ دل خواجہ میر درد شاہجہانی پریس بھوپال
سفرنامہ آنند رام مخلص آنند رام مخلص مرتبہ ڈاکٹر سید اظہر علی
ہندوستانی پریس رام پور ۱۹۴۶ء
سفینۂ ہندی بھگوان داس ہندی مرتبہ عطا الرحمن کاکوی پٹنہ ۱۹۵۸ء
سیر المتاخرین (فارسی) غلام حسین خاں طباطبائی نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۷ء
ایضاً (اردو ترجمہ) منشی گوکل پرشاد لکھنوی نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۹ء طبع دوم
سیر الاولیا میر خورد مرتبہ چرنجی لال محب ہند پریس دہلی ۱۳۰۲ھ
سیر الاقطاب الہدایہ چشتی نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۳ء
سفینۂ خوشگو بندرابن داس خوشگو مرتبہ عطا الرحمن کاکوی پٹنہ ۱۹۵۸ء
سنگاسن بتیسی بکرماجیت شاگرد خواجہ میر درد (قلمی) منیر عالم کلیکشن
علی گڑھ یونیورسٹی
سرگذشت نجیب الدولہ سید نور الدین حسین خاں فخری علی گڑھ ۱۹۲۴ء
شجرۃ الانوار مولانا رحیم بخش (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ
شاہنامہ منور کلام شیو داس لکھنوی (قلمی) رضا لائبریری رام پور
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات شاہ ولی اللہ مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی
(علی گڑھ اوّل اڈیشن)
صحیفۂ اقبال مصنف نامعلوم روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی

ضمیمہ مقامات مظہری شاہ عبدالغنی خلیفہ شاہ غلام علی مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ

عماد السعادت سید غلام علی خاں نقوی نول کشور

عقد ثریا غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق برقی پریس دہلی ۱۹۳۴ء

عیار الشعراء خوب چند ذکا (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

عبرت نامہ مولوی خیرالدین الہ آبادی (قلمی) رضا لائبریری رام پور

فخر الطالبین سید نورالدین حسینی فخری (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ

فہرست خاندان مغلیہ جانکی رام (قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ

کاشف الاستار سید حمزہ (قلمی)، عبدالسلام کلیکشن۔ علی گڑھ یونیورسٹی

کلمات طیبات مفید عام پریس آگرہ ۱۹۱۴ء

کارنامہ عشق انند رام مخلص (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

کلمات الشعراء مرزا محمد افضل سرخوش مرتبہ صادق علی، لاہور ۱۹۴۲ء

گلستان رحمت نواب مستجاب خاں (قلمی) خدابخش لائبریری پٹنہ

گل عجائب اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء

گلزار ابرار (اردو ترجمہ) محمد غوثی شطاری مطبوعہ

ماثر الامرا نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کلکتہ ۱۸۸۸ء

منتخب التواریخ خافی خاں مولوی کبیرالدین احمد کلکتہ ۱۸۷۴ء

ماثر الکرام (سرو آزاد) میر غلام علی آزاد بلگرامی حیدرآباد دکن ۱۹۱۳ء

ماثر الکلام ایضاً مفید عام پریس آگرہ ۱۹۱۰ء

میزان دانش انند روپ روٹوگراف علی گڑھ یونیورسٹی

مفتاح التواریخ | تھامس ولیم بیل | نول کشور کانپور ۱۸۶۷ء
ملفوظ رزاقی | نواب محمد خاں شاہجہاں پوری، مرتبہ سید شاہ غلام جیلانی رزاقی
مجتبائی پریس لکھنؤ
مراۃ الاوضاع | منشی لال ولد سیتل پرشاد (قلمی) مملوکہ پروفیسر شیخ عبدالرشید
سابق صدر شعبہ تاریخ، علی گڑھ یونیورسٹی
مناقب فخریہ | نظام الملک (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ
مخزن نکات | شیخ محمد قیام الدین قائم | مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد دکن ۱۹۲۹
مرات آفتاب نما | شاہ نواز خاں (قلمی) لٹن فہرست فارسیہ، علی گڑھ یونیورسٹی
مجمع النفائس | سراج الدین علی خاں آرزو (قلمی) علی گڑھ یونیورسٹی
مجمع الاخبار | ہرسکھ (قلمی) فہرست لٹن اردو فارسیہ (۲) علی گڑھ یونیورسٹی
مجموعۂ نغز | میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی لاہور ۱۹۳۳ء
مراۃ الاشباہ | فخر الدین حسینی | مطبع سلطانی
ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی | مجتبائی پریس میرٹھ ۱۳۱۴ھ
مرقع دہلی | درگاہ قلی خاں | تاج پریس حیدر آباد دکن
معمولات مظہری | مولوی نعیم اللہ بہرائچی | نظامی پریس کانپور ۱۲۷۵ھ
مقامات مظہری | شاہ غلام علی | مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ
مناقب محبوبین | حاجی نجم الدین | رام پور ۱۲۸۹ھ
مجالس رنگین | سعادت یار خاں رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب
لکھنؤ ۱۹۲۹ء (پہلا اڈیشن)

مراۃ الاصطلاح   آنند رام مخلص   (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی   نول کشور   ۱۸۸۲ء

نورالقلوب   سید امجد علی خاں   (قلمی) رضا لائبریری رام پور

نالۂ عندلیب   خواجہ محمد نصیر عندلیب   شاہجہانی پریس بھوپال ۱۳۰۸ھ

نادر نامہ   ملا عبدالکریم کشمیری   (قلمی) عبدالسلام کلیکشن علی گڑھ

نکات الشعراء   میر تقی میر   مرتبہ مولوی عبدالحق، دکن ۱۹۳۵ء

وقائع عالم شاہی   کنور پریم کشور فراقی   مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی
ہندوستانی پریس رام پور ۱۹۴۹ء

وقائع بعد از وفات عالمگیر   مصنف نامعلوم   قلمی علی گڑھ یونیورسٹی

واقعات اظفری، مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری' ترجمہ عبدالستار مدارس ۱۹۳۷ء

وقائع آنند رام مخلص، آنند رام مخلص (قلمی) فہرست لٹن اردو فارسیہ (۲)
علی گڑھ یونیورسٹی

ہفت تماشا۔ مرزا محمد حسن قتیل (اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر)
مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۸ء

اُردو

اخبار الصنادید مولوی نجم الغنی ۱۹۱۸ء
الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر (بریلی) مرتبہ منظور نعمانی بریلی ۱۳۵۹ھ
آب حیات محمد حسین آزاد لکھنؤ اڈیشن
آئین اکبری ابوالفضل ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب حیدرآباد ۱۹۳۸ء
آثار الصنادید سرسید احمد خاں ترتیب و تدوین خالد نصیر ہاشمی سنٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی ۱۹۶۵ء
اخبار الاخیار عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد پاکستان ۱۹۶۳ء
اردوئے معلیٰ غالب
البلاغ المبین شاہ ولی اللہ مکتبہ شعیب حدیث منزل کراچی
انتخاب طلسم ہوشربا محمد حسن عسکری
بزم آخر منشی فیاض الدین رحمانی پریس دہلی ۱۹۲۰ء
تاریخ مہاراجگان ہند مولوی نجم الغنی ہمدم پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء
تاریخ اودھ مولوی نجم الغنی نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء
تاریخ مرہٹہ و ابدالی علی ابراہیم خاں مطبع احمدی بنارس ۱۷۹۴ء
تحریر مرتبہ مالک رام جلد (۲) شمارہ (۳) دہلی ۱۹۶۸ء
تذکرہ گلشن ہند مرزا علی لطف مرتبہ مولوی عبدالحق۔ لاہور ۱۹۰۶ء

تاریخ مشائخ چشت پروفیسر خلیق احمد نظامی ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء
تذکرہ خوش معرکہ زیبا سعادت خاں ناصر لکھنوی (قلمی)، منیر عالم کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

تاریخ بلدۂ نجیب آباد　　نواب محمد سعید اللہ خاں (قلمی) عبدالسلام کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی

تذکرہ طبقات الشعراء ہند　　مولوی کریم الدین　　دہلی ۱۸۴۸ء

تقویت الایمان　　شاہ اسمعیل شہید　　نول کشور ۱۸۸۸ء

تاریخ عزیزی　　غلام حلیم معروف بہ شاہ عبدالعزیز دہلوی بن مولانا صہبائی (قلمی) سلیمان کلیکشن۔ علی گڑھ یونیورسٹی

حیات حافظ رحمت خاں　　سید الطاف علی بریلوی　　پاکستان ۱۹۶۳ء

حیات ولی　　مولانا رحیم بخش　　دہلی ۱۳۱۹ھ

حجۃ اللہ البالغہ　　شاہ ولی اللہ　　ترجمہ خلیل احمد، لاہور ۱۸۹۷ء

دیوان مصحفی اول تا ہشتم　　(قلمی) رضا لائبریری رام پور و خدابخش لائبریری پٹنہ

دیوان جرأت　　قلندر بخش جرأت　　(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

دیوان شاہ کمال الدین حسین　(قلمی) رضا لائبریری رام پور

دیوان عیشی　　میاں طالب علی عیشی (قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

دیوان حسرت　　جعفر علی حسرت　(قلمی) رضا لائبریری رام پور

دیوان زادہ　　شاہ حاتم　(قلمی) عبدالسلام کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی

دیوان یقین　　انعام اللہ خاں یقین، مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ　مطبوعہ

دیوان مصحفی　　غلام ہمدانی مصحفی　　مرتبہ مولانا حسرت موہانی　علی گڑھ ۱۹۰۵ء

دیوان قائم چاند پوری　　شیخ محمد قیام الدین قائم (قلمی) رضا لائبریری رام پور

دیوان بیدار　　مرزا محمدی بیدار دہلوی　(قلمی) رضا لائبریری رام پور

دیوان تاباں　　میر عبدالحی تاباں　مرتبہ مولوی عبدالحق　حیدر آباد ۱۹۳۵ء

دیوان رشید — رشید الدین (قلمی) سلیمان کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی

دلی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی دہلوی — دہلی ۱۹۴۳ء

دیوان جوشش — میاں محمد روشن جوشش — مرتبہ قاضی عبدالودود — دہلی ۱۹۴۱ء

دلی کا دبستان شاعری — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — (طبع اول)

دیوان مہجور — صدرالدین مہجور — (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

رسالہ تعزیہ داری — شاہ عبدالعزیز دہلوی (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

سلک گوہر — انشاء اللہ خاں انشاء — مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی، رام پور ۱۹۴۸ء

سوانحات سلاطین اودھ — سید کمال الدین حیدر — نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۶ء

سفینۃ الاولیا — دارا شکوہ — ترجمہ محمد علی لطفی — پاکستان طبع دوم ۱۹۶۱ء

شباب لکھنؤ — محمد احد علی — مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۹ء

فسانۂ آزاد — پنڈت رتن ناتھ سرشار — جلد اول نول کشور ۱۹۴۹ء

فسانۂ عجائب — مرزا رجب علی بیگ سرور — نول کشور لکھنؤ ۱۹۴۴ء

فرہنگ زیورات — از سید محمد — (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

کلیات انشاء — انشاء اللہ خاں انشاء — نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء

کلیات ہدایت — غلام حسین ہدایت — (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

کلیات سودا — محمد رفیع سودا — مرتبہ عبدالباری آسی — نول کشور لکھنؤ ۱۹۳۲ء

کلیات میر حسن — میر حسن دہلوی (قلمی) لٹن لائبریری اردو، علی گڑھ

کلیات نظیر اکبر آبادی — مرتبہ عبدالباری آسی — لکھنؤ ۱۹۴۱ء

کلیات میر — میر تقی میر — مرتبہ عبدالباری آسی — لکھنؤ ۱۹۴۱ء

کلیات جرأت — قلندر بخش جرأت (قلمی) سبحان اللہ کلیکشن علی گڑھ

کلیات قاسم — قدرت اللہ قاسم (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

کلیات قائم — قائم چاند پوری (قلمی) رضا لائبریری رام پور

گذشتہ لکھنؤ — مولوی عبدالحلیم شرر — نسیم بک ڈپو لکھنؤ

لکھنؤ کا دبستان شاعری — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — لاہور ۱۹۵۵ء

میر کی آپ بیتی　میر تقی میر　ترجمہ ذکر میر، نثار احمد فاروقی　مکتبہ برہان دہلی ۱۹۵۷ء

مجموعہ مثنویات میر حسن　میر حسن دہلوی　مرتبہ عبدالباری آسی　نول کشور لکھنؤ ۱۹۴۵ء

مثنوی واجد علی شاہ　نواب واجد علی شاہ (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

مسائلہ　سعادت یار خاں رنگین (قلمی) سلیمان کلیکشن علی گڑھ

مثنوی سراپائے عشق　میر غلام علی آزاد بلگرامی　سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

میر حسن دہلوی اور ان کا زمانہ　ڈاکٹر وحید قریشی　لاہور ۱۹۵۹ء

میر تقی میر حیات اور شاعری　ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی　علی گڑھ ۱۹۵۴ء

نصیحت المسلمین　مولوی خرم علی (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

نادرات شاہی　شاہ عالم ثانی　مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی رام پور ۱۹۴۴

نقوش　لاہور، اکتوبر ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۲ء

وقائع عبدالقادر خانی　عبدالقادر رام پوری　ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی پاکستان ۱۹۶۰ء

وزیر نامہ　محمد امیر علی خاں　نظامی پریس کانپور ۱۸۷۲ء

وقائع سیر و سیاحت (اردو ترجمہ) ڈاکٹر برنیر　مطبوعہ

واقعات دارالحکومت دہلی　منشی بشیر الدین احمد　آگرہ ۱۹۱۹

وصیت نامہ شاہ ولی اللہ　شاہ ولی اللہ، اردو ترجمہ جامعہ پریس قرول باغ دہلی

ہندو تیوہاروں کی اصلیت　منشی رام پرشاد　لاہور

ہدایت المومنین　مولوی سید حسن قنوجی حسن (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ

ہفت قلزم　منشی گوری شنکر　ستارہ ہند پریس دہلی ۱۸۷۹ء

Memoirs of Delhi and Faizabad,
Eng. Trans. of Tarikh-i-Farah Bakhsh,
Mohd Faiz Bukhsh, By William Hoey.
Allahabad: 1888

Farazer: The History of Nadir Shah
London 1742.

Lockhart, L.: Nadir Shah, London
1938.

Grose, J.H.: A voyage to the East
Indies, London, 1766.

K.K.Datta: Aliverdi And His Times,
Calcutta, 1963.

Srivastava, A.L.: First Two Nawabs
of Oudh, Agra 1954.
(2 Edition)

George Forster: Journey from Bengal to England etc., London 1808.

Dow, Alxender: History of Hindostan London.

George william Forrest: Selections from the Letters etc., Calcutta, 1890

Polier, A.H.: Shah Alam IInd And His Court, Calcutta, 1947.

Twining, Thomas: Travels in India, A Hundred years Ago. (1794) London, 1893.

Lumsdon: A Journey from Merut to London, London, 1822.

Davidson,: Diary of Travels and Adventures in upper India, London 1843.

William Hodges: Travels in India, during the years, 1780 1781, 1782, 1783 London, 1793.

Mrs Mir Hasan Ali: Observations on the Musalmans of India, etc., London 1832 1st edition 2nd Vols. 2nd edition 1917, one Volume.

James Forbes: Oriental Memoires, etc., London 1814.

Ross, Sir, E. Denison: Hindu-Muhammadan Feasts and Festivals etc., Calcutta 1914.

Jamila Brij Bhushan: The Costumes and Textiles of India, Bombay, 1958.

Orlich, Capt. L. Von: Travels in India etc., London. 1845

Sarkar, Jadunath: Fall of the Mughal Empire, (3rd ed.)

Shatish Chand: Parties and Politics at the Mughal Court, Aligarh, 1959.

Ganda Singh: Ahmad Shah Durrani.

William Franklin: The History of the Reign of Shah Allum, London, 1798.

Smith, V.A.: Oxford History of India, Oxford, 1923.

Keaye.: Rulers of India, Oxford, 1901.

Qanungo. K.R. : History of the Jats. Cal. 1989.

Spear, P : Twilight of the Mughals, Delhi, 1969

Vansittart, Henery : A Narrative of the Transaction, in Bengal etc., London, 1766.

Jafar Sharif : Qanun-e-Islam, London 1921.

Della valle Pietro : The Travels etc. London.

Mandelslo Robert : Voyags and Travels etc., (2nd Ed.) London 1669.

Jamila Brij Bhushan: Indian Jewellery, Ornaments etc., Bombay

Manucci: Storia Do Mogor or Nugal India.

Ovington, J.: A voyage to Suret in the year, 1689 London 1696

Donaldson: The Shiite Religion (L. 1933)

Sarkar, Jadunath: Studies in Nughal India, Cal. 1919.

Bland: Peisian Game of Chess, L. 1850.

Chopra, A. N.: Society and Culture in Mughal Age, Agra, 1955.

Stoddard: The New World of Islam, New york. 1921.